

انقلاب

اٹھارہ سو ستاون

پی۔ سی۔ جوشی



قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

انقلاب ۱۸۵۷ء

انقلاب ۱۸۵۷ء

1857 - The last stand of Islam

پنی-سی-جوشی

A Muslim war



قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل

حکومت ہند

ویسٹ بلاک-I، آر-کے-پورم، نئی دہلی-110066

پیش لفظ

”ابتدا میں لفظ تھا۔ اور لفظ ہی خدا ہے“

پہلے جمادات تھے۔ ان میں نمو پیدا ہوئی تو نباتات آئے۔ نباتات میں جبلت پیدا ہوئی تو حیوانات پیدا ہوئے۔ ان میں شعور پیدا ہوا تو بنی نوع انسان کا وجود ہوا۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ کائنات میں جو سب سے اچھا ہے اس سے انسان کی تخلیق ہوئی۔

انسان اور حیوان میں صرف نطق اور شعور کا فرق ہے۔ یہ شعور ایک جگہ پر ٹہر نہیں سکتا۔ اگر ٹہر جائے تو پھر ذہنی ترقی، روحانی ترقی اور انسان کی ترقی رک جائے۔ تحریر کی ایجاد سے پہلے انسان کو ہر بات یاد رکھنا پڑتی تھی، علم سینہ بہ سینہ اگلی نسلوں کو پہنچتا تھا، بہت ساحصہ ضائع ہو جاتا تھا۔ تحریر سے لفظ اور علم کی عمر میں اضافہ ہوا۔ زیادہ لوگ اس میں شریک ہوئے اور انھوں نے نہ صرف علم حاصل کیا بلکہ اس کے ذخیرے میں اضافہ بھی کیا۔

لفظ حقیقت اور صداقت کے اظہار کے لیے تھا، اس لیے مقدس تھا۔ لکھے ہوئے لفظ کی، اور اس کی وجہ سے قلم اور کاغذ کی تقدیس ہوئی۔ بولا ہوا لفظ، آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ ہوا تو علم و دانش کے خزانے محفوظ ہو گئے۔ جو کچھ نہ لکھا جا سکا، وہ بالآخر ضائع ہو گا۔

Inqilab 1857

By : P.C. Joshi

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت:

پہلا اڈیشن : 1972

دوسرا اڈیشن : 1983

تیسرا اڈیشن : 1998 تعداد 1100

قیمت : 75/-

سلسلہ مطبوعات : 781

ناشر : ڈائریکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر۔ کے۔ پورم،

نئی دہلی-110066

طابع : سپریم آفسیٹ پریس، مالویہ نگر، نئی دہلی۔

دیباچہ

پبلشر پبلشنگ ہاؤس نے، ۱۸۵ء کے انقلاب کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر ایک یادگار صحیفہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سو سال کی پرانی شورش کے قومی رنگ سے وطن پرست علماء میں بالعموم اتفاق رائے پایا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود بد قسمتی سے ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئی طلب مسئلہ ہے جو ابھی تک حل نہیں ہوا۔ یہ صحیفہ ایک مباحثے کی حیثیت رکھتا ہے اور ہر متفکر نگار نے اپنے اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔

تلمیذ خلدون ایک پرانے محقق ہیں اور آپ نے اس موضوع کے تحقیقی مطالعے میں قدیم تاریخی دستاویزات سے استفادہ کیا ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے ڈاکٹر کے ایم اشرف نے دہلیوں کا نظریہ اور بغاوت میں ان کے کردار کی نقش گری کی ہے۔ دہلیوں کی ایک منظم اور موثر جماعت تھی جو کسی قدر قدیم تر جاگیر دار مگر روشن خیال طبقے کے نقطہ نگاہ کی ترجمانی کرتی تھی۔ بے گھوش نے روشن خیال بنگالیوں کے مخالفانہ مگر معقول رویے کا پس منظر اجمال کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ بنگالی جدید تعلیم سے بہرہ مند نئے پڑھے لکھے طبقے کے نمائندے تھے۔ میں نے، ۱۸۵ء کے انقلاب سے متعلق مختلف ادب متفاد نظریات پر بحث کر کے اس گفتی کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ میں کوئی پیشہ ور مورخ نہیں ہوں اس لیے میں نے طویل اقتباسات سے کام لیا ہے اگرچہ یہ ایک فرسودہ طریقہ ہے۔ اگر میرا یہ طریقہ جدت پسند ادبا کو ناگوار گزرتا ہے تو میں یہ عذر پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ میں نوجوان متعلمین کو ان قدیم اور نایاب نسخوں میں سے مواد مہیا کر رہا ہوں جو ان کی دسترس سے دور ہیں۔

مختلف زبانوں کے ہندوستانی قومی ادب میں جو حب وطن کا رجحان ہے وہ بڑی حد تک، ۱۸۵ء کے انقلاب کی دین ہے۔ اس سے ہندوستانی ادب کو درد و کرب، جدوجہد اور ایثار نفس کے ڈرامائی واقعات اور قوم پرستی کے بلند پایہ مضامین میسر آئے ہیں۔ اس کتاب کے ادبی حصے میں الیڈیو نیوٹن کے پروفیسر پی۔ سی۔ گپتا نے ہندی ادب اور لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر اعتشام حسین نے اردو ادب پر، ۱۸۵ء کے انقلاب کے اثرات کا تجزیہ کیا ہے۔ ڈاکٹر کے ایم۔ اشرف نے غالب پر ایک مقالہ شامل تالیف

پہلے کتابیں ہاتھ سے نقل کی جاتی تھیں اور علم سے صرف کچھ لوگوں کے ذہن ہی سیراب ہوتے تھے۔ علم حاصل کرنے کے لیے دور دور کا سفر کرنا پڑتا تھا، جہاں کتب خانے ہوں اور ان کا درس دینے والے عالم ہوں۔ چھاپہ خانے کی ایجاد کے بعد علم کے پھیلاؤ میں وسعت آئی کیونکہ وہ کتابیں جو نادر تھیں اور وہ کتابیں جو مفید تھیں آسانی سے فراہم ہوئیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اچھی کتابیں، کم سے کم قیمت پر مہیا کرنا ہے تاکہ اردو کا دائرہ نہ صرف وسیع ہو بلکہ سارے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی اس زبان کی ضرورتیں پوری کی جائیں اور نصابی اور غیر نصابی کتابیں آسانی سے مناسب قیمت پر سب تک پہنچیں۔ زبان صرف ادب نہیں، سماجی اور طبعی علوم کی کتابوں کی اہمیت ادبی کتابوں سے کم نہیں، کیونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے، زندگی سماج سے جڑی ہوئی ہے اور سماجی ارتقاء اور ذہنی انسانی کی نشوونما طبعی، انسانی علوم اور ٹکنالوجی کے بغیر ممکن نہیں۔

اب تک بیورو نے اور اب تشکیل کے بعد قومی اردو کونسل نے مختلف علوم اور فنون کی کتابیں شائع کی ہیں اور ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ کتاب اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے یہ اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔ میں ماہرین سے یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کوئی بات ان کو نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں نظر ثانی کے وقت خامی دور کر دی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

ڈائریکٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی

فہرست مضامین

ویاچہ

حصہ اول

۱۳

تلمیذ خلدون

بغاوتِ عظیم :

۸۶

احیائے اسلام کے حامی اور ۱۸۵۷ء کا انقلاب : کے۔ ایم۔ اشرف

۱۱۷

بنگال کا روشن خیال طبقہ اور انقلاب : بے گمش

۱۳۲

ہماری تاریخ میں ۱۸۵۷ء : پی۔ سی۔ جوشی

حصہ دوم

۲۳۲

پی۔ سی۔ گیت

۱۸۵۷ء اور ہندی ادب :

۲۳۵

اشتہام حسین

اردو ادب اور انقلاب ۱۸۵۷ء :

۲۵۳

کے۔ ایم۔ اشرف

غالب اور بغاوت ۱۸۵۷ء :

۲۶۶

گوپال بلند

۱۸۵۷ء سے پہلے اور بعد کا بنگالی ادب :

۲۷۸

پی۔ سی۔ جوشی

۱۸۵۷ء سے متعلق لوگ گیت :

حصہ سوم

۲۹۹

جیمز براؤن

۱۔ بغاوتِ ہند اور برطانوی رائے :

۳۲۰

پارسی فورمین

۲۔ ہمعصر فرانسیسی پریس :

۳۲۸

لیانا ڈول نوگاری

۳۔ اٹلی میں ۱۸۵۷ء کی صدائے بازگشت :

۳۳۷

پی۔ شاستی کو

۴۔ ۱۸۵۷ء اور روسی پریس :

۳۴۱

۵۔ چین اور ہندوستان انیسویں صدی کے وسط میں : یو۔ شینگ وو۔ چین کن

۳۵۶

جدول تواتر

کیا ہے۔ بنگال کے ادبی نقاد اور ادیب گوپال چند نے معاصر بنگالی ادب پر بحث کی ہے۔

ہم اُن غیر ملکی علماء کے شکر گزار ہیں جنہوں نے اپنے بیش بہا مقالات سے ہمیں نوازا ہے۔ انھوں نے ان مقالات میں اپنے اپنے ملک میں ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ اس باب میں جیمز برٹن کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ وہ برطانوی رد عمل سے متعلق مقالے کے مصنف ہیں۔ ان کی ناگہانی وفات نے ہمیں تاریخ ہند کے ایک مخلص اہم درو اور دانش مند طالب علم سے محروم کر دیا ہے۔ یہ مقالات بڑی محنت، تحقیق و تدقیق کا نتیجہ ہیں۔ ان کے مطالعے سے ظاہر ہے کہ ان تمام غیر ممالک میں ۱۸۵۷ء کے انقلاب کا خیر مقدم کیا گیا کیوں کہ یہ غلامی کے برطانوی جوئے سے نجات پانے کے لیے ہندوستانوں کی قومی جدوجہد تھی جس نے عالمی جمہوری حلقوں میں یک جہتی کے جذبات کو ابھارا۔ ہمیں امید ہے کہ یہ غیر ملکی مقالات ہندوستان کی قومی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنے میں مدد دیں گے جس کا ہمیں اب تک علم نہ تھا۔

ہم اپنے مقالہ نگاروں کے ممنون ہیں جن کے تعاون سے اس یادگار صحیفہ کی اشاعت ممکن ہو سکی۔ ہم ان دوستوں کے بھی مرمون منت میں جن کی محبت آمیز اور بے غرض کوشش سے اس کتاب کا مسودہ طباعت کی منزل تک پہنچ سکا۔

پی۔ سی۔ جوشی

حصہ اول

تلمیذ خلدون

بغاوتِ عظیم

۱۔ تمہید

ہندوستان کا غدر (۱۸۵۷ء) برطانوی اور ہندوستانی مورخین کا ایک محبوب موضوع رہا ہے۔ برطانوی مورخین نے اسے محض "فوجی بغاوت" تصور کیا ہے اور اسے اس سے زیادہ اہمیت دینے پر آمیل نہیں ہوئے۔ اُن کا عقیدہ یہ ہے کہ اس بغاوت کی تہ میں حب وطن کا کوئی جذبہ کارفرما نہ تھا بلکہ اس میں غرض مندی کا پہلو نمایاں تھا۔ اسے نہ تو وطن دوستوں کی رہنمائی حاصل تھی اور نہ ہی عوام کی حمایت۔ اس کے بالکل برعکس ہندوستانی مصنفین نے اسے شاندار "جنگِ آزادی" کا نام دیا ہے اور اس کی عظمت کے راگ گائے ہیں۔ انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ عوام نے جوق در جوق اس جنگِ آزادی میں شرکت کی، فرنگیوں کو دم نہ لینے دیا اور آخر دم تک لڑتے رہے۔ اگر ہم برطانوی مورخین کے نظریہ کو شہنشاہی نخوت کا نتیجہ قرار دیں تو یہ بھی نہ بھوننا چاہیے کہ ہندوستانی مورخین کی تاویل غیر معقول قوم پرستی کا مظاہرہ ہے۔ دونوں نظریے انتہا پسندانہ ہیں اور فریقین پر اپنے اپنے مفاد کی طرف داری اور مصلحت کا گمان گزرتا ہے۔

برطانوی نظریہ یقیناً کمزور ہے۔ یہ اس صورتِ حال کے سبب پر روشنی نہیں ڈالتا کہ دس دنوں کے اندر سوبہ اور دھیس انگریزی حکومت کے پرچمے اڑا گئے اور اس کا نام و نشان باقی نہ رہا۔ برطانوی نظریہ اس حقیقت کو بھی نظر انداز کرتا ہے کہ "متعدد مقامات پر فوجیوں کی سرکشی سے پہلے ہی لوگوں نے علم بغاوت بلند کر دیا تھا"، نیز اگر یہ خالص فوجی شورش تھی اور عوام کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا تو "ملک کے دیہاتیوں اور شہریوں کو کون جرائم کی بنا پر جرمیٰ اور پھانسی کا سزاوار سمجھا گیا" اور پھر باغیوں کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہوئے لارڈ کیننگ "سرکشی سپاہیوں کی بہ نسبت ان شہریوں پر کیوں زیادہ شد و مد کے ساتھ بر سے جنھیں بغاوت پر اکسایا گیا تھا" پھر سوال اٹھاتا ہے کہ اورنگ آباد کے غدر

کے ہر خیمے میں خدمت گزاری پر آمادہ تھے اور کھانے کی میز تک کے گرد کھڑے ہوتے تھے۔ کوئی اچانک حملہ کرنا ایک سچوہ تھا کیوں کہ زبانی انواہیں تیز رفتاری میں ہمارے رسلے کو بھی بات کرتی تھیں۔ اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ دیکھا گیا اور جنا کے درمیانی علاقوں میں ”شاید ہی کوئی مسلم یا ہندو ہوگا جو ہمارے خلاف صف آراء ہو“ ۱۲ مایسن کا بھی یہ بیان ہے کہ اودھ، روہیلکھنڈ، بندیکھنڈ اور ساگر و نربدا کے چار شمالی صوبوں میں ”عوام کی اکثریت نے برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کی“ ۱۵ پادری کیو براؤن نے بھی اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ ”اودھ شدید تر اودھ بھاگنے بغاوت کا مرکز تھا کیوں کہ یہاں یہ واقعی مقبول عام تھی“ ۱۶ پنجاب میں جہاں کوئی بغاوت رونما نہ ہوئی ”تمام مقامی آبادی متمول ساہوکار سے معمولی پوپاری تک اور سرکاری ٹھیکہ دار سے ادنیٰ قتی تک الگ تھلک رہی، کسی سے کوئی مدد یا مدد وغیرہ نہ ملی“ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کے ماہ ستمبر کے وسط میں دہلی پر قبضہ ہو گیا، ۱۷ تھا مسن تو کے قول کے مطابق دختر کش راجپوت، اکثر برہمن، متعصب مسلمان اور پیش پسند توند والا من چلامرٹھ سبھی اس جہاد میں شامل ہو گئے۔ گائے کا قاتل اور گائے کا پجاری، خنزیر سے کراہیت رکھنے والا اور خنزیر کا گوشت کھانے والا، لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا کلمہ پڑھنے والا اور برہمن کے منہ زور کو گنگانے والا سبھی نے مل کر بغاوت کی ۱۸۔ اسی وقت فرماتے ہیں: ”اس میں کوئی شک نہیں کہ سیاسی مقاصد محض ایک فوجی بغاوت کو شمالی اور وسطی ہندوستان کے اکثر طبقوں میں پھیلانے میں معاون ثابت ہوئے اور اسے ایک سیاسی شورش میں بدل دیا“ ۱۹ غرض برطانوی مورخین کا یہ بلند بانگ دعوٰی کہ ۱۸۵۷ء کا انقلاب صرف ایک فوجی بغاوت تھی، حقیقت کے خلاف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بغاوت پھوٹنے کے چند ہی ہفتوں کے اندر شمالی ہندوستان میں برطانوی سلطنت کے نام و نشان مٹنے میں تھوڑی سی ہی کسر باقی رہ گئی تھی۔

لیکن اس بغاوت کو صرف اس لیے کہ یہ انگریزوں کے خلاف بہت بڑی شورش تھی، قومی آزادی کی جنگ کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ اس دعوٰی کی صاف تردید اس امر سے ہوتی ہے کہ جوں ہی کسی ضلع سے باغی فوجیوں اور سرکش سرداروں کو بھگایا جاتا دہاں فوراً امن و امان بحال ہو جاتا۔ ۲۱ اس کے علاوہ یہ خیال تاریخی اقتدار سے بھی صحیح نہیں۔ اس وقت ہندوستانیوں میں قومیت کا ایسا جذبہ نہ پایا جاتا تھا جس کا مفہوم آج ہمارے ذہن میں ہے۔ قوم پرستی کا یہ فقدان اس بات سے بھی ظاہر ہے کہ بغاوت کے لیے کوئی عوامی منصوبہ نہیں مرتب کیا گیا تھا اور جب بغاوت پھوٹی تو باغیوں کی رہنمائی کے لیے کوئی مرکزی تنظیم موجود نہ تھی۔ سخت غامض، نا اہل، نا اہل، لٹی جھانسی

اور ناگپور کے تمام فرنگیوں کے قتل کی سازش کے ساتھ ساتھ واقع ہونے کا کیوں کر انکشاف ہوا؟ اور مشرق سے ناگپور اٹھنے والے طوفان کی سی تیزی کے ساتھ بغاوت کی کوئی آندھی چلی جس نے برطوں "ہزاروں میلوں تک کپڑی کے نظام حکومت کا تختہ الٹ کر اسے ہنس نہس کر دیا حالانکہ یہ نظام ہر قسم کے صدمے سے محفوظ نظر آتا تھا۔"

بغاوت کا طول و عرض پوری ایگزیکٹو ڈیپارٹمنٹ، چارلس بال بلکہ سر جان ولیم کے اور کرنل جی بی۔ ہارن کے مذکورہ ذیل بیانات سے بخوبی ظاہر ہے حالانکہ وہ اسے محض ایک فوجی غدر قرار دیتے ہیں۔ بقول ڈیپارٹمنٹ "جب بھی دشمنوں کا سامنا ہوا ان میں بھگدڑ پھیل گئی وہ تتر بتر ہو گئے اور اپنی توپیں بھی کھو بیٹھے لیکن متواتر شکستوں کے باوجود وہ منظم ہو کر آدھکے گویا از سر نو آئندہ پیکار ہیں۔ جوں ہی ایک شہر پر قبضہ کیا جاتا ہے یا ملک پہنچ کر کسی اور کج نجات دلائی جاتی ہے تو دوسرا خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ جیسے برطانوی لشکر کی ریل پیل سے ایک ضلع میں امن و امان کا اعلان کیا جاتا ہے تو کسی اور میں فتنہ و فساد پیدا ہو جاتا ہے۔ جب بھی اہم مقامات کے درمیان کوئی شاہراہ کھلتی ہے فوراً دوبارہ مسدود ہو جاتی ہے اور مواصلات بھڑکے لیے ریل و سرائی کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ ادھر ایک بستی کو باغیوں اور سرکشوں سے پاک کیا اور دوسری میں وہ ڈگنے ڈھلنے کے ساتھ ہجوم کے ساتھ ٹوٹ پڑے۔ جوں ہی نقل و حرکت کرنے والا فوج کا پر دشمن کی صفوں کو چیرتا ہوا گزر جاتا ہے اس کے پس پشت تمام علاقے پر مخالفت پھر سے قابض ہو جاتے ہیں۔ بدخواہوں کے ہرے میں اگر کوئی شہر گمان پیدا ہوتا ہے تو ان کی آن میں پڑ ہو جاتا ہے اور مستقل معافی یا فوج کا نشان کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ ہماری قلیل مگر بہادر فوجیں باغیوں کے ڈھکی چھپی دلی میں سے بجائے ایک زبردست ہل کی طرح ناہموار کھیت میں کوئی نشان چھوڑنے کے اس طرح گزر جاتی ہیں جیسے ایک غناب کہ ہوائی میں سے، یا جیسے ایک ذی شان جہاز سمندر کی ہموار سطح کو بغیر کوئی گیر ڈالے عبور کر جاتا ہے۔" ۱۲

چارلس بال نامی ایک اور برطانوی مورخ بغاوت کی مقبولیت کو یوں بیان کرتا ہے :
 "ادھ میں باغیوں کو نقل و حرکت کے وقت رسد رسائی کی ضرورت تھی کیوں کہ لوگ ہمیشہ ان کی خاطر تواضع کرتے۔ وہ اپنا سامان بغیر منافذ کے راستے میں چھوڑ جاتے کیوں کہ لوگ اس پر ہاتھ نہ ڈالتے انہیں ہمیشہ اس بات کا علم ہوتا تھا کہ وہ خود کہاں ہیں اور ان کا فرنگی دشمن کہاں مقیم ہے کیوں کہ لوگ گھسنے گھسنے کے بعد ان کو صورت حال سے مطلع کرتے رہتے۔ انگریزوں کی کوئی تدبیر بھی راز میں نہ رہ سکتی تھی کیوں کہ بغاوت سے خفیہ ہمدردی رکھنے والے ہندوستانی، برطانوی لشکر کا

کارندوں اور ملازموں کی نجی بالائی آمدنی شامل نہ تھی۔ ۳۱ (کمپنی کے ادنیٰ ملازم بھی جب انجکستان کو کوٹے تو امرار کی طرح ٹھاٹ باٹ کے ساتھ رہنے لگتے اور بالعموم انھیں "نواب" کہہ کر مخاطب کیا جاتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ کس طرح اس ملک میں غیر قانونی طریقوں سے بے حساب دولت بناتے)

۱۷۱۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال کی دیوان حاصل کر لی۔ اس وقت تک یہ کمپنی تمام یورپی حریفوں کو ہندوستان کی منڈی سے خارج کر چکی تھی۔ دیوان کے اصول اور ہندوستان کے ساتھ تجارت کی اجارہ داری سے کمپنی اور اس کے ملازمین کے منافع میں اور بھی اضافہ ہوا لیکن ہندوستان کے لوگوں کی پریشانی اور ناداری بڑھ گئی۔ دیوان کے بارے میں ایڈم سمٹھ فرماتے ہیں: "کسی بھی ملک کے لیے خاص تجارتی کمپنی کی حکومت شاید ہر قسم کی حکومت سے بدتر ہے۔ کبھی بھی کوئی اور فرماں روا اپنی رعایا کی خوشی یا خستہ حالی، اپنی قوم کی بہبودی یا بربادی اور اپنی حکومت کی شان یا ذلت سے اس قدر لاپرواہ نہ تھا یا تقاضائے حالات سے نہ ہو سکتا تھا جس قدر کہ ناقابل مزاحمت اخلاقی اسباب کی بناء پر ایسی تجارتی کمپنی کے بیشتر مالک ہیں یا لازماً ہونے چاہئیں۔ یہ ایک انوکھی حکومت ہے جس کا ہر حاکم ملک سے نکل جانا اور سرکار کے ساتھ جلد سے جلد اپنا قطع تعلق کرنا چاہتا ہے۔ جونہی وہ یہاں سے مال و زر کے ساتھ رخصت ہوتا ہے اس سرکار کے مفاد سے کامل بے رخی کا اظہار کرتا ہے۔ گویا سارے ملک کو بھونچال ہڑپ کر گیا ہے۔" ۳۲ ولیم بولٹس کے قول کے مطابق "جب کہ یہ (برطانوی) قوم آئندہ حاصل ہونے والے پھل پر نظر میں ٹکاڑے ہوئے ہے، کمپنی اور اس کے نائبوں کو درخت کو جڑ سے اکھیر پھینکنے کی کھلی چٹنی ہے۔ اگر کمپنی کو اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا تو یہ تباہ ہو جلتے گی۔ بنگال میں برطانوی مقبوضات بنگال ہو جائیں گے۔" ۳۳ ہومز کا بیان ہے کہ دیہی حکام کسانوں پر ظلم روا رکھتے اور مالیر میں غبن کرتے تھے۔ کمپنی کے ملازمین ان بدعنوانیوں سے چشم پوشی کرنا سود مند سمجھتے تھے۔ ۳۴

انجکستان میں لوٹ کے مال کا انبار لگنے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس ملک میں اس قسم کی دوسری ذخیرہ اندوزیوں کے ساتھ سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد پڑ گئی۔ مارکس کا قول ہے کہ "مشہور یافتہ کمپنیاں، دولت اندوزی کی کوس کو بڑھانے کا قوی سبب تھیں۔ جو خزانے یورپ سے باہر نقل و حرکت اور دوسروں کو غلام بنانے سے حاصل ہوئے متواتر مادر وطن (ام البلاد) میں پہنچتے رہے اور وہاں بہت بڑا سرمایہ فراہم ہو گیا۔" ۳۵ مارکس سے اتفاق رائے کرتے ہوئے بروکس ایڈمز طنزاً لکھتا ہے: "اگر وائ اپنے زمانے سے پچاس سال قبل ہوتا تو وہ خود اور اس کی ایجاد ایک ساتھ خاک میں ملنے کیونکہ دونوں سے کام لینے کے لیے مطلوبہ سرمایہ کی کمی ہوتی۔" ۳۶

کونرسنگھ اور فیض آباد کے مولوی صاحب کی مہمت اپنے اپنے علاقوں تک محدود تھیں۔ مختلف باغی ملہ گاؤں یا بغاوت کے مرکزوں کے مابین کوئی رابطہ قائم نہ تھا۔ اس کے برعکس جلی ہی برطانوی حکومت کے آثار شتے دکھائی دیے جہاں سرداروں اور عوام میں علاقائی اور طبقاتی تفرقات رونما ہو جاتے اور نتیجہ یہ ہوتا کہ انگریزوں کے غلام متحدہ محاذ کمزور ہو جاتا۔ ۲۲

انتہا پسندانہ ہندوستانی نظریہ بغاوت کی جغرافیائی حد بندی کے لحاظ سے بھی غلط ثابت ہوتا ہے۔ اس بغاوت سے ملک کے رقبے کا صرف چھٹا حصہ اور آبادی کا فقط دسواں حصہ متاثر ہوا۔ صرف اسی پر بس نہیں اس شرمناک حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ بغاوت کو خود ہندوستانیوں کی امداد کے بغیر فرو نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ۲۳

لہذا بغاوت کی مہمت کو سمجھنے اور ہندوستان کی تاریخ مابعد پر اس کے سماجی، اقتصادی اور سماجی اثرات کا جائزہ لینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم بغاوت کے حقیقی اسباب کی تحقیق اس خنزیر اور دہشت انگیز دور کی چھان بین اور اس میں مختلف طبقات کے کردار کا مطالعہ کریں۔ صرف اسی صورت میں ہم داستان انقلاب کو اس کے کچھ دے پاک کر سکیں گے جو مخصوص دلائل اور خود غرضانہ بیانات نے اچھالا ہے۔

۲۔ اسباب

بغاوت کا اصلی سبب شہنشاہیت پرستوں کے ہاتھوں ہندوستانیوں کی اقتصادی لوٹ کھسوٹ تھا۔ اس لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام کے دنوں کی طرف رجوع کرنا مناسب ہوگا۔ جب پرتگیزی، ولندیزی اور فرانسیسی کمپنیوں کے ہندوستان کی تجارت سے بے انتہا منافع کمانے کی داستانیں پھیلیں تو برطانوی من چلے سوداگر بھی اسی غرض سے ایک تجارتی کمپنی قائم کرنے پر آمادہ ہوئے۔ ۲۴ میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ملک الزبتھ اول سے ہندوستان اور مسالوں کے جزیروں کے ساتھ تجارت کرنے کے لیے ایک اجازت نامہ حاصل کیا۔ اُس زمانے میں ہندوستان کے ساتھ تجارت سے مراد یہ تھی کہ اس ملک سے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزیں اور دوسری فنی اور قیمتی مصنوعات خریدی جائیں۔ ہندوستانی کاری گر چوکنہ عام طور پر بین الاقوامی منڈی میں اپنے مال کی قدر و قیمت سے بے خبر تھے اس لیے چالاک اور بے ایمان غیر ملکی تاجران کا مال کوڑیوں کے مول خرید لیتے اور اونچے داموں بیچتے۔ ۲۵ ایسٹ انڈیا کمپنی کے منافع کی شرح ایک سو سے ڈھائی سو فی صدی تک سالانہ تھی ۲۵ اس میں کمپنی کے ہندوستان میں

تجارتی تعلقات میں اس انقلاب کا ہندوستان کی سیاسی تنظیم پر بہت ناگوار اثر پڑا۔ جس کے
 کے صنعت کاروں نے زراعت کا سہارا دھونڈا۔ ۳۸ شہنشاہی حلقہ اقتدار کے اندر کسی جدید صنعتی نظام
 کی ترقی کا کوئی امکان نہ تھا۔ زمین پر پہلے ہی کافی دباؤ تھا اور یہ مزید بار سنبھالنے کے قابل نہ
 تھی۔ موجودہ ابتدائی قسم کے زرعی آلات کے ساتھ گہری کھدائی کی کاشت ناممکن تھی اور پھر بھاری
 لنگر کی شرح کے نئے طریقے نے اور بھی غضب ڈھایا۔ جنگال میں ۶۵-۶۴ء میں مایہ کی کل رقم
 آٹھ لاکھ گیارہ ہزار پونڈ تھی لیکن دیوان کے پہلے ہی سال یعنی ۶۵-۶۴ء میں یہ رقم بڑھ کر سترہ لاکھ
 چالیس ہزار پونڈ ہو گئی۔ ۳۹

ہندو اور مسلم حکومتوں کے عہد میں بادشاہ سالانہ پیداوار کا کچھ حصہ بطور لگان وصول کرتا تھا۔
 یہ حصہ ٹیکس کے طور پر خود اختیار گرام پنچایت کے مشترکہ مالکان زمین کی طرف سے عکراں یا اس کے
 نامزد نائب کو ادا کیا جاتا تھا۔ ”ہندوستان میں زمین کا مالک قبیلہ یا اس کی شاخ۔ گرام پنچایت۔ فرقہ
 یا گاؤں میں آباد برادری۔ ہوتی تھی۔ بادشاہ کو کبھی بھی زمین کا مالک تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ جاگیرداری یا
 شہنشاہی نظام کے تحت سوائے کسانوں کے، زمین کی ملکیت کا حق کسی کو حاصل نہ تھا۔ ۴۰ کمپنی
 کے عہد حکومت میں یہ فرض کر لیا گیا کہ سرکاری زمین کی سب سے بڑی مالک ہے۔ پہلے گرام پنچائیتیں
 مل کر بحیثیت مجموعی جنس کا خاص حصہ حکومت کو ادا کرتی تھیں۔ اب اس روایتی دستور کی جگہ
 کمپنی نے زمین پر نقد لگان کا طریقہ نافذ کیا اور یہ لگان بلا لحاظ اچھی یا بُری فصل یا رتبہ کاشت مقرر
 کر دیا جاتا۔ بیشتر صورتوں میں مالیہ کی تشخیص شخصی ہوتی تھی۔ یہ لگان یا تو سیدھا کاشتکار پر لگا دیا
 جاتا یا سرکار کے مقروضہ زمینداروں پر۔ اس شخصی تشخیص کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ گرام سماج کی معاشیات میں رخنہ
 پیدا ہو گیا۔ جہاں کسانوں کی جماعتوں یا گرام پنچایتوں کو زمین کا مالک تسلیم کیا گیا وہاں بھی نتائج زیادہ
 مختلف نہ تھے کیوں کہ مشترکہ ذمہ داری محض برائے نام تھی شخصی تشخیص کی طرف زیادہ رجحان تھا اور عملی
 طور پر زمین کے حصے داروں کو الگ الگ مالک تصور کیا جاتا تھا۔ انھیں اپنی زمین بیچنے یا گروہ رکھنے
 کا حق حاصل تھا۔ ۴۱ سر جان اسٹرنجی نے لکھا: ”ہماری حکمت عملی زمین کی نجی ملکیت کی حوصلہ افزائی
 کرتی ہے۔ (اگرچہ) سابقہ عکراں ایسی ملکیت کو تسلیم نہ کرتے تھے۔ ۴۲

زمین کی نجی ملکیت کے حق کا نتیجہ مفروضہ ہوا کیوں کہ ”جس زمانے میں ایسا حق نہ تھا،
 نسبتاً گسٹوں کی ساکھ بھی نہ تھی جو زمیندار قرض لینا چاہتا تھا وہ قابل اعتماد ضمانت پیش نہ کر سکتا
 تھا۔ اس لیے مفروضہ کم تر تھی ۴۳ اگرچہ زمینیں اکثر گروہی رکھی جاتی تھیں لیکن مستقل بے دخلی

اصل چارٹر کی شرائط کے مطابق ایسٹ انڈیا کمپنی حتی الامکان انگلستان کی مصنوعات کے ہندوستان کی پیداوار کے ساتھ تبادلے کی مجاز دہی بلکہ ہندوستان اور یورپ کی مصنوعات اور اشیاء اٹھانے کی پابندی تھی۔ ۳۲ اس کے برعکس ۱۷۷۳ء اور ۱۷۸۳ء میں برطانوی پارلیمنٹ میں ایسے قانون منظور کیے گئے جن کی رو سے چند مخصوص چیزوں کے سوا انگلستان میں ”چھپی ہوئی“ یا رنگی ہوئی سوئی چھینٹ کا لباس یا فرنیچر میں استعمال اور ایسی چھپی ہوئی رنگین چیز کو جس میں جزو ارونی بھری گئی ہو، کام میں لانا قطعی طور پر ممنوع قرار دیا گیا۔ ۳۳ ہندوستان، ایران اور چین کا ”پختہ ریشم یا چھپی ہوئی یا رنگین چھینٹوں کا پہننا تعزیری جرم تھا اور دو سو پونڈ تک جرمانے کی سزا تھی۔ ۳۴“

”اگر ہندوستان آزاد ہوتا تو وہ انتقام لیتا۔ برطانوی مال پر امتناعی محصول لگاتا اور اس طرح اپنی صنعت و حرفت کو محفوظ کرتا لیکن اسے مدافعت کی اجازت نہ تھی۔ وہ ایک بدیشی حکمران کے رحم و کرم پر تھا۔ برطانوی مال اُس پر ٹھونس گیا جس پر کوئی محصول نہ تھا۔ غیر ملکی کارخانے دار نے سیاسی نا انصافی کے بل بوتے پر پہلے اپنے ہندوستانی حریف کو دبایا اور بالآخر اس کا گلا گھونٹ دیا جس کا وہ مساوی طور پر مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ ۳۵ یہ اُس وقت کے واقعات ہیں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی علاقائی توسیع اور الحاق کی پالیسی کی وجہ سے ہندوستانی مصنوعات کی مانگ کے بڑے ذرائع یعنی دیسی حکمرانوں کے دربار ہندوستان کے نقشے سے محو ہو رہے تھے۔ زوال کا یہ عمل غیر ملکی حکومت کے قیام سے شروع ہوا۔ غیر ملکی اقتدار کے اثر سے تیز ہوا اور غیر ملکی مال کی درآمد کے مقابلے سے پایہ تکمیل کو پہنچا۔“

انگلستان کے صنعتی انقلاب نے ہندوستان کے ساتھ اس کے تعلقات کی نوعیت کو یکسر بدل دیا۔ برطانوی مصنوعات نے ترقی کر کے پہلے ہندوستان کی صنعت پر جو ابتدائی حالت میں تھی، غلبہ پایا اور آخر کار اُسے تباہ کر دیا۔ اس سے ملک خام مال کی منڈی بن کے رہ گیا۔ ہندوستان برطانوی مال کی کچیت کے لیے سب سے بڑی مارکیٹ بن گیا۔ اجڑے ہوئے صنعت کاروں اور کاری گروں کی حالت خستہ ہو گئی۔ لارڈ ولیم بینٹک نے کمپنی کے ڈائریکٹروں کی کورٹ کو لکھا کہ ”تجارت کی تاریخ میں اس پریشان حالی کی کہیں نظیر نہیں ملتی۔ سوئی کپڑا بننے والے جولاہوں کی ہڈیاں سرزمین ہند پر دھوپ میں سڑ رہی ہیں۔ ۳۶“ ڈھاکہ کے لوگوں کی آبادی — جو نفیس مٹل پیدا کرنے میں شہرہ آفاق تھے — ۱۸۲۷ء اور ۱۸۳۷ء کے دوران میں ایک لاکھ پچاس ہزار سے گھٹ کر صرف بیس ہزار رہ گئی۔ ۳۷

زمین چن ملکیت عطا کیا جائے لیکن محض نکان وصول کرنے والے کارندوں کی حیثیت سے نہیں (جیسا کہ وہ ہمیشہ رہے ہیں) بلکہ اسی معنی میں جس میں انگلستان کے زمیندار ہیں۔ جو منصوبہ پیش کیا گیا ہے اس کا تمیز کچھ اس طرح لگایا گیا ہے کہ کمپنی کی آمدنی نہ صرف محفوظ رہے گی بلکہ بڑھ بھی جائے گی۔ ۵۱

امیدوں کے جو شگوفے لارڈ کارنوالس نے کھلائے تھے، جلد مر جھا گئے۔ کورٹ آف ڈائریکٹرز نے بلا کسی غل غبارہ کے بندوبست دوائی کی تجویز منظور کر لی اور ۱۸۹۲ء میں بنگال میں مالہ سے متعلق بندوبست دوائی کا اعلان کر دیا گیا۔ سر چرچر ڈیپل کے قول کے مطابق بندوبست دوائی ایک ایسا ”اقدام تھا جو انگلستان کی زمینداری کی روایات کو بنگال کے باشندوں میں مروج کرنے کی غرض سے کیا گیا تھا۔“ ۵۲ لیکن جیسا کہ لارڈ نکات نے کہا ہے ”اس اقدام سے مزارعین کے قدیم حقوق واقعی غصب ہو گئے جب ہم نے حق ملکیت ان لوگوں کو دے دیا جس کا زمین پر کوئی دعویٰ نہ تھا۔“ ۵۳

بندوبست دوائی کے تحت بھی ”ایکٹ اول ۱۸۵۵ء کی دفعات کے تحت عدم ادائیگی مالہ کی صورت میں جائدادیں قابل فروخت تھیں۔“ ۵۴ ہومز ”ہسٹری آف انڈین میوٹنی“ (تاریخ بغاوت ہند) میں رقمطراز ہیں: ”کارنوالس کے اقدام کا نتیجہ یہ تھا کہ اس سے ادنیٰ مزارعین کو کوئی فیض نہ پہنچا۔ زمیندار بار بار مالہ ادا کرنے میں ناکام رہے اور ان کی زمینیں سرکار کے فائدے کے لیے بیچ دی گئیں۔ ۵۵ کلکٹر مدنا پور نے ۱۸۵۶ء میں اس رائے کا اظہار کیا کہ ”فروخت اور قرقی کے اس طریقے“ کے نفاذ سے چند ہی سالوں کے اندر بنگال کے بڑے بڑے زمیندار ”خستہ حال گرد اگر بن کر رہ گئے۔ اندرونی ضابطوں کے زیر اثر بنگال کی جائداد آراضی میں جو تبدیلی پیدا ہوئی اس سے زیادہ تبدیلی اتنی مدت میں شاید کسی بھی زمانے میں اور کسی بھی ملک میں رونما نہیں ہوئی۔“ ۵۶ بنگال کے بندوبست دوائی کا ایک اور نتیجہ زمین کے حقوق کی تقسیم در تقسیم تھا۔ زمیندار اپنے حقوق آراضی دالوں کو پٹے پر دے دیتے تھے اور پھر دلال بھی انھیں آگے اجارہ پر دے دیتے۔ اس سے اصلی کاشتکار اور سرکار کے مابین نکان وصول کرنے والوں اور ادا کرنے والوں کا ایک طویل سلسلہ قائم ہو گیا۔ ۱۸۹۱ء میں کاشتکاروں کے مطلقاً زمینداروں کے رحم پر پڑ جانے کا ”انسوس کے ساتھ اعتراف کیا گیا لیکن پھر بھی کاشتکار کی حفاظت کے لیے کوئی اقدامات نہ کیے گئے۔“ ۵۷ پس ایک طرف جاگیرداری اور دوسری طرف کمین کی غلامی بنگال کے بندوبست

کبھی عمل میں نہ آتی تھی۔ کسی بھی آدمی کو سرکاری کسی فرد کے قرض کے عوض اس کی موروثی زمین سے محروم نہ کیا جاسکتا تھا۔

کمپنی کے قانون کے تحت سارا گاؤں، زمیندار سے کمین تک، اکثر مقروض رہتا اور تمام قرض خواہوں میں بنیاد سے زیادہ بے رحم تھا۔ ۴۴ اور اس کے برعکس توقع بھی نہ ہو سکتی تھی۔ کمپنی کا قانون نہ صرف اس کی پشت پناہی کرتا تھا بلکہ مقروض کی زمین بھی قرض کی ضمانت کے طور اس کے حق میں رہن ہوتی تھی۔ بقول مارک تھوارن ہل "یہ تسلیم کرنا افسوس ناک ہے کہ ضابطہ قانون کے تحت عدالتی چارہ جوئی کے دبا، فیصلے کی تاخیر اور مقدمہ بازی کے کثیر مصارف کے سبب بنیے کو اپنے مطالبات میں جعل سازی کا مقبول جاتا۔ قانون کی آدمیں اُسے اس قدر ہولناکیاں میسر تھیں کہ جعلی دستاویز اور جھوٹے گواہ اس کی کامیابی کی ایسی ہی پونجی تھے جیسے کہ اس کے بھی کھاتے اور اشیائے تجارت ۴۵ اس کے علاوہ بنیاد جابرانہ و طیرہ بھی اختیار کر سکتا تھا۔ قدیم طرز حکومت کے برعکس اب قرض کی جبری وصولی میں بنیے کو کسی سخت انتقام کا خطرہ بھی درپیش نہ تھا۔ ضابطہ قانون میں اس تبدیلی کا، اثر ہوا کہ جتنی آراضی کا انتقال ایک پشت میں مختلف مالکوں کے ہاتھوں ہوا، کبھی دیکھنے سننے میں نہیں آیا۔ پُرانے زمینداروں کی جگہ نئے مالکوں نے لے لی جن میں بیشتر بنیے تھے ۴۶ کے کساد دعویٰ ہے کہ نیلام میں زمین کے یہ خریدار زیادہ تر شہروں میں رہتے تھے۔ اُن کا مقصد صرف یہ تھا کہ روپیہ لگا کر نفع کمایا جائے۔ جبکہ قدیم مالکان آراضی زمین کے ساتھ طبعی وابستگی رکھتے تھے۔ اُن کو زمین کے ساتھ بے لوث الفت تھی اور اس بات کی مطلق پروا نہ تھی کہ اس سے انھیں کس قدر آمدنی ہوتی ہے۔ ۴۸

کمپنی کے ڈائریکٹروں کی نگاہ میں بھی زمین کی حیثیت مال تجارت سے زیادہ نہ تھی۔ ۴۹ مسئلہ میں جب زمیندار حسب معاہدہ سرکار کو مالیہ ادا کرنے میں ناکام رہے تو ان کی زمین فروخت کر دینے کا حکم صادر کر دیا گیا۔ ۴۹ کے لکھا ہے: "نئے نظام کے تحت وہ لوگ جو اتنے وسیع قطعہ آراضی کے مالک تھے کہ جہاں تک نظر جاتی تھی انہی کی زمین تھی، مٹی کی جھونپڑیوں میں مزارع بن کر سمٹ گئے اور اُن کی جائداد کھانا پکانے کے چند برتنوں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ ۵۰

لیکن نئے نظام میں کچھ اپنے مخصوص تقاضے تھے۔ کمپنی کو اپنی نوآبادیوں کی آمدنی پر پورا پورا اعتماد نہ تھا۔ اس غیر یقینی حالت پر قابو پالے لیے لارڈ کلاک ہاؤس نے ۲ اگست ۱۷۸۹ء کو کورن آف ڈائریکٹرز کی خدمت میں لکھا کہ "ہیودی عامہ کے مفاد میں ہے کہ زمینداروں کو

کاشت کے روح فرسا کام کو اپنے لیے نہیں بلکہ اُن کے لیے ازہر نو شروع کرے۔ ۵۹

ڈاکٹر فرانسس جیکسن نے ۱۸۴۷ء اور ۱۸۴۸ء کے درمیان کمپنی کی طرف سے "اعداد و شمار" مرتب کیے اور رپورٹ پیش کی کہ "ہندوستانیوں کا کہنا ہے کہ جو کچھ ہم اب ادا کر رہے ہیں دراصل اس کا نصف بھی مغل انصروں کو ادا نہ کرتے تھے۔" ۶۰ بشپ جیمز نے ۱۸۴۳ء میں اپنی سوانح حیات میں یہ خیال ظاہر کیا کہ کمپنی کے تحت علاقوں میں کسان "مجموعی طور پر وایان ریاست کی رعایا کی نسبت زیادہ خستہ حال، زیادہ مفلس اور زیادہ بددل ہیں۔" بشپ نے دعویٰ کیا کہ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی ایسی حکمران اس قدر مالِ مالہ کا تقاضا نہیں کرتا جس قدر کمپنی کرتے ہیں۔" ۶۱

کمپنی نے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی لوٹ کھسوٹ سے اتنی دولت حاصل کی کہ اسے اپنے علاقے کی توسیع کی ترغیب ہوئی۔ پلاسی کی جنگ اور بغاوتِ عظیم کے درمیان کمپنی کی فوجوں نے بیس لڑائیاں لڑیں۔ ایک سو سال میں میسور، بہار، شتر، کرناٹک، پنجور، بندیکھنڈ، اردھیکھنڈ، ہریانہ، پنجاب (جس میں تقسیم سے پہلے شمال مغربی سرحدی صوبہ بھی شامل تھا) اور اودھ کمپنی کی قلم رو میں شامل کر دیے گئے۔ تمام سابقہ دیسی ریاستیں کشمیر سے لے کر کوچین تک کمپنی کے "زیر سایہ" آگئیں۔ جس چیز کا کمپنی کے سپاہیوں پر سب سے زیادہ اثر پڑا وہ ۱۸۵۷ء میں لارڈ ڈلہوزی کا الحاقِ اودھ تھا جو "کمپنی کی فوج کے پچھتر فی صدی سپاہیوں کا وطن تھا۔" ۶۲ (درحقیقت اٹھارویں صدی کے وسط سے ہی کمپنی نے اودھ کی حکومت میں دو عملی رائج کر رکھی تھی) ۶۳ لفٹیننٹ جرنیل میکوڈس انس نے اپنی بلند پایہ تصنیف "فوجی بغاوت" ۶۴ (THE SEPOY REVOLT) میں لکھا ہے: "جو چند مسلم حکمران خاندان بااقتدار باقی رہ گئے تھے اُن میں سے جب ایک اور کو اختیاراتِ حکومت سے محروم کر دیا گیا تو نہ صرف اودھ کے بلکہ سارے شمالی ہندوستان کے مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔"

شہر کے چھ سات ہزار باشندے جن کا مدار سابقہ دربار کی ادائیگی پر تھا اور تاجروں اور بار کے لیے سامانِ عیش و عشرت کا اہتمام کرتے تھے، بے روزگار ہو گئے۔ ۶۵ اس کے علاوہ اور ہزاروں لوگ جن کا کام صرف دربار کی شرمناک رنگ رلیوں کا سامان کرنا تھا، بیکار ہو گئے۔ ۶۶ البمباتِ فاخرہ، نفیس پگڑیاں، اعلیٰ درجے کے آرٹیشی جوئے اور ان سے وابستہ کئی دوسرے ادنیٰ دھندے کرنے والوں کو سخت نقصان پہنچا جب ان کی مصنوعات کی مانگ ختم ہو گئی۔ ۶۷ دربار کی سرپرستی کے خاتمے کے اثرات کو ایل۔ اسی۔ رومز نے ذرا زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے: "ہزاروں امراء

آرامی کی بڑی خصوصیتیں ہونگئیں۔ تھلان ہل نے اس نئے تعلق کا یوں جائزہ دیا: پرانے زمیندار گاؤں کے رہنے والے ہوتے تھے اور کاشتکاروں کی اپنی ذات کے آدمی بلکہ اکثر ان کے رشتہ دار ہوتے تھے۔ وہ زمین کے ساتھ فطری وابستگی رکھتے تھے بلحاظ اس بات کے کہ انھیں اس سے کس قدر آمدنی ہوتی ہے۔ نئے مالکوں کا جذبہ مختلف تھا۔ انھیں زمین کی مطلق پروا نہ تھی۔ ان کا مقصد صرف روپیہ لگا کر نفع حاصل کرنا تھا۔ ۵۸

سر تھامس مئرو کے رعیت داری بندوبست آرامی سے بھی کچھ مختلف نتائج برآمد ہوئے یہ بھی زمینداری سسٹم کی طرح ہندوستانی روایات سے ملو کر پائش پائش ہو گیا۔ اس کے ریونیو بورڈ نے ۵ جنوری ۱۸۱۵ء کو لکھا: ”ہم دیکھتے ہیں کہ غیر ملکی فاتحین کی ایک چھوٹی سی ٹولی ہے جو نئے مفتوحہ ممالک کے وسائل اور ان کے حقوق ملکیت آرامی کی صحیح کیفیت سے ناواقف ہے“ جول ہی یہ فاتحین ایک وسیع علاقے پر قبضہ کرتے ہیں جس میں مختلف زبانیں، رسم و رواج اور عادات رکھنے والی مختلف قومیں آباد ہیں وہ ہفت خوانِ رسم کا سا کارنامہ انجام دینے کی کوشش کرتے ہیں یعنی وہ زمین کا مالک مقرر کرنا چاہتے ہیں ہر صوبے، ضلع یا ملک کا نہیں اور نہ ہی ہر جائداد اور جاگیر کا بلکہ اپنے تحت علاقوں کے اندر ہر الگ الگ کھیت کا۔ یہ ایسا کام ہے جو یورپ کے مہذب ترین ملکوں میں بھی شیخ چلی کا منسوب تصور ہو گا جہاں ہر قسم کے اعداد و شمار دستیاب ہیں اور جہاں حکومت اور رعایا میں یک جہتی پائی جاتی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اس نام نہاد اصلاح کی غرض سے وہ بلا ارادہ، ”تدبیر“ بلوں اور روایوں کو مٹا رہے ہیں جو ہندو گرام پنچایتوں کے اتحاد کا موجب تھے اور ایک سسٹم کے زرعی قانون کے ذریعہ ان زمینوں کی از سر نو تشخیص کر کے ان کے ٹکڑے کر رہے ہیں جو صدیوں سے گرام پنچایت کی مشترکہ ملکیت تھیں۔ وہ ہر کھیت پر مالک کے مطالبہ کا حق جتانے میں لیکن دراصل ان پر پابندیاں عاید کرتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ کا تقاضہ کرتے ہیں جو حاصل نہ ہو رعیت پر اپنی مرضی سے لگان کی تشخیص کرتے ہیں اور سابقہ مسلم حکومت کی طرح کاشتکار سے جبراً اہل چلواتے ہیں اور اس زمین کی کاشت پر مجبور کرتے ہیں جس پر بعد سے زیادہ لگان عائد کیا گیا ہے۔ اگر کاشتکار فراہم ہو جاتا ہے تو اسے گھسیٹ کر واپس لے آتے ہیں اور فصل پکے تک لگان کا تقاضہ ملوثی کر دیتے ہیں۔ پھر فصل تیار ہوتے ہی اس سے زیادہ سے زیادہ وصول کر لیتے ہیں اور کسان کے پاس سوائے بیلوں اور بیج کے کچھ نہیں چھوڑتے بلکہ یہ بھی فراہم کر کے اس پر احسان دھرتے ہیں تاکہ وہ

اعلیٰ طبقوں کی حد درجہ نااہلیت کمپنی کی نگاہ میں ایک مسلمہ حقیقت تھی۔ کمپنی کے ملازموں کو یقین ہو گیا کہ اودھ کے لوگوں کو جس چیز سے سب سے زیادہ فائدہ پہنچ سکتا تھا وہ زمیندار امیروں کے طبقے کا خاتمہ تھا۔^{۸۸} اس مقصد کے پیش نظر زمینداروں کے حقوق اور دستاویزات کی جانچ پڑتال کے لیے انعام کمیشن مقرر کیا گیا۔ بغاوت سے پہلے پانچ سالوں میں پینتیس ہزار جاگیرداروں میں سے اکیس ہزار کو ضبط کر لیا گیا۔^{۸۹}

بی۔ جی۔ اسٹین کرنے گورنر جنرل کے نام اپنی عرض داشت میں انعام کمیشن کے کام کو بھڑک موندنے سے مشابہہ کیا ہے۔ اس نے لکھا: ”ہر روز مظلوم زمینداروں کی فہرست تیار کی جاتی جو چرچ جاتے ان کی خوشنحی سے زمینداروں کے اس گروہ کا درد و کرب اور بھی بڑھ جاتا جو بھڑک خانوں سے اپنا بال بال منڈوا کر باہر نکلتے اور کسی کام کے ذرہ تھے، جنہیں بھیک مانگتے شرم آتی اور جو کوڑی کوڑی کو محتاج ہو جاتے۔“^{۹۰} تھارن ہل نے کمیشن کے فیصلوں کو ”ہبسطی کے احکام“ قرار دیا۔

چنانچہ وہ خاندان جو سالوں میں مدوٹی جاگیروں پر قابض رہے اور جنہیں اپنے حق ملکیت کے سلب ہو جانے کا کبھی سان گمان بھی نہ تھا، اپنی جاگیر سے محروم ہو گئے۔ گئے نے فرمایا: اس طرح آہستہ آہستہ انگریزی قانون کے اطلاق کے وسیلے سے ایک انقلاب برپا ہوا جس نے اتفاقاتاً دوسرے اسباب کے ساتھ اُن بد دل اور خطرناک طبقات کی تعداد میں اضافہ کیا جو اپنے زوال کو برطانوی حکومت کی کارروائیوں سے منسوب کرتے تھے۔ وہ کسی نے انقلاب دور میں اپنے کھوتے ہوئے مقبوضات کو از سر نو حاصل کرنے کے لیے موقع کے انتظار میں تھے۔^{۹۱}

اس سے زمین کی کاشت کرنے والے کو کوئی فائدہ نہ پہنچا جیسا کہ کمپنی نے دعویٰ کیا تھا۔ کمپنی کے ملازمین کورٹ آف ڈائریکٹرس کی خدمت میں ایک کثیر رقم کا (مصلحتاً) باقی پیش کرنے کے لیے فکر مند تھے تاکہ یہ ثابت کریں کہ نئے استحصالات منفع بخش ہیں۔ اس لیے انھوں نے میزان مالیک کو بڑھانے کی غرض سے لگان کی شرح بڑھادی۔^{۹۲} گبنٹس ناچا اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ ”کھانوں میں سرکار کے تقاضے کا دباؤ حد سے زیادہ تھا۔“ تھارن ہل لگان آراضی کے تعین کو ”ظالمانہ“ قرار دیتا ہے۔ وہ لکھتا ہے: ”ہمارے لگان آراضی کی تشخیص بلاشبہ بہت زیادہ تھی۔ زمین کی زرخشت کے لیے جبری وصولیوں نے اس کی سختی میں اور بھی اضافہ کیا۔ ہمارے قانون نے سراسر زمینوں کی جبرستانوں میں مدد کر کے ان کے حرص کا کلنک حکومت کے ماتھے پر لگا دیا۔ سرسید احمد خاں، جن پر

شرقرار اور حکام جو بادشاہ کے عہد میں نفع بخش عہدوں پر فائز تھے اور اس قدر کاہل تھے کہ کام سے جی چراتے تھے اب مغلی اور تنگ رستی کا شکار ہو گئے۔ اور اُن کے ہزاروں نوکر چاکر اور ملازم روزگار کھو بیٹھے پھر بے شمار آوارہ گرد، من چلے، شہدے اور گداگر جن کی دیسی حکومت کے تحت شہر میں کثرت تھی اور جنہیں اس میں روزی ملتی تھی، ہمارے عہد حکومت میں بھوکوں مرنے لگے۔ جب واجد علی تخت پر رونق افروز تھے ہندوستانی سوداگر، دوکاندار اور ساہوکار بادشاہ اس کے بازویوں اور بھرے حرم کی دولت مند بیگمات کے لیے عیش و عشرت کے سامان فراہم کمرے بڑے بڑے منافع کھاتے تھے۔ اب ان کے مال کا کوئی خریدار نہ رہا۔ لوگ بالعموم اور غریب بالخصوص بیزار تھے کیوں کہ ان پر بلا واسطہ اور بالواسطہ ہر طرح سے ٹیکس لگائے جاتے تھے ۶۸ جس طبقے نے شاید سب سے زیادہ خسارہ اٹھایا وہ تعلقہ داروں کا تھا۔ ۶۹ نواب وزیر اودھ کی کمر در حکومت کے تحت انھوں نے اس کی پر واکے بغیر اقتیارات کا استعمال کیا تھا۔ بیگین کی نوک، ۱ پر جبراً مال و مصلو کیا تھا اور ملک کو ناپائنداری کی حالت میں مبتلا کیے رکھا جس سے جان و مال اور صنعت و حرفت غیر محفوظ ہو گئے تھے ۷۰، بقول سر ڈیو۔ ایچ۔ سلین۔ "جب وہ ایک دوسرے کے ساتھ یا دیسی سرکار کے مقامی حکام کے ساتھ کسی سبب سے لڑتے جھگڑتے ہیں تو اندھا دھند قتل و غارت کا بازار گرم کر دیتے ہیں۔ ان تمام زمینوں پر جہاں ایک ہی طبقہ کے آدمیوں کا قبضہ نہیں ہوتا۔ کوئی سرگ، قصبہ، گاؤں یا بستی اُن کے ظالمانہ حملوں سے محفوظ نہیں۔ قتل و غارت اُن کے لیے تفریح طبع کا سامان یا کھیل تماشہ ہوتا ہے۔ ہم ازار مر رہے اور قتل اور بچوں کو یوں بلا دریغ موت کے گھاٹ اتارتے ہیں گویا وہ ہرن یا جنگلی سؤر ہیں" ۷۱ بلکہ جہاں تعلقہ داروں کا بھی ہاتھ نہ تھا، سیکڑوں گاؤں حریص اور لالچی حکام کی جبری وصولیوں سے تباہ و برباد ہو گئے تھے ۷۲، تباہ حال اور مریل مویشی جو فرسودہ آلات زراعت کھینچنے کے قابل نہیں تھے، غلیظ اور غیر آباد دیہات، برباد اور ہیکار کنوئیں اور ننگے اور فاقہ زدہ کسان خستہ حال کے واقع ثبوت تھے ۷۳، ایم۔ آر۔ گینس جو ڈیشنل کمشنر اودھ نے عین بغاوت سے پہلے اور اس کے دوران یہ کہا کہ "میں نے عام افلاس کے ایسے منظر کبھی نہیں دیکھے جیسے کہ اودھ میں ۷۴، الحاق سے پہلے کے زمانے میں اودھ کے کسانوں کی حالت کے بارے میں آئے نے فرمایا: "بہ نقلی کی ایسی ہولناک خرابیاں کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھیں کبھی کسی کاہل اور جاہر حکومت کے نقص اس سے زیادہ مصائب کا موجب نہیں ہوتے تھے۔" ۷۵

لگ بھگ ہر کسان کے گھر میں جبری بیروزگاری تھا۔

اس فوجی طبقے کے لیے جسے اب تک خاص حقوق حاصل تھے، اودھ کا الحاق ایک اور سبب سے بھی نقصان دہ ثابت ہوا: ”فوجی کامکان اور پنشن خوار کا قطع باغ بھی اب ٹیکس سے مستثنیٰ نہ رہے۔“ ۹۴

یہی وجہ ہے کہ بہت الحاق اور سخت غدر کے دوران اس صوبے کے رہنے والے پچھتر ہزار سپاہیوں سے چودہ ہزار درخواستیں لگان کی سختیوں کے خلاف وصول ہوئیں۔ ۹۵ ان سپاہیوں میں پچیس ہزار برہمن تھے۔ جب خیراتی اداروں سے ملحق زمینیں ضبط کر لی گئیں تو ان برہمنوں کو دو گونہ چوٹ لگی۔ اس سہل آمدنی کے چھن جانے سے پردہت طبقہ کے افراد نے اپنی تمام زحمت اور اپنے اثر کو اپنے متقدمین میں بے اطمینانی پیدا کرنے اور ان کے دلوں میں مذہبی خوں پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا۔ ۹۶

اودھ کے الحاق سے جو حالات پیدا ہوئے ان کو مائیسن نے خوب اچھے انداز میں بیان کیا ہے۔ الحاق اودھ سے دیسی ریاستوں کے حکمران منحرف ہو گئے۔ انھوں نے اس اقدام میں اقتدار کی ایسی ہوس دیکھی جس کی تسکین نہ تو کامل وفاداری کے اظہار سے ہو سکتی تھی اور نہ ہی اس اہل اقتدار کو قرض پر پیشگی رقم دینے سے۔ اس سے علاقائی امرار کے طبقے نے بھی مزہ موڈ لیا کیوں کہ نئے مروجہ برطانوی نظام کی رو سے انھوں نے اپنے آپ کو اچانک اپنی جائیدادوں کے نصف بلکہ بعض اوقات اس سے بھی زیادہ حصے سے محروم پایا۔ اس سے مسلمان طبقہ امرار بھی خلافت ہو گیا یعنی درباری جن کی آمدنی کا مدار اس منصب اور وظیفہ پر تھا جو وہ والی ریاست کی عنایت سے پاتے تھے۔ اس سے ان فوجیوں کا طبقہ بھی بگڑ گیا جو بادشاہ کے ملازم تھے اور جنھیں بے مددی کے ساتھ کہنے کے قلیل وظائف یا انعامات پر پھینک دیا گیا۔ اس سے وہ سپاہی بھی بدظن ہو گئے جو برطانوی حکومت نے اودھ میں بھرتی کیے۔ جب تک ان کا ملک آزاد رہا انھیں خاص حقوق حاصل تھے اور وہ برطانوی ریزیڈنٹ کے ذریعہ پیش کی گئی درخواستوں سے دربار کے گھنٹے پر اثر انداز ہو سکتے تھے اور اس طرح وہ یقینی طور پر اپنے کنبوں کو جبر و استبداد سے محفوظ رکھ سکتے تھے۔ اس سے ملک کے کسان اور شہروں کے چھوٹے چھوٹے صنعت کار دونوں ہی ناخوش تھے۔ پرانا نظام اگرچہ جابر اور تانا شاہی تھا تاہم انھیں یہ گوارا نہیں تھا کہ اس کی جگہ ایک ایسا نظام لے لے جس کا پہلا اصول بنیاد ضرورت کی چیزوں پر ٹیکس لگانا تھا۔ غرضیکہ اودھ کے الحاق نے ایک ملک کو جس کے باشندے برطانیہ کے

انگریزوں کا مخالفت ہونے کا الزام نہیں دھرا جاسکتا، اپنے ”رسالہ اسباب بغاوت ہند“ میں فرماتے ہیں: ”انگریزی حکومت نے لگان آراضی کے تقرر کا جو طریقہ نافذ کیا ہے وہ بلاشبہ قابل تعریف ہے لیکن سابقہ لگانوں کی نسبت شرح لگان زیادہ ہے۔ غیر متوقع مصارف کا لحاظ رکھے بغیر انگریزی سرکار نے لگان آراضی کی تشخیص کی ہے۔ بنجر زمین پر بھی اسی حساب سے مالہ لگایا جاتا ہے جس سے قابل کاشت زمین پر۔ مالہ کی ادائیگی کے لیے کاشتکار قرض لینے پر مجبور ہیں۔ ان قرضوں پر شرح سود بہت زیادہ ہوتی ہے۔“ ۸۶

بہت سی جاگیروں کو ہر سال عدالتی ڈگری کے تحت اُن قرضوں کے عوض نیلام کر دیا جاتا تھا جو بعض اوقات چند روپوں کی رقم سے زیادہ نہ ہوتے تھے۔ اُن کو نچلے طبقوں کے نئے لوگ خرید لیتے تھے۔ سابقہ مالک جو اب بھی زمین کے ساتھ وابستہ تھے اپنی ہی آبائی زمینوں پر چھوٹے کسان اور ادنیٰ اسامی بن کر رہ جاتے۔ بقول سرسید احمد خاں برطانوی حکومت کے ابتدائی ایام میں جائداد کی بار بار فروخت کا اثر یہ ہوا کہ ہندوستانی معاشرہ نہ دبلا ہونے لگا۔ ۸۷

عدالتی اور ریونیو اسٹاف کے اجلاس جو ہندوستانی رواج اور روایت کی سپرٹ کے خلاف تھا لوگوں پر اندیشہ زیادہ پوجھ پڑا جب کہ وہ پہلے ہی کنگال ہو چکے تھے۔ اس سے دادرسی میں بھی بڑی رکاوٹ پڑتی تھی۔ ۸۸ اس پر طرہ یہ کہ ایفون بہر ایک بھاری محصول لگا دیا گیا۔ اس سے غریب طبقے کی بے اطمینانی کی سہولت آگ بھڑک اٹھی۔ ۸۹ چنانچہ آب و عارض پر، خوراک پر، مکانات پر کھانے کی چیزوں پر اور کشتیوں کے گھاٹ پر بھی ٹیکس تھا۔ ایک ایفون کا ٹھیکہ دار تھا تو دوسرا غلے اور اشیائے خور و نوش کی ہم رسانی کا ایک اور ٹیکہ اور شرب کا ٹھیکہ دار تھا۔ درحقیقت ہر اس چیز کا ٹھیکہ دیا جاتا تھا جو پیرس میں چٹنگی کے تحت آتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کھانے کی ہر چیز بہت گراں ہو گئی۔ ٹھیکہ دار خوب دولت کما رہے تھے اور عوام ان کے استحصال کے شکار تھے۔ ۹۰

سابق بادشاہ کی فوج ختم ہو جانے کی وجہ سے سبکدوش فوجیوں کی تعداد، ریزرو فوج کے تخمینے کے مطابق ستر ہزار تک پہنچ گئی تھی جس کی وجہ سے اودھ میں گندوں، شہدوں کا ایک لشکر پیدا ہو گیا تھا۔ بقول لفٹیننٹ نیل انس ”ایک سپاہی کو موتوں کرنا کو یا ایک لیٹر پیدا کرنا تھا۔“ ۹۱ اودھ میں کوئی ایسا کتبہ نہ تھا جس کا کم از کم ایک فرد فوج میں ملازم نہ ہو۔ ملازمت سے سبکدوش کیے گئے جن فوجیوں کو اودھ کی نئی بے ضابطہ فوج اور فوجی پولیس میں کوئی جگہ نہ ملی انھوں نے سارے علاقے میں اودھم مچا دیا۔ ۹۲ فوجی خدمت سے سبکدوشی کا نتیجہ اودھ کے

تھے۔ درحقیقت اُن میں سے بہت سے ایک آنے اور ڈیڑھ آنے فی یوم کی حقیر اجرت پر باغیوں کے ملازم ہو گئے اور بہت سے ایسے تھے جنہوں نے بجائے نقدی کے ڈیڑھ دو سیر اناج یومیہ بول کیا۔ ۱۰۲

ادھر مذہبی اوقات کی ضبطی نے قدیم مسلمان خاندانوں پر ناگوار اثر ڈالا اور انھیں مشتعل کر کے بغاوت پر آمادہ کیا۔ ۱۰۳ ادھر جدید طریقہ تعلیم سے جس میں انگریزی زبان، مغربی ادب اور سائنس کو فوقیت حاصل تھی، روشن خیال مسلم طبقہ کی وقعت خاک میں مل گئی۔ کئے اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ "ہمارے تعلیمی افدمات اور ہر گز انگریزیت جس سے ملک کو خطرہ درپیش تھا، شانِ مسلمان کو گھٹانے اور اُس متعصب دین کے بہت سے پارسوخ لوگوں کو ان کی آمدنی سے محروم کرنے کا موجب ہوئے۔" ۱۰۴ عدالتوں میں فارسی زبان کے ترک سے اور سرکاری ملازمت میں امتحان کی بنا پر بھرتی سے مسلمانوں کے لیے سرکاری نوکری کے مواقع اگر یکسر مٹے نہیں تو کمتر ضرور ہو گئے۔ ۱۰۵

تو نے صورتِ حالات کو جس جامع طور سے بیان کیا ہے وہ کسی قدر طویل ہونے کے باوجود نقل کیے جانے کے قابل ہے: "یہ صاف ظاہر ہے کہ اس ملک کے وسائل کو ترقی دینے کے بجائے اسی حالت میں چھوڑ دیا گیا جس میں وہ ہزار سال قبل تھے اور انھیں رو بہ زوال رہنے دیا گیا جو فتنوں اور مصنوعات تمام مغربی دنیا میں ہندوستان کا نام بلند کرتے تھے اور باعثِ حیرت تھے آج اُن کا نام و نشان بھی نہیں رہا جو شہر کبھی شہرت و عظمت کئے تھے اب محض کھنڈرات کے ڈھیر ہیں جن میں لکڑی بنگلے اور گیڈر بہتے ہیں۔ اگر بڑی بڑی درس گاہیں نیست و نابود ہو چکی ہیں مشرق کے داناؤں کا وجود صرف ماضی کی داستانوں اور تاریخوں میں رہ گیا ہے۔ اس کے مندر اور اجنتا اور الورا کے حیرت انگیز غار اور دوسرے مقامات ٹوٹ پھوٹ کر تیزی سے خاک میں مل رہے ہیں اور آہستہ آہستہ اُن کا کوئی نشان بھی باقی نہ رہے گا۔ اس کے اکثر تالاب خشک ہو چکے ہیں اور سماں سراسیمہ ہو چکا ہے اور جو باقی ہیں وہ بھی تیزی سے برباد ہو رہی ہیں۔ اس کی آبشاریں نہریں پٹ چکی ہیں اور ٹھکائی جا چکی ہیں۔ اس کی آباد بستیاں ویرانے بن چکی ہیں جہاں اب جنگل جانوروں کا ڈیرہ ہے اور چاروں طرف بھلک مٹیر یا پھیلا ہوا ہے۔ جا بجا تباہی و بربادی اور مفلسی کے دل سوز منظر ہیں گویا سارے ملک کو کوئی کوڑھی چھو گیا ہے۔ جو کوئی دیکھنے کو آنکھیں اور سننے کو کان رکھتا ہے، بلاشبہ فوراً اعتراف کرے گا کہ ہم نے اس قدر عظیم ملک کے وسائل پر

شالی وفادار تھے بے اطمینانی اور سازش کا اکھاڑہ بنا دیا۔ ۹۷

اس کے علاوہ ہندوستانی لوگ اس بات پر بھی کڑھتے تھے کہ انھیں نفع بخش عہدوں اور اسیامیوں سے محروم رکھا جاتا ہے۔ ہندوؤں کی بہ نسبت مسلمانوں کو اس مشکل کا زیادہ سامنا تھا۔ میوخلالذکر عام طور پر ملازمت اختیار نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے آباؤ اجداد کے پیشوں کو اپنا رکھا تھا۔ برہمنوں کے پس پشت روایت تھی اور انھیں ملازمت کی ضرورت ہی نہ تھی۔ ویش تاجرا اور ساہوکار تھے۔ کشتری جو کبھی ملک کے حکمران تھے ان میں سے ہر ایک نے چھوٹا سا قطعہ آراضی سنبھال لیا۔ وہ کسی قدر حکومت کی خوب بھی رکھتے تھے۔ ہندوؤں میں صرف ایک طبقہ تھا یعنی کاسیہ جو سرکاری ملازمت سے اپنی روزی کھاتے تھے۔ ۹۸

اس کے برعکس مسلمانوں کا انحصار زیادہ تر سرکاری ملازمت پر تھا۔ کپینی کی حکومت سے پہلے مسلمانوں کے عہد حکومت میں وہ ممتاز ترین عہدوں پر فائز تھے اور اب بھی وہ اسی قسم کی اسیامیوں کی توقع رکھتے تھے لیکن کپینی کی حکومت کے تحت انھیں ان عہدوں سے محروم رکھا گیا جن اسیامیوں تک ان کی رسائی تھی مثلاً کپینی کی فوج میں سپاہی کی حیثیت، ان کو وہ حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس حقارت کا سبب سادہ سا تھا۔ اپنی قومی حکومت کے تحت وہ اعلیٰ شہری اور فوجی عہدوں پر مامور رہ چکے تھے اور ان کے مشاہرت کپینی کے فرنگی ملازمین سے کسی طور کم نہ تھے۔ ان میں سے بعضوں نے رسالدار کی حیثیت سے ہزار روپیہ ماہوار مشاہرہ پایا تھا۔ اب ان کے بیٹے صرف اتنی روپے ماہوار تنخواہ پاسکتے تھے اور وہ بھی اگر خوش قسمتی سے رسالدار بن جائیں ۹۹ دہلی ریاستوں کے خاتمے سے صورت حالات بگڑ گئی۔ غالباً یہی بات ڈیوک آف ولنگٹن کے ذہن میں بھی تھی جب اس نے یہ کہا کہ کسی ریاست کے الحاق کا مطلب ہندوستانیوں کو ذلیل کرنا اور انھیں بھکاری بنا کر سراسر دشمن بنانا ہے۔ ۱۰۰ سر تنھامس مترو نے بھی کہا کہ اس پالیسی نے تمام قوم کو ذلت اور پستی کے گڑھے میں گرادیا ہے۔ ۱۰۱

ان عہدوں پر مامور ہونے کے بعد فرنگیوں نے فدام کا کوئی لاؤ لشکر نہ رکھا اور نہ ہی ان سے ایسی توقع تھی جیسا کہ سابقہ حکومتوں کے عہد میں ہندوستانیوں نے کیا تھا اور غالباً اب بھی کریں گے اگر ان کو ان اسیامیوں پر فائز کر دیا جائے۔ چنانچہ غریب طبقے کے ہندوستانی کسی بھی حالت میں پہلے جیسی ملازمتیں حاصل نہ کر سکتے تھے خواہ کوئی بھی سرکار ان پر حکمران ہوتی اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ اپنی حالت کو بہتر بنانے کی غرض سے کسی بھی ہنگامے میں شامل ہونے پر آمادہ

کیا تاکہ دوسرے میں کافی کپڑے زیب تن کر سکیں۔ ۱۳

ان حالات میں جب ہندوستانی سپاہیوں کو یہ بتایا گیا کہ سندھ یا پنجاب میں فوجی خدمت بجالانے کے لیے آئندہ انھیں بیرون ملک خدمت سے متعلق خاص حقوق (بھتہ) نہیں حاصل ہوں گے تو ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اُن کا کہنا تھا کہ سابقہ حقوق سے صرف اس لیے کیوں محروم کر دیا جائے کہ برطانوی قلمرو کی سرحد اس علاقے تک بڑھ گئی ہے جو کچھ پہلے غیر ملکی تھا۔ اس فیصلے سے کس طرح مطمئن ہو سکتے تھے جب کہ وہ جانتے تھے کہ وہ علاقے ان کی امداد کے بغیر فتح نہیں کیے جاسکتے تھے۔ وہ آزد و غافل تھے کیوں کہ ان کی مالک کمپنی نے ان کی نیک خدمات کا یہ صلہ دیا کہ انھیں اُن کی تنخواہ کے ایک حصے سے محروم کر دیا جس کے وہ مستحق تھے۔ ۱۴

ایک اور معاملہ جس سے ہندوستانی سپاہی آگ بگولا ہوئے وہ اُن کے مذہبی عقاید میں کمپنی کی مبینہ مداخلت تھی۔ شلاستی کی رسم کا افساد، ہندو بیواؤں کی دوسری شادی کی قانونی منظوری اور دختر کشی کی مانعت۔ یہ اقدام بذات خود اچھے تھے مگر ہندوستانی رسوم و روایات کے منافی تھے۔ اس سے ہندوستانیوں کے شبہات میں اضافہ ہوا۔ ۱۵ ۱۸۵۷ء میں ایک قانون پاس کیا گیا جس کی رو سے نو عیسائیوں کو اپنی آبائی میراث پر قابض رہنے کی اجازت دی گئی۔ اس سے ہندوستانیوں میں بڑا خفتشار پیدا ہوا۔ اسی دوران کلکتے سے کمپنی کی حکومت کے تمام بڑے بڑے افسروں کے نام سر ایڈمنڈ کی طرف سے ایک خط لکھ کر کیا گیا۔ خط کا مضمون یہ تھا کہ چوراکر سارا برصغیر ایک عیسائی طاقت کے تحت ہے اس لیے ہندوستانیوں کو عیسائی مذہب اختیار کرنے پر مجبور کرنا جائز ہے۔ ۱۶ سر سید احمد خاں لکھتے ہیں: ”یہ کہنے میں کوئی مبارک نہ ہے۔“ جب ہندوستانیوں کو اس گشتی چٹھی کا علم ہوا تو خوف نے اُن کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ ۱۷ یہ افواہ پھیل گئی کہ کمپنی کے ہندوستانی ملازمین کو سب سے پہلے عیسائی بنایا جائے گا اور اس کے بعد عوام کو تیسری بار یہ تھا کہ خط متعلقہ سرکار کے حکم سے لکھا گیا۔ جب بنگال کے فکٹس گورنر نے ایڈمنڈ کے خط کے بارے میں سنا تو اس نے ان افواہوں کی تردید جاری کی لیکن اس تردید سے صرف عارضی تسکین ہوئی۔ عام خیال یہ تھا کہ سرکار نے اس منصوبے کو صرف ملتوی کیا ہے اور جوں ہی وہ اپنے آپ کو کافی طاقتور سمجھے گی، اس کی تکمیل پر توجہ دے گی۔ ۱۸

اس میں کوئی شک نہیں کہ کمپنی کی حکومت سرسری طور پر بے اطمینانی کی اس نفا سے باخبر تھی جو اُس وقت طاری تھی۔ حاکم اور محکوم کے درمیان کوئی رابطہ نہیں تھا اور نہ باہمی میل جول یا

مطلق توجہ نہیں دی جب کہ ہم نے اس ملک کے گوشے گوشے میں اپنے صنعتی شہروں کی لغویات کے انبار لگا دیے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہم نے مشرق کی مفید تجارتی مصنوعات کو تباہ کرنے کی عہد اکوشش کی ہے۔ ۱۰۶ تو پوچھتا ہے: "اگر ایسی غلط حکمت عملی جاری رہی تو اس کوتاہ اندیشی کا کیا انجام ہوگا؟" ۱۰۷

ان شدید مصائب کے دور میں طویل کساد بازاری (۱۸۵۷-۱۸۵۹ء) نے (جب قیمتیں خاص طور پر تیزی سے گریں) افسوس ناک معاشی، سیاسی اور سماجی حالات پر اور بھی تتم ڈھایا۔ ۱۰۸ ۱۸۵۷ء میں چاندی کی پیداوار دنیا کی مانگ سے بہت کم نکلی۔ اس سے صورت حال اور بھی بگڑ گئی۔ ایک تو اس لیے کہ ۱۸۳۵ء کے قانون کی رو سے ہندوستان کے رائج سکے کی بنیاد خالص چاندی پر رکھی گئی تھی، دوسرے اس لیے کہ ہندوستان ابھی تبادلہ جنس کے رواج سے نقد معاشی نظام کے عبور کی دور سے گزر رہا تھا۔ ۱۰۹

اثر و رسوخ اور اقتدار کی توسیع کے اس نازک مرحلے پر انگریزوں نے افغانستان کی پہلی جنگ (۱۸۳۸-۱۸۴۲ء)، جنگ کریمیا (۱۸۵۴-۱۸۵۶ء) اور سکھوں کے خلاف دو جنگوں (۱۸۴۵-۱۸۴۹ء) میں کئی شکستیں کھائیں۔ اس سے ان کی یہ سادہ کہ وہ ناقابل تسخیر میں قریب قریب ختم ہو گئی حالانکہ وہ ان تمام جنگوں میں فتح یاب ہوئے۔ لوگوں پر یہ حقیقت آشکار ہو گئی کہ انگریز فوق البشر نہیں ہیں اور ان سے ہلک خطا میں سرزد ہو سکتی ہیں۔ ایسی غلطیاں جن سے چالاک حریف فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ چونکہ یہ اعتقاد لگ بھگ زائل ہو چکا تھا کہ برطانوی فوج ناقابل تسخیر ہے اس لیے سپاہیوں کو زعم ہو گیا کہ انگریزوں نے جو بہت سی فتوحات حاصل کی تھیں وہ محض ہندوستانیوں کی شجاعت کا نتیجہ تھیں۔ ان کا یہ اعتقاد تھا اور انھوں نے اس اعتقاد کا غیر مبہم الفاظ میں اظہار کیا کہ انگریزوں نے انھیں کے بل بوتے پر ہندوستان کو برما سے کابل تک فتح کیا تھا۔ کمپنی کی فوج کی ساخت بھی اس یقین کو تقویت پہنچاتی تھی۔ چالیس ہزار برطانوی فوجیوں کے مقابلے میں ہندوستانی سپاہیوں کی تعداد تین لاکھ ساٹھ ہزار تھی اور چھ ہزار پانچ سو فرنگی توپچیوں کے مقابلے میں بارہ ہزار ہندوستانی توپچی تھے۔ ۱۱۰

برطانوی وسائل کے بے انتہا ہونے کا یقین بھی تقریباً زائل ہو چکا تھا۔ گئے نے اسے تاکیداً بیان کیا ہے: "جنگ کریمیا کے لیے ہندوستان سے فوجیں منگوانے کی جو تجویز پارلیمنٹ میں پیش کی گئی اس سے ہندوستان کے روشن خیال لوگ حیرت زدہ ہوئے۔ اس سے بلند تر آواز میں ہم اپنے وسائل کی کمی کا ڈھنڈو دہا نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ ہم نے اپنے آپ کو دنیا کے ایک گوشے میں ننگا

ہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اگرچہ ہندوستان کا مطلق صاف ہے پھر بھی ایک چھوٹا سا بادل نمودار ہو سکتا ہے جو پہلے بہت حقیر ہو لیکن بڑھتے بڑھتے اتنا بڑھ سکتا ہے کہ نہیں تباہی کے سیلاب میں غرق کر دے۔ ۱۲۲۰ لیکن کہتی کی حکومت نے ان تینہوں پر کان نہ دھرا۔

یہ انتہائی بحران کا وقت تھا ۱۲۵۰ ایک عام معصومانہ حرکت تھی بے خبری کے عالم میں یارود پر جنگاری کا کام کر سکتی تھی۔ عین اسی وقت سرکار نے نئے سرکاروںس رائج کرنے کا فیصلہ کیا جن پر پارلیمنٹ کے خیال میں واقعی لگائے اور یورپ کی چرائی لگی ہوئی تھی ۱۲۶۰ اور جن کے استعمال سے وہ اپنی ذات اور اپنے دین سے محروم ہو جائیں گے۔ پھر ایک انقلابی جنگاری، ہنگامہ لگانے والی آتش گیر مادے پر لگ کر پڑی اور آگ بھڑک اٹھی۔ ۱۲۶۰ انوقت کی آگ جو ہلاکتی کے بعد وہ گئی تھی اور اس وقت سے جنگ رزمی تھی کیلبرنگ کی تھی سے بھڑک اٹھی، معزول شدہ، اعلیٰ انسان، لڑائیوں اور دانتوں، زمینداروں اور مزدوروں، مصنعت کاروں اور مزدوروں، مسلمان تلووں اور عیسویوں اور ہندو پندتوں نے اپنے اہلکاروں کے لیے اس موقع کو غنیمت سمجھا۔ انگریزوں کو پہلی بار جب سے وہ ہندوستان تک وارد ہوئے تھے متضاد فلسفہ کے ایسے زبردست انجمن کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

۱۲۔ متضاد فلسفہ

اس سوال یہ ہے کہ وہ کس قسم کی تنظیم تھی جس نے بغاوت کا اہتمام کیا؟ اس کے لیے مختلف رائےیں چلائی گئیں اور بعد میں اس کی رہنمائی کی۔

ہم باغیوں کی تنظیم کے بارے میں، خاص طور پر بغاوت سے پہلے کے دور سے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ اس کا سبب ظاہر ہے۔ باغیوں نے قتلوں کا کام کرتے تھے اس لیے وہ اپنی تنظیم کی سخت سرگرمیوں اور اہمیت کے بارے میں کوئی دستاویز نہیں رکھتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بغاوت سے متعلق قیدیوں، دوہرے، دہلیوں اور قیدیوں، پندتوں اور سینڈیسوں، رہنما کارنگو، گرگوریل اور دیاروں کی دستاویزوں سے کبھی پڑی ہیں جو جمہوریت پر تھے اور بغاوت کا پیغام نشر کرتے تھے۔ ایسی کتابوں میں ان سرخ رنگوں کے پھولوں اور چیتوں کی کہانیاں تھیں کہ کثرت ہو جو د

تاریخ کے گروہوں سے دوسرے گروہوں کو پہنچائی جاتی تھیں۔ "A NARRATIVE OF THE INDIAN REVOLT" کے مصنف نے کوئل سے ایک گشت کو یوں بیان کیا ہے: "ایک آدھی کوئل کے پھول کے ساتھ نمودار ہوتا اور اسے جو حجت کے دوسرے کے سپرد کر دیتا۔"

ایک دوسرے کی قربت تھی جیسا کہ ان فاتحین کا دستور تھا جو شمال مغرب سے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے۔ انگریز حکمرانوں کی نگاہ ہمیشہ ملازمت سے سبکدوش ہونے اور وطن کو بوٹنے پر رہتی۔ وہ شاذ و نادر ہی ہندوستان میں آباد ہونے کے ارادے سے آتے تھے۔ ۱۱۹

ہندوستانیوں کو ملک کی حکومت میں کوئی دخل حاصل نہیں تھا۔ اس لیے سرکار نہیں جاتی تھی کہ جو قانون اور ضابطے اس نے پاس کیے ہیں وہ مصلحت پر مبنی ہیں یا نہیں۔ سرکار کو یہ معلوم ہونا چاہیے تھا لیکن کہیں یہ معلوم ہو پاتا کہ ان مسائل سے متعلق لوگوں کی کیا رائے تھی۔ لوگوں کو کسی نا انصافی کے خلاف صلے احتجاج بلند کرنے یا اپنی خواہشات کو ظاہر کرنے کا وسیلہ حاصل نہ تھا۔ لیکن سب سے بڑا فتنہ یہ تھا کہ لوگ سرکار کے خیالات اور مقاصد سے متعلق غلط فہمی کا شکار تھے۔ وہ ہر فعل کو غلط سمجھتے اور جو بھی قانون پاس کیا جاتا لوگوں کی طرف سے اس کی غلط تاویل کی جاتی کیوں کہ اس کی ترتیب میں ان کا ہاتھ نہ ہوتا تھا اور اس کے مفہوم کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ آخر کار ہندوستانیوں کو یہ سوچنے کی عادت پڑ گئی کہ تمام قانون ان کی تفسیل اور تباہی اور انھیں اور ان کے ہونٹوں کو ان کے دین ایمان سے محروم کرنے کی غرض سے پاس کیے جاتے ہیں۔ بالآخر وہ وقت آ گیا جب تمام لوگ انگریزی سرکار کو ایک دیر اثر ذہن پر ریت کی دیوار (جمونا سہارا) اور شعلہ فزیب تصور کرنے لگے۔ وہ یہ خیال کرنے لگے کہ اگر آج ہم سرکار کے پتے سے نجات حاصل کر لیں تو کل پھر اسی میں گرفتار ہو جائیں گے، اور اگر کل بھی بچ جائیں گے تو پرسوں کا ل تباہی کا سامنا ہو گا۔ جب حاکم اور محکوم کے باہمی تعلق کا یہ حال ہو تو وفاداری اور خیر سگالی کی کیا امید ہو سکتی ہے؟ ۱۲۰

یہ بات نہیں تھی کہ تمام انگریز ہندوستانی رعایا کے جذبات سے بے خبر تھے۔ ان میں سے بعضوں نے فی الواقع کمپنی کی سرکار کو اس کے ملاتے میں خطرناک صورت حال سے آگاہ کیا۔ مٹکات کو یہ توقع تھی کہ "ایک دن سہانی صبح کو جب جاگوں گا تو مجھے معلوم ہو گا کہ برطانوی تاج ہندوستان سے محروم ہو چکا ہے" ۱۲۱ کرنل سلیم نے ماہ اپریل ۱۸۵۲ء میں ڈہلوی کو لکھا تھا کہ ممکن ہے کہ دیسی ریاستیں کسی "جان جو کم کے کام میں متحد ہو جائیں" ۱۲۲ ڈاکٹر کنزنگر نے حکومت کو متنبہ کیا کہ اودھ کے قلعہ دار خاموش ہیں کیوں کہ "ہندوستان کے باشندے سختیاں سمیٹے اور اپنے حاکموں کی مرضی کے سامنے ہر تسلیم خم کرنے کے عادی ہیں لیکن اگر ہماری مغربی سرحد پر کوئی دشمن نمودار ہو جائے یا بد قسمتی سے کوئی بغاوت پیا ہو جائے تو ہم ان تعادروں کو مخالف صفوں میں پائیں گے اور ان کی مدد یا اور نوکر پاکر اسی جھنڈے کے نیچے ہوں گے" ۱۲۳ لارڈ کینگنگ نے لندن سے روانگی سے پہلے فرمایا:

یہ انسان کی ہتھیلی کے برابر ہوتی تھی اور اس کا وزن دو تو لے تھا۔ ۱۳۲

چپاتیوں کی تقسیم بالکل اس واقعہ کا اعادہ تھا جو ۱۸۰۲ء میں شمالی ہندوستان پر مرہٹوں کے حملے سے پہلے رونما ہوا۔ فرق صرف یہ تھا کہ چپاتی کے ساتھ گوشت کے بجائے باجرے کے پودے کی ڈالی ہوتی تھی ۱۳۵ اسی طرح مستعمل بغاوت سے پہلے سال کے درخت کی ٹہنی گھاؤں گھاؤں میں تقسیم کی گئی تھی۔ ۱۳۶ سر جان کلیم کے قول کے مطابق ”۱۸۰۲ء میں ساحلی فوج (COAST ARMY) کے غدر سے پہلے مٹھی بھر کھانڈ پر اسرار طریقہ سے تقسیم کی گئی تھی“ ۱۳۷ ان چپاتیوں کی تقسیم کے بعد مبہم پیشین گوئیاں اور افواہیں اڑنے لگیں جو متبل عام کا پیش خیمہ جنال کی جاتی تھیں۔ ان سے عوام کے دلوں میں دہشت پیدا ہو گئی۔

اس وقت برطانوی حکام کا عام خیال یہ تھا کہ بغاوت کی تنظیم میں مسلمانوں کا زیادہ ہاتھ ہے۔ ریورنڈ جے۔ کیو۔ براؤن کا بیان ہے کہ پنجاب سرکار نے شروع ہی سے یہ اعلان کر دیا تھا کہ بغاوت کا آغاز دراصل ہندوستانیوں اور مسلمانوں کی طرف سے ہوا۔ مسلمانوں کو بغاوت کا محرک سمجھا جاتا تھا اور ہندوؤں کو ان کا آلہ کار ۱۳۸ گبتس، براؤن کی رائے سے اتفاق رکھتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ مسلمانوں نے بڑی احتیاط کے ساتھ ہندوؤں کو خوف زدہ کر کے اپنا آلہ وسیعہ کیا۔ ۱۳۹ جس فوجی کمیشن نے بہادر شاہ ظفر کے مقدمے کی سماعت کی اس کے ڈپٹی ایڈوکیٹ جنرل میجر الین۔ جے۔ بیرٹ کا بیان ہے کہ: ”ان مقدمات کی انتہائی معنی خیز حقیقت یہ ہے کہ جہاں کہیں ہم نے تفتیش کی ہے مسلمانوں کی سازش کے آثار پائے ہیں لیکن ایک بھی ایسی دستاویز ہاتھ نہیں لگی جس سے ظاہر ہو کہ ہندو بحیثیت فرقے کے ہمارے خلاف سازش کرتے رہے ہیں یا مرہٹوں اور بجاویلوں نے عیسائیوں کے خلاف جہاد کا پرچار کیا ہو.... مسلمان ملاحظہ باطن کے اور فرضی قوت معجزہ کے جوئے دعویدار، مسلمان بادشاہ، ان کے فریب میں پھنسنے ہوئے لوگ اور شریک جرم.... ترک اور ایران کی مسلمان حکومتوں میں مسلمان خفیہ سفارت خانے.... مسلمانوں کی طرف سے ہمارے اقتدار کے زوال کی پیشگوئیاں.... ہماری حکومت کی وارث مسلم سرکار؛ مسلمان قاتلوں کے ہاتھوں سفاک قتل... اسلامی غلبہ کے لیے جہاد.... اور بغاوت کے بانی مسلمان سپاہی۔ غریفہ ہندوؤں کا کہیں بھی دخل ظاہر نہیں ہوتا اور اگر کہیں شاندار ہوتا بھی ہے تو اپنے جنگ جوہر سے کی زیر ہدایت محض ثانوی حیثیت سے۔“ ۱۴۰ اسی لیے سب آرٹن رابرٹس (جو بعد میں فیلڈ مارشل لارڈ رابرٹس ہو گئے) ان بدسیرت مسلمانوں کو دکھانا چاہتا تھا کہ ”خدا نے چاہا تو انگریز اب بھی ہندوستان

وہ اسے دوسرے کے حوالے کر دیتا۔ اس طرح ہر آدمی اسے لے کر آگے بڑھا دیتا اور جب یہ آخری آدمی کے ہاتھ میں آتا تو وہ اچانک غائب ہو کر اگلی چھاؤنی میں پہنچ جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنگال میں کوئی ایسا الگ فوجی دستہ یا چھاؤنی نہ تھی جس میں کنول کے پھول نے گشت زکیا ہوئے ۱۲۸ سر جارج آٹوٹریوٹین کی رائے ہے کہ سرخ پھول نے تمام سپاہیوں کو مستعد کر دیا۔ ۱۲۹ ہر آدمی سرخ کنول کی قسم کھا کر عہد کرتا کہ جب بھی دعوتِ عمل آئے گی وہ دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرے گا۔ اس رسم کے بعد ہر جمنٹ تنظیم کی اپنی خفیہ شاخ قائم کرتی۔ وٹمن اپنی تصنیف "DEFENCE OF LUCKNOW" (لکھنؤ کی مدافعت) میں یوں لکھتا ہے: "جو شہادت دستیاب ہے اس سے ظاہر ہے کہ ہر جمنٹ میں تین افراد کی ایک انجمن تھی جو غدر سے متعلق ہر ضروری کارروائی کرتی تھی۔ یہ انجمن تمام اہم تجاویز کے بارے میں فیصلہ کرتی۔ خط و کتابت بھی اسی کے ذمے تھی اور کئی دوسرے کام انجام دیتی تھیں۔" ۱۳۰ سادہ کر کے مطابق سپاہی رات کو خفیہ طور پر ملا کرتے تھے تمام قرار دینے والی مجلس میں منظور کی جاتیں اور اندرونی حلقوں میں جو فیصلے کیے جاتے ان تمام کی تعمیل سختی کے ساتھ کی جاتی۔

جب سپاہی خفیہ اجلاس میں شامل ہوتے تو وہ سوائے آنکھوں کے اپنے تمام چہرے کو ڈھانپ کر اپنی شخصیت کو چھپا لیتے۔ اجلاس میں وہ ان بے انتہا مظالم کو تفصیلاً بیان کرتے جو انگریز ملک میں دھاتے تھے ۱۳۱ اگر کسی پر غبر ہونے کا شک گزرتا تو اسے فوراً موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ جب ایک جمنٹ کی تنظیم پایہ تکمیل کو پہنچ جاتی تو اس کی بڑی انجمن دوسری جمنٹ کی بڑی انجمن کے ساتھ نامہ و پیام کرتی تاکہ مل کر کام کر سکیں۔ جمنٹوں کے حلف سپاہیوں کی سرگندگی کی طرح واضح اور معین ہوتے تھے ہر جمنٹ بڑی تنظیم کا جز ہوتی تھی۔ مختلف جمنٹوں کے درمیان بحث و مباحثہ کی سہولت کے لیے ایسا انتظام کیا گیا کہ تیوہاروں کی تقاریب مل کر منانے کے لیے جمنٹیں ایک دوسرے کو دعوت دیں۔ اس سے متحدہ خفیہ اجلاس منعقد کرنے کا بہانہ مل جاتا۔ منتخب سپاہی صوبیداروں کے گھروں میں ملتے۔ اہم معاملات کا فیصلہ انصروں پر چھوڑ دیا جاتا ۱۳۲

شورش سے عین پہلے چپاتیوں کی تقسیم غالباً لوگوں کو آنے والے انقلاب کے لیے تیار کرنے کا اشارہ تھا۔ نواب معین الدین کے بیان سے ظاہر ہے کہ کس طرح ماہِ فروری میں ایک دن علی الصبح سرائے فرخ خاں کا پاسبان ایک چپاتی لایا اور اسے اسی قسم کی پانچ چپاتیاں پکانے اور پانچ نزدیک ترین دیہات میں بھیجے کہو کہا اور ساتھ ہی یہ ہدایت کی کہ ہر گاؤں کا چوکیدار اسی قسم کی پانچ چپاتیاں اسی طریقے سے تقسیم کرنے کے لیے تیار کرے۔ ہر چپاتی جو اور گندم کے آٹے کی بنی ہوئی تھی

بغاوت کے دوران دہلی کے کو تو ال نواب معین الدین نے اپنی کتاب "TWO NARRATIVES OF THE MUTINY IN DELHI"

آٹا لی کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کسی فرنگی کے مکان یا مارگہ کو بند کرنا ایک قسم کا اشارہ تھا۔ کسی مارگہ کی آتش زنی کی خبر فوراً میجر میجر مارگلہ سے پنجاب تک پہنچا دی جاتی تھی۔ اور یہ تباہ کیا جاتا تھا کہ جو لوگ اس اشارے سے آشنا ہیں وہ یہ خبر سن کر سمجھ جائیں گے کہ انھیں بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔ اس آتش زنی کی اطلاع ملک میں دور دور تک نشر کی جاتی تھی۔ کہتے ہیں کہ ایک رجمنٹ سے دوسری کو مسلسل خطوط بھیجے جاتے تھے جن میں سپاہیوں کو اس قسم کی تحریک کاری پر اکسایا جاتا تھا اور اس کی تعمیل پر کرنے پر ذرات برادری سے اخراج کی دھمکی دی جاتی تھی۔ اہم خط و کتابت میں باغی نکلنے اور اعداء پر شمل ایک قسم کی خفیہ تحریک کر رہے تھے۔ احتیاط کے ساتھ ناموں کے ذکر سے احتراز کیا جاتا تھا۔ ۱۵۹۰ نیڈ مارشل لارڈ رابرٹس کے بیان کے مطابق عظیم الشان قسطنطنیہ کے عرشا کے ساتھ باغیانہ مراسلہ نگاری بھی کرتا رہا جس میں اس نے سپاہیوں کی بے اطمینانی اور ہندوستان کی عام بد امنی کی حالت کا ذکر کیا اور برطانوی غلامی کا جو آثار دیکھنے کے لیے ترکوں سے امداد کی التجا کی۔ لارڈ رابرٹس کا یہ بھی بیان ہے کہ عظیم الشان نے چند محکمہ میں مقیم فرانسیسی آبادکاروں کی وساطت سے فرانسیسی سرکار کے ساتھ بھی ایسی قسم کی خط و کتابت جاری رکھی۔ ۱۵۹۱

زبانی خبروں اور روٹا ہونے والے واقعات کا احتیاط کے ساتھ مقابلہ کرنے کے بعد کریک فورڈ وٹسن کو یقین ہو گیا کہ اس قسمی شہادہ کا اتوار وہ دن تھا جو بنگال کی ساری فوج میں بغاوت کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ ۱۵۹۲ لیکن دوسرے ہم پایہ معتد مشاہدین نے وٹسن کے انکشافات کو قبول نہ کیا۔ مثال کے طور پر سر جان لارنس کا یہ کہنا کہ "معتد خطوط جو سپاہیوں نے لکھے اور جنھیں راستے میں روک لیا گیا، ان میں ایک بھی خط ایسا نہ تھا جس میں ایسی سازش کا اشارہ نہ ہو۔ سازش کا علم نہ تو وہاں سپاہیوں کو تھا اور نہ موت کی سزا پانے والے باغیوں کو جو اس سازش کا (اگر کوئی تھی) انکشاف کر کے اپنی جان بچا سکتے تھے۔ ۱۵۹۳ لارنس نے سوال کیا کہ "کیا سبب ہے کہ عوام اور فوجیوں نے ایک ہی وقت پر بغاوت نہیں کی؟ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ اس سازش کے نتیجہ وقت کا پتہ چل جانے سے میرٹھ کا بنگامہ پہلے ہی بپا ہو گیا تو بھی سوال اٹھتا ہے کہ اس شورش کی خبر پانے کے بعد فوراً بغاوت کیوں نہیں شروع ہوئی؟ ۱۵۹۴

بے شک یہ معقول دلائل ہیں لیکن واقعات سے ان کی تردید ہوتی ہے۔ حقیقت حال سے

میں مبتلا تھا۔ ۱۶۶ میکلوڈ انس کا بیان ہے کہ ”بالائی صوبوں میں یعنی گنگا اور جمنہ سے سیراب ہونے والے میدانوں سے لے کر خاص بنگال تک برطانوی امن معضل اور شہری نظام حکومت کلیتہً درہم برہم تھا۔“ ۱۶۷ وسطی ہندوستان کے بارے میں کینگ نے لکھا: ”میں وسطی ہندوستان کو ہاتھ سے گیا سمجھتا ہوں جسے از سر نو فتح کرنا ہو گا۔“

کانپور میں نانا صاحب نے باغیوں کی ”راستہائی کی۔“ ۱۶۸ گردونواح کے دیہاتی سرپرستوں کی اشتعال انگیزی پر جو نانا صاحب کی طرف سے جہاد کی تلقین کر رہے تھے، باغیوں کے ساتھ صف آرا ہو گئے۔ ۱۶۹ اس علاقے کے ہر فرد کے سر میں ایک ہی دھن سہائی ہوئی تھی کہ ”غیر کے جبر کا جواب اتار پھینکے گا بس یہی موقع ہے۔“ ۱۷۰ جھانسی میں لکشمی بائی نے ”بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔“ ۱۷۱ پٹنہ میں وہابیوں اور بنارس میں برہمنوں کا مذہبی اثر اتنا زیادہ تھا کہ یہ دو شہر مزاحمت کے گڑھ بن گئے۔ ۱۷۲ علیہ اور دوسری اشیائے خورد و نوش کی گرانی جسے ہمیشہ برطانوی حکومت سے منسوب کیا جاتا تھا الہ آباد کے باغیوں کے ہاتھ میں حکومت کو بدنام کرنے کا ایک سہل اور جائز حربہ بن گئی۔ ۱۷۳ بہار میں بندوبست دوائی اس طرح نیست و نابود ہوا گویا ایک خواب تھا۔ ۱۷۴

جہاں کہیں فوجی شورش بپا ہوتی عموماً اس کے بعد یا اس کے ساتھ ہی شہر اور دیہات میں بغاوت پھوٹ پڑتی لیکن کئی مقامات میں لوگوں نے سپاہیوں سے پہلے ہی علم بغاوت بلند کر دیا۔ ۱۷۵ جہاں کہیں بغاوت شروع ہوتی سرکاری خزانہ، گودام اور اسلحہ خانہ لوٹ لیا جاتا۔ بیرکوں اور سرکاری عمارتوں کو نذرِ آتش کر دیا جاتا اور جیل خانوں کے پھانگ کھول دیے جاتے۔ ۱۷۶ ہر جگہ سرکاری دستاویزات کی طرف باغیوں کا وہی رویہ ہوتا جو بیہوشی کے بھی کھاتوں کی طرف تھا اور دونوں صورتوں میں وجہ ایک ہی تھی۔ ان کی نگاہ میں یہ دستاویزات جاہلانہ ٹیکسوں کی وصولی اور ضبط و امن کے قیام کے وسائل تھے جو انھیں ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ ۱۷۷ اس لیے وہ سرکاری دستاویز کو تباہ کر دیتے اور ان کے ہاتھوں بیہوشی کے بھی کھاتوں کا بھی یہی حشر ہوتا۔ ”بے دخل کیے گئے زمینداروں نے اس موقع کو غنیمت جانا جس کے وہ مدت سے منتظر تھے۔ انھوں نے اپنی رعایا کو اکٹھا کیا اور مغرور دولت نودوں کو مار بھگایا جنھوں نے ان کی جاندا دیں خرید لی تھیں اور اس طرح فاتحانہ انداز سے اپنے آبائی گھروں میں آباد ہو گئے۔ گستاخ قرض داروں کے ہجوم بیہوشی پر ٹوٹ پڑے اور انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اگر قانون کے مضبوط ڈنڈے کا خوف نہ ہوتا تو وہ انھیں پہلے ہی جبراً رویہ ایٹھنے کی سزا دے چکے ہوتے۔“ ۱۷۸ تا جردن کو مجبور کیا جاتا کہ وہ ۱۸۱۱

اس بات کا اعتراف کیا کہ ہندوستانی ریاستوں نے اس سیلاب کو روکا جس کے ایک ہی
رہے سے ہم لوہٹک جاتے تھے ۱۸۵۰

باغیوں کو پنجاب سے عملی امداد کی توقع تھی۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ جنوں کے انگریزوں نے
اسے صرف آٹھ سال ہی پہلے فتح کیا تھا اس لیے وہ لوگوں کے دلوں کو نہ جیت سکے ہوں گے
اور نہ ہی ان کی وفاداری انھیں حاصل ہوئی ہوگی۔ انگریزوں کی قسمت کا دار صرف پنجاب کی
حمایت یا مخالفت پر تھا۔ تھانہ بن سیم کرتا ہے کہ اگر پنجاب نے بغاوت کر دی تو ہماری حالت
خطرناک ہو جائے گی۔ ہم ٹھاپے کی تاب نہ لاسکیں گے۔ جب تک انگلستان سے کمک نہ پہنچے ۱۸۵۱
لیکن پنجاب "مجموعی طور پر وفادار" رہا بلکہ اس صورے سے انگریز تمام فریقوں "مذہبوں اور
بولیوں کے انتالیس ہزار جوان فوج میں بھرتی کرنے کے قابل ہو گئے ۱۸۵۱

بغاوت کی طرف پنجاب کی بے رخی کے کئی اور اسباب تھے۔ سیکھ سردار مغل غلبے اور مغل
اقتدار کی بحالی سے خائف تھے کیوں کہ اس کا مطلب ان کا یقینی طور پر مغلوب ہو جانا تھا ۱۸۵۱ اس کے
علاوہ سرہندی لائسنس نے ان کے ساتھ نرمی کا سلوک ردا رکھا تھا۔ ان کے برگشتہ مقدمے کے ساتھ ہرجی
کا اظہار کیا تھا اور ان کی جاگیروں پر اس قدر سختی کے ساتھ ہاتھ نہیں ڈالا تھا جیسا دوسرے صوبوں
میں کیا گیا تھا ۱۸۵۱ جی۔ ڈیلیو۔ فارمسٹ لکھتا ہے: "بغاوت کے دوران سر جان لائسنس کی حکومت
کی شہزادہ کامیابی اس اقدام کی رہنمائی ہے جو سرہندی لائسنس نے جاگیرداروں کے عروسی حقوق
کی حمایت میں کیا ۱۸۵۱ جن سرداروں پر تشدد تھا انھیں جلا وطن کر دیا گیا۔ وہ سردار جنھیں اپنے حال پر
چھوڑ دیا گیا غالبہ فوج کے جبر و ستم کو یاد کر کے ایسی بغاوت کی کامیابی کے تصور سے ہم نگے جو
غالب انھیں اسی قبیل کی ستم شعار فوج کے رحم و کرم پر ڈال دے گی ۱۸۵۱ بے دخل کیے گئے سکھ
جاگیردار جو سکھوں کی جنگوں میں رہا تھا تھے اور جن کے دلوں میں ابھی کینے کے افسروں کے زیرِ کمان
پورے سپاہیوں کے ہاتھوں شکست کی یاد تازہ تھی بے تابی کے ساتھ انگریزوں کے آڑے
آئے۔ اس طرح انھیں اس شکست کا انتقام لینے کی بھی امید تھی اور اپنے سابقہ حقوق اور مقام
اور سرفرازی حاصل کرنے کی بھی ۱۸۵۱ اس کے علاوہ وہ یہ نہ سمجھتے تھے کہ پورے سپاہیوں نے انھیں بچے
ذات ۱۸۵۱ ہونے کا لفظ دیا تھا۔

سکھ لوگوں نے باغیوں کے ساتھ شامل ہونے کا خیال اس لیے بھی ترک کر دیا کیوں کہ وہ
بغاوت کی کامیابی کا لازمی نتیجہ یہ سمجھتے تھے کہ سلاٹوں کے ہاتھوں ان پر مذہبی جبر و ستم ہوگا۔ ان

جہان پہنچانے کے لیے باغیوں کی مدد کریں ۱۷۵

فوجی مرکز میں غیب سنگ حکومت کے ظاہری نشانات مٹانے کے بعد سپاہیوں نے دہلی پر اپنی توجہ مبذول کی۔ دہلی کی فتح سے اس تحریک کو ایک سیاسی وقعت حاصل ہوئی اور اس کی حیثیت ایک مقامی شورش کی سی ہوئی۔ لوگوں کو بھی جو ہندوستانیوں اور ہندوستانی چیزوں کا کسی صورت پرانہ تھا، یہ تسلیم کرنا پڑا کہ باغیوں نے اپنی سرگرمیوں کے لیے ایک شاندار مرکز کا انتخاب کر لیا تھا جہاں ہر قسم کے سامان جنگ کا ذخیرہ تھا جیسا کہ ایک اول درجے کے استوفانے میں ہونا چاہیے۔ یہ ایک ملکی دولت اور شان و شوکت سے مالا مال قلعہ بند شہر تھا جہاں انگریزوں کا ایک بہت بڑا خزانہ اور کثیر القدر بارود کا گودام موجود تھا اور جہاں مسلمانوں کی آبادی انگریزوں کی مخالفت تھی۔ ۱۸۰۰ء جنگی مصالحت کے لحاظ سے بھی دہلی پر قبضہ ایک کارہی ضرر تھی۔ یہاں تک پہنچانے والی انگریزی فوجوں کے بگڑ جانے، اپنے اڈے سے جدا ہوجانے اور بالآخر نیست و نابود ہوجانے کا اندیشہ تھا کیوں کہ یہاں نقصانات کی تلافی کے وسائل مفقود تھے۔ فیصلہ کن جدوجہد کا محاذ ایسی جگہ منتخب کیا گیا جہاں ہندوستان میں مقیم انگریزی فوجوں کی اکثریت کے ساتھ آسانی سے پہنچا جاسکتا تھا۔

لیکن آخری مغل بادشاہ اور نانا صاحب کی بھالی نے راجپوت ریاستوں، پنجاب کے سکھوں اور نظام حیدر آباد کے دلہیز شہنشاہ پیدا کر دیے۔ راجپوت ریاستوں کی فوجی اہمیت کے بارے میں لارڈ کیننگ نے کوٹ آف ڈائمنز میں کے نام ایک سرکاری مراسلہ میں اس بات کا اعتراف کیا کہ ”اگر بہار، سندھیا، بنارہ میں شامل ہوجاتے تو مجھے کل ہی بوریا ستر گول کرنا ہوتا۔“ ۱۸۶۰ء راجپوت ریاستوں کے حکمران اور دوسرے لوگ ڈرتے تھے کہ باغیوں کی کامیابی کا مطلب یہ ہوگا کہ مغل اور مرہٹے ڈاکو اپنی غارتگری پھر شروع کر دیں گے۔ انھیں وہ وقت یاد تھا جب کپٹن کی حفاظت انھیں نہیں حاصل تھی اس لیے وہ امن و امان اور استحکام حکومت کھونے سے ڈرتے تھے جو اس حفاظت کے معاہدے کا نتیجہ تھے جس کی تائید جارج لارنس کے قول و فعل سے ہو چکی تھی۔ ۱۸۶۰ء اس لیے انھوں نے اپنی بقا کا خاطر اس طاقت کی مدد کی جس نے انھیں مغلوں اور مرہٹوں کی رہزنی سے بچایا تھا۔ نظام نے بھی باغیوں کے ساتھ کسی ہمدردی کا اظہار نہ کیا۔ اس کے آباؤ اجداد مغل اقتدار کے زوال کے باعث ہی ایک ریاست قائم کرنے کے قابل ہوئے تھے۔ اس لیے وہ اس اقتدار کی بحالی کا خواباں نہ تھا۔ ۱۸۶۰ء کیننگ نے ہندوستانی ریاستوں کو خراج تحسین ادا کیا جس کی وہ مستحق تھیں۔ اس نے

پشاور اور چھاؤنی کی منڈیوں کے دروازے بند کر دیے جائیں ۲۰۲ کے طنزاً بیان کرتا ہے کہ ”اگر چہ گنوار مسلمان حضرت محمد سے بہت عقیدت رکھتے تھے لیکن دولت کے ساتھ انھیں زیادہ محبت تھی۔ ہر شخص جس کے پاس کوئی توڑے دار بندوق یا تلوار اور گھوڑا پیش کرنے کو تھا وہ اپنے نذرانے کے ساتھ پشاور میں برطانوی افسروں کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ۲۰۳“

پنجابیوں کے مبہم رویے کا سمجھنا دشوار نہیں۔ پنجاب کی فتح کو اتنی تھوڑی مدت ہوئی تھی کہ پنجابیوں کو نہ تو ان مصائب کو بھولنے کا وقت ملا جس سے اس فتح نے انھیں نجات دلائی تھی اور نہ ہی ان مصیبتوں کو جھیلنے کی نوبت آئی جو دوسرے صوبوں میں برطانوی سرکار کے ساتھ نازل ہوئیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی موت کے بعد بدامنی کے دور میں ٹیکسوں اور محصولوں کا جو بوجھ حد درجہ بڑھ گیا تھا وہ نئی حکومت کے تحت ہلکا ہو گیا تھا۔ راجہ کی قریب قریب قلع قمع ہو گیا تھا ۲۰۴ لگان کی فوری اور منصفانہ تشخیص سے رعایا کی خوشحالی میں اضافہ ہوا اور وہ قناعت پسند ہو گئی ۲۰۵۔ نئے حکمرانوں نے لگان آراضی کی تشخیص بہت کم کی اور زمین پر قابض کاشتکاروں کے لیے ”بجائز“ وافر آمدنی کی گنجائش چھوڑ دی ۲۰۶۔ چوں کہ پنجاب سرحد کے قریب تھا اس لیے انھوں نے یہاں حقوق ملکیت آراضی میں کوئی مداخلت نہ کی۔ نئی سرحدوں، نہروں اور پلوں کی تعمیر اور جنگیوں اور چرائیگوں کی حفاظت کا کام زور شور سے شروع کر دیا گیا ۲۰۷ قصہ کوتاہ، سالوں کی بے چینی اور لاقانونی کے بعد پنجابی ایک مستحکم حکومت کی برکتوں سے آشنا ہوئے ۲۰۸۔

پنجاب کو یکے بعد دیگرے ایسی کھربوں فصلیں نصیب ہوئیں کہ سالوں دیکھنے میں ذاتی تھیں ۲۰۹ کو پھر اپنی تصنیف *THE CRISIS IN THE PUNJAB* (پنجاب میں بحران) میں لکھتا ہے: ملک اتنا فارغ البال اور خوشحال تھا کہ محض دوستی کی خاطر کسی شورش میں شریک نہ ہو سکتا تھا ۲۱۰ اور نہ غیر یقینی مستقبل کا خطرہ مول لے سکتا تھا ۲۱۱۔

اس کے علاوہ بقول سرسید احمد خاں اس کے کچھ دوسرے ”معقول اسباب“ ۲۱۲ بھی تھے۔ ایک تو مفاسد جو سارے ہندوستان میں ڈیرہ ڈالے ہوئے تھے، ابھی اسے پنجاب میں پہنچنے اور اثر ڈالنے کا وقت نہیں ملا تھا ۲۱۳۔ دوسرے ایک طاقتور یورپی فوج موقع پر موجود تھی۔ تیسرے افسروں نے سپاہیوں کو فوراً ہتھاکر نے میں دانشمندی کا ثبوت دیا۔ چوتھے الحاق کے بعد تمام پنجاب کو بے ہتھیار کر دیا گیا تھا۔ پانچویں پنجابیوں اور چٹھانوں نے پہلے ہی ملازمت اختیار کر لی تھی اور کوئی بے کار لوگ نہیں تھے جنہیں کوئی فتنہ سوجھتا۔ چھٹے، ہندوستان یعنی دہلی، بکسر،

کے نوین گرو، تیغ بہادر کی چاندنی چوک دہلی میں شہرت اور دوبار قتل عام کی یاد ابھی تازہ تھی۔ جان لانس نے ان کے جذبات کا صحیح جائزہ لیا اور یہ افواہ پھیلادی کہ بادشاہ دہلی اس شخص کو انعام و اکرام سے نوازے گا جو کسی سکھ کو ہلاک کرے گا اور ثبوت کے لیے اس کا سر لائے گا۔ ۱۹۶

یہ کہنا صحیح نہ ہو گا کہ اہل پنجاب میں سے ہرن سکھوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ بغاوت کے دوران پنجابیوں نے مجموعی طور پر ان کی امداد کی۔ تینوں فرقوں — سکھ، ہندو، اور مسلم — کے دیہاتیوں نے مختلف مقامات پر باغیوں کو گرفتار کرنے میں برطانوی حکام کی مدد کی۔ ۱۹۷ لگان آراضی ایک ایک پائی تک باقاعدہ ادا کیا جاتا تھا۔ ۱۹۸ ہو مرنے لکھا ہے کہ "محصول آب کاری کی آمدنی یقیناً بڑھ گئی اور سرکاری اسکولوں کی حاضری میں چنداں کمی واقع نہ ہوئی۔" ۱۹۹ پارسی کیو براؤن لکھتا ہے: "پنجاب کے کچھ ضلعوں میں لگان آراضی اور دوسرے محصولات کی ادائیگی بلاشبہ ان کے واجب الادا ہونے کی تاریخ سے پہلے ہی کر دی جاتی۔ یہ حقیقت اس حوصلہ افزا یقین کی دلیل تھی کہ عوام واقعی چاہتے ہیں کہ انگریزی راج جاری رہے۔ وہ آقا کی تبدیلی کے خواہاں نہ تھے خاص طور پر اس لیے کہ عبوری دور میں لاقانونیت کا خطہ تھا۔" ۲۰۰

پشاور میں سرکار نے تاجروں سے بڑے بڑے قرض لیے۔ اس طرح تاجروں کے مفاد خصوصی کمپنی کی حکومت کی بقا کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ "جہاں پہلے وہ بغاوت کے صرف تماشائی تھے اب اپنی غرض سے قانون کے حامی ہو گئے۔" ۲۰۱

پنجاب کے مسلمان بھی باغیوں کی طرف داری سے ڈرتے تھے۔ انگریزوں نے انھیں سکھوں کے جوہر سے بچایا تھا۔ اگر انگریز ہندوستان کے دوسرے حصوں میں مسلمانوں کی تباہی اور پستی کا موجب تھے تو پنجاب میں وہ ان کے نجات دلانے والے تھے۔ ۲۰۲

فریڈرک کوپر کا بیان ہے کہ سواتیوں، پشوریوں اور کابلیوں پر اچھا اثر ڈالنے میں کئی ایک اسباب کار فرما تھے۔ وادی کی تشخیص مالیہ اتنی ہلکی ہے کہ ان کے علم میں پہلے کبھی نہ ہوتی تھی۔ درانی لوگوں کا کچھ مرزا لیتے ہیں۔ کابل میں آج تک ان کا وسیعہ یہی ہے۔ وادی سے سکھ بارہ لاکھ روپیہ سالانہ بطور ٹیکس اور اتنا ہی اور لوٹ کھسوٹ کے ذریعے وصول کرتے تھے۔ برطانوی سرکار صرف چھ لاکھ پر قناعت کرتی ہے جس سے لوگ خوش ہیں اور اتنا ہی ہر ماہ ان پر خرچ کر دیتی ہے۔ کثیر مصارف اور فوجیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کی وجہ سے پہاڑی میوے، لکڑی اور غلے کی ایک منڈی قائم ہو گئی ہے۔ یہاں تک کہ کسی سرکش قبیلہ کے لیے سب سے کڑی سزا یہ ہے کہ ان پر

کو سبزی گئی ۲۲۲ مجلس کا کام حکومت کا انتظام کرنا، امن و امان قائم رکھنا، تحصیلوں سے دکان
 اراضی وصول کرنا، دہا جنوں سے قرضے لینا، سلطنت کی حفاظت کرنا اور جنگ کا اہتمام کرنا تھا۔ ۲۲۳
 شہنشاہ نے مجلس سے یہ وعدہ کیا کہ "مجلس سے متعلق کسی بھی جماعت کی یادداشت پر غور نہیں کیا
 جائے گا اور ان تمام احکام میں جو تمہاری مجلس سے صادر ہوں گے حکومت کا کوئی اہل نام یا شہر زادہ
 کسی طور مداخلت نہ کرے گا۔" ۲۲۵

مجلس انتظار میں رہی۔ لیکن پیشتر ہونی چھ فوج سے اور چار دیوانی محکموں سے ۲۲۶
 فوج کی نمائندگی کو تینوں شعبوں یعنی چارہ، سالار اور توپ خانہ میں یکساں تقسیم کیا گیا۔ ۲۲۷ لیکن اس کا
 انتخاب کثرت رائے سے ان سمجھدار، دانش مند، قابل اور تجربہ کار آدمیوں میں سے کیا جوا جو بعض
 میں وفادارانہ خدمت انجام دے کر ندامت پائی ہوگی۔ ۲۲۸ اس حقیقت کے پیش نظر کہ صرف چند آدمی کی
 سابقہ خدمات کا دعویٰ کر سکتے تھے، آخری شرط بالکل قابل فہم نہیں ہے۔ "توق کے ساتھ تو کچھ نہیں
 کیا جاسکتا لیکن فائدہ ایسی وجہ سے اس شرط کو لائی تو رائے قابل دیکھا گیا اور یہ جلسہ طور سے اس کی
 گنجائش کچھ بھی کہ نہایت قابل اور سمجھدار شخص کے لیے بشرط ضروری نہیں تھی۔ ۲۲۹ مجلس کے کچھ آدمی
 الگ الگ ایک طرح اپنے اپنے محکموں کی طرف سے چنے جاتے تھے۔ ۲۳۰

مجلس کے میں الگ الگ میں سے ایک کو بطور صدر مقرر اور دوسرے کو نائب صدر مقرر
 کثرت رائے سے چھنا تھا۔ مجلس کے صدر کو دو رائے دینے کا اختیار تھا۔ مجلس کا سرکن اس محکمے
 کا مقیم اعلیٰ ہوتا تھا جس کی طرف سے وہ منتخب کیا جاتا تھا۔ ۲۳۱ اس کی مدد کے لیے مجلس کے چار الگ
 پر مشتمل ایک کمیٹی تھی۔ سرکاری انتظامات
 میں کثرت رائے سے منظور ہوئی تصدیق کے لیے کرن متعلق کی وساطت سے مجلس میں پیش کی
 جاتی تھی۔ ۲۳۲ جن محکموں کے نمائندے مجلس میں صدر اور نائب صدر چنے جاتے تھے ان محکموں کا
 مقیم کون تھا؟ اس کی وضاحت نہیں کی گئی۔ یہاں لیا انھیں صدر اور نائب صدر کے علاوہ اپنے
 اپنے محکمے کے کچھ نمائندوں کو فراہم بھی کیا گیا۔ دینے سے یہ چار محکمے تبدیل نہ کھاتے تھے، "ایسا معلوم ہوتا
 ہے کہ ان کی سرکار ایک قسم کی آئین فوجی حکومت تھی۔ بادشاہ یا شاہ تھا اور اس حیثیت سے ایک
 آئینی ادارہ تھا کہ اس کی طرف سے کسی کی جاتی تھی لیکن پارلیمنٹ کی بجائے اس کی ایک فوجیوں کی
 کو کسٹ تھی جو فوجیوں کا تھا اور جس کو کسٹ دے دینے کی کارندہ تھا۔ کوئی عرب یا فارسی امام یا مجسمہ
 و نام، اصطلاحات رائے کی کہیں بلکہ اس کے برعکس انگریزی اصطلاحات اور دستور بعض اختیار کیے

اور آگرہ وغیرہ میں لوٹ مار کی دھم ان کے سر پر موار تھی۔ میر جان ولیم کے لکھتا ہے: "پیس زیادہ خطرناک طبقہ کی اگر ضمانتیں نہیں تو اطاعت ضرور حاصل تھی" ۲۱۵

البتہ بغاوت کے اولین ایام میں انگریزوں کے تین پنجاب کی حمایت بے عملی کی تھی۔ سر چارلس ایچسٹن اپنی تصنیف: *LIFE OF LORD LAWRENCE* (لارڈ لارنس کی سوانح حیات) میں لکھتا ہے کہ وہ بھرتی تو ہوئے مگر زیادہ تعداد میں نہیں۔ وہ پیچھے پیچھے رہے یہاں تک کہ دہلی فتح ہو گئی۔ اس کے بعد تو رنک و کڑ سہزاروں کی تعداد میں آ گئے۔ ۲۱۶

۵۔ سیاسی تنظیم

باغیوں کی ابتدائی کامیابی کے فوراً بعد انگریزوں کے خلاف مستحکم اور متحدہ محاذ میں کمزوری اور انتشار پیدا ہو گیا۔ غیر ملکی حکومت سے نفرت نے باغیوں کو متحد کر دیا لیکن آزاد ہندوستان کے مختلف تصورات سے ان میں پھوٹ پڑ گئی۔ مغلوں اور مرہٹوں کے درمیان جاگیردار رقابت پیدا ہو گئی۔ یہی وجہ تھی کہ آخری پیشوا کے بیٹے نے نانا صاحب نے دہلی جانے سے انکار کر دیا۔ اسے اس بات کا خدشہ تھا کہ "مغل دربار میں وہ کسی گنتی میں نہ ہوگا" اور والیان ریاست کے انجمن میں اس کا شخصی اقتدار اور اثر و رسوخ مٹ جائے گا ۲۱۸

جن جاگیرداروں نے "زمینداروں میں عنایت" ۲۱۹ دوبارہ حاصل کرنے کی غرض سے بغاوت کو متعل کیا یا اس پر ضمانت دے کر ان کا اظہار کیا یا بعد میں شامل ہو گئے انہیں یہ دیکھ کر بڑا صدمہ پہنچا کہ تحریک آہستہ آہستہ ان کے اختیار سے نکل رہی ہے۔ ایک معاصر صحافی نے ۱۸۵۷ء کے *CALCUTTA REVIEW* (کلکتہ ریویو) میں لکھا کہ "بہت سے راجہ دانشمندی سے بھانپ گئے کہ غلاموں کی جنگ یعنی ادنیٰ طبقات کی اعلیٰ طبقات کے خلاف بغاوت سے ان کا مقصد حاصل نہ ہوگا۔ ۲۲۰ ملک کی سیاسی اور معاشی تعمیر نو کے لیے جو منصوبے باغیوں نے باندھے ان سے ظاہر ہے کہ راجاؤں کا جائزہ صحیح تھا۔

۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ کے شہنشاہ ہند ہونے کا اعلان کر دیا گیا تھا لیکن درحقیقت جولائی کے پہلے ہفتے میں ہی اس کی حیثیت برائے نام رہ گئی۔ جبریل بخت خان کے بیٹے کے بعد دہلی کے باغیوں نے ایک پروانہ جاری کیا جس میں نئی حکومت کی ترکیب کا خاکہ دیا گیا تھا۔ بہادر شاہ کے ہندوستان کے شہنشاہ ہونے کا دوبارہ رسمی طور پر اعلان کیا گیا لیکن اصلی قوت غالب مجلس انتظامیہ

مجلس دو قسم کے اجلاس منعقد کرتی تھی ۲۲۲ عام اجلاس ہر روز پانچ گھنٹے کے لیے لال قلعہ میں منعقد کیا جاتا۔ خاص اجلاس کوئی ضروری معاملہ انجام دینے کے لیے دن یا رات کو کسی بھی دن منعقد کیا جاتا۔ ۲۲۳ باغی اتفاق رائے اور سرعت عمل کی ضرورت کو ضرور سمجھتے ہوں گے۔ کیوں کہ انھوں نے بیکار تجاویز پیش کرنے پر پابندی عائد کرنے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ کسی تجویز میں ترمیم پیش نہ کی جاسکتی تھی جب تک دس اراکین میں سے چار اس کی تائید نہ کریں۔ شدید ضرورت کے پیش نظر تین تقریریں ہو چکنے کے بعد مجلس مزید تقریروں کی ممانعت کر سکتی تھی ۲۲۴ تمام معاملات میں اتفاق رائے ضروری تھا۔ اگر کوئی فیصلہ کسی رکن کی غیر حاضری میں کیا جاتا تو اس کا اطلاق اس کے محکمے پر بھی ہوتا تھا۔ ۲۲۵ جس کا مطلب یہ ہے کہ ذمہ داری مشترک تھی۔

راز داری قائم رکھنے کے لیے پروانے ۲۲۶ میں یہ تاکید ہوتی تھی کہ مجلس کے اجلاس خفیہ ہوں گے۔ اگر کوئی رکن کھلم کھلا یا اشارتاً کارروائی کو فاش کرتا تو اسے مجلس سے اخراج کا سزاوار سمجھا جاتا۔ حکومت سے کسی قسم کے دغا کرنے یا کسی شخص یا اشخاص کی جماعت کے ساتھ رورعایت کرنے کی بھی یہی سزا مقرر تھی۔ ۲۲۷

باغیوں نے جو دستور العمل وضع کیا تھا وہ نہ تو جامع تھا اور نہ ہی جدید حکومت کے اصولوں کے مطابق۔ دستور العمل کی ترتیب تو درکنار، باغیوں کو جمہوری حکومت کا کوئی تجربہ ہی نہیں تھا۔ تاہم بظاہر کارروائی کی بنیاد پنچایتی طریقے پر تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ مجلس خاص طور پر ان کے اپنے طبقے کے جمہوریہ کی تسکین کے غام کی گئی تھی۔ اس طبقے کی سماجی سیاسی تنظیم ہمیشہ روایتی پنچایت تھی۔ اپنی سم کا ۱۰۔ سیاب پروانہ ۲۲۸ مورخہ ۸ اگست ۱۸۵۷ء ان معاملات کی نوعیت کا پتہ دیتا ہے جو مجلس انجام دیتی تھی۔ یہ پروانہ مجلس کے اراکین کے لیے ایک قسم کا اطلاع نامہ تھا کہ وہ مجلس کے خاص اجلاس میں شریک ہوں۔ اس کے اجنڈے میں شہر دہلی کے مناسب انتظام کا معاملہ، رسد رسانی کا بہتر اہتمام، فوج کی زیادہ موثر نگہداشت، ڈاک کے بہتر تقسیم اور ہاجنوں سے قرضے لینے کے معاملات شامل تھے۔ فوج میں ضبط اور قانون کی پابندی، بدمنویاؤں کا انسداد، اختیار منصبی کا ناجائز استعمال اور جبرستانی سے متعلق بھی مجلس اکثر احکام اور گشتی چٹھیاں جاری کرتی تھی۔ ۲۲۹

نہ صرف مجلس کے اختیارات کی نوعیت اور حدود وسیع اور جامع تھیں بلکہ مجلس اپنے اختیارات میں کسی قسم کے خارجی اثرات کی ممانعت بھی گوارا کرنے پر آمادہ تھی۔ مثلاً فوجی معاملات

گئے۔ بظاہر تمام درخواستیں بادشاہ کو پیش کر کی جاتی تھیں لیکن تمام معاملات سے متعلق ان عہدوں کو (عرائض پر صادر کیے گئے حکم کے مطابق) مجلس کے سپرد کیا جاتا جو مختار کل تھی۔ یہ ایک جماعت تھی جو چند کربنیوں، ایک برگیدہ، مجراور ایک سکریٹری پر مشتمل تھی۔ یہ تمام کرنیل وغیرہ ایسے سپاہی تھے جنہوں نے امتیاز حاصل کیا تھا۔ ۲۳۵

شہنشاہ بہادر شاہ کو مجلس کی نشست میں شرکت کا حق حاصل تھا۔ ۲۳۶ مجلس کا کوئی فیصلہ شہنشاہ کے دستخط کے بغیر سلطنت میں نافذ نہ ہو سکتا تھا۔ اگر شہنشاہ مجلس کی کوئی قرارداد منظور کر دیتا تو مجلس اس پر از مہر نو غور و خوض کرتی۔ ۲۳۷ علی طور پر البتہ مجلس اپنی مرضی کے مطابق ۲۳۸ فیصلے کرتی اور بادشاہ کو اس پر ہر تصدیق ثبت کرنے پر مجبور کرتی۔ جو فوجی کمیشن بہادر شاہ کے مقدمہ کی سماعت کے لیے ۱۷۵۵ء میں خاص طور پر مقرر کیا گیا اس کے سامنے صفائی کا بیان دیتے ہوئے بادشاہ نے کہا: ”باغی فوجیوں نے ایک مجلس قائم کر رکھی تھی جس میں تمام معاملات پر غور و خوض ہوتا تھا اور فیصلے کیے جاتے تھے لیکن میں نے کبھی ان کے اجلاس میں شرکت نہیں کی۔ جہاں تک ان احکام کا تعلق ہے جو میری مہر اور میرے دستخط کے تحت صادر ہوتے تھے، حقیقت یہ ہے کہ جس دن سے باغی فوجی وارد ہوئے اور یورپی افسروں کو ہلاک کر دیا اور مجھے قیدی بنا لیا، اس کے بعد میری حیثیت یہی رہی۔ جو کاغذات وہ مناسب خیال کرتے تیار کر لیتے، میرے پاس لاتے اور ان پر ہر ثبت کرنے کے لیے مجھے مجبور کرتے۔ بعض اوقات وہ احکام کا نام تمام مسودہ لاتے اور میرے سکریٹری سے ان کی نقول تیار کروا لیتے۔ کبھی اصلی خطوط بھیجنے کے لیے لاتے اور ان کی نقول میرے دفتر میں چھوڑ جاتے اس لیے بہت سے مختلف ہاتھوں کے لکھے ہوئے مسودے مسل مقدمہ میں شامل کر دیے گئے ہیں۔ بسا اوقات وہ کورے لغافوں پر میری ہر لکھا لیتے۔ نہ تو مجھے خطوط کے مضامین کا علم ہوتا اور نہ ہی یہ کہ وہ خطوط کس کس کو بھیجے جا رہے ہیں۔ چونکہ میری زندگی خطرے میں تھی اس لیے میں اس معاملے میں کچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔ انہوں نے میرے ملازموں اور بیگم زینت محل پر یہ الزام لگایا کہ وہ انگریزوں کے ساتھ سازش میں شریک ہیں۔ انہوں نے ملازموں کو قتل کرنے کی بھی دھمکی دی اور مجھ سے تقاضہ کیا کہ بیگم کو بطور یرغمال ان کے حوالے کر دوں۔ ۲۳۹ ایک موقع پر بہادر شاہ اتنے بیزار اور بے بس ہو گئے کہ انہوں نے شہنشاہیت کے لقب کو ترک کرنے کا ارادہ کیا جو انکار و آلام سے سمورے تاکہ وہ باقی ایام عبادت میں بسر کر سکیں۔ ۲۴۰ ایک بار اس نے میرا نکل کر خود کشی کرنے کی دھمکی دی۔ ۲۴۱

گفت و شنید کرنے کی کوشش کی ۲۵۴

مجلس انتظامیہ اعلیٰ عدالت بھی تھی۔ یہ عدالتیں قائم کرتی، ججوں کا تقرر عمل میں لاتی اور دیوانی اور فوجداری مقدمات کے لیے عدالتی ضابطے وضع کرتی۔ پولیس افسروں اور دیوانی ملازموں کی تقرری بھی مجلس ہی کرتی۔ یہ ملازم مجلس کے سامنے جوابدہ ہوتے تھے اور مجلس ان کو موقوف بھی کر سکتی تھی ۲۵۵ اس نے رشوت خوری اور بددیانتی ختم کرنے کی کوشش کی اور اس نے یہ کام بڑی سختی کے ساتھ انجام دیا۔ عوام اختیارات کے ناجائز استعمال اور جبر و ستم کے تمام واقعات کے خلاف مجلس سے دادخواہی کر سکتے تھے ۲۵۶

مالیات کے معاملے میں بھی مجلس مختار کل تھی۔ افسرانِ مال کو بھی صرف مجلس ہی متعین اور موقوف کر سکتی تھی ۲۵۷ لگان آراضی، دوسرے ٹیکس اور محصول وصول کرنے کا اختیار بھی اسے حاصل تھا ۲۵۸ مجلس کے سوا کسی کو قرض لینے کا اختیار نہیں تھا۔ افسروں کو اگر کہیں سے رقم فراہم کرنے کا کوئی پروانہ ملے تو اسے فوراً مجلس کے پاس بھیج دیں۔ ان کو یہ بھی ہدایت کی گئی تھی کہ مجلس کے حکم کے بغیر کسی اس شخص کو گرفتار نہ کریں جو قرض دینے سے انکار کرے ۲۵۹ ایک بار جب مرزا سلطان خضر نے اپنے طوطہ پر روپیہ حاصل کرنے کی کوشش کی تو مجلس نے سختی کے ساتھ احتجاج کیا اور شہنشاہ سے کہا کہ وہ شہزادوں کو اس سے باز رکھنے کی تنبیہ کریں ۲۶۰ شہنشاہ نے مرزا مغل کی اس تجویز کو منظور کرنے سے انکار کر دیا کہ مجلس کے ایجنٹوں کی بجائے شاہی خاندان کے افسروں کو روپیہ وصول کرنا چاہیے۔ حالانکہ مرزا مغل نے یہ دلیل بھی پیش کی کہ اس سے زیادہ روپیہ وصول کرنے میں مدد ملے گی ۲۶۱ شہنشاہ نے مرزا کو یاد دلایا کہ مجلس ہی اس معاملے میں مختار کل ہے ۲۶۲ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قرض حاصل کرنے کے معاملے میں مجلس بری طرح ناکام ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ جامداد طبقے باغیوں کے قرض مانگنے اور جاگیر داری کو ختم کرنے کی بدعت سے بہت خوفزدہ تھے ۲۶۳ کسان فوجی اپنی طبقاتی خصوصیت کے سبب زمین کو قومی ملکیت قرار دینے کے تصور کو گوارا نہ کر سکتے تھے۔ بہا جنوں نے سوائے مجبوری کی حالت کے روپیہ دینے سے انکار کر دیا۔ تھوک فروشوں اور خوردہ فروشوں نے بھی نئی حکومت کو اپنا مال ادھار دینے سے انکار کر دیا کیونکہ انہیں حکومت کے دیوالیہ اور ناپائیدار ہونے کا یقین تھا۔ یہ لوگ کسی قدر حق بجانب بھی تھے کیوں کہ مجلس شہر میں امن امان بحال کرنے میں ناکام ہو چکی تھی ۲۶۵ ذخیرہ اندوزی، نفع خوری اور سیاہ بازاری نے لوگوں کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ یہ بھیجے کہ مجلس نے

میں رہشہنشاہ کو کوئی رنڈر دخل حاصل تھا اور رہشہنشاہوں کو شہنشاہ نے ایک خط مودعہ ۲۸ جون
 خصلہ میں اپنے بیٹے مرزا فضل سے شکایت کی ۲۵ پہلے کچھ فوجیوں نے حیات بخش اور متباب
 بانگات میں پورہ ڈال لیا تھا۔ ان کے قیام کے دوران ان بانگات کو نقصان پہنچا۔ ہمارے حکم کی تعمیل
 میں وہ فوجی رخصت ہوئے لیکن اب بھر گپ بھگ رو رہے فوجی وہاں قیام پزیر ہیں۔ اس لیے
 جس تعینات ہلاکت کرتا ہوں کہ مجلس کے اراکین سے بات چیت کر کے ان کو وہاں سے نکلواؤ ایک
 اور موقع پر بہادر شاہ نے اس بات پر تہمت کا اظہار کیا کہ فوجی انفریمری کے سوس ہو کر اور
 اکو لپ شہابی کی پروہان کرتے ہوئے دربار میں آ رہے تھے۔ وہ گھوڑوں کو گھر میں روڑا تے ایسے قتل
 میں داخل ہو جاتے ہیں جہاں رہنا اور شاہ بہادر شاہ اور مرزا کوئی برطانوی گورنر جنرل گھوڑے پر
 سوار ہو کر کبھی وارد ہوا تھا۔ کیا فوج ملک کی بہبود کی خاطر ہاں ہے؟ اللہ اعلم آخری نکلانہ پیدار نے
 یہ کلمات بلوچی کے علم میں پہلے کر گئے۔

شہزادوں کی حالت اس سے کچھ بدتر تھی۔ ان کا سلطان کوئی اثر و رسوخ نہ تھا اور حقیقت
 خود مرزا لوگ ستارچ فوج کے ہاتھوں ان کی اسپیرس قیدم آج ہر ذراک میں مل رہی تھیں۔ مرزا فضل نے
 جو وہاں پہلے سلطنت اور جنرل بخت نال کی آمد تک باہمی فوج کا سرسلا لا انظر تھا اور جنرل نے
 کے کوئی بہادر نہ دیکھا۔ بہادر شاہ سلطنت اس حقیقت سے انکادیں کہ بخت نال کی آمد سے
 پہلے جنگ کے عملی اقدامات ہر روز اور ہلاک ہو کر انجام دے جاتے تھے۔ آج جب میں دشمن
 پر حملہ کرنے کے لیے اپنے فوجی دستوں کے ساتھ شہر سے باہر گیا تو وہ مراحم ہوا اور سرسری فوج کو
 اپنے حرکت لکھوا کیے رکھا۔ وہ وہاں جا رہا تھا کہ یغیا بکا حکم کس نے دیا۔ پھر اس نے نیکو یہ کہار
 کی اجازت کے بغیر فوج آگے نہ بڑھے۔ بالآخر اس نے یہیں بونے پر رنڈو کر دیا۔ ۲۵

جو کہ مجلس مرزا فضل اور جنرل بخت نال کے درمیان یہاں ہوا اور ان کے جوابوں تک
 پہنچ گئی مجلس ذاتی منہموت رہ گئی۔ وہ حقیقت اب شہزادوں کو پورہ فوج میں سلطان
 جو وہاں رہتا تھا اور وہاں پہلے سلطنت اور انکادیں کے کہانیاں ہیں جن میں
 اس کی بہترین مثال پزیر ہو کر اور وہاں رہنے کے لیے تھیں۔ سلطان کے کہانیاں
 یہ کہ کوئی تعجب نہ رہے کہ وہاں رہنے کے لیے وہاں رہنے کے لیے وہاں رہنے کے لیے
 اور اس لیے وہاں کے دورانیہ ان کے کہانیاں رہنے کے لیے وہاں رہنے کے لیے
 رہشہنشاہوں کو کوئی دخل نہ تھا کہ جس سے انکا اور انھوں نے انکا وہاں رہنے کے لیے

خطات سے پڑتے ۲۳ باغی فوجی اپنے کمانڈروں کی پروا نہ کرتے اور اپنی من مانی کرتے تھے ۲۴

۶۔ طبقات کارول

اعلیٰ طبقات کے لوگ فوجیوں میں جمہوری سپرٹ کی ترقی سے دہشت زدہ تھے۔ بغاوت کے نتائج پر انھیں شک ہونے لگا اور بغاوت کا پہلا ریلوے ختم ہونے کے بعد ان کا جوش جاتا رہا۔ بغاوت کے دوران اعلیٰ طبقات بالخصوص تعلقداروں، زمینداروں اور ساہوکاروں کے بدلتے رویے سے یہ چیز ظاہر ہے۔ بغاوت کے پہلے دور میں (جو لگ بھگ جولائی ۱۸۵۷ء کی پہلی تاریخ کو ختم ہوا یعنی جس دن دہلی میں مجلس انتظامیہ قائم کی گئی) تمام تعلقدار اپنے نوکروں کو لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کی مدد سے انھوں نے ان لوگوں کو جبراً بے دخل کر دیا جنھیں ان کی جائیدادیں بخش دی گئی تھیں ۲۵ ہنری سینٹ جارج بتھرنے گورنر جنرل کے نام ایک خط میں صورت حال کو یوں بیان کیا: ”تمام زمیندار اور نیلام شدہ زمینوں کے خریدار شل ہو چکے ہیں اور جائیدادوں سے محروم کر دیے گئے ہیں ان کے ایجنٹوں کو اکثر قتل کر دیا جاتا ہے اور ان کی جائیدادوں کو تباہ کر دیا جاتا ہے“ ۲۶

لیکن برطانوی حکومت کے ختم ہونے کے ساتھ آزادی کے تصور کی شکل ظاہر ہونا شروع ہوئی۔ سپاہیوں اور عوام نے بھی زمینوں پر قبضہ کرنا، شہروں کو لوٹنا اور سرکاری دستاویزات اور ملکیت کی دستاویزیں تباہ کرنا شروع کر دیں ۲۷ ایسے ہی ایک موقع پر بہار کے باغیوں کے راہنما کنور سنگھ نے جو خود ایک بڑا زمیندار تھا، اپنے پیروؤں کو ان بدعنوانیوں سے باز رکھنے کے لیے یہ دلیل دی کہ ”ملک سے انگریزوں کے نکالے جانے کے بعد لوگوں کے حقوق کا کوئی ثبوت نہ رہے گا اور واجب الادا رقموں کی مقدار معلوم کرنے کے لیے کوئی دستاویزی شہادت نہ ملے گی“ ۲۸

بہر حال مسلح عوام اکثر اپنے اپنے علاقوں کے آقا بنے ہوئے تھے اور جب چاہتے امیروں کی دولت چھین لیتے ۲۹ مارک تھارن ہل لکھتا ہے کہ ”ہر دکان نہ صرف لوٹ لی جاتی بلکہ تباہ بھی کر دی جاتی۔ دروازے اکھیر دیے جاتے، برآمدوں کو مسمار کر دیا جاتا، فرش کھود دیے جاتے اور دیواروں میں بڑے بڑے شگاف پیدا کر دیے جاتے۔ جو کچھ اٹھا لے جانے کے قابل تھا دیہات میں پہنچ گیا، باقی گلیوں میں بکھرا پڑا رہا۔ نرٹکیں، فرش اور برآمدوں کے طے کے علاوہ کچھ ہوتے ہی کھاتوں، ٹوٹی بوتلوں اور مرتبانوں اور صندوقوں کے ٹکڑوں سے اٹی پڑی تھیں ۳۰“ وہ تمام لوگ جنھیں نقصان اٹھانا پڑا سپاہیوں کو کستے تھے ۳۱ بقول سر سید

معاشرتی تباہی سے بچانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ اس نے قیمتوں کو مقرر کرنے اور ان پر قابو پانے کی کوشش کی۔ ۱۶۶۱ء لیکن راشن سسٹم، اشیائے خورد و نوش کی یقینی رسد اور پائیدار نظم و نسق کے نہ ہونے کی وجہ سے قیمتوں پر قابو پانے میں کامیابی نہ ہوئی اور نہ ہو سکتی تھی۔

ضرورت نے مجلس کو بھاری اور من مائے ٹیکس لگانے پر مجبور کر دیا لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ میکسل کا بوجھ ان طبقات پر پڑا جو ادا کر سکتے تھے۔ ۱۶۶۱ء ٹیکس کے اقدامات کا عام آدمی پر کوئی اثر نہ پڑا بلکہ مجلس نے اُسے امداد دینے کی کوشش کی۔ اس نے زمینداری نظام کو ختم کرنے اور اصلی کاشتکار کو حق ملکیت دینے کے احکام صادر کیے۔ ۱۶۶۵ء مجلس کے ان احکام سے ظاہر ہے کہ اس نے تشفی پسندانہ طریقے میں مکمل اصلاح کا ارادہ کیا تھا لیکن اس کی حکومت تھوڑی دیر رہی اور یہ کام پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

ایسی ہی مجلس انتظامیہ لکھنؤ میں بھی قائم کی گئی تھی۔ دہلی کی طرح لکھنؤ کے باغیوں نے بھی اودھ کے سابق بادشاہ کے حقیقی بیٹے برجیس قدر کو تاج پہنایا۔ اس کے تحت نشین ہونے اور نواب وزیر اودھ بننے کے بعد۔ کیوں کہ اس کی حکومت شہنشاہ دہلی کے تحت تھی۔ اختیارات کی باگ ڈور اس کی ماں اور ممتوں خاں کے ہاتھ میں تھی اور یہ دونوں فوجیوں کے رحم و کرم پر تھے انہیں کی وجہ سے یہ برسرِ اقتدار تھے۔ ۱۶۶۹ء

درحقیقت اصلی طاقت ایک وزیر اور مجلس انتظامیہ کے ہاتھ میں تھی۔ ۱۶۷۰ء مجلس بادشاہ کے مقتدر خدام، اس علاقے کے راجاؤں اور بڑے زمینداروں اور فوج کے خود ساختہ اعلیٰ عہدیداروں پر مشتمل تھی۔ مجلس اس بات پر غور و خوض کرتی تھی کہ انگریزوں کے خلاف کس طرح اقدامات کیے جائیں۔ اس کا اپنا سپہ سالار اعظم تھا۔ پہلے سابق بادشاہ کا سالار شمرمت الدولہ سپہ سالار اعظم کے عہدے پر فائز تھا۔ مجلس نے مختلف ڈیویژنوں کے جنرل بریگیڈیر اور کرنل مقرر کیے تھے بظاہر یہ ایک ایسی فوج تھی جس کی اچھی طرح تنظیم کی گئی تھی۔ ۱۶۷۱ء درحقیقت سپاہی خود اپنے افسروں کا اور افسر اپنے کمانڈوں کا بادشاہ کے نام پر انتخاب کرتے تھے۔ اور اگر جیسا کہ اکثر ہوتا تھا، وہ بہادر سپاہیوں کو ناراض کر بیٹھتے تو بحث و مباحثہ کے لیے سپاہی فوراً ایک جلسہ منعقد کرتے اس جلسے کے اختتام پر انہیں عام طور پر عہدے سے معزول یا قتل کر دیا جاتا تھا۔ ۱۶۷۲ء غرضیکہ نئے عہدیداروں کے ساتھ عزت کا سلوک نہیں تھا اور افسروں کو سپاہیوں کی وہ تابعداری حاصل نہیں تھی جو ایک منضبط فوج کے افسر کو حاصل ہوتی ہے۔ چند اعلیٰ عہدوں کو چھوڑ کر باقی عہدے

وقت تک دہلی، لکھنؤ، کانپور، بنارس اور آلہ آباد میں باغیوں کو شکست ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ وہ اندرونی اختلافات اور اقتصادی بحران کی وجہ سے بھی کمزور ہو چکے تھے اس لیے تعلقہ داروں کے دلوں سے یہ خوف جاتا رہا کہ اگر وہ انگریزوں کے خلاف غاصب عوام کا دل و جان سے ساتھ دیں گے تو ان کا روایتی معاشی اور سماجی ڈھانچہ ٹوٹ جائے گا۔

اعلان کے خطرناک نتائج کو بھانپتے ہوئے سرکار ج کیپ بیل نے جو ایک ممتاز سیدو ملین تھے سرکار کو اس اعلان کی تعمیل نہ کرنے کا مشورہ دیا بلکہ اس کے برعکس اس نے اس بات پر زور دیا کہ "گذشتہ راضلۃ آئندہ راضلۃ" کے مصداق تعلقہ داروں کی دلجوئی کی جائے کیونکہ سرسہری لارنس کی نرم پالیسی سے متاثر ہو کر ان میں سے بعضوں نے لکھنؤ کی ریزیڈنسی کو ایشیائے خور و نوش بہم پہنچائی تھیں اور اودھ میں بغاوت پھوٹنے کے بعد انگریز بھگواروں کی مدد کی تھی۔ ۲۹۷ جنرل اورٹام نے گورنر جنرل سے کہا کہ وہ تعلقہ داروں کو "باعزت دشمن" سمجھیں اور انھیں زمین کی بحالی کا یقین دلایں۔ اس نے لارڈ کینگنگ کو تنبیہ کی کہ اگر تعلقہ داروں کو صرف جان بخشی اور قید سے آزادی کی پیشکش کی گئی تو وہ دیو سی کے عالم میں گویلا جنگ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے جس سے ہزاروں فرنگیوں کو جنگ، بیماری اور خطروں کا شکار ہونا پڑے گا لیکن اگر انھیں زمین کی بحالی کا یقین دلایا جائے تو وہ امن و امان کے کام میں اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر سرکار کی مدد کریں گے۔ ۲۹۸ صورت حال کافی نازک تھی اس لیے جاگیردار سرداروں کے دل جیتنے کے لیے لارڈ کینگنگ جنرل اورٹام کی تجویز کو قبول کرنے پر مائل ہو گئے۔ اس نے تعلقہ داروں کو مناسب سلوک کا یقین دلایا۔ اس کا فوراً خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ ۲۲ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو جب اودھ میں ابھی بغاوت زوروں پر تھی، بیگم اودھ کا وکیل برطانوی کمانڈر انچیف کے ڈیرے میں یہ پوچھنے گیا کہ صلح کی کیا شرائط ہو سکتی ہیں۔ تمام راجے اور تعلقہ دار جو ابھی بھاگے ہوئے تھے اسی قسم کے پیغامات کے ساتھ اپنے اپنے نمائندے پہلے ہی بھیج چکے تھے۔

اس لیے بغاوت کے بعد "صرف تعلقہ داروں کی جائیدادیں بحال ہوئیں بلکہ بہتوں کو حکومت کی طرف سے اتنے زیادہ حقوق حاصل ہو گئے جن کو انھوں نے خود بھی سوا بھی نہیں تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی وعدہ کیا گیا کہ ان حقوق کو برقرار رکھا جائے گا۔" ۳۰ بغاوت کے بعد الحاقی اودھ ۳۱ کے وقت رائج حق ملکیت کے مطابق زمین کا لگ بھگ دو تہائی حصہ بڑے زمینداروں کے قبضے میں چلا گیا۔ ۳۲ یہ بغاوت کے ساتھ غداری کرنے کا صلہ تھا جو تعلقہ داروں کو دیا گیا۔ کہاں تو ان کی جائیداد

باغی اکشر وہ لوگ تھے جو تلاش اور محکوم تھے، حکمران طبقے سے ان کا تعلق نہیں تھا۔ اس لیے اعلیٰ طبقوں کے لوگ بغاوت کی ناکامی سے زیادہ بغاوت کی کامیابی سے خوفزدہ تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اگر بغاوت کامیاب ہوئی تو ان کی تباہی کا زیادہ امکان تھا۔ "ان میں سے اکثر کافی سوچ بوجھ رکھتے تھے اور وہ بھانپ گئے کہ باغیوں کا ساتھ دینے سے ان کا مقصد حاصل نہ ہوگا۔" ۲۸۳ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے محاصرے کے دوسرے ہفتے کے بعد باغیوں کو اودھ کے تعلقداروں سے مزید کمک نہیں ملی۔ ۲۸۷

جب عام لوگ بغاوت کے لیڈر بن کر سامنے آئے تب، ۱ ستمبر ۱۸۵۷ء کو جنرل اوٹرام کو علم ہوا کہ نہایت طاقت ور اور اکثر متوسط درجے کے لوگوں میں اودھ کا ایک بڑا اور بارہ سوخ طبقہ رئیسوں اور زمینداروں کا ہے جو واقعی ہماری حکومت کے قیام کا خواہاں ہے۔ ۲۸۵ لکھنؤ جنرل میکلوڈ انس کو اس بات کا یقین تھا کہ "مندر میں ان میں سے بیشتر کی شرکت محض برائے نام تھی۔" بعضوں نے اپنی "سلیغ غیر جانبداری ۲۸۶ کو قائم رکھا جب کہ کئی دوسروں نے "باغیوں کے مطالبے پر کمک بھیج دی اور خود شریک نہیں ہوئے۔ ۲۸۸ پھر کچھ اور بھی تھے جنہوں نے برطانوی حکام کو باغیوں کی نقل و حرکت اور ان کی بارود گولے کی کمی سے آگاہ کیے رکھا۔ ۲۸۹ بعض تعلقداروں اور بنیوں نے برطانوی فوج کو ضروریات زندگی بھی بہم پہنچائیں۔ ۲۹۰ اور بھاگے ہوئے برطانوی سپاہیوں کو پناہ بھی دی۔ ۲۹۱ کے لکھتا ہے۔ "جب شورش عروج پر تھی بعض طاقتور راجاؤں نے یا تو انگریزوں کا ساتھ دیا یا مصلحتاً غیر جانبدار رہے کیوں کہ ان کا مفاد امن و امان کے قیام میں تھا۔" ۲۹۲ ہوتے ہوئے لکھتا ہے، "اگرچہ بارہ سوخ زمینداروں کے تمام طبقے میں سے بعضوں نے بلاشبہ ہماری علی غلغلہ کی لیکن ان کی ایک اچھی خاصی تعداد خاموش اور وفادار رہی اور چند ایک جو اندر دھ کے ساتھ میدان میں کود پڑے اور بغاوت کے سیلاب کو روکنے میں انہوں نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لیا۔ ۲۹۳ جنرل اوٹرام کو اس امر کی کوئی قطعی شہادت نہ مل سکی کہ کیننگ کے ۲۰ مارچ ۱۸۵۸ء کے اعلان کے اجراء سے پہلے کسی تعلق دار نے بذات خود باغیوں کی طرف سے معرکہ آرائی کی ہو۔ ۲۹۴

البتہ کیننگ کے اعلان کی اشاعت کے بعد اس کے بالکل برعکس "تعلق داروں کے گروہ کے گروہ باغی ہو گئے۔" ۱۹۵ اعلان کے مطابق صوبے کی تمام زمینیں ضبط کر لی گئی تھیں سوائے چھ خاص اشخاص کی زمینوں کے یا ان لوگوں کی زمینوں کے جو ثبوت کے ساتھ مہاراجا کی تسلی کر سکتے تھے کہ بغاوت کے دوران وہ وفادار رہے ہیں۔ ۲۹۶ بغاوت کے اس جزئی فیصلے کا ایک سارے گارہیلو یہ تھا کہ اس

۲۰ اگست کے دن شہر کے ساہوکاروں نے فیصلہ کیا کہ سپاہیوں کی مزید جبری وصولیوں کی مشترک طور پر مزاحمت کی جائے ۳۱۲ جب عدم ادائیگی ۳۱۵ کے سبب دکانداروں نے اشیائے خوردونوش بیچنے سے انکار کر دیا اور سپاہی فاقہ کشی پر مجبور ہو گئے تو انھوں نے اندھا دھند لوٹ مار شروع کر دی ۳۱۶ بلکہ سارے شہر کو تباہ و برباد کر کے کی دھکی دی۔ سپاہی بیسیوں ساہوکاروں، تاجروں سابق درباریوں اور شہزادوں کو ان سے روپیہ ایشٹھنے کی روزانہ کوشش میں دھکی دینے لگے۔ ۳۱۷

صاحب جانا دہلیوں نے سپاہیوں کے ساتھ برضا و رغبت تعاون کرنا ترک کر دیا اور وہ صرف ناچار ہو کر مدد کرتے تھے اور وہ بھی صرف جان و مال بچانے کی حد تک۔ انھوں نے اپنی دولت زمین کے نیچے گاڑ دی اور عدم ادائیگی کے سبب اشیائے خوردونوش ہم پہنچانے سے انکار کر دیا۔ ۳۱۹ ۲۰ اگست کے دن محکمہ رسد کے افسر اعلیٰ دولائی مل نے رپورٹ کی کہ آئندہ وہ فوجیوں کو رات بھیا کرنے سے قاصر ہے۔ ۳۲۰ اگلے دن ملاہی لال متھریہ کی نام کے ایک ٹھیکیدار نے درخواست پیش کی کہ اب مزید گندھک خریدنا ممکن نہیں اور بارود کی تیاری کو موقوف کرنا ہو گا ۳۲۱ اعلیٰ طبقوں کو یقین ہو گیا کہ جن باغیوں نے لوٹ کے مال سے گھر بھر لیے ہیں وہ نہ تو شہر کو چھوڑ سکتے ہیں اور ناہی اس کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ ۳۲۲ وہ صرف امیر بننے کے لیے یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں ۳۲۳ شہری آبادی یعنی دکاندار، خورد فروش اور دوسرے دولت مند طبقے جنگ کے ہونا تک مصائب اور لاقانونی کے سبب بھیانک قلت اور تنگ دستی کو بڑی طرح محسوس کرنے لگے ۳۲۴ فریڈرک کوپر نے لکھا: "ایک مسلمان نامہ نگار سے اس عظیم کوشش کا پتہ چلتا ہے جو مفتی محمد الدین، حکیم احسن اللہ خاں، مرزا الہی بخش اور سیکرٹریٹ محل انگریزی سرکار کے ساتھ صلح کی خاطر کرنے پر آمادہ ہیں۔ بادشاہ، امراء اور بیگناہ اور بے بس اہلیان دہلی کے لیے خاص طور پر دم کی درخواست کی گئی ہے۔" ۳۲۵

بنگال میں بھی یہی داستان دہرائی گئی۔ زمیندار عملاً انگریزوں کے وفادار رہے۔ ان کی وفاداری کا سبب سمجھنا دشوار نہیں۔ بغاوت کے دوران بہار (جو اس وقت صوبہ بنگال کا حصہ تھا) کے کسان نہ صرف انگریزوں کی بلکہ زمینداروں اور ان کے ایجنٹوں کی کھلم کھلا مخالفت پر اتر آئے۔ جو عرضداشت بنگالی زمینداروں نے دسمبر ۱۸۵۷ء میں گورنر جنرل کے نام بھیجی اس میں بیان کیا گیا ہے کہ "ہم نے اپنے مفاد کو اس قدر حکمرانوں کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے کہ بغاوت کے ہر محاذ پر ہمیں انھیں مظالم کا نشانہ بنایا جاتا ہے جو باغیوں اور ان کے گمراہ ہوطنوں نے ان انگریزوں پر روا رکھے ہیں جو ان کے ہاتھ لگے ہیں۔" ۳۲۶

ضبط کی جا رہی تھی اور کہاں اب انھیں اس سے بھی زیادہ ملا جس کا انھوں نے مطالبہ کیا تھا چنانچہ
 یکوئی حیرت کی بات نہیں کہ ”بڑے بڑے زمینداروں اور دیہات کے معزز لوگوں نے برطانوی فوجوں
 کا پرتیاک خیر مقدم کیا“ ۲۲

دہلی میں کبھی ویسی ہی حالت تھی۔ مغلیہ دارالسلطنت میں داخل ہونے اور بہادر شاہ کے رسمی
 طور پر شہنشاہ ہند ہونے کا اعلان کرنے کے بعد باغیوں نے شہر پر قبضہ کر لیا۔ ایک برطانوی جاسوس
 رجب علی کی مختصر رپورٹ یہ تھی: ”کامل افزائری اور فتنہ و فساد کا دور دورہ ہے۔“ نواب معین الدین
 اس کی تصویر یوں کھینچتا ہے: ”وہ شہنشاہ کو توین امیر کلمات کے ساتھ مخاطب کرتے جیسے:
 ’اے بادشاہ! اے بڑھے! ایک اسے ہاتھ سے پکڑ کر چیختے ہوئے کہتا: ’سنو!‘ دوسرا اس کی
 داڑھی کو چھو کر کہتا: ’میری بات سنو! ان کے اس وطیرے پر بادشاہ کے تن بدن میں آگ لگ
 جاتی لیکن ان کی بدتمیزی کو روکنے میں بے بس تھا اس لیے وہ اپنے نوکروں چاکروں کے سامنے
 اپنے مصائب اور بد بختی کا رونا رو کر اپنے دل کا غبار ہلکا کریتا۔ وہ لوگ جو پہلے انکساری کے ساتھ
 اس کے احکام بجالا کر خوش ہوتے تھے اب انھیں بادشاہ کی توہین کرنے اور ہنسی اڑانے میں
 عار نہ تھی۔“ اس کی بیگم کو کئی بار گرفتاری کی دھمکی دی گئی۔ اس کے بیٹوں کو باغیوں کی ہاں میں ہاں
 ملانی پڑتی اور شاہی طبیب کو باغیوں نے سچ پچ قید کر دیا۔ ۲۳ اس سے تنگ آکر اس نے سپاہیوں
 کو شہر سے نکل جانے کا حکم دیا۔ ۲۴ جب اس کی التجائیں کسی نے نہ سنیں تو اس نے انگریزوں کے
 ساتھ گفت و شنید کرنے کا فیصلہ کیا لیکن ایسا کرنے میں اپنے آپ کو بے بس پایا۔ ۲۵ جولائی ۱۸۵۷ء
 کا واقعہ ہے۔ ۲۶ وہ عجیب شش و پنج میں تھا۔ کبھی وہ فقری اختیار کرنے کی سوچتا اور کبھی یہ کہ جے پور
 جو دھ پور، بیگانہ اور الور کے راجاؤں کے حق میں شہنشاہی اقتدار سے دست بردار ہو جائے۔ سلطنت
 کے اہم معاملات کی تنظیم اور انجام دہی کے لیے وہ کسی پر بھروسہ نہ رکھ سکتا تھا۔ ۲۷ جب چاروں
 حکمرانوں سے مناسب جواب حاصل کرنے میں ناکام رہا تو شہنشاہ ہند بہادر شاہ نے شرائط صلح پر
 گفت و شنید کے لیے برطانوی کیمپ میں اپنے نمائندے بھیجے۔ ۲۸

جب شہنشاہ ہند کی یہ حالت تھی تو جاگیرداروں اور سود خوروں کی حالت بخوبی تصور
 کی جاسکتی ہے۔ اپنی جائیداد کو لئے اور بربادی سے بچانے کے لیے انھوں نے نابالذرقم کی ادائیگی
 سے ایک رجمنٹ کی مدد حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۲۹ بعد میں انھوں نے لوٹ مار اور تشدد سے
 حفاظت کے لیے ایک پرائیویٹ پولیس دستہ تیار کیا۔ ۳۰ لیکن جلد ہی یہ انتظامات بھی ناکام ہو گئے۔

میں کئی بار شکار ہوئے ہیں۔ گزشتہ غدر میں انھوں نے باغیوں کے ہاتھوں فرنگیوں کے ساتھ برابر بلکہ کئی حالتوں میں ان سے زیادہ مصائب جھیلے۔ ان تاجروں کے ذریعے ہم نے سب کچھ حاصل کیا جس کی بہن فوجی کوچ کے وقت ضرورت تھی ۲۲۵

انگریزی کی تعلیم پانے والے ہندوستانیوں اور مقامی حکام نے عام طور پر بغاوت میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ اول الذکر ہر موقع پر انگریزوں کے وفادار رہے ۲۲۶ جب کہ موخر الذکر ہنگامے کی ساری مدت کے دوران ”مردانہ وار اپنے منصب پر ڈٹے رہے ۲۲۷ بغاوت سے ان کی مخالفت ذاتی غرض پر مبنی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اگر بادشاہی حکومت ۲۲۸ از سر نو قائم ہو گئی تو انھیں موقوف کر دیا جائے گا۔ فارسی زبان سے ناواقفیت، مشرقی رسوم و آداب سے ناآشنائی اور پیرا علی طبقے سے متعلق نہ ہونے کی وجہ سے انھیں اس سماجی اور سیاسی نظام میں کوئی مقام حاصل نہ ہو گا۔

بغاوت کو دو سال کی قلیل مدت میں کچل دیا گیا۔ صاحب جاٹا طبقوں کی غذاری کے سبب اسے دبانے آسان ہو گیا۔ اپنے طبقاتی مفاد کی خاطر انھوں نے آزاد قوم کی حیثیت سے اپنے کو تسلیم کر دیا۔ والیان و ریاست میں سے کسی نے بھی بغاوت میں شرکت نہ کی کیوں کہ لارڈ کینگ نے صدق دل کے ساتھ انھیں جیتنے بنانے کے دائمی حق کی ضمانت دی ۲۲۹ راجاؤں اور رانیوں میں سے صرف جھانسی کی لکشمی بائی نے انگریزوں کے خلاف دگر اپنی جان قربان کی۔ اگرچہ وہ مارچ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف میدان جنگ میں کودی — یہ بھی صرف اس وقت جب وہ انھیں اس بات کا یقین دلانے میں ناکام رہی کہ بغاوت یا جھانسی کے قتل عام کے ساتھ کسی طرح بھی اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ ۳۴۰ بہادر شاہ بھی مجبوری میں لڑا۔ نانا صاحب نے انگریزوں کے خلاف اس لیے سرکھ آرائی کی کہ وہ فوجیوں کے ہاتھوں ایک قیدی کی حیثیت رکھتا تھا ۲۲۱ عہدِ برطانیہ اور اس سے پہلے کے زمیندار تاجر، ساہوکار، پڑھاکھا متوسط طبقہ اور دیسی حکام، سبھی نے انگریزوں کا ساتھ دیا یا حالات سے مجبور ہو کر بادل ناخواستہ غیر جانبدار رہے۔ ان کی نگاہ میں اس وقت انگریزوں کے نجات دہندہ تھے جب کہ ہندوستانی کسان غیر ملکیتوں اور جاگیرداروں کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے لیے جان کی بازی لگا کر لڑ رہے تھے۔ غریبکے شروع میں بغاوت کی تنظیم اس لیے کی گئی تھی تاکہ انگریزوں سے پہلے کی تسلیم معیشت کو بحال کیا جائے جو ”مشرقی ممالک میں شخصی حکومت کی مستحکم بنیاد رہی تھی۔ ۲۲۲ لیکن آخر میں بغاوت ملکی زمینداری اور غیر ملکی سامراج کے خلاف کسانوں کی جنگ بن گئی۔

فساد زدہ علاقوں کے دیہات اور قصبات میں چالاک تاجروں اور حریص ساہوکاروں نے کمپن کی حکومت کی حتی الامکان امداد کی کیوں کہ انھوں نے برطانوی ضابطہ قانون اور زمینداری نظام کے تحت خوب دولت کمائی تھی۔ وہ باغیوں کی مدد صرف اس وقت کرتے تھے جب ہاتھ کھینچنا ناممکن ہوتا۔ ۲۲۸ ان کا خیال تھا کہ باغیوں کی فتح کا مطلب قدیم دیہاتی معاشرت کی بحالی تھا۔ جس میں ان کے لیے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ ۲۲۹ اس لیے وہ قانون اور امن کی بحالی اور روزمرہ تجارت کے سابقہ طریقوں کے خواہاں تھے اور یہ صرف برطانوی حکومت کے تحت ہی ممکن تھا۔ تھامس جیل کا یہ قول کہ سوائے بیویوں کے جنھوں نے افزائش سے نقصان اٹھایا، سبھی طبقے اس اُتھل پُتھل سے خوش تھے ۲۳۰ صور حال کا اجمال بیان ہے۔ گئے نے ان تجارت پیشہ طبقات کے اظہارِ مسرت میں حد درجہ خلوص پایا جنھیں عام طور پر ان ہنگاموں میں فائدے سے زیادہ نقصان ہوا تھا۔ ۲۳۱

ساحلی اور غیر متاثرہ علاقوں میں تاجروں اور ساہوکاروں نے عملی طور پر انگریزوں کی امداد کی۔ وہ سُن چکے تھے کہ آزاد شدہ "علاقوں میں تھوڑی ہی مدت میں کئی بار ان کے طبقے کے لوگوں کی جائیدادیں چھین چکی ہیں۔ انھیں یقین تھا کہ خواہ جاگیردار سرداروں کے جھنڈے تلے بغاوت کا مایہ ہو یا باغی فوجیوں اور کنگال کسانوں کی قیادت میں، ہر حالت میں اس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ خود انتہائی اعتبار سے مٹ جائیں گے۔" بیویوں اور دیسی ٹھیکیداروں نے کبھی بھی کمپن کی حکومت کی قوت میں اعتماد نہ کھویا بلکہ ہمیشہ یہ کہتے کہ "صاحب تھوڑی دیر کی بات ہے۔ یہ باغی مزہ کی کھائیں گے کیونکہ کمپن کی طاقت بڑھ رہی ہے۔ ۲۳۲ ہومز کے بیان کے مطابق "تجارت پیشہ اور دکاندار طغنا جانتے تھے کہ ان کی عزت اور خوشحالی کا مدار پُر امن حکومت کے قیام پر ہے اور اگر حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی گئی تو لاقانونیت پھیل جائے گی جن میں انھیں تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لیے وہ سرکار کے اگر وفادار نہیں تو کم از کم مستقل حامی ضرور تھے۔ ۲۳۳ وہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے زوال کی افواہوں پر مطلق کان نہ دھرتے ۲۳۴ اور قدم بوسی اور خدمت کی پیش کش میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر وفاداری کا اظہار کرتے ۲۳۵

پارسیوں نے جو اکثر تاجر تھے، انگریزوں کی ایک اور سبب سے بھی امداد کی تھا جس کو لکھتا ہے کہ "اگر وہ دولت مند ہیں تو کسی ہندو یا مسلمان کے طفیل نہیں، اگر وہ ملک میں کسی دوسری قوم کی نسبت انگریزوں کی طرف زیادہ مائل ہیں تو اس وجہ سے کہ برطانوی انصاف پروری اور قانون نوازی انھیں غارتگری اور جور و ستم سے بچاتی ہے جس کے وہ دوسری حکومتوں کے دور

انفیلڈ رائفل کے علاوہ ٹیلی گراف زمانہ حال کی ایک اور ایجاد تھی جسے باغیوں کے خلاف کام میں لایا گیا۔ بقول رسل: جب سے برق تار ایجاد ہوا اس نے کبھی اتنا اہم اور دلیرانہ کام انجام نہیں دیا جیسا کہ اب ہندوستان میں دے رہا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو کمانڈر ان چیف کی نصف فوج ناکارہ ہو جاتی۔ یہ اس کے دست راست سے زیادہ کام کا ہے۔ ۲۴۹

اس کے علاوہ ایک منظم جمعیت کے بغیر بغاوت کامیاب نہ ہو سکتی تھی۔ بغاوت کے راہنما بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والوں کا ایک انبوہ تھا: زمینوں سے بے دخل کیے گئے زمیندار، اجڑے ہوئے صنعت کار، کنگال کاشتکار، غیر مطمئن سپاہی، متعصب ملا اور برہمن جن کے ذہنوں میں آزاد ہندوستان کے جداجدا تصور تھے۔ مجلس انتظامیہ اور نظام حکومت جس کی حیثیت ایک بڑی گرام پنچایت سے زیادہ تھی راہنماؤں کے ادھورے اربالوں کے ترجمان تھے (آخر یہی ان کی سیاسی میلش تھی) یہ سچ ہے کہ نئی حکومت کا سماجی اور معاشی نصب العین کاشتکاروں کو زمینوں کے مالک قرار دینا تھا۔ ۲۵۰ لیکن اگر باغی کامیاب بھی ہو جاتے تو باوجود منتخب مجلس انتظامیہ کے نئی حکومت کچھ وقت کے بعد اسی قدیم شاہی نظام حکومت میں بدل جاتی۔ اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا جب ہم دہلی کے باغی لیڈر جنرل بخت خاں کا ذکر چھیڑتے ہیں جس نے "لاٹ صاحب گورنر بہادر، ناظم امور دیوانی و فوجداری" کا لقب اختیار کیا تھا۔ ۲۵۱ اس نظریے کی تصدیق اس امر سے ہوتی ہے کہ یہ بغاوت ذرائع پیداوار میں کسی انقلابی فنی تبدیلی کے سبب نہیں ہوئی جس سے سماجی ڈھانچے میں تبدیلی کی ضرورت پڑتی جو ایک نئے نظام حکومت کی متقاضی ہوتی بلکہ یہ بغاوت نئے سماج کو جنم دینے کے بغیر پرانے سماجی ڈھانچے کے کبھرنے کے باعث تھی۔

۸۔ بعض اثرات

اگرچہ بغاوت دو سال کے اندر فرو ہو گئی لیکن اس کے اثرات دیر پا اور دور رس تھے۔ سر جان اسٹرنجی کا بیان ہے کہ "برطانوی سرکار اور اس کے افسروں پر رجعت پسندانہ خیالات طاری تھے ۲۵۲ چونکہ والیان ریاست نے بغاوت کے سیلاب کو روک کر نمایاں خدمات انجام دی تھیں اس لیے انہیں سلطنت کی تفصیل کے طور پر قائم رکھنا اس وقت سے برطانوی سیاست کا اصول رہا ہے۔" یہ ایک انگریز مورخ پی۔ ای۔ رابرٹس کا خیال ہے ۲۵۳ جب ملکہ وکٹوریہ ہندوستان کی ملکہ معظمہ بنی تو اس نے یہ اعلان کیا: ہم ہندوستان کے والیان

۶۔ ناکامی کے اسباب

صاحبِ جاؤد بطحوں کی غزاری کے علاوہ کچھ اور اسباب بھی تھے جو ہندوستان کی سیاسی اور معاشی آزادی کی جنگ میں باغیوں کی شکست کا موجب ہوئے۔ تعجب کا مقام ہے کہ بغاوت ایک بھی قابلِ جنگی رہنما پیدا نہ کر سکی۔ یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ دہلی، جہانسی اور گوالیار میں باغی کس طرح اڑے اور لکھنؤ میں کس طرح ٹوٹ کر انگریزوں سے جنگ کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستانیوں نے بھی کچھ قابلِ قدر فتوحات حاصل کیں لیکن یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ فتوحات فوجیوں کی کثیر تعداد کے طفیل تھیں نہ کہ فوجی حکمتِ عملی یا تدبیر جنگ کے سبب۔ سر جان لانس نے بجا طور پر کہا ہے کہ اگر باغیوں میں ایک بھی قابلِ راہنما ہوتا تو ہماری نجات کی کوئی امید نہ تھی ۳۴۲ اس کے علاوہ جب بغاوت شروع ہوئی تو جنگ کریمیا اور جنگِ ایران ختم ہو چکی تھیں اور برطانوی فوج چاق و چوبند تھی۔ افغانستان کے ساتھ دوستی کا معاہدہ ہو چکا تھا۔ اس لیے مددِ خیبر کے اس پار سے کوئی فوری روسی خطرہ درپیش نہ تھا۔ ہندوستان کی بغاوت کے ساتھ پنشنے کے لیے انگریزوں کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔

ایک سبب اور بھی تھا جس سے باغی نہ پیٹ سکے۔ وہ یہ کہ اسی زمانے میں چین کے خلاف اعلانِ جنگ کرے گا۔ چین سے لڑنے کے لیے فرنگی فوجوں کی کثیر تعداد بھجوا دی تھی اس قدر قریب سے گزری کہ انھیں آواز دے کر پکارا جاسکتا تھا۔ خدا کی قدرت سے اس اتفاقی واقعہ کے طفیل ہی شمال مغربی ہندوستان میں دوبارہ اور جلد برطانوی حکومت قائم ہوئی۔ ۳۴۳ باغیوں کو نہ صرف روپے کی مستقل قلت کا سامنا ۳۴۵ تھا بلکہ سامانِ جنگ کی کمی کا بھی۔ ۳۴۶ پاس ۲۸۴۲ توپیں، ۱۸۶۱۶۷ بندو قلیل، ۵۶۱۲۲۱ تلواریں، ۵۰۳۱۱ برچیاں اور ۶۲۸۶۸۳ چھوٹے تھیاری تھے۔ درحقیقت باغیوں کے لگائے ہوئے زخم زیادہ تر تلوار کے تھے۔ ۳۴۷ افضل مینی رائفل ہوتی تو دہلی اب بھی مغلوں کی ملکیت ہوتا اور تیمور کا وارث قید کی کوٹھری میں ایک بوسیدہ چارپائی کے بجائے اپنے آرائی محل میں اب بھی آپ دار موتیوں سے مرصع تخت پر بیٹھا ہوتا۔ ۳۴۸

پہچوت چھات سے متعلق قانون، ہندوؤں میں طلاق اور ہندو عورتوں کے حق وراثت کے بارے میں ترقی پسند ابھرتے ہوئے متوسط طبقے کے مطالبات کے برعکس ہندوستان میں انگریز سماجی اور مذہبی روایات کو محفوظ اور برقرار رکھنے کے حامی ہو گئے۔

انگریز ہندوستانی فوج اور مسلمانوں کو بغاوت کے بڑے محرک سمجھتے تھے۔ اس لیے ان پر خاص توجہ دی گئی۔ پیل کمیشن (۱۸۵۵ء) نے دیسی فوج میں کمی کی سفارش کی۔ تقریباً دو لاکھ جوان جن میں کچھ فوجی پولیس کے آدمی بھی شامل تھے برطرف کر دیے گئے۔ ایک اور فوجی کمیشن نے جو اکیس سال بعد مقرر کیا گیا بغاوت سے دو سبق اخذ کیے۔ پہلا ملک میں ایک ناقابل مزاحمت برطانوی فوج کا قیام۔ دوسرا توپخانے کو فرنگیوں کے قبضے میں رکھنا۔ لارڈ کیننگ نے جسے انجمنستان میں ہندوستان نواز سمجھا جاتا تھا اور جس کی "رحمدل" ۲۶ کا مذاق اڑایا جاتا تھا، سفارشی کی کہ کسی فرنگی فوجی کو ہندوستان میں اتنی دیر ٹھہرنے کی اجازت نہ دی جائے کہ وہ یہ بھول جائے کہ میں قابض فوج کا سپاہی ہوں۔ اس کی تجویز کو سالہ ۱۸۶۱ کی آرمی ایملنگیشن سکیم (امتراج فوج کا منصوبہ) میں شامل کر لیا گیا۔ ۱۸۶۲ء کی طرح بڑے بڑے خزانوں، اسلحہ خانوں، تدبیر جنگ کے لحاظ سے اہم مقامات، اہم قلعوں اور فوجی ٹھکانوں کی حفاظت اب فرنگی فوجیں کرنے لگیں جن کی تعداد "اتنی کافی تھی کہ ندر کی صورت میں ڈٹ کر مقابلہ کر سکے" ۳۶۴ مسلمان بھی انگریزوں کے قہر و عتاب کا شکار ہوئے۔ ان پر بغاوت میں نمایاں حصہ لینے کا الزام دھرا گیا۔ ۳۶۵ ان ہندوستانی مسلمانوں کو عبرت دلانے کے لیے ججز، بلب گڑھ، فرنگ نگر کے لوہوں اور چوبیس شہزادوں کو پھانسی پر لٹکا یا گیا۔ ۳۶۶ مسلمانوں کی جائیدادوں کو ضبط کر لیا گیا یا تباہ کر دیا گیا۔ مسلمانوں سے ۱۱۰ کی غیر منقولہ جائیدادیں بیس فی صدی بطور تعزیری جرمانہ وصول کی گئیں جب کہ ہندوؤں کو دس فی صدی کے "بجور" دیا گیا۔ جب دہلی کو دوبارہ فتح کر لیا گیا تو ہندوؤں کو چند ہی مہینوں کے اندر واپس آنے کی اجازت مل گئی لیکن مسلمان ۱۸۵۹ء سے پہلے لوٹ سکے۔ سی۔ ایف۔ اینڈریوز اپنی تصنیف *Zakaullah of Delhi* (دہلی کا زکا اللہ) میں بیان کرتا ہے کہ "دہلی میں تحریک احیائے علوم کو ایسی زک پہنچی کہ پھر نہ سنبھلی" ۲۶۷

دوسرے مقامات اور صوبوں میں کبھی یہی حال تھا۔ مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف اپنی جدوجہد اگر کھلم کھلا نہیں تو روزمرہ کی منافرت کے اظہار سے جاری رکھی۔ اسی منافرت نے مجموعی طور پر برطانوی تمدن، تہذیب، فلسفہ اور تعلیم بلکہ برانگریزی چیز کی مخالفت کی شکل اختیار کی۔ پس بغاوت کے بعد کے دور میں بقول سر تھیوڈور ماریش "ہندو یونیورسٹیوں کی تحریک سے علمی

ریاست کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم ان تمام معاہدوں اور اقرارناموں کو قبول کرتے ہیں اور خلوص نیت کے ساتھ ان کے پابند ہوں گے جو ان کے ساتھ خود ایسٹ انڈیا کمپنی نے کیے یا اس کے حکم سے کیے گئے اور ہم ان کی طرف سے بھی اسی طرح عمل پیرا ہونے کی توقع رکھتے ہیں۔ ہم دیسی حکمرانوں کے حقوق و قار اور عزت کا اسی طرح پاس رکھیں گے جیسے یہ ہمارے اپنے ہیں۔ ۲۵۴

بغاوت کے نتیجے کے طور پر ہندوستانی زمینداروں اور ساہوکاروں اور انگریزوں کے مابین ایک اتحاد وجود میں آیا۔ انگریزوں نے سوچا کہ اگر ہم ایسی پالیسیاں اختیار کریں گے جن کے سبب ہندوستانیوں کے اعلیٰ طبقے ہم سے منہ موڑ لیں تو ہمارے لیے مستقل طور پر حکومت کرنا مشکل ہو جائے گا۔ ۲۵۵ اس لیے ملک کے اعلان میں یہ کہا گیا: ”جو زمینیں ہندوستانیوں کو اپنے آباؤ اجداد سے ورثہ میں ملی ہیں ان کے ساتھ ان کی وابستگی کے جذبہ سے ہم آگاہ ہیں اور اس کا پاس رکھتے ہیں اور ہم زمینوں سے متعلق ان کے تمام حقوق کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں۔ قانون وضع کرنے اور نافذ کرنے میں ہندوستان کے قدیم حقوق اور رسم و رواج کا مناسب احترام کیا جائے گا۔“ ۲۵۶ حکومت ہند نے نومبر ۱۸۵۹ء میں لندن کو یہ مشورہ دیا کہ ”ہندوستان میں زمیندار امار کے طبقہ کا قیام اس قدر اہمیت رکھتا ہے کہ اس کی خاطر ہم اس نظام کو قربان کر سکتے ہیں جس نے کاشتکاروں کی آزادی میں اضافہ کیا ہے اور ان کے حقوق کو محفوظ کیا ہے لیکن قدیم طبقہ امار کے زوال یا خاتمے کا موجب ہوا ہے۔“ ۲۵۷ اسی حکمت عملی کا نتیجہ تھا کہ اودھ کے ان دو تہائی تعلقہ داروں کو صوبجات کے سماجی ڈھانچے میں لازمی عنصر کے طور پر بحال کر دیا گیا جنہیں پہلے کینگ نے حقارت کے ساتھ ایسے آدمی کہا تھا جن میں کوئی امتیازی خصوصیت نہ تھی مثلاً اعلیٰ خاندان، اعلیٰ خدمت، یا زمین سے وابستگی۔ ۲۵۸ نیز ۱۸۵۹ء اور ۱۸۶۰ء کے درمیان زمینداری نظام کی توسیع کی تجویز پر برطانیہ میں گرم گرم بحث ہوئی۔ بالآخر اس تجویز کو ترک کر دیا گیا کیوں کہ بغاوت نے مالی مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ ۲۵۹ لیکن ہندوستانی زمینداروں اور برطانوی شہنشاہیت پرستوں کے درمیان اس اتحاد نے ہندوستان کو ایک زرعی بحران میں مبتلا کر دیا تھا جس کے اثرات ابھی تک کامل طور سے نہیں مٹے تھے۔ اقتصادی اور سیاسی سطح سے اس اتحاد کا اثر سماجی اور تمدنی سطح تک جا پہنچا۔ ”فرمودہ روایات کو بد لنے اور ان کی جگہ تہذیب کی نئی روشنی پھیلانے کی پالیسی ترک کر دی گئی۔“ ۲۶۰ سر ہنری مین لکھتا ہے: ”۱۸۵۷ء کے خونخوار واقعات کے بعد ہندوستانی حکام ملکی رسوم کو بد لنے سے اس طرح خون کھانے لگے گویا ان کی رگ رگ میں دہشت سمائی ہوئی ہے۔“ ۲۶۱ شادی کی عمر،

ہیچوں کا پھل ہندوستان اس وقت تک نہ پائیں گے جب تک وہ خود اتنے طاقتور نہیں ہو جاتے کہ برطانوی غلامی کا جوا اتار پھینکیں۔ ۲۶، ۲۷ اسی حقیقت کے احساس کا نتیجہ تھا کہ ہندوستانیوں نے ۱۸۵۷ء میں آزادی کے لیے منظم جدوجہد کا آغاز کیا اور کچھ سال بعد ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو انھوں نے آزادی حاصل کر لی۔

حواشی

۱۔ لفظ "غدر" اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ یہ کثرت کے ساتھ مستعمل ہے۔ میں اس واقعے کو "غدر" تصور نہیں کرتا۔ بی۔ کے۔

۲۔ سر جان ولیم کے، کرنل جی۔ بی۔ مایسن اور ہیٹ سے دوسرے برطانوی مضفین نے اس عنوان کے تحت ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بارے میں کتابیں لکھی ہیں۔

۳۔ سر جان سیلے، اشوک تپتہ کے حوالے سے *The Great Rebellion* "دی گریٹ ریبلیئن" ۱۹۷۶ء، صفحہ ۲۹

۴۔ وی۔ ڈی۔ سادورک : *India's war of Independence* "انڈیا اس وار آف انڈیپنڈنس" مطبوعہ ۱۹۷۶ء، انگریز لوگ

جی۔ ڈبلیو۔ فارسٹ : *History of the Indian Mutiny* "ہسٹری آف دی انڈین میوٹینی" مطبوعہ ۱۹۰۷ء، جلد اول صفحہ ۲۱۰

Oxford History of India صفحہ ۷۲، "ہسٹری آف انڈیا" سر ڈبلیو۔ اپتج۔ ریسٹ : *My Diary in India in the year 1858-59* "مائی ڈائری ان انڈیا ان دی ایر ۱۸۵۸-۵۹ء" مطبوعہ ۱۸۶۰ء، جلد دوم، صفحہ ۲۵۹۔
سر جارج کیمپ بیل : *Memoirs of my Indian Career* (دیسما لریز آف مائی انڈین کیریئر) ۱۸۹۳ء، جلد اول، صفحہ ۲۸۲

لارڈ ایلن برائن نے ۱۶ فروری ۱۸۵۷ء کو برطانوی پارلیمنٹ میں مندرجہ ذیل بیان دیا:
"اگرچہ ہمارے مورخ یہ دعویٰ کرنے کے دلدادہ ہیں کہ غدر محض ایک فوجی بغاوت تھی لیکن ہزاروں شہریوں کو مقتدرے کا ڈھونگ رہا کہ اس کے بغیر ہی پھانسی دیئے اور سوائے ہندوستانی نسل کے آباد کیے

اور اخلاقی نشاۃ ثانیہ کی منزلیں طے کر رہے تھے جب کہ سارے ہندوستان میں مسلمان مادی ناداری اور علمی انحطاط کے شکار تھے ۲۶۸

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرکار کے تمام انتظامیہ اداروں میں مسلمانوں کا تناسب گھٹ کر چار پانچ فی صدی رہ گیا جب کہ سو سال پہلے انھیں حکومت کی اجارہ داری حاصل تھی۔ یہی حال ان اعلیٰ اسیبوں کا ہے جہاں سرکار کے لطف و کرم کی تقسیم پر ہر وقت کڑی نگاہ رکھی جاتی ہے۔ کم حیثیت کے عہدوں سے مسلمانوں کا اخراج اور بھی زیادہ ہے ۲۶۹ قبل اس کے کہ ان کی آنکھیں کھلیں اور وہ اس رویت سے پہنچنے والے نقصان کو محسوس کریں (جیسا کہ سرسید احمد خاں کی قسم کے آدمیوں کی تصنیفات سے ظاہر ہے) ہندو تعلیم کے میدان میں بہت آگے بڑھ چکے تھے اور سرکاری ملازمتوں اور تجارت میں اپنے قدم جما چکے تھے۔ پڑھے لکھے طبقے کے لیے صرف یہی راہیں کھلی تھیں۔ دونوں فرقوں کی غیر مساوی ترقی سے ہندو مسلم مسئلہ پیدا ہو گیا۔ اسی مسئلہ نے بعد میں ہندوستان کی قومی آزادی کی جدوجہد میں رخنہ ڈالا۔ انگریزوں نے اس مسئلہ کو ہوا دی اور اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور بالآخر یہ پاکستان کے قیام کا موجب ہوا۔

ہندوستان میں بغاوت کے بعد برطانیہ کی علاقائی توسیع علی طور پر ٹرک گئی اور ہنہنشاہت کی استواری کا دور شروع ہوا۔ سر جان سٹیل کا بیان ہے کہ "قدر کے بعد الحاق علاقہ کا سلسلہ ختم ہو گیا تاہم صدی کے وہ پچیس سال جن میں کوئی فتوحات عمل میں نہ آئیں تجارت میں تیز رفتاری ترقی کا دور تھے" ۲۷۰ بقول اسٹوک ہنتر تجارت میں لگ بھگ ۲۷۰ فی صدی کی توسیع ہوئی ۲۷۱

اس توسیع کی وجہ یہ تھی کہ ریلوں اور سڑکوں کے جال بچھ جانے سے ملک کے اندرونی حصوں کی منڈیوں میں سرمایہ لگانے کی راہیں کھل گئیں لیکن مارکس نے لکھا کہ: "تم ایک وسیع ملک میں ریلوں کا جال قائم نہیں رکھ سکتے جب تک وہ تمام صنعتی کام شروع نہ کیے جائیں جو ریلوں کی نقل و حرکت کی فوری اور مستقل ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ اسی لیے ایسی ضمنی صنعتیں وجود میں آ جاتی ہیں جن کا ریلوے کے ساتھ قریبی واسطہ نہیں ہوتا اس سے موروثی پیشوراء گروہ بندیاں مٹ جائیں گی جن پر ہندوستانی ذات پات کا مدار ہے۔ جو ہندوستان کی ترقی اور اقتدار کی راہ میں حائل ہیں" ۲۷۲ پس اگرچہ انگلستان کی یہ پالیسی ذیل ترین مقاصد پر مبنی تھی لیکن وہ دہرہ و دانستہ ایشیا کے تاریخ کے سب سے بڑے بلکہ سچ پوچھو تو بے نظیر انقلاب کا آلہ کار بنی جو پہلے کبھی سننے میں نہ آیا تھا۔ ۲۷۳ لیکن بقول مارکس "سماج میں انگریزوں کے بوئے ہوئے

مطبوعہ ۱۸۵۸ء باب دوم اور بحوالہ تصنیف ٹریولین، صفحہ ۷۶، بھی ملاحظہ فرمائیں۔

۱۷۔ بحوالہ تصنیف کیو۔ براؤن۔ جلد اول، صفحہ ۱۹۲

۱۸۔ بحوالہ تصنیف کو، صفحہ ۲۲۶

۱۹۔ آر۔ سی۔ دت: *The Economic History of India* (دی اکنامک ہسٹری آف

انڈیا) مطبوعہ ۱۹۵۷ء، طبع ہفتم، جلد دوم، صفحہ ۲۲۲، ڈسرایلی کا خیال تھا کہ ”بنگالی فوج کے باغی اپنی پیشہ ورانہ شکایات کے سبب اس قدر انتقام لینے والے نہیں تھے جس قدر وہ عوامی بے اطمینانی کے ترجمان تھے۔“ بحوالہ ایڈورڈ تھا من منقول از تصنیف صفحہ ۲۲

۲۰۔ مارک تھارن ہل: *The personal adventures and experiences*

of a magistrate during the rise, progress and suppression of the Indian mutiny (1884) P. 178

مطبوعہ ۱۸۸۷ء، صفحہ ۱۷۸

۲۱۔ سر سید احمد خاں سے گئے تک *Kaye's mutiny papers* (کے ایس

میوٹی پیپرس)، جلد ۲۵، صفحات ۱۶-۱۱

۲۲۔ نقار کے مذکورہ ذیل البواب چہارم بیجم اور ششم ملاحظہ فرمائیں۔

۲۳۔ اشوک نے بحوالہ تصنیف صفحہ ۶۰

۲۴۔ ریورنڈ ڈاکٹر فرینک برائٹ اپنی تصنیف *History of England* (ہسٹری آف

انگلینڈ) دوم چہارم، مطبوعہ ۱۸۹۳ء میں ان مظالم کا ذکر کرتا ہے جو ہندوستانی باغیوں

اور برطانوی فوجوں کے درمیان ”ایسا دکھائی دیتا تھا گویا دو وحشی قوموں میں مقابلہ

سے جنہیں انصاف یا رحم سے آنکھیں موندے صرف یہ ایک ہی خیال موجھتا تھا کہ اپنے

دشمنوں کو صفیہ ہستی سے تارویا جائے۔“ صفحہ ۲۲۸ البتہ مارکس نے ہندوستانی باغیوں

کے وحشت ناک مظالم کو جائز ٹھہرایا۔ اس کا بیان تھا: ”سپاہیوں کی کڑوت خواہ کنہی ہی

مذہب ہر آخر یہ مجموعی صورت میں انگلینڈ کے ہندوستان میں اپنے ہی اس طریقے کا رد عمل

ہے جو انھوں نے نہ صرف مشرق میں سلطنت کے قیام کے دوران میں بلکہ مستحکم اور مدت

سے جمی ہوئی حکومت کے آخری دس سالوں میں بھی اپنایا۔“ (مارکس اور انجیل برطانیہ پر)

صفحہ ۲۴۹

- ہوئے دوستوں دشمنوں کے دیہات کو جلا دینے کے عمل نے فخر کو ایک عوامی بناوت میں
 دیا ہوتا ہے۔ ایڈورڈ تھاپسن کے حوالے سے، *The other side of the Medal*
 (دی اور سائڈ آف دی میڈل) ۱۹۳۰ء، صفحہ ۱۰۶
- ۱۰۔ تھاپسن کو: *Central India during the Rebellion of*
 ۵۸ — ۱۸۵۷ (سینٹرل انڈیا ڈیورنگ دی ریبیلین آف ۵۸-۱۸۵۷) مطبوعہ
 صفحہ ۲۴
- ۱۱۔ سرجی۔ اور ٹریوٹمین، *The Competition Wallah* (دی کمپٹییشن والہ)
 مطبوعہ ۱۸۹۰ء، صفحہ ۴۵
- ۱۲۔ ریورنڈ ڈاکٹر ایگنیز ڈنٹ: *The Indian Rebellion: Its causes and results in a series of letters*
 (دی انڈین ریبیلین: اس کا نڈا ایریزٹس ان اے سیریز آف لیٹرز) مطبوعہ ۱۸۵۵ء، صفحہ ۲۲۲
- ۱۲۔ چارلس ہال: *History of the Indian Mutiny* (ہسٹری آف دی انڈین
 میوٹنی) جلد دوم، صفحہ ۵۴۲
- ۱۲۔ کے: *History of the Sepoy war in India* (اے ہسٹری آف
 سپاہی وار ان انڈیا) مطبوعہ ۱۸۵۵ء، طبع چہارم، جلد دوم، صفحہ ۱۹۵
- ۱۵۔ ہالٹن: *History of the Indian Mutiny* (ہسٹری آف دی انڈین میوٹنی)
 مطبوعہ ۱۸۵۵ء، جلد سوم، صفحہ ۴۸۴
- ۱۶۔ ریورنڈ جے۔ کیو براؤن: *The Punjab and Delhi in ۱۸۵۷* (دی پنجاب ایر
 دی ان ۱۸۵۷ء) مطبوعہ ۱۸۹۱ء، جلد اول، صفحہ ۲۸-۲۹
- The lost dominion* کے مصنف کو ریورنڈ کے ساتھ اتفاق رائے ہے
 کا بیان ہے: "صرف یہی کہنا ضروری ہے۔ سوائے اودھ کے ندر کسی بھی معنی میں قوی بننا
 نہیں ہے۔" منقول از تصنیف ایڈورڈ تھاپسن، صفحہ ۳۰۴
- لفٹنٹ جنرل میکلوڈ اس کے بیان کے مطابق: "کم از کم اہل اودھ کی جدوجہد
 جنگ آزادی قرار دینا چاہیے۔" منقول از تصنیف ساورکر، صفحہ ۲۵ جان برڈس اور
 تصنیف: *Topics for Indian Statesmen* (ٹاپکس فار انڈین اسٹیٹسمن)

(ہسٹری آف برٹش انڈیا) جلد اول، باب ہشتم وغیرہ

۲۶. مارکس : Capital (کمپٹل) جلد اول، پندرہواں باب فصل پنجم
۲۷. مارکس : Articles on India (آرٹیکلز آن انڈیا) صفحہ ۲۲۔
۲۸. پروفیسر ڈی۔ آر۔ گریڈگل اپنی مشہور تصنیف *Industrial Evolution of India* (انڈسٹریل ایولوشن آف انڈیا) میں بیان کرتا ہے کہ "شہری صنعت و حرقت سے یقیناً زمین پر دباؤ بڑھ گیا لیکن شہروں سے نقل مکان کے سبب اس قدر نہیں (۲۰ بات نہیں کہ بالکل ہی نہ ہوا) بلکہ زمین پر ان لوگوں کے رہ جانے سے جو وقت پاکر شہری صنعتوں میں کھپ جاتے، صفحہ ۲۵
۲۹. وادیہ و مرچنٹ : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۷۹
۳۰. رادھا کمل کرنی : *Land problems of India* مطبوعہ ۱۹۳۲ء، صفحات ۱۱۱۶
- نیز ملاحظہ فرمائیں : *India : its administration and progress* مطبوعہ ۱۹۱۱ء
- طبع چہارم صفحات ۱۳۷، ۳۶۵
۳۱. آر۔ سی۔ دت : بحوالہ تصنیف، جلد اول، صفحہ ۸۵
۳۲. اسٹرنیکے : بحوالہ تصنیف، صفحہ ۱۳۷
۳۳. ایضاً، صفحہ ۲۲۷
- سرسید احمد خاں بھی عام طور پر سر جان کا ہم خیال ہیں۔ وہ فرماتے ہیں : "پرلے نہانی میں سابقہ مملکتوں کے تحت بلاشبہ جائداد آراضی کے حقوق خریدنے، بیچنے، رہن رکھنے اور بذریعہ ہبہ انتقال کرنے کا طریقہ رائج تھا لیکن بہت کم تھا اور جو بھی تھوڑا بہت تھا وہ زمین متعلقہ کی رضامندی اور خواہش سے تھا۔ لگان کے بقایا یا قرض کی وصولی کے لیے ان حقوق کے مطلق العنانہ طور سے بیع کرنے پر کسی کو مجبور کرنے کا ان دنوں دستور نہ تھا، رسالہ اسباب لغاوت ہند (طبع اردو) مطبوعہ ۱۸۵۵ء، صفحات ۲۸-۲۷
۳۴. تھارن ہل : بحوالہ تصنیف صفحات ۳۳، ۳۲
۳۵. ایضاً، صفحہ ۳۷۔ اس نکتہ کی صراحت کے لیے ملاحظہ فرمائیں : اسٹرنیکے بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۲۷، نیز خان : بحوالہ تصنیف، صفحات ۲۰-۲۷
۳۶. تھارن ہل : بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۳
۳۷. بحوالہ تصنیف، جلد دوم، صفحہ ۲۶۰

۲۵۔ جون بوٹھیپ: *British Imperialism in India* (برٹش ایمپیرلزم ان انڈیا) مطبوعہ ۱۹۳۵ء صفحہ ۱۷۰۔ نیز ملاحظہ فرمائیں: آر۔ پام رت کی تصنیف: *Modern India* (ماڈرن انڈیا) مطبوعہ ۱۹۲۷ء صفحہ ۱۳

۲۶۔ ولیم بولٹس نے صحت حال کو یوں بیان کیا: "سلطنت روما کے دور زوال میں اس کے دور دراز صوبوں کی طرح ایشیا میں برطانوی نوآبادیوں کو ہر قسم کے نفع بازوں کے رحم پر قنونا جائزہ کار کی حیثیت میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ جہاں تک کہ کہنی کے بیشتر ملازم جو رستم کے ایسے ہونک مناظر دکھانے کے بعد جن کی نظیر کسی ملک کی تاریخ میں شکل سے ملے گی، دوت سے ملا مال ہو کر انگلستان کو لوٹے ہیں۔"

Consideration on Indian Affairs (کنسڈریشن آن انڈین ایفیرز) مطبوعہ ۱۷۷۲ء دیا چر

موضوع کے دل چاہ مطالعہ کے لیے ملاحظہ فرمائیں جیمز ہالزین *The Nabobs in England* (دی نوابس ان انگلینڈ) مطبوعہ ۱۹۲۷ء دیا چر

۲۷۔ ایڈم سٹم: *The wealth of nations* (دی ویلتھ آف نیشنز) مطبوعہ ۱۹۳۰ء جلد چہارم باب ہفتم

۲۸۔ بولٹس بحوالہ تصنیف دیا چر میں۔

۲۹۔ ٹی۔ رائس بوتز: *A History of the Indian Rebellion* (ایس ہسٹری آف دی انڈین ریبیلن) طبع پنجم، مطبوعہ ۱۸۹۸ء صفحہ ۶

۳۰۔ مارکس *Capital* (کپٹل) جلد اول، صفحات ۳۷-۸۲۵

۳۱۔ بروکس ایڈمس: *The Laws of Civilisation and Decay* (دی لاز آف سولریشن اینڈ ڈیکے) صفحہ ۲۶۰

۳۲۔ *Queen Elizabeth I's charter to the East India Company* (منقول تصنیف وادیر ورجنٹ) مطبوعہ ۱۹۸۵ء صفحہ ۲۷۹

۳۳۔ مارکس *Articles on India* (آرٹیکلز آن انڈیا) طبع دوم، ہندوستانی مطبوعہ ۱۹۸۵ء صفحات ۲۲-۲۳

۳۴۔ ایضاً صفحات ۲۲-۲۳

۳۵۔ جیمز ویل: *History of British India* (H. H. Wilson's continuation)

۶۲. انٹس : ایضاً صفحہ ۲۷ : بحوالہ تصنیف صفحہ ۷۱
۶۳. ایم. آر. گبٹس : And : An account of the mutinies in Oudh : مطبوعہ ۱۸۵۸ء طبع دوم صفحہ ۷۰
۶۵. ایضاً صفحہ ۷۰ : ای. سی. روتھریز : A personal narrative of the Siege of Lucknow. مطبوعہ ۱۸۵۸ء صفحات ۲۳-۲۴
۶۶. ایضاً : صفحہ ۷۰
۶۷. ایضاً : صفحہ ۷۰
۶۸. ریز : بحوالہ تصنیف صفحات ۲۲-۲۴
۶۹. گبٹس : بحوالہ تصنیف : صفحہ ۶۷
۷۰. ایضاً : صفحہ ۶۷
۷۱. کے : بحوالہ تصنیف جلد اول : صفحہ ۱۱۴ : انٹس : بحوالہ تصنیف : صفحہ ۲۸
۷۲. ایضاً : جلد اول صفحات ۸-۱۳۷
۷۳. Col. Sleeman's Diary : منقول از تصنیف کے : صفحہ ۱۳۵
۷۴. کے : ایضاً جلد اول صفحات ۱۱۵-۱۱۴ : انٹس : بحوالہ تصنیف صفحات ۲۸-۲۹
۷۵. گبٹس : بحوالہ تصنیف صفحہ ۶۱
۷۶. ایضاً : صفحہ ۶۱
۷۷. کے : بحوالہ تصنیف : جلد اول : صفحہ ۱۱۴
۷۸. ایضاً صفحہ ۱۵۴
۷۹. G. B. Seton Karr's memorial to the Governor General. : منقول از تصنیف کے جلد اول صفحہ ۱۷ : بحوالہ تصنیف صفحہ ۴۱
۸۰. کے : بحوالہ تصنیف جلد اول : صفحات ۷۹
۸۱. تھارن ہل : بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۲
۸۲. کے : بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۷۹ : تھارن ہل : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۲
۸۳. فارست : بحوالہ تصنیف جلد اول : صفحہ ۱۶۲
۸۴. ریز : بحوالہ تصنیف : صفحات ۲۵-۲۶

- ۴۸۔ تھارن ہل: بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۴۔ ولیم ایڈورڈس کی تصنیف: Personal
 ۴۹۔ آر تھورن: India مطبوعہ ۱۸۵۸ء، صفحہ ۱۰۸۔ adventures in the Indian rebellion
 ۵۰۔ کے: بحوالہ تصنیف جلد اول، صفحہ ۱۵۷۔
 ۵۱۔ Cornwallis correspondence: Lord Cornwallis to the
 court of directors P 533۔ بورڈ آف کنٹرول نے بحوالہ پر سے "تجلی جائداد
 آراضی کا خلاق اعظم" کے لقب سے ملقب کیا۔ منقول از تصنیف ریکز میجر
 ۵۲۔ سر رچرڈ ٹیمپل: Men and events of my times in India مطبوعہ ۱۸۸۲ء، صفحہ ۳۰۔
 ۵۳۔ Selections from the papers of Lord Metcalfe P. 253۔ آر تھورن: بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۱۲۔
 ۵۴۔ بحوالہ تصنیف، صفحہ ۱۲۔
 ۵۵۔ رپورٹ کلکٹر مناپور ۱۸۰۲ء، منقول از تصنیف پام دت۔ India today، طبع ایڈورڈس
 ۵۶۔ مطبوعہ ۱۹۲۷ء، صفحہ ۱۹۱۔
 ۵۷۔ وادیہ در چٹ: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۳۶۔
 ۵۸۔ تھارن ہل: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۷۔
 ۵۹۔ Minutes of the Madras Board of Revenue۔ تصنیف آر۔ بی۔ دت صفحہ ۱۲۴۔
 ۶۰۔ مستول از تصنیف آر۔ بی۔ دت، صفحات ۱۸۵-۸۶۔
 ۶۱۔ ہشپ آئیر: Remoires and Correspondance، مطبوعہ ۱۸۵۸ء۔
 ۶۲۔ تھارن ہل: بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۱۲۔
 ۶۳۔ تھارن ہل: بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۱۲۔
 ۶۴۔ تھارن ہل: بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۱۲۔
 ۶۵۔ تھارن ہل: بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۱۲۔
 ۶۶۔ تھارن ہل: بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۱۲۔
 ۶۷۔ تھارن ہل: بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۱۲۔
 ۶۸۔ تھارن ہل: بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۱۲۔

۱۰۴۔ آ: صفحہ ۱۹۶

۱۰۵۔ ایضاً صفحہ ۱۹۶

۱۰۶۔ نو: بحوالہ تصنیف صفحات ۵۸-۲۵۷

۱۰۷۔ ایضاً صفحہ ۲۵۸

۱۰۸۔ پروفیسر تھامس: *Economic History Review* مطبوعہ ۱۹۲۲ء

۱۰۹۔ ایضاً اشوک تبت: بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۷

۱۱۰۔ آ: بحوالہ تصنیف جلد اول صفحہ ۲۷۷ نیز ملاحظہ فرمائیں

A. L. Morton's A peoples History of England

مطبوعہ ۱۹۳۵ء صفحہ ۱۰۵

ذاتی طور پر میں ان شکستوں کو اتنا ہی اہم خیال کرتا ہوں جتنا کہ جاپانیوں کے ہاتھوں ۱۹۰۵ء میں روس کی شکست کو۔ نی۔ کے۔

۱۱۱۔ خان: بحوالہ تصنیف صفحہ ۵۱

۱۱۲۔ آ: بحوالہ تصنیف جلد اول صفحہ ۲۴۱

۱۱۳۔ ایضاً صفحہ ۲۴۳

۱۱۴۔ ایضاً صفحات ۳۱۰-۲۷۷

جامع مسجد (دہلی) کی دیواروں پر کسی نظم گو نے چند اشعار لکھے جن کا ناپختہ ترجمہ حسب ذیل ہے:-

جب جنگ سر پر ہوتی ہے اور موکہ آرائی کا نظارہ درپیش ہوتا ہے

خدا اور سپاہی کے حق ہی میں غورے بلند ہوتے ہیں

جب جنگ فتح میں اختتام پاتی ہے

خدا بھول جاتا ہے اور سپاہی کی مٹی پلید ہوتی ہے

سر۔ ٹی۔ مکھن: *Two native narratives of the mutiny at Delhi*

مطبوعہ ۱۸۹۸ء صفحہ ۲۳

۱۱۵۔ ہنڈل ۱۹۲۷، فوریئر نمبر ۳۰ پر واڈ باغیان جس میں انگریزوں کے خلاف ان کی شکایات کی

تفصیل اور ہموطنوں سے بغاوت کی اپیل تھی: (ملاحظہ فرمائیں *Press list of*)

- ۸۴۔ گینس : بحوالہ تصنیف صفحہ ۷۳
- ۸۵۔ تھارن ہل : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۲۲
- ۸۶۔ خان : بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۰-۲۷
- ۸۷۔ ایضاً : صفحہ ۲۷
- مارکس لکھتا ہے : ”زمینداروں کا اصلی طبقہ کمپنی کے دباؤ تلے جلد پس کر سٹ گیا۔ ان کی جگہ نفع خور تاجروں نے لے لی جو اب بنگال کی تمام زمین پر قابض ہیں، سوائے چند جاگیروں کے جو سرکار کے بلا واسطہ انتظام کے سبب واپس کر دی گئیں“ (Articles on India) طبع ہندی، مطبوعہ ۱۹۲۳ء، صفحہ ۱۸
- ۸۸۔ خان : بحوالہ تصنیف صفحات ۲۱-۲۰، کے : بحوالہ تصنیف، جلد اول، صفحات ۷۸-۷۷
- ۸۹۔ گینس : بحوالہ تصنیف صفحہ ۴۱
- ۹۰۔ ریز : بحوالہ تصنیف صفحات ۳۵-۳۴
- ۹۱۔ کے : بحوالہ تصنیف، جلد اول، صفحات ۲۷-۱۲۶
- ۹۲۔ انس : بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۷
- ۹۳۔ گینس : بحوالہ تصنیف صفحہ ۶۶
- Michael Joyce : Ordinal at Lucknow، مطبوعہ ۱۹۳۸ء، صفحہ ۴۷
- ۹۴۔ کیوبراؤن : بحوالہ تصنیف جلد اول، صفحہ ۲۷
- ۹۵۔ تہتہ : بحوالہ تصنیف صفحہ ۶۶
- ۹۶۔ کے : بحوالہ تصنیف، جلد اول، صفحہ ۱۸۰
- ۹۷۔ مائیس : بحوالہ تصنیف جلد اول، صفحات ۴۹-۳۴۸
- ۹۸۔ خان : بحوالہ تصنیف، صفحہ ۲۵
- ۹۹۔ ایضاً : صفحہ ۳۶، گینس : بحوالہ تصنیف، صفحہ ۹۸
- ۱۰۰۔ خان : بحوالہ تصنیف، صفحہ ۲۶
- ۱۰۱۔ ایضاً : صفحہ ۲۶
- ۱۰۲۔ ایضاً : صفحہ ۳۶
- ۱۰۳۔ کے : بحوالہ تصنیف جلد اول، صفحہ ۱۹۷

۱۳۲. *Narratives of the Indian Mutiny* صفحہ ۵ کے: بحوالہ تصنیف

جلد اول، صفحہ ۲۶۵

۱۳۳. مشکات: بحوالہ تصنیف صفحہ ۹

۱۳۵. ایضاً صفحہ ۲۱

۱۳۶. ایضاً صفحہ ۲۱

۱۳۷. کے: بحوالہ تصنیف، جلد اول، صفحہ ۶۳۸ این

۱۳۸. کیو براؤن: بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۲۷۳

۱۴۰. گینس: بحوالہ تصنیف صفحہ ۴۹

۱۴۱. *Trial of Bahadur Shah* مطبوعہ ۱۸۹۵ء صفحہ ۱۶۰

۱۴۲. لارڈ رابرٹس: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۱۱

۱۴۳. مشکات: بحوالہ تصنیف صفحات ۹-۲۰

۱۴۴. ایضاً صفحہ ۹

۱۴۵. ایضاً صفحہ ۹

۱۴۶. کے: بحوالہ تصنیف، جلد دوم، صفحہ ۵۶۵

سر سی۔ ایچ جین اپنی تصنیف: "Lord Lawrence" (۱۸۹۲ء) میں
بیان کرتے ہیں کہ "اس وقت پر ہم مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف آلہ کار بنائے" (صفحہ ۷۷) نیز

ملاحظہ فرمائیں کیو براؤن: بحوالہ تصنیف، جلد دوم، صفحہ ۲۷۳

۱۴۷. مشکات: بحوالہ تصنیف صفحہ ۹

۱۴۸. بنڈل ۱۹۹، فریو ۱۳۷ (اردو)، مورخہ ۱۰ جولائی ۱۸۵۷ء

۱۴۹. ایس: بحوالہ تصنیف جلد پنجم، صفحہ ۲۹۲

۱۵۰. کے: بحوالہ تصنیف، جلد اول، صفحہ ۵۷۹ اس

۱۵۱. مشکات: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۹

۱۵۲. کے: بحوالہ تصنیف جلد اول، صفحہ ۶۵۳

۱۵۳. انس: بحوالہ تصنیف، صفحہ ۵۵

۱۵۴. لارڈ رابرٹس: بحوالہ تصنیف صفحات ۲۹-۲۲۸

Mulensy Papers امپریل ریکارڈ آفس، کلکتہ، ۱۹۲۰ء

۱۱۶- خان: بحوالہ تصنیف صفحات ۲۲-۲۱

۱۱۷- ایضاً صفحہ ۲۲

۱۱۸- ایضاً صفحہ ۲۳

۱۱۹- ایضاً صفحہ ۲۲

۱۲۰- ایضاً صفحہ ۱۲

۱۲۱- منقول تصنیف فارست، جلد اول صفحہ ۱۰

۱۲۲- منقول تصنیف کے، جلد اول صفحہ ۱۳۶

۱۲۳- ایضاً صفحہ ۱۶۵

۱۲۴- ہنری ایس۔ کنگم، Earl Canning مطبوعہ ۱۸۹۹ء طبع چہارم، صفحات ۲۴-۲۶

۱۲۵- جان بروکس مارتن لکھتا ہے: "ملک میں اس قدر سیاسی بے چینی پھیلی ہوئی تھی کہ جو نصف دہائی بنادیس پارکے کو کافی تھی"۔

(The Rebellion in India: How to Prevent another) مطبوعہ ۱۸۵۶ء صفحات ۷-۶

۱۲۶- فیلڈ ارشہ لارڈ رابرٹس تسلیم کرتا ہے کہ "حکومت ہند کے سرکار کی غلات پر اسٹریٹس کی

حالیہ قیمت سے ثابت ہوتا ہے کہ کارٹوسوں کی تیاری میں جو روپیہ محلول استعمال کیا گیا واقعی وہ قابل

اعتراض اجزاء یعنی گائے اور خنزیر کی چربی سے مرکب تھا، اور ان کارٹوسوں کی ساخت میں فوجیوں

کے ذہنی تعصبات اور جذبات کی مطلق پروا نہیں کی گئی"۔

(Forty one years in) ایک جلد طبع، مطبوعہ ۱۹۰۸ء صفحہ ۲۲۱

۱۲۷- انس: بحوالہ تصنیف صفحہ ۵۲

۱۲۸- گمنام: مطبوعہ ۱۸۵۸ء صفحہ ۴

۱۲۹- ٹریولین

۱۳۰- لفٹیننٹ جنرل ٹی۔ ایف۔ وٹسن، Cawn Pore مطبوعہ ۱۸۹۹ء

۱۳۱- سادکر: بحوالہ تصنیف جلد دوم، صفحہ ۱۰۴

۱۳۲- ایضاً صفحات ۹۱-۹۰- سرٹی۔ مکانات بحوالہ تصنیف۔

- ۱۷۱۔ Political Proceedings نمبر ۲۸، مورخہ ۲۰ دسمبر ۱۸۵۹ء پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی تاریخ کے ایک غیر جانبدار معلم کو یقین آجائے گا کہ رانی انگریزوں کے خلاف مارچ ۱۸۵۷ء میں میدان جنگ میں کودی اور وہ بھی اس وقت جب انگریزوں نے بالآخر اس کے ونا داری کے وعدوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔
- نیز ملاحظہ فرمائیں گے : بحوالہ تصنیف جلد سوم صفحہ ۳۷۰
- ۱۷۲۔ ہومز : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۰۹۔ گے : بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۲۰۰
- ۱۷۳۔ ایضاً جلد دوم صفحہ ۲۴۴
- ۱۷۴۔ ایضاً جلد سوم صفحہ ۹۸۔ ایف ایف وہ بھی بحالت مجبوری لڑا۔ ملاحظہ فرمائیں Patna
- University Journal VIII مطبوعہ ۱۹۶۲ء
- ۱۷۵۔ آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا۔
- ۱۷۶۔ تھارن ہل : بحوالہ کتاب صفحات ۸۶، ۳۵
- ۱۷۷۔ ایضاً صفحہ ۸۷
- ۱۷۸۔ ہومز : بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۴۲
- ۱۷۹۔ ایضاً صفحات ۲۴۰، ۲۵۲ نیز ملاحظہ فرمائیں فریڈرک کوپر : The crisis in the Punjab مطبوعہ ۱۸۵۸ء صفحات ۲۱۲، ۲۰۸
- ۱۸۰۔ لو : بحوالہ تصنیف صفحہ ۶۱
- ۱۸۱۔ انس : بحوالہ تصنیف صفحہ ۶۲
- ۱۸۲۔ منقول از تصنیف تہمتہ صفحہ ۶۲
- ۱۸۳۔ انس : بحوالہ کتاب صفحہ ۲۸۔ ہومز : بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۹۵
- ۱۸۴۔ ہومز : بحوالہ تصنیف صفحہ ۵۰۰
- ۱۸۵۔ منقول از تصنیف 'INDIA' جلد دوم صفحہ ۳۳۸ مؤلف پی۔ ای۔ رابرٹس۔
- ۱۸۶۔ تھارن ہل : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۷۱
- ۱۸۷۔ کوپر : بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۱
- ۱۸۸۔ ایپکینس : بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۰۰
- ۱۸۹۔ خوشنوت سنگھ : The Sikhs۔ لبرڈ ۱۹۵۳ء صفحہ ۸۳

۱۵۴۔ کے : بحوالہ تصنیف ، جلد دوم ، صفحہ ۱۰۹

۱۵۵۔ ہونز : بحوالہ تصنیف ، صفحہ ۵۲۶

۱۵۶۔ کے : بحوالہ تصنیف ، جلد دوم صفحہ ۱۱۳۔ اینڈرسن اینڈ صوبیدار
"The last day of the Company" مطبوعہ ۱۹۱۵ء جلد اول صفحہ ۱۱۲

۱۵۷۔ جان بروکس نارٹن : Topics for Indian Statesmen مطبوعہ ۱۸۵۸ء باب دوم ، جابجا

۱۵۸۔ تھارن ہل : بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۴۸۔ نیز ملاحظہ فرمائیں کیو براؤن : بحوالہ تصنیف جلد اول صفحہ ۱۹۲

۱۵۹۔ لو : بحوالہ تصنیف صفحہ ۵۹

۱۶۰۔ منکات : بحوالہ تصنیف ، جابجا

۱۶۱۔ نارٹ : بحوالہ تصنیف جلد اول صفحہ ۲۱۴

۱۶۲۔ گینس : بحوالہ تصنیف ، صفحہ ۱۲۳۔ تھارن ہل : بحوالہ تصنیف : صفحہ ۱۲۳

۱۶۳۔ ہونز : بحوالہ تصنیف ، صفحہ ۱۲۴

۱۶۴۔ ایضاً صفحات ۱۳۸ ، ۱۲ - ۴۱۱

۱۶۵۔ کے : بحوالہ تصنیف ، جلد دوم ، صفحہ ۴۱۱

۱۶۶۔ انٹس : بحوالہ تصنیف ، صفحہ ۶۱

۱۶۷۔ انٹس

۱۶۸۔ فوجی عدالت کے روبرو تانیا ٹوپے نے اپنی شہادت میں کہا : "نانا نے جو کچھ کیا ، مجبور ہو کر کیا۔"

وہ باغیوں کے ہتھے میں ایک قیدی کی حیثیت رکھتا تھا۔

ملاحظہ فرمائیں نارٹ : بحوالہ تصنیف جلد اول ، صفحہ ۴۲۰۔ کے : بحوالہ تصنیف

جلد دوم ، صفحہ ۳۱۰۔ مایٹن : بحوالہ تصنیف ، جلد سوم ، صفحہ ۵۱۵۔ ہونز : بحوالہ تصنیف

صفحہ ۲۲۵

جب تانیا ٹوپے نے یہ بیان دیا تو اس کے لیے بغاوت میں اپنے یا اپنے آقا کے

کارناموں کی وقعت کو گھٹانے کی کوئی وجہ نہ تھی اس کے برعکس ان کارناموں کو بڑھا چڑھا

کر بیان کرنے کی بڑی ترغیب تھی تاکہ وہ قومی سوراؤں کی حیثیت میں زندہ جاوید ہو جائیں۔

۱۶۹۔ ہونز : بحوالہ تصنیف ، صفحہ ۵۱۸

۱۷۰۔ ٹریوٹین : بحوالہ تصنیف صفحہ ۷۹

- ۲۰۱۔ نصف صفحہ ۲
- ۲۰۲۔ کے: بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۲۳۶
- ۲۰۳۔ کوثر: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۰
- ۲۰۴۔ کیو براؤن: بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۲۸۲
- ۲۰۵۔ قاتل: بحوالہ تصنیف صفحہ ۵۴
- ۲۰۶۔ کے: بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۵۹
- ۲۰۷۔ آر سی رت: بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۹۰
- ۲۰۸۔ ایکسٹن: بحوالہ تصنیف صفحہ ۸۱
- ۲۰۹۔ اگرچہ سکھوں کا جذبہ جہاد دبا ہوا تھا لیکن ختم نہیں ہوا تھا۔ دہلی میں باغیوں کی طرف سے سکھ دستے بھی لڑ رہے تھے۔ ملاحظہ فرمائیں مشکات بحوالہ تصنیف صفحات ۱۰۳-۱۹
- ۲۱۰۔ تہ: بحوالہ تصنیف جلد اول صفحہ ۴۲۰۔ ہوتن: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۲۸
- ۲۱۱۔ یہ مقالہ شہزادے کی طرف سے جاری کیا گیا اعلان جس میں باغیوں کے معاہدہ بین کے تحت مقبول از تصنیف اشوک پور صفحات ۲۱-۲۶
- ۲۱۲۔ گھڑ-پولیہ-ظہور ۱۸۵۷ء صفحہ ۶۴
- ۲۱۳۔ نرس ۵۷ فوئو نمبر ۴۱-۵۳۹ (اردو) غیر مورخ
- ۲۱۴۔ ان کے اپنے کلمات: ایضاً قاعدہ نمبر ۷
- ۲۱۵۔ ملی مہاجن، ساہوکار اور کاریگر۔
- ۲۱۶۔ بحوالہ تصنیف، تمہید۔
- ۲۱۷۔ بنڈل ۱۵۰ فوئو ۱۲ (فارسی) ۱۰۳
- ۲۱۸۔ بنڈل ۵۷ فوئو ۴۱-۵۳۹ قاعدہ نمبر ۲
- ۲۱۹۔ ایضاً قاعدہ نمبر ۲۴
- ۲۲۰۔ ایضاً قاعدہ نمبر ۴
- ۲۲۱۔ ایضاً قاعدہ نمبر ۵
- ۲۲۲۔ بحوالہ مقام
- ۲۲۳۔ ان کے اپنے کلمات: ایضاً قاعدہ نمبر ۲

- ۱۹۰۔ کے: بحوالہ تصنیف جلد اول صفحہ ۶۱
- ۱۹۱۔ لینڈ لارڈ
- ۱۹۲۔ فارست: بحوالہ تصنیف جلد اول صفحہ ۱۰۲
- ۱۹۳۔ ہومز: بحوالہ تصنیف صفحات ۲۲۰ کے: بحوالہ تصنیف جلد اول صفحات ۵۹-۶۱
- فارست: بحوالہ تصنیف جلد اول صفحات ۳۸-۳۳-۳۲۰-۳۲۵
- ۱۹۴۔ کوپر: بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۳۱
- ۱۹۵۔ کے: بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۴۷۲ این
- ۱۹۶۔ کیو براؤن: بحوالہ تصنیف جلد اول صفحہ ۲۹۶۔ نیز ملاحظہ فرمائیں: مشکات بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۶۷
- ۱۹۷۔ کوپر: صفحات ۶۸-۵۵-۵۴۔ نیز ملاحظہ فرمائیں *The Hero of Delhi*
- مطبوعہ ۱۹۴۸ء صفحات ۲۰۹-۱۷۱-آرکی۔ دت *The Economic History of India* جلد دوم طبع ہفتم، مطبوعہ ۱۹۵۰ء صفحہ ۹۰
- ۱۹۸۔ ہومز: بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۲۶
- ۱۹۹۔ ایضاً صفحہ ۳۷۶
- ۲۰۰۔ کیو براؤن: بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحات ۸۲-۲۸۱
- ۲۰۱۔ ایضاً صفحہ ۲۸۶۔ ہومز: بحوالہ تصنیف صفحات ۶۸-۳۶۳
- ۲۰۲۔ خان: بحوالہ تصنیف صفحہ ۵۸
- ۲۰۳۔ کوپر: بحوالہ تصنیف صفحات ۷۲-۷۳
- ۲۰۴۔ کے: بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۴۹۲
- ۲۰۵۔ ہومز: بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۱۱
- ۲۰۶۔ ایضاً صفحہ ۳۲۰ کے: بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۴۲۱
- ۲۰۷۔ فارست: بحوالہ تصنیف جلد اول صفحہ ۱۷۱
- ۲۰۸۔ آر۔ راس۔ دتہ سکتھ *Life of Lord Lawrence* مطبوعہ ۱۸۸۳ء
- جلد اول صفحہ ۳۴۱
- ۲۰۹۔ فارست: بحوالہ تصنیف جلد اول صفحہ ۱۷۱۔ ہومز: بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۲

- ۲۵۰۔ بنڈل ۱۹۹، فوئیو نمبر ۱۹۵ (فارسی) ۲۲ جولائی ۱۸۵۷ء
- ۲۵۱۔ Trial of Bahadur Shah صفحات ۲۵-۱۲۷
بادشاہ کی طرف سے مرزا نعل کے نام ایک غیر مؤرخ حکم کی نقل
- ۲۵۲۔ ایضاً فوئیو نمبر ۱۸۵ (فارسی) ۷ اگست ۱۸۵۷ء
- ۲۵۳۔ ایضاً فوئیو نمبر ۴۹ (فارسی) ۷ اگست ۱۸۵۷ء
- ۲۵۴۔ کیو براؤن: بحوالہ تصنیف جلد اول صفحہ ۱۴۰
- ایچ۔ ایچ۔ گریٹھ اپنی تصنیف : Letters written during the Siege of Delhi (1858) میں ۱۹ اگست ۱۸۵۷ء کو لکھتا ہے: "شہزادوں سے مجھے خفر۔ مٹے شروع ہو گئے ہیں۔ وہ اعلان کرتے ہیں کہ انھیں پیشہ ہمارے ساتھ رہنا ہے۔ وہ صرف یہ جانتا چاہتے ہیں کہ وہ ہماری کیا مدد کر سکتے ہیں۔" صفحات ۶-۲۰۵
- یہ بھی قابل ذکر ہے کہ بادشاہ بہادر شاہ نے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو انٹینٹ گورنر آگرہ کے نام ایک خط لکھا جس میں اس نے میرٹھ کے باغیوں کے دہلی میں دھڑ ہونے سے مطلع کیا۔ ۳۱ جولائی ۱۸۵۷ء کو دہلی کا محاصرہ کرنے والی برطانوی فوج کے کانڈر ان چیف جنرل میڈر نے چیف کمشنر پنجاب سر جان لارنس کو لکھا کہ اگر ہم بادشاہ کو جان بخشی اور چٹن کا یقین دلا دیں تو وہ ہم پر شہر اور لال قلعہ کے دروازے کھول دے گا۔
- بادشاہ کی چھیتی بیگم زینت محل نے بادشاہ کے ساتھ اپنے اثرو رسوخ کو کام میں لانے کی پیش کش کی تاکہ مصالحت کی کوئی نہ کوئی راہ نکال جائے۔ (گریٹھ بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۱۷)
- ۲۵۵۔ بنڈل ۱۹۹، فوئیو نمبر ۱۳۷ (اردو) ۲۰ جولائی ۱۸۵۷ء۔ اداکین مجلس کی بادشاہ کی خدمت میں درخواست
- ایضاً ۲۵۰۔
- ۲۵۶۔ بنڈل ۱۹۹، فوئیو نمبر ۶ (اردو) ۸ اگست ۱۸۵۷ء
- ۲۵۷۔ بنڈل ۱۹۹، فوئیو نمبر ۱۳۷ (اردو) ۱۰ جولائی ۱۸۵۷ء
- ۲۵۸۔ بنڈل ۱۹۹، فوئیو نمبر ۶۱ (اردو) ۸ اگست ۱۸۵۷ء
- ۲۵۹۔ بنڈ ۱۵۳، فوئیو نمبر ۱ (فارسی) غیر مؤرخ۔ بنڈل ۱۵۷، فوئیو نمبر ۵۲۲ (فارسی) ۱۹ اگست ۱۸۵۷ء

۲۳۲۔ ان کے اپنے کلمات، بحوالہ مقام

۲۳۳۔ ایضاً، قاعدہ نمبر ۱۱

۲۳۴۔ بحوالہ مقام

۲۳۵۔ کیمپ بیل، بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۲۵۶

۲۳۶۔ بنڈل ۵۷، فوئو ۴۱-۵۳۹ (اُردو) قاعدہ نمبر ۸

۲۳۷۔ ایضاً قاعدہ نمبر ۷

۲۳۸۔ Trial of Bahadur Shah مطبوعہ ۱۸۹۵ء، صفحات ۱۴۰-۱۳۷

شہزادہ ظہیر الدین لٹن مرزا مغل نے شاہنشاہ کو لکھا کہ میر نے جہول بخت خاں اور مجلس دوسرے اراکین کے ساتھ بات چیت کی ہے لیکن انھوں نے بادشاہ سلامت کی تجاویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

بنڈل ۱۹۹، فوئو ۱۵۵ (فارسی) غیر مورخہ

۲۳۹۔ Trial of Bahadur Shah سابق بادشاہ کا بیان صفحہ ۱۳۰-۱۳۷

۲۴۰۔ دہلی آراء اخبار، جلد ۱۹، شمارہ ۲۱، ۲۲ مئی ۱۸۵۷ء

۲۴۱۔ Trial of Bahadur Shah صفحات ۱۳۵-۱۳۲، بادشاہ کی طرف سے مرزا مغل کے نام ایک خط میں مکمل حوالہ، غیر مورخہ

۲۴۱۔ بنڈل ۱۹۹، فوئو ۲۶۰ (فارسی) ۹ اگست ۱۸۵۷ء

۲۴۲۔ بنڈل ۵۷، فوئو ۴۱-۵۳۹ (اُردو) قاعدہ نمبر ۲۔ غیر مورخہ

۲۴۳۔ بحوالہ مقام

۲۴۴۔ ایضاً قواعد نمبر ۸-۹-۱۰

۲۴۵۔ ایضاً قاعدہ نمبر ۸

۲۴۶۔ ایضاً قواعد نمبر ۸، ۷

۲۴۷۔ ایضاً قواعد نمبر ۷، ۶

۲۴۸۔ بنڈل ۵۷، فوئو نمبر ۲۸۵ (اُردو) ۸ اگست ۱۸۵۷ء

۲۴۹۔ ایضاً، فوئو نمبر ۱۹، ۱۳۰، ۲۷۷ (اُردو) مورخہ ۱۳، ۱۲ جولائی اور ۸ اگست ۱۸۵۷ء

- ۲۷۷۔ کے: بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحات ۲۲۲-۲۲۳
- ۲۷۷۔ تھارن ہل: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۲۲
- ۲۷۸۔ "آریہ کیرتی" مصنفہ رجنی گپتا بنگالی۔ منقول از تصنیف ساورگر صفحہ ۲۲۵
- ۲۷۹۔ مشکاف: بحوالہ تصنیف، جابجا ہومز: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۵۲۔ تو: بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۸۵۔ تھارن ہل: بحوالہ تصنیف صفحات ۷۶-۸۶ گینس: بحوالہ تصنیف صفحہ ۶۲
- ۲۸۰۔ تھارن ہل: بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۰۸
- ۲۸۱۔ ہومز: بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۵۲
- ۲۸۲۔ خان: بحوالہ تصنیف صفحہ ۵
- ۲۸۳۔ جائیس: بحوالہ کتاب صفحہ ۸۱
- ۲۸۴۔ ہومز: بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۲۳
- ۲۸۵۔ جنرل مر جیز اوڈرام: Orders, despatches and correspondence مطبوعہ ۱۸۵۹ء صفحہ ۲۹۷
- ۲۸۶۔ انس: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۲
- ۲۸۷۔ کے: بحوالہ تصنیف جلد دوم، صفحہ ۲۶۵
- ۲۸۸۔ لفٹیننٹ جنرل انس: Lucknow and Oudh in mutiny مطبوعہ ۱۸۹۶ء صفحہ ۲۹۳
- ۲۸۹۔ گینس: بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۳۰
- ۲۹۰۔ انس: The sepoy revolt P III ہومز: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۶
- ۲۹۱۔ تمام نجی داستانوں میں ایسے حوالے بکثرت موجود ہیں۔ بقول گینس "غذاری کی صورت ایک مثال ہے جس سے ہمیں واسطہ پڑا" (بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۲۰)
- ۲۹۲۔ کے: بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۲۶۰
- ۲۹۳۔ ہومز: بحوالہ تصنیف صفحات ۱۲۳-۲۶۰
- ۲۹۴۔ منقول از تصنیف ہومز صفحہ ۶۲۶
- ۲۹۵۔ انس: Lucknow and Oudh in mutiny صفحات ۹۳-۲۹۱
- ۲۹۶۔ نین: بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۲۰۹

- ۲۶۱- بڈل ۱۵۳، فوئیو نمبر ۱۶ (فارسی) غیر موثر
- ۲۶۲- بڈل ۱۹۹، فوئیو ۲۲۸ (فارسی) ۶ اگست ۱۸۵۷ء
- ۲۶۳- بڈل ۱۹۹، فوئیو نمبر ۱۳۷ (اُردو) ۱۰ ارجوال ۱۸۵۷ء
- اس کا مضمون یہ ہے "اگر دستاویزات کے موافق اور گواہوں یعنی قانون گواہوں کی اور موضع کے معتز آدمیوں کی شہادت پر یہ بات واضح طور پر ثابت ہو جائے کہ مدعی دائر زمین پر قابض تھا تو انتقال حق ملکیت اس کے نام کر دیا جائے گا۔"
- ۲۶۴- بڈل ۱۰۶، فوئیو نمبر ۲۰ (اُردو) ۶ جولائی ۱۸۵۷ء، نیز بڈل ۱۲۶، فوئیو نمبر ۲۰ (اُردو) ارجون ۱۸۵۷ء
- ۲۶۵- بڈل ۴۰، فوئیو نمبر ۲۹۷ (اُردو) ۹ اگست ۱۸۵۷ء
- ۲۶۶- بڈل ۱۲۹، فوئیو نمبر ۴۲، ۴۹، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، مختلف تواریخ کے
- ۲۶۷- بڈل ۱۵۳، فوئیو نمبر ۶ (فارسی) ۲۸ جولائی ۱۸۵۷ء
- ۲۶۸- ملاحظہ فرمائیں ماسیہ نمبر ۲۶۱
- ۲۶۹- کیپٹن جی۔ بیچنسن
- صفحہ ۱۶۱- ریز: بحوالہ تصنیف ۲۶۱ — بیچنسن مجلس انتظامیہ ہفتہ کے مندرجہ ذیل پار
- ۱- داروغہ واجد علی ۵- مول خاں شریف لدوہ ۲- کیپٹن امروہ ۳- کیپٹن امروہ ۴- ریز: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۶۲
- ۲۷۰- ریز: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۶۲
- ۲۷۱- جے مال پوانز ویز
- صفحہ ۲۶۵
- ۲۷۲- ریز: بحوالہ تصنیف صفحات ۶۳-۶۴
- ۲۷۳- ایضاً صفحات ۶۳-۶۴
- ۲۷۴- انس: بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۵۲
- ۲۷۵- ہومز: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۶۰
- ۱۸۸۷ء INDIA .. Under British rule

۲۱۶۔ شکات : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۱۶

۲۱۷۔ ایضاً جابجا

۲۱۸۔ ایضاً صفحہ ۹۳

۲۱۹۔ ایضاً صفحہ ۲۱۲

۲۲۰۔ ایضاً صفحہ ۲۱۳

۲۲۱۔ ایضاً صفحہ ۲۱۴

۲۲۲۔ ایضاً صفحہ ۹۷

۲۲۳۔ بحوالہ مقام

۲۲۴۔ کوپر : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۱۲

۲۲۵۔ ایضاً صفحات ۲۱۰-۲۱۱

۲۲۶۔ اشوک مہتہ : بحوالہ تصنیف صفحہ ۶۴۔ ہومز : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۵۸

۲۲۷۔ ہومز : بحوالہ تصنیف صفحات ۲۵، ۱۶۲، ۱۴۰، ۱۸۸، ۲۵۲ اور ۲۶۱

۲۲۸۔ وجوہات کے لیے ملاحظہ فرمائیں (سٹریچے : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۲۷)

۲۲۹۔ تھارن ہل : بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۱۴

۲۳۰۔ کے : بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۲۹۱۔ تھارن ہل : بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۰۷

۲۳۱۔ کوپر : بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۱۵

۲۳۲۔ ہومز : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۷۵۔ کے : بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۱۱۷۔ تھارن ہل : بحوالہ

تصنیف صفحہ ۱۰۸۔ فان : بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۸

۲۳۳۔ ہومز : بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۷۰

۲۳۴۔ ایضاً صفحات ۱۶۳، ۱۶۸

۲۳۵۔ تو : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۲۹

۲۳۶۔ ہومز : بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۴۳۔ وجوہات کے لیے ملاحظہ فرمائیں ریکس : بحوالہ تصنیف

صفحہ ۱۳۷

۲۳۷۔ ہومز : بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۴۳۔ نارٹن نے اپنی تصنیف : Topics for Indian

Stalesman (1858) میں بیان کیا : "جواہان پڑھے لکھے ہندوستانیوں نے ہم پر کیا ہے

- ۲۹۰۔ جارج کیمپ بیل: بحوالہ تصنیف جلد دوم، صفحہ ۱۲۷۔ باس ورکھ ستمہ: بحوالہ تصنیف جلد دوم، صفحہ ۱۴۶، ۱۹۸، ۱۹۵-۱۹۳۔ انس: *the sepoy report* صفحات ۲۲۲-۵
- ۲۹۸۔ منقول از تصنیف ہونز صفحہ ۲۲۷۔ مالسن: بحوالہ تصنیف جلد سوم صفحہ ۲۵۱ صدر بورڈ آف کنٹرول لارڈ ایلن برائے اعلان کو پسند نہ کیا۔ ملاحظہ فرمائیں گفتہ: بحوالہ تصنیف

باب ہفتم، جابجا

- ۲۹۹۔ ہونز: بحوالہ تصنیف صفحہ ۵۲۷
- ۳۰۰۔ اسٹریچی: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۸۱
- ۳۰۱۔ ایضاً صفحہ ۳۸۲
- ۳۰۲۔ سالکس: *Compendium of the laws specially related to the Talukdar's of Oudh* صفحات ۸۳-۲۸۲
- ۳۰۳۔ ہونز: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۳۲۔ کے: بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۳۹۱
- ۳۰۴۔ چارلس ریکس: *Notes on the revolt in the N.W. Provinces of India (1858) pp 156*
- ۳۰۵۔ منقول از تصنیف کیو براؤن جلد دوم صفحہ ۳۷
- ۳۰۵۔ ملکات: بحوالہ تصنیف صفحہ ۸۷
- ۳۰۶۔ ایضاً صفحہ ۸۷
- ۳۰۷۔ ایضاً صفحہ ۹۳۔ کوپر: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۰۳
- ۳۰۸۔ ملکات: بحوالہ تصنیف صفحات ۹۲-۱۹۳
- ۳۰۹۔ ایضاً صفحات ۱۷۵، ۱۷۸
- ۳۱۰۔ ایضاً صفحہ ۲۲۰۔ ہونز: بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۵۲
- ۳۱۱۔ کیو براؤن: بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۳۹۔ ملاحظہ فرمائیں حاشیہ نمبر ۲۵۲
- ۳۱۲۔ ملکات: بحوالہ تصنیف صفحہ ۵۹
- ۳۱۳۔ ایضاً صفحہ ۹۳
- ۳۱۴۔ ایضاً صفحہ ۲۰۳
- ۳۱۵۔ ایضاً صفحہ ۲۱۲

- ۲۵۵۔ گبتش : بحوالہ تصنیف صفحہ ۹۸
- ۲۵۶۔ میور : بحوالہ تصنیف صفحات ۸۲-۲۸۲
- ۲۵۷۔ حکومت ہند بنام وزیر ہند : منقول از تصنیف ہٹریچ صفحہ ۳۸۱
- ۲۵۸۔ اسٹریچے : ایضاً صفحات ۸۲-۳۸۱
- ۲۵۹۔ ایضاً صفحہ ۳۸۲
- ۲۶۰۔ کنگکم : بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۰
- ۲۶۱۔ منقول از تصنیف اشوک تبتہ صفحہ ۷۴
- ۲۶۲۔ ایضاً صفحات ۷۳-۷۱
- ۲۶۳۔ بحوالہ مقام
- ۲۶۴۔ ایضاً صفحہ ۷۴۔ گبتش نے لکھا : "برطانوی سلطنت ہندوستان میں پہلے حقیقتاً اعتقاد پر مبنی تھی۔ اس کے بعد یہ مادی قوت کی مستحکم بنیاد پر قائم ہوئی۔ پہلے ہم نے اس فوج پر بھروسہ کیا جو ملک رعایا سے بھرتی کی گئی تھی۔ اس کے بعد ہم اپنے ہم وطنوں کی سنگینوں پر زیادہ اعتماد رکھیں گے۔" (بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۳۶)
- ۲۶۵۔ ریکس کا بیان ہے : "مسلمان باغی کا مترادف کلمہ تھا" (بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۷۵) نیز ملاحظہ فرمائیں بال : بحوالہ تصنیف جلد دوم، صفحات ۷۹، ۹۲۔ کیو۔ براؤن : بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۲۷۲۔ انس : The Sepoy Report صفحہ ۸
- ۲۶۶۔ سرولیم میور : Indian Mutiny: Intelligence Record مطبوعہ ۱۹۰۲ء جلد اول، صفحہ ۲۷۳
- ۲۶۷۔ سی۔ الف۔ اینڈریوز : Maulvi Zakaullah of Delhi P 38
- ۲۶۸۔ منقول از تصنیف محمد نعمان : Muslim India مطبوعہ ۱۹۲۲ء صفحہ ۲۲
- ۲۶۹۔ سر ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ ہنٹر : Our Indian Musalmans طبع دوم مطبوعہ ۱۹۷۲ء صفحہ ۱۷۰
- ۲۷۰۔ سیٹیل : The expansion of England طبع ششم مطبوعہ ۱۹۱۲ء صفحہ ۲۱۲
- ۲۷۱۔ تبتہ : بحوالہ تصنیف صفحہ ۷۰
- ۲۷۲۔ آرکس : بحوالہ تصنیف صفحہ ۶۵ ۲۷۳۔ ایضاً صفحہ ۲۵ ۲۷۴۔ ایضاً صفحہ ۶۶

اس کا ہم شکریہ کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں : (صفحہ ۵۶) نیز ملاحظہ فرمائیں بروس ٹائیٹل
 میٹکی : English Education and the Origin of Indian -
 Nationalism - مطبوعہ ۱۹۲۰ء صفحات ۲۴-۲۲۶

۲۲۸۔ منلیہ حکومت
 ۲۲۹۔ ایس۔ سی۔ بیگنسن : Memorials of service in India
 صفحہ ۳۱۱

۲۳۰۔ Political proceedings : نمبر ۱۷۸۰، ۲۰ دسمبر ۱۸۵۹ء

۲۳۱۔ نانا صاحب نے ملکہ معظّمہ، پارلیمنٹ، کورٹ آف ڈائریکٹرز، گورنر جنرل وغیرہ کے نام ایک
 خط مورخہ ۲۰ مارچ ۱۸۵۹ء میں لکھا کہ یہ تعجب اور حیرت کا مقام ہے کہ آپ نے ان لوگوں کو
 معاف کر دیا ہے جو واقعی قاتل ہیں اور اس کو معاف نہیں کیا گیا جو بحالتِ مجبوری باغیوں کے
 ساتھ شامل ہوا۔ (Political proceedings نمبر ۶۰، ۶۲، ۲۷ مئی ۱۸۵۹ء نمبر کے ذیلیو ۶۲)

۲۳۲۔ مارکس : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۸

۲۳۳۔ اینڈرسن اینڈ صوبیدار : بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۱۴

۲۳۴۔ مشکات : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۱

۲۳۵۔ ملاحظہ فرمائیں مذکورہ بالا فصل پنجم

۲۳۶۔ مشکات : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۱۴

میجر جنرل سراوون ٹوڈر بن

۲۳۷۔ ۱۸۹۱ء صفحہ ۵۵-این : Clyde and Strathnairn مطبوعہ

۲۳۸۔ بال : بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۶۰۹

۲۳۹۔ رسل : بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۲۲۲

۲۴۰۔ ملاحظہ فرمائیں حاشیہ نمبر ۲۶۱

۲۴۱۔ بنڈل ۱۹۹، فروری نمبر ۲۵ (نارسی) ۱۸۵۶ء

۲۴۲۔ اسٹریچے : بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۸۰

۲۴۳۔ پی۔ ای۔ رابرٹس : بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۳۸۸

۲۴۴۔ ریکزے یوڈ : بحوالہ کتاب صفحہ ۳۸۲

اس کے علاوہ وہابی تحریک مزدور عوام کی بہتر اور زیادہ خوشحال زندگی کی خواہش کی ترجمان تھی۔ اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس دور کے وہابی راہنماؤں میں مزدوروں کی قوت اور استقلال کی بھی جھلک ملتی ہے اور زوال پذیر مکران طبقے کی انجمنوں کی بھی۔

اس مقالے میں ہم ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں وہابیوں کے رول کا جائزہ لیں گے لیکن ان واقعات کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے جنہوں نے احیائے اسلام کی روایت کی خاص شکل اختیار کی ہیں کسی قدر پیچھے سے شروع کرنا ہوگا۔

۱۔ روایت

شاہ ولی اللہ

علاؤ خاص طور پر سنی اور ابو حنیفہ کے فرقے سے تعلق رکھنے والے) روایتاً مغلیہ سلطنت کا لازمی حصہ تھے۔ بالعموم تعلیمی اداروں کا اہتمام انھیں کے سپرد تھا۔ یہی عدالت کے منصبوں پر فائز ہوتے تھے اور اوقاف کے نگران ہوتے تھے۔ جب ”فتاویٰ عالمگیری“ (جو اورنگ زیب کے عہد میں قانون شریعت کا خلاصہ تھی) مرتب ہو کر نافذ ہوئی تو علما کو حکومت کے معاملات میں کافی عمل دخل حاصل ہو گیا۔ اس کی وفات کے بعد یہ اور بھی بڑھ گیا کیوں کہ جلد ہی مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہو گیا۔ تیموریوں کی بحالی کا مسئلہ نہ صرف مغل حکمرانوں کے لیے بلکہ علما کے لیے شدید اہمیت اختیار کر گیا کیونکہ انھیں پر علما کا انحصار تھا۔ اس مرحلے پر شاہ ولی اللہ (وفات ۱۰۶۲ھ) سامنے آئے جو احیائے اسلام کے حامیوں میں سب سے زیادہ جدت پسند اور تعمیری مفکر تھے اور جو سیاسی حقائق سے بخوبی آشنا تھے۔ انھوں نے ابتدا ہی میں یہ بات تسلیم کی کہ چند خاندانوں میں دولت کا اجتماع اور اس کی غیر مساوی تقسیم ایسی خرابیاں ہیں جو لازمی طور پر سماج میں تنزل اور اذیت فری کا سبب بنتی ہیں۔ اس لیے انھوں نے اس اشد ضرورت پر زور دیا کہ قومی دولت کی منصفانہ اور مساوی تقسیم ہو اور ساتھ ہی سماج کا ایک متوازن ڈھانچہ ہو اور پیدا کاروں کی سلامتی اور ان کی سماجی مجلس آزادی کی ضمانت ہو۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر یہ شرائط پوری نہ کی گئیں تو شہری سماج تباہ ہو جائے گا۔

شاہ ولی اللہ نے مغلیہ سلطنت کے زوال کا سبب ان بھاری اور ناقابل برداشت ٹیکوں کو قرار دیا جو کسانوں، کاریگروں، تاجروں یا دوسرے لفظوں میں پیداوار میں مشغول لوگوں کو

کے۔ ایم۔ اشرف

احیائے اسلام کے حامی اور ۱۸۵۷ء کا انقلاب

اگر ہم ۱۸۵۷ء سے متعلق سرکاری اور برطانوی دستاویزات کا مطالعہ کریں تو دھندلا سا
مکمل ہوتا ہے کہ احیائے اسلام کے حامی گروہوں، بالخصوص وہابیوں کا اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ تعلق
موجود تھا۔ جا بجا جہاد کی دعوت، بڑے شہروں میں پولیوں کے فتووں اور بغاوت کے اہم مراکز
میں سبز علم کی نمائش کا ذکر ملتا ہے۔ ان سب باتوں سے ظاہر ہے کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات میں
احیائے اسلام کی تحریک کارنگ تھا۔ بہادر شاہ کے مقدمے کے سلسلے میں یہ بیان نامہ بند کیا گیا کہ
جنرل بخت خان ایک وہابی تھا اور اس نے سرفراز علی نام کے ایک شخص کو مجاہدین کا سالار مقرر کر
دیا اور یہ کہ مختلف مقامات سے وہابیوں کے دستے باغیوں کے ساتھ شامل ہوئے۔ ان مقامات
میں ٹونگ بھی شامل تھا۔

البتہ اس سے اس بغاوت میں ان کے حصے یا کارناموں کی مکمل اور واضح تصویر نہیں ملتی
درحقیقت اس بات کی اہمیت کو پورے طور پر نہیں سمجھا جاتا کہ احیائے اسلام کا رجحان مسلمانوں کے
سیاسی نظریات کی تشکیل میں فیصلہ کن اثر رکھتا تھا اور یہ کہ صرف وہابی ہی تھے جو انگریزوں کے
خلاف محکم عقائد کے ساتھ لیس ہو کر میدان میں نہ صرف خود اترے بلکہ ان کی پشت پر سارے
شمالی ہندوستان میں منظم مراکز کا ایک جال بچھا ہوا تھا۔ جنوب میں رہنے والوں کے ساتھ بھی
ان کا رابطہ تھا اور ملک کے طول و عرض میں روشن خیال مسلمانوں پر انھیں اثر و رسوخ بھی
حاصل تھا۔ ایک طرح دیکھا جائے تو سیاست اور مذہب کے متعلق وہابی نظریہ حکمران مسلم
طبقوں کی اس صد سالہ مخالفت کا آئینہ دار تھا جو برطانیہ کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے انھیں تھی

سیت تمام مغل حکمرانوں کو انگریزوں کے خلاف نئے جہاد میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ چوں کہ شاہ عالم سندھیا کا محض ایک وظیفہ خوار تھا اس لیے وہ اس ہم میں شامل نہ ہوا۔ ٹیپو نے حکم دیا کہ جمعہ کے خطبہ میں مغل شہنشاہ کے نام کی جگہ اس کا اپنا نام شامل کر دیا جائے۔ بحیثیت ایک مطلق العنان فرما دوائے اسلام اور احیائے اسلام کے حامی کے ٹیپو نے نہ صرف اپنی مملکت اور حیدرآباد کی پڑوسی ریاست میں انگریزوں کے خلاف جہاد کی تلقین کی بلکہ دور کے صوبہ بنگال اور کانٹھیا داڑ کو بھی اپنے سفیر بھیجے۔ یہ اسلام میں نئی روح کی دلیل ہے کہ جب سرنگاپٹم پر انگریزوں نے ۱۷۹۹ء میں قبضہ کر لیا تو ٹیپو نے ہاتھ میں تلوار لے کر لڑتے ہوئے جان دینے کا فیصلہ کیا۔

انگریزوں کے خلاف لڑنے کا جو جذبہ اس نے پیدا کیا تھا وہ جلد ہی ۱۸۰۳ء کے غدریلو میں رد نہا ہوا۔ جنرل برگس کے قول کے مطابق "جنوب میں ہمارے اقتدار کو نشانے کے لیے غیر مطمئن مسلمانوں کی طرف سے یہ پہلی کوشش تھی"۔ جنرل موصوف نے مزید لکھا ہے کہ اس کی اپنی رجسٹ کے مسلمان فوجی جو اس وقت حیدرآباد میں متعین تھے مخالف سازشوں میں دل سے شریک تھے اور اس کے بہت سے برطانوی افسر اپنے سر ہانے مجبور ہوئے ہسپتال "رکھ کر سوتے تھے" درحقیقت یہ ۱۸۰۳ء کا رہرسل تھا۔ اس وقت کے گورنر مدراس لارڈ ٹینک نے کہا کہ ہندوستانی پیادہ اور رسالہ فوج کو مذہب کے سوال پر حسن تدبیر کے ساتھ بھڑکایا گیا تھا اور "شورش پسند عناصر سلطان ٹیپو کے کسی بیٹے کے تحت از سر نو مسلم حکومت کے قیام کا منصوبہ بنا رہے تھے نیز کسی "بڑے دھماکے" کی روک تھام کے لیے اس نے بے حد چوکس رہنے کی تاکید کی کیوں کہ سازش دور دور تک فوج میں پھیل چکی تھی"۔

ان حالات میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ۱۸۰۳ء میں سرنگاپٹم کے مسلمانوں نے دہلی کے باغیوں کی کامیابی کے لیے سلطان ٹیپو کے مقبرے پر جا کر باقاعدہ دھماکا لگایا۔ بہادر شاہ جو دہلی کی باغی حکومت کا صرف نام کا سربراہ تھا، اس احساس سے شرم اور ذلت محسوس کر رہا تھا کہ انگریزوں کے خلاف سلطان ٹیپو کا جہاد ہندوستانی فوج کی حمایت اور مدد سے محروم رہا۔ ۱۳

احیائے اسلام کے حامی بنگال کے فرانضی

مسلم نشاۃ ثانیہ کی ترقی میں بنگال کے فرانضی احیائے اسلام میں زرعی اصلاحات کے رجحان کے ترجمان ہیں۔ یہ ۱۷۹۳ء کے بندوبست دوامی اور برطانیہ کی اس اقتصادی پالیسی کے اثر

حکمران طبقہ کے عیش و آرام کی فراہمی کی خاطر ادا کرنے پڑتے تھے۔ مسلم حکومت کی دوبارہ تعمیر کی خاطر ایک نئی نظریاتی بنیاد ڈالنے کے لیے انھوں نے حضرت محمدؐ کی احادیث کی روشنی میں قرآن مجید کی حقیقی تعلیمات پر زور دیا۔ انھوں نے ایک طرف خلافت اور امامت کے عقائد کے بیچ (یعنی سنی اور شیعہ فرقوں کے بیچ) اور دوسری طرف شریعت اور طریقت یعنی قدامت پسندی اور تصوف کے درمیان بڑھتی ہوئی علیحدگی کو پاٹنے کی کوشش کی۔ شاہ ولی اللہ بلاشبہ انیسویں صدی کے احیائے اسلام کے ممتاز محرکوں میں ہیں جنھوں نے برطانوی حکومت کے خلاف پے درپے شورشوں کی تنظیم اور قیادت کی۔

سلطان ٹیپو

دکن میں مسلمان، مسلم معاشرے کے اسامی تعمیر نو کے مسئلے سے دوچار نہیں تھے بلکہ انھیں برطانوی جارحیت کی ٹھوس حقیقت سے سامنا تھا۔ سلطان ٹیپو نے اسلام میں نئی روح پھونکنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس لیے پیچھے کی طرف دیکھنے کی بجائے اس نے مستقبل کے انقلاب فرانس کے انقلابی انگیز تصورات سے بھی بکثرت استفادہ کیا اور نیپولین کے فن حرب سے بھی۔ اس کا جہد پسند مسلمانوں کا "احمدی" دستہ جدید ترین یورپی نمونے پر منظم کیا گیا تھا اور مغل امراء کی فوج کے مقابلے میں عثمانی ترکوں کے جال شاد سپاہیوں سے زیادہ مشابہ تھا۔ احیائے اسلام کے اپنے دعوے کی رعایت سے وہ بعض اوقات جہاں گہرے ہمعصر سید احمد سرہندی کی تصنیفات کا حوالہ دیتا تھا۔ جیسا کہ ولزلی پیرز (Wellesley) سے ظاہر ہے سرنگاپٹم میں ایک باقاعدہ انجمن جمہور قائم کی گئی اور ایک رات یونیسٹ انجمن کے اراکین نے رسی طور پر بادشاہت کے تمام نقوش کو جلا دیا اور اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ ٹیپو نے اپنے فوجیوں کے نام احکام جادی کے کہ وہ سلام کے سادہ دستور کے مطابق ایک دوسرے سے "سلام علیکم" اور اس کے جواب میں "علیکم السلام" کہہ کر خطاب کریں اور قدیم دربار داری کے پرتکلف اور رسمی آداب کو ترک کر دیں۔ اپنی فکر و میں سلطان ٹیپو نے تمام مسلمانوں کو روزی کے وسائل ہم پہنچانے کا بیڑا اٹھایا اور جو لوگ تجارت یا زراعت کا پیشہ اختیار کیا کرتے تھے ان میں سے ہر ایک کو حکومت کی طرف سے ضروری سرمایہ اور زمین حسب ضرورت پیشہ کرنے والوں کو مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن قرار دیا۔ اس نے مغل شہنشاہ شاہ عالم

قابل اور نڈر شاہ عبدالعزیز کے حصے میں آئی جس نے بلاتامل اعلان کیا کہ دہلی سے کلکتہ تک سارا ملک نصرازیوں کے قبضے میں چلا گیا ہے۔ وہ مطلق العنان اور اعلیٰ اقتدار کے مالک ہیں جب کہ حیدر آباد، لکھنؤ اور رام پور کے نام نہاد مسلمان حکمران ان کے رحم و کرم پر ہیں ۱۹ دوسرے لفظوں میں ہندوستان شرعی کی رو سے دارالاسلام نہیں رہا اور اب اسے دارالحرب تصور کرنا ہوگا۔

اس سے کلیتہً ایک نئی اور نازک صورت حال پیدا ہو گئی کیوں کہ جب ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا گیا تو مسلمانوں پر یہ فرض ہو گیا کہ وہ یا تو انگریزوں کے خلاف جہاد کریں یا کسی آزاد مسلم ملک کو ہجرت کر جائیں۔ اس کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔ اگر کسی ناگزیر سبب کی بنا پر انھیں انگریزوں کے تحت رہنا ہی پڑے تو انھیں انگریزی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ انگریز غاصبوں کے ساتھ دوستی یا اشتی ممکن نہیں، درحقیقت یہ قطعی طور پر حرام تھی۔

اگلا قدم امام کا انتخاب تھا جو جہاد کا اہتمام کرے اور جس کے ہاتھوں بیعت کی جائے اور حلفِ وفاداری اٹھایا جائے ۲۰

مناسب مدت کے بعد سید احمد بریلوی (۱۸۳۱-۱۸۸۶ء) کو امام اور امیر المسلمین منتخب کر لیا گیا جب کہ ولی اللہ کے خاندان کے محمد اسماعیل (وفات ۱۸۸۳ء) کو اس کا نائب اور نائب محارب متقرر کیا گیا۔ سید احمد نے نہایت شدت کے ساتھ کہا کہ اگر کوئی امامت (یعنی سید احمد بریلوی) کی قبول کرنے سے انکار کرے یا قبول کرنے سے خوف ہو جائے تو اسے اسلام کا غدار سمجھا جائے اور اسے وہی سزا دی جائے جو کسی اور کا فر کو ۲۱۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ یہ وہابی (جنہوں نے بعد میں سید احمد بریلوی کی قیادت میں قرآن کے اصولوں پر مبنی حکومت قائم کی) چھوٹے تاجروں، رعیت اور کاری گروں پر عاید کی گئی قدیم اور ناجائز جنگی اور محصول کو اسلام کے انشاء و منشا کے منافی سمجھتے تھے۔ وہ کھلم کھلا مقامی حکام کے جبری مطالبات کی وجہ سے ان کی مذمت کرتے تھے ان حکام میں فاضی اور کوٹوال بھی شامل تھے۔ محمد اسماعیل نے اپنی ذہانت سے مغل شہنشاہوں کے جد امجد تیمور کی حکومت کے زمانے میں صادر کیے گئے ایک فتوے میں ان بنیادی اصلاحات کا جواز ڈھونڈ نکالا ۲۲۔ اس طرح وہابیوں نے لوگوں کو تلقین کی کہ وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر سرکار کا مقابلہ کریں اگر اس کے قانون کی تعمیل سے احکام الہی کی خلاف ورزی ہوتی ہو ۲۳۔ ان کے پیرو ادھر ادھر پھرتے اور کھلم کھلا یہ پرچار کرتے کہ ظالم اور جابر کی ہر کام میں مزاحمت کی جائے ۲۴

یہ عجیب بات ہے کہ سربراہِ ردہ وہابی مقلدین نے امام کے تصور کی بنیاد مطلق العنانی پر رکھی

سے وجود میں آئے جس نے قدیم مسلمان زمینداروں کو ختم کیا اور بنگال کی دستکاریوں کو تباہ کر دیا۔
 ڈھاکہ کی آبادی ایک لاکھ پچاس ہزار سے گھٹ کر بیس ہزار رہ گئی۔ یہ لوگ زمینداروں کو زمین سے
 بلا معاذ بے دخل کرنے کا پرچار کرتے تھے ۱۲ فریدپور کے شریعت اللہ نے ۱۸۰۴ء میں فرائضی تحریک
 کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس کا پہلا کام یہ تھا کہ اس نے نئے زمینداروں کی جبری وصولیوں کے خلاف ایک
 کے نام پر متحد کیا جس میں پھر سے جان ڈالی گئی تھی۔ اس وقت عام خیال تھا کہ فرائضیوں کا اصل مقصد
 غیر ملکی حکمرانوں کو نکلانا اور مسلمانوں کے اقتدار کو بحال کرنا ہے۔ بنگال کی سرکار کے سپرنٹنڈنٹ
 پولیس ڈیپٹی نے بعد میں یہ خیال ظاہر کیا ۱۵ اور شریعت اللہ کے بیٹے اور جاکشین دودویاں
 انگریزوں کے خلاف سرگرمیوں سے اس کی تصدیق ہو گئی۔

دودویاں نے براہیت میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے فوجیوں کے خلاف جداگانہ مگر ناکام شورش
 کے ساتھ ۱۸۲۱ء میں سکوں کے خلاف میدا احمد بریلوی کی محرک آرائی (جس پر بعد میں بحث ہوگی) کی
 تقلید کی۔ اس نے اپنے باپ کو کبھی مات کر دیا جب اس نے مکمل کھلائیے تلقین کی "خدا کی زمین پر کسی
 انسان کو ٹیکس لگانے کا حق نہیں" اس نے دینا دار بزرگوں کی زیرمعدارت دیہاتی عدالتیں بھی قائم
 "اگر کوئی ایسا مقدمہ انگریزی عدالت میں لے جاتا تو اسے سزا کی طرف سے مقررہ سزا دی جاتی۔" ۱۶
 میں فرائضی گویا "سرخ جمہوریت پسند" تھے۔ وہ بلا تعصب ہندو اور مسلمان زمینداروں کے گھروں میں
 یکساں لقب لگاتے، ڈیپٹی پیر نے یہ بھی دیکھا کہ اسی ہزار فرائضیوں کی جماعت جو کامل مساوات کا دعوہ
 کرتی تھی، ۱۷ اپنی طبقوں کے لوگوں پر مشتمل تھی "آخر شش دودویاں کاقتصاد ہندو اور مسلمان
 زمینداروں سے اور ۲۴ پرگنہ، نادیر اور فریدپور کے ضلعوں میں وسیع کھیتوں کے انگریز کارخانہ داروں کے
 کے ساتھ ہوا۔ اس نے ۱۸۲۸ء، ۱۸۳۱ء، ۱۸۳۳ء اور ۱۸۳۶ء میں کسانوں کے فسادات کو بھی
 کیا۔ ۱۸۵۶ء میں جب دہلی کی بغاوت کی خبر پہنچی تو اسے گرفتار کر کے حراست میں لے لیا گیا۔ ۱۸

وہابیوں کا نعرہ جہاد

۱۸۰۳ء میں دہلی میں لارڈ لیک کی آمد کے ساتھ علماء کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز
 ہوا جب انھیں قرآن کے اصولوں اور احکام شریعت کی روشنی میں برطانوی حکمرانوں کی نسبت
 کی شرعی حیثیت کی وضاحت کرنے کو کہا گیا۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا کیوں کہ شریعت میں کوئی ایسا
 ہی نہیں ہے کہ جہاں مسلمانوں کے محکوم ہونے کا سوال ہو۔ خوش قسمتی سے شاہ ولی اللہ کی جائزہ

کے ساتھ ان کی عقیدت اور وہابی مقصد کے ساتھ ان کی ہمدردی میں تاثر کوئی فرق نہ آیا۔ انہوں نے اپنی اردو مثنوی کو مناجات کے ساتھ ختم کیا جس میں انہوں نے ”مجاہدین اسلام“ کے ساتھ شہید ہونے کی دعا مانگی۔

سید احمد خاں جب دہلی کے بلند زبرہ اشخاص کا ذکر اپنی کتاب میں کرتے ہیں تو وہ اس میں نہ صریحاً بعض وہابی راہنماؤں کو شامل کرتے ہیں بلکہ وہابیوں کی دعوت جہاد کے مذہبی تقدس کی مبالغہ آمیز تعریف کرتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں شاہ عبدالعزیز علما میں سب سے زیادہ سربراہ اور رہبر تھے اور ان کے مسلہ قائد اور استاد ہیں۔ ”سید احمد بریلوی کو“ ”مومنین اسلام کی صحبت میں نہ صریحاً شہادت نصیب ہوا بلکہ یہ حادثہ پہلے سے ان پر منکشف ہو چکا تھا۔ اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ لاکھوں مسلمانوں کو جہاد کے عظیم ثواب کا یقین ہے۔ وہ راہِ خدا میں اپنی جان و مال کی قربانی کو سعادت دینی تصور کرتے ہیں اور محمد اسماعیل اور عبدالحی کی دکھائی ہوئی راہ پر گامزن ہوتے ہیں!“

سید احمد بریلوی اور محمد اسماعیل کی وفات کے پندرہ سال بعد، جب وہابی مجاہد شمال مغربی سرحدی صوبہ کے اُس پار دور دراز کی بستی ستانہ کو انگریزوں کے ساتھ لڑنے کے لیے پایادہ جا رہے تھے، سید احمد خاں ”احکام محمدی کی اطاعت“ کرنے والوں کی تعریف کرتے نہ تھکتے اور ”جہاد کو“ انتہائی دینی تقدس کا فعل تصور کرتے جس کا ثواب جہاد کے فائدہ شہید محمد اسماعیل کی زوہ پاک کو پہنچتا ہے۔ ۲۲ اور آخر زندگی میں جب سید انگریزوں کے طرفدار ہو گئے تو انہوں نے چراغِ علی کو جہاد سے متعلق آیاتِ قرآنی کی ایسی تفسیر کرنے پر آمادہ کیا جس کی رو سے جہاد صرف ممانعت کی غرض سے ہے اور اس کی حیثیت فرار کا نہیں ہے۔ ۲۳

جہاد کی وہ چنگاری جس سے سر ۱۸۵۶ء سے پہلے اعتقاد اور ہمت کی روشنی پائی ۱۸۵۶ء تک ایک ایک شعلہ بن گئی، اس کو ۱۸۵۶ء میں جب علم دوست حضرات نے اپنا زندگی بھر کا مشغہ تعلیم و تدریس ترک کر دیا اور انگریزوں کے خلاف لڑائی میں مجاہدین کے ساتھ شامل ہو گئے۔ ۲۴

۱۸۵۶ء سے قبل وہابیوں کی سرگرمی

اوسین وہابی راہنماؤں کے سوانح حیات ان کی سرگرمیوں پر بحث کرنا اس مضمون کے دائرہ سے باہر ہے۔ جو لوگ ایسی تفصیلات سے دل چسپی رکھتے ہوں وہ ہرگز اپنی کتاب ملاحظہ

اور ان کا امام دہلی کے تخت پر بیٹھنے والے جنگ باز اور مطلق العنان سلاطین کی شبیہ تھا۔ کوئی بھی عوامی یا جمہوری طرز حکومت ان کے نظریات کے سرسرنافی دکھائی دیتی تھی۔ ان کی اصطلاح میں امام کا درجہ سبط نبیؐ کا ہے اور اس کے کارندے اس کے "فرض شناس خدام اور جاں نثار فلام" تھے۔ اگر امام کا کوئی مقلد اپنے آپ کو درجے میں اس کے برابر سمجھتا تو اس پر نمک حرامی کا الزام عاید ہوتا اور اس کی یہ تفسیر قدرتی طور پر شاہی قہر و عقاب کا موجب ہوتی ۲۵۔ خود سید احمد بریلوی، شاہ عبدالعزیز کے بیٹے محمد اسحاق کو صاحبزادہ والا تبار کہہ کر پکارتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہابی قدیم اور بوسیدہ نظام جاگیرداری کو بحال کر کے اور احیائے اسلام کے اس مقدس فرض کو جاگیردار سرداروں کے سپرد کر کے ختم ہو گئے جس کی خاطر ان کی ایک کثیر تعداد نے جانیں قربان کیں۔

ہمارے فوری مقصد کے لیے فی الحال یہ جاننا کافی ہے کہ ہندوستان کے وہابیوں نے مسلم عوام کو بیدار کیا اور انھیں برطانوی اور مسلمان جابروں کے سپاہی جو رستم اور ہندوستانی مفاد پرستیوں کے معاشی استحصال سے نجات حاصل کرنے پر اکسایا۔ انھوں نے مسلم معاشرے کے اندر طبقاتی امتیازات کو کسی قدر مٹانے میں مدد دی اور اصلاح کے لیے روشن خیال طبقے کو غیر مطمئن عوام کے ساتھ متحد ہونے پر آمادہ کیا۔ احیائے اسلام کی تحریک ان وہابی رہنماؤں کی اہمین کوششوں کی رہین منت ہے جس سے انگریزوں کے خلاف مسلم معاشرے کے مختلف طبقوں میں بھی اتحاد کا ایک وسیع محاذ پیدا ہو گیا۔ اس محاذ فوجی، یہی نہیں بلکہ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے بھی ایک مشترک محاذ قائم کیا۔ بقول ڈاکٹر مینٹر ان کا نظام "واقعی ایک بیقرار آبادی کے امید و بیم کے ساتھ ہم آہنگ تھا۔" ۲۶

وہابیوں کے نعرۂ جہاد کی جاذبیت اور تاثیر کا اندازہ کرنے کے لیے آئیے دو مشہور امرا کے تاثرات کا مطالعہ کریں۔ ایک مومن خاں (۵۱-۶۱۸۰۰) اردو و فارسی کے ممتاز شاعر اور دوسرا سر سید احمد خاں (۹۸-۶۱۸۲۰)، مشہور سماجی رفرمر اور وہابی جنھوں نے بعد میں انہی خیالات کی تردید کرنے کی کوشش کی جو انھوں نے ۱۸۴۶ء تک پیش کیے تھے ۲۷۔

مومن خاں نے "اسلامی فوج کے سپہ سالار اور نیک سیرت امام" یعنی سید احمد بریلوی کے سکھوں کے خلاف جہاد کی عظمت پر اور ضمناً اپنے ایمان کو تازہ کرنے کے لیے فارسی اور اردو میں ایک مثنوی نظم کی ۲۸۔ مومن خاں عیسائی حملہ آوروں کا بھی چنداں دوستدار نہ تھے۔ ان کی سرگرمیوں نے دہلی کے حکام کو ان کا مخالف بنادیا جس کی وجہ سے انھیں بڑی پریشانی اٹھانی پڑی ۲۹۔ امام

۱۸۴۰ء میں جب سید احمد بریلوی سکھوں کے ساتھ جنگ کے واضح مقصد کی تکمیل کے لیے کلکتہ گئے (کیوں کہ رنجیت سنگھ کی قلم رو میں اسلام پر پابندیاں عائد کی گئی تھیں) تو انگریزوں کی حوصلہ افزائی اور مدد کرنے کو بے تاب تھے لیکن آگے چل کر جب سرحد کے وہابیوں نے سوات کے حکمران کی حمایت حاصل کی (جس کی انگریز دشمنی مشہور تھی) اور انگریزوں کے خلاف لڑائیوں میں شریک ہونے لگے تو انگریزوں کو اپنے رویے اور پالیسی پر نظر ثانی کرنی پڑی۔ یہ اور بھی ضروری ہو گیا جب انھیں معلوم ہوا کہ وہابی مجاہدین جنگ افغانستان کے دوران ان کے دشمنوں کی طرف سے بڑے بڑے تھے اور نظام کا بھائی مبارز الدولہ جو سید احمد بریلوی مرحوم کا نائب اور رئیس المسلمین ہونے کا دعویٰ کرتا تھا برطانوی حکومت اور اس کے چٹھو نظام کا تختہ الٹنے کی غرض سے سارے ملک میں تعلقات قائم کر رہا تھا۔

۱۸۵۰ء میں انگریزوں کو یہ جان کر بڑی پریشانی ہوئی کہ وہابی ان کا تختہ الٹنے کے لیے پنجاب میں سازش کر رہے ہیں اور اس مقصد کے لیے ہمارے فوجیوں کے ساتھ نام و پیام میں مصروف ہیں۔ ۱۸۵۰ء اور ۱۸۵۱ء کے درمیان وہابی سرحدی قبائل کو انگریزوں کے خلاف بھڑکاتے رہے جس کا نتیجہ وہ سولہ برطانوی ہمت تھیں جن میں ۲۳۰۰۰ باقاعدہ فوجیوں نے شرکت کی۔ ۱۸۵۱ء میں سرحد پر واقع وہابی مرکز نے اپنے منصوبوں کو دہلی اور لکھنؤ کے باغیوں کے منصوبوں کے ساتھ مربوط کیا اور انگریزوں کے خلاف ملک گیر بغاوت کو منظم کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں سوات کے حکمران "اخوند" نے سرحد پر اور پنجاب میں ہندوستانی فوجی دستوں کے ساتھ راہ و رسم پیدا کی اور صورت حال اتنی خطرناک ہو گئی کہ جنرل سرسڈی کاٹن کو پانچ ہزار جوانوں کے ساتھ سرحد کی طرف کوچ کرنا پڑا۔ ۱۸۵۱ء تک، جب سرحد پر واقع ستانہ کے وہابی مرکز کی قطعی تباہی کے لیے اقدامات کیے گئے، انگریزوں کو بیس فوجی ہمت کا اہتمام کرنا پڑا جس میں بہت بڑے فوجیوں اور امدادی پولیس کے علاوہ ساٹھ ہزار باقاعدہ فوجیوں نے حصہ لیا۔

۲۔ ۱۸۵۶ء کی بغاوت میں وہابیوں کا حصہ

تنظیم اور پروگرام

بعض ہندوستانی عالموں کی رائے ہے کہ ۱۸۵۶ء کی بغاوت غیر مطمئن فوج کے ایک حصے کی غیر مربوط اور بے ساختہ شورش سے زیادہ حیثیت رکھتی تھی اور کسی بھی اعتبار سے اسے جنگ

فرمائیں ۱۸۵۶ء کے واقعات کے سلسلے میں ہیں صرف ان کی تنظیم اور سازشوں سے متعلق ان -
 طریقہ کار سے سرکار رہے جو ۱۸۲۱ء میں ان کی فوجی ناکامی کے بعد بھی باقی اور جاری رہیں۔

۱۸۲۱ء ہی میں سید احمد بریلوی امام نے شمالی ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں
 اپنے معتبر کارندے متعین کیے جو مرکزی راہنماؤں کی طرف سے نامزد علاقائی خلیفہ کے تحت کام کرتے
 مثلاً پٹنہ جو بنگال کا علاقائی مرکز تھا، محمد حسین کے زیرِ انتہام تھا۔ ۲۵

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ جولائی ۲۱ دسمبر ۱۸۳۶ء کو سکھ سرکار کے خلاف جہاد کا اعلان کیا گیا سر
 مجاہد کیمپ کے لیے ان کارندوں نے رنگوٹ بھرتی کرنا شروع کر دیے۔ اسی طرح جب پہلے پشاور
 اور پھر ستان میں وہابی حکومت قائم کی گئی اور مالی امداد طلب کی گئی تو وہابی مراکز فوراً اس کی مدد
 لیے زکوٰۃ جمع کرنے لگے۔ چونکہ یہ کام مخفی اور خطرناک تھا اس لیے خلیفہاؤں یا علاقائی ناظموں کو
 کے صدر مقام خوجا کوہیادی پور میں پیش کرنا پڑتی تھیں۔ آگے چل کر وہابیوں نے امام بادشاہ کے
 ایک باقاعدہ مدد دفتر، محکمہ مالیات اور دوسرے لوازمات حکومت قائم کیے۔ یہ امام بادشاہ بعد میں
 تک پورے شد و مد کے ساتھ فرائض انجام دیتا رہا لیکن شمالی ہندوستان کے وہابی مراکز کی سرگرمیوں
 آہستہ آہستہ انگریز دشمنی کا رنگ نمایاں ہونے لگا اور برطانوی حکام ان پر شبہ کرنے لگے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ وہابیوں کو بعض اوقات مختلف علاقوں میں ۲۰۰۰ میل کی دوری
 رنگوٹ اور روپہ بھیجنے پڑتے تھے جس کی وجہ سے بنگال سے ستان تک تمام راستے بھر معتبر اور
 کارندوں کے زیرِ انتہام خانقاہوں کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا۔ اپنی اصلی سرگرمی کو چھپانے کی غرض
 یہ کارندے مختلف قسم کی تجارت اور پیشوں میں مصروف رہتے۔ مثال کے طور پر فرض کر دو کہ
 رنگوٹ، بنگال سے سرحد پر واقع وہابی مرکز کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں اس کے سفر کی ہر
 کے خاتمے پر وہابی خانقاہ کے ہنم نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اس طرح وہ منزل بمنزل چلتا رہا اور
 اپنی منزل مقصود تک پہنچ گیا۔ اس طرح ایک درمی زبان مرتب کی گئی جس سے بڑی بڑی فرقہ
 اسلام دبار و دیہے میں مدد ملتی۔

درحقیقت اس سازشی طریقے میں نمایاں خصوصیات تھیں جیسا کہ ۱۸۵۶ء کے
 مقدمات کے دوران ظاہر ہوا۔ پہلی 'ان کے ایجنٹوں کی خوش تدبیری اور دانش مندی۔ دوسری
 جس کے ساتھ وہ پیچیدہ کام انجام دیتے تیسری، ایک دوسرے کے ساتھ کامل وفاداری اور
 تک حصول مقصد میں ثابت قدم رہنے کا عزم کیوں کہ ان کا اعتقاد تھا کہ خدا تعالیٰ کی رضا یہی ہے۔

خفیہ کارندوں اور خانقاہوں کا ایک سلسلہ قائم کر کے سازش کا طریقہ کار تیار کر لیا تھا۔ ان رعایتوں اور رالٹوں سے فوجیوں کی منتخب کمیٹیاں وجود میں آئیں جنہوں نے عملی طور پر ۱۸۵۷ء میں دہلی و لکھنؤ کی حکومت سنبھال لی اور ساتھ ہی تربیت یافتہ فوجی بھی فراہم کیے جنہوں نے انگریزوں کے ساتھ لڑنے میں حیرت انگیز تدبیر اور شجاعت کے جوہر دکھائے۔

یہ بات بھی اتنی ہی اہم ہے کہ ۱۸۵۷ء تک انگریز مخالف تحریکوں کے راہنماؤں نے عوامی پروگرام ترتیب کرنے کا چرچا شروع کر دیا تھا۔ نظام جاگیر داری کی اصلاح کی ضرورت کا احساس تو پہلے ہی موجود تھا۔ شاہ ولی اللہ کے زمانے سے کم از کم وہابی راہنماؤں کے دماغوں میں یہ خیال سمایا ہوا تھا۔ درحقیقت سلطان ٹپو اس معاملے میں سبقت لے جا چکے تھے جب ان کی حکومت نے بیکاری دور کرنے کی ذمہ داری سنبھال لی۔ سب سے زیادہ مشکل مسئلہ غریب اور بے زمین کسانوں کا تھا۔ بنگال کے زراعتیوں نے نہ صرف زمینداری کو ختم کرنے بلکہ زمینداروں کو زمینوں سے محروم کرنے کا پروگرام بھی وضع کر لیا تھا۔ پس دہلی میں جب بخت خاں نے نمک اور کھانڈ کے محصول موقوف کر دیے اور ذخیرہ اندوزی کو قابل سزا قرار دیا تو وہ انگریزوں کی مخالف تحریک کے ایک دیرینہ مطالبے کو عملی جامہ پہنارہا تھا۔ ایسے ہی اقدامات احمد اللہ اور فوجی کمیٹی نے لکھنؤ میں کیے۔ یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ ایک موقع پر دہلی کی باغی سرکار نے پانچ میگھ زمین معافی دائمی ملکیت کے طور پر ہر اس فوجی کے کنبہ کو عطا کرنے کی پیش کش کی جو انگریزوں کے خلاف لڑائی میں جان دے گا ۴۴ درحقیقت بعض عاملوں کی یہ رائے ہے کہ ۱۸۵۷ء میں دہلی اور اودھ دونوں کے دیہات میں عوامی شورش نے کسانوں کی جنگ کی صورت بہت جلد اختیار کر لی جس سے صوبائی حکومت کے وہ لوگ جن کے مفاد کو نقصان پہنچنے کا ڈر تھا اس قدر خوفزدہ ہو گئے کہ وہ آزاد قومیت کے تصور کو قربان کر کے ذیلی مفاد سے مل گئے ۲۵۔

اس سے انکار نہیں کہ بعض اوقات مہمان وطن عوام کے مذہبی تعصبات سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں زمانہ سازی کا ثبوت دیتے اور برطانوی حکام کی بعض رفاہ عام کی اصلاحات کی مذمت کرنے مثلاً سستی کا انسداد، بیوہ کی دوبارہ شادی کی حوصلہ افزائی اور کچھ حد تک ذات پات میں تبدیلی ۴۶ چونکہ ہندو اور مسلمان عوام متحد تھے، دہلی کی باغی حکومت نے ہندوؤں کی دلجوئی کے لیے گائے کا ذبح کرنا ممنوع قرار دے دیا۔ اس کے عوض ہندو باغی راہنماؤں نے (مثلاً مانا صاحب) ازروئے تحسین مغل سرکار کے تمام نشانات کو برقرار رکھا جیسے — سن، ہجری کا استعمال، سرکاری

آزادی یا قومی بغاوت کا نام نہ دینا چاہیے بعض باخبر برطانوی مشاہدین جنہوں نے موقع پر اس مسئلہ کی تحقیق کی، مذکورہ بالا نظریہ کی تائید نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر ایگنر ڈیڈٹ "بغاوت ہند" پر جن کے مراسلات کا سلسلہ بغاوت کے فوراً بعد ہی شائع ہوا، یہ کہتے ہیں کہ "غدر اور بغاوت کو سیاسی سازش کا نتیجہ سمجھنے اور قرار دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں"۔ ۴۰ وہ اسے محض ایک فوجی شورش خیال نہیں کرتے بلکہ ایک بغاوت، ایک انقلاب سمجھتے ہیں جس میں فوجی سپاہیوں کے علاوہ عوام نے انگریزی اقتدار اور برکری کے خلاف شرکت کی۔ ۴۱ اسی طرز میں اس کا ۱۸۵۷ء سے متعلق مقالہ مشہور ہے۔ بعد میں جب ہندوستانی اس کے ساتھ کھل کر بات کرنے لگے تو اس نے از سر نو چھان بین کی۔ اُسے اس بات کا یقین ہو گیا کہ کچھ ایسے خارجی اسباب کام کر رہے تھے جن سے ہندوستانیوں کے دلوں میں کینہ بڑھ گیا اور یہ جذبہ نفرت شخصی نہیں بلکہ قومی تھا۔ ۴۲

اگر ہم سلطان ٹیپو کے عہد سے واقعات کا تسلسلہ دیکھیں تو ہم یقیناً اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ انیسویں صدی کے نصف اول کے دوران ہندوستانی بحیثیت مجموعی برطانوی حکمرانوں سے مقابلہ کرنے کی ایک ملک گیر تحریک کی تیاری کر رہے تھے۔ سلطان ٹیپو نے انگریزوں کے خلاف جہاد میں سارے ہندوستان کو آمادہ پیکار کرنے کی کوشش کی اور پھر غدر و یلور (۱۸۵۷ء) جو چوٹے پیمانے پر ۱۸۵۷ء کے انقلاب کا ہی نمونہ تھا۔ البتہ یہ قابل ذکر ہے کہ نئے زمینداروں کا طبقہ اور بڑے شہروں میں رہنے والے انگریزیت کے دلدادہ روشن خیال لوگ اس ہنگامے میں شریک نہ ہوئے کیوں کہ ان کی تازہ حاصل کردہ دولت اور سماج میں حیثیت انگریزوں ہی کی وجہ سے تھی اور وہ محسوس کرتے تھے کہ ان کی قسمت انگریزوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ ۴۳

اس طویل تیاری کی وجہ سے ہندوستان کی جنگ آزادی کے سپاہیوں نے ۱۸۵۷ء تک ملکی اور عالمی صورت حال سے اپنی فانی واقفیت حاصل کر لی تھی اور ہندوستانی قوت میں ایک پائدار محاذ قائم کر لیا تھا۔ مثال کے طور پر اٹھارویں صدی کے ختم کے قریب میسور کے سلطان ٹیپو اور ادھ کے نواب وزیر علی دونوں نے ملک کے اندر اور بیرونی ممالک میں انگریزوں کی مبالغہ قوتوں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں ایسی سیاسی چالیں منظر عام پر آئیں۔

اس کے علاوہ ویلور کی شورش (۱۸۵۷ء) کے بعد فوجیوں کی غیر سرکاری سیاسی انجمنوں کا قیام فوجی زندگی کی ایک عام خصوصیت تھی۔ ان انجمنوں نے ۱۸۴۰ء اور ۱۸۵۷ء کے دوران خاص طور پر پنجاب اور صوبہ سرحد میں ان وہابی رہنماؤں کے ساتھ راہ ورسم پیدا کر لی تھی جنہوں نے

نئی سرکار کے عملے نے نہایت لیاقت، حسن انتظام اور ایسا اندازی کے ساتھ اپنے فرائض ادا کیے اور عارضی حکومت کی عزت کو دشمنوں کے ہاتھوں اس کا تختہ الٹ جانے کے بعد بھی برقرار رکھا۔ ۵۲

۳۔ ۱۸۵۷ء کے رانہا اور وہابی

۱۸۵۷ء کی عظیم قومی تحریک کی پشت پر کون سے رانہا تھے اس بارے میں بہت سی قیاس آرائیاں کی گئی ہیں۔ بعض لوگ قدرتی طور پر یہ خیال کرتے ہیں کہ غالباً یہ بغاوت بہادر شاہ اور واجد علی شاہ کی سازش کا نتیجہ تھی جو شمالی ہندوستان کے دو ممتاز شاہی خاندانوں کے وارث تھے بلکہ یہی خیال کیا جاتا ہے کہ انھوں نے دل کر ہندوستانی فوج کو براہِ گنیمتہ کیا اور فرنگیوں کے قتل عام کا منصوبہ باندھا جس کے بعد برطانوی فوج پر دوسرے ہندوستانی والیان ریاست کے حملے کی تجویز تھی۔ ۵۲ البتہ اس دعویٰ کی تائید میں کوئی شہادت نہیں ملتی۔ اس کے برعکس جو معلومات حاصل ہیں ان سے ظاہر ہے کہ اس وقت بھی جب عارضی حکومت کے معاملات میں ان کو کچھ اختیار حاصل تھا، انھوں نے کوئی خاص رول ادا نہیں کیا۔ ۵۳ میں اپنے کے ایک پیر علی نامی شخص کے گھر سے جو خطوط حاصل ہوئے ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہابیوں کے علاوہ دہلی اور لکھنؤ کے حکمرانوں کی طرف سے دو جماعتیں علی الاعلان کام کر رہی تھیں مگر اس بات کا کوئی قطعی ثبوت نہیں ملتا کہ ان حکمرانوں کی طرف سے انھیں کوئی اختیار دیا گیا۔ ۵۴ دہلی کے شاہی خاندان کے افراد میں سے اگر کوئی فرد تحریک میں علی طور پر حصہ لینے اور اس کی رہنمائی کرنے کا دعویٰ کر سکتا ہے تو وہ مغل شہنشاہ فرخ سیر کا پوتا شہزادہ فیروز شاہ تھا جس کو وہابی پٹھان گنیمتہ کے ان سپاہیوں کی مدد حاصل تھی جو مرہٹہ حکمرانوں کی ملازمت سے برطون ہونے کے بعد اس کے ساتھ مل گئے تھے۔ جہاں تک بیگم اودھ کا تعلق ہے اُن کو فیض آباد کے مشہور مولوی سے ہدایت ملتی تھی جو ہر لحاظ سے ”سازش کی روح رواں“ ۵۵ کہلانے کا مستحق ہے۔ یہ وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اگرچہ احمد اللہ خاں وہابی نہ تھا یعنی اہل حدیث کے فرقے سے تعلق نہ رکھتا تھا مگر وہ اپنے کئی ہم وطن سلطان پور کی طرح اچانک اسلام کا حامی یقیناً تھا اور اس نے اسی مقصد کے پیش نظر سیاسی اقتدار کی بجالی کے لیے کام کیا۔ بہر حال وہ سید احمد بریلوی کے پیروؤں اور وہابیوں کی جماعت کے ساتھ پورے طور پر تعاون کر رہا تھا۔ ۵۶ لیکن بغاوت کی سب سے سربراہ اور شخصیت دہلی کی مرکزی حکومت کا سربراہ بخت خاں ہے جو سلطان پور (اودھ) کا روہیلہ سپاہی تھا۔ بخت خاں نے انگریزوں کے تحت فوجی تربیت کا کافی تجربہ حاصل کیا تھا۔ جب اُس نے روہڑال

مراسلات اور اطلاعات میں "بسم اللہ" کا اندراج اور جمہور کو سرکاری تعطیل۔

بہادر شاہ: قومی اتحاد کی نشانی

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے مقبول رہنماؤں نے اس بات کو محسوس کر لیا کہ دہلی کا نام بہادر شاہ جس کے پیچھے ہندوستان کے مختلف فرقے اور طبقے اکٹھے ہو سکتے تھے۔ ۴۸ وہ نہ صرف اس بات پر متفق ہوئے کہ مرکزی حکومت کا تاج اس کے سر پر رکھا جائے اور دہلی کو اس کا پایہ تخت قرار دیا جائے بلکہ مغلیہ دہلی کی قدیم روایات و رسوم کو بھی برقرار رکھا جائے ۴۹

ایسے مستقبل کے تصور سے اچھے اسلام کے حامیوں کو دلی مسرت ہوئی جو ایک مستحکم اور متحد حکومت کے خواب دیکھ رہے تھے اور امیر تیمور اعظم کے خاندان کے ایک فرد کو امام اور بادشاہ کی حیثیت میں دیکھنے کے متنی تھے۔ یہ بات قابل تعریف ہے کہ بادشاہ بہادر شاہ لوگوں کی توقعات پر پورے اُترے۔ اچھے اسلام کے حامی کی نگاہ میں وہ ایک غازی تھے۔ ایرانیوں یا لکھنؤ کے شیعوں (چیلے) رکھتے ہیں۔ روشن خیال طبقہ بالعموم ان کی شعروازی اور علم دوستی کی داد دیتا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا تھا کہ حکومت کی بحالی کی صورت میں وہ تمام لوگوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے لوگوں کو رعایتیں دیں گے۔ انھوں نے ہندو راجاؤں کو متبنی کرنے کا حق دینے کا وعدہ کیا۔ قدیم زمینداروں سے کہا کہ ان کا دوائی بندوبست منسوخ کر دیا جائے گا اور رگان کر دیا جائے گا اور مال لانے لے جانے کے لیے امداد اور سہولتیں دی جائیں گی۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ سرکاری ملازمتوں کی تنخواہ میں قابل قدر اضافہ کیا جائے گا۔ اعلیٰ افسروں کو کم از کم دو سو سے تین سو روپیہ تک دیں گے اور سپاہیوں کا مشاہرہ دگنہ کر دیا جائے گا۔ کاری گروں کو بھی روزگار۔ کے تحفظ کا قول دیا گیا جب بے شک ان کی خوشحالی کی ضمانت تھی۔ درویش صفت بادشاہ نے یتیموں اور دوسرے مقدس انسانوں کو یاد فرمایا جن کو اکبر یا عالمگیر کی شان کے ساتھ معافی کی اور فی بطور وقف عطا کرنے کی تجویز تھی۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ ہم بہادر شاہ کے تحت مجاہدین کی مختصر حکومت کی داد دیں اور اعتراف کریں کہ دہلی، لکھنؤ، بریلی اور کئی دوسرے مقامات میں

اور ناشائستہ طور طریقوں کا مذاق اڑایا گیا لیکن وہ انگریزوں کے ساتھ ہفتوں لڑا اور انہیں سپر سالاری میں مات کیا۔ اس نے اس بات کی پوری یقین ناکام کوششیں کیں کہ فوج کے ہاتھوں دہلی کی شہری آبادی کو کوئی تکلیف نہ ہو اور ہر حالت میں ضابطوں کی پابندی سختی کے ساتھ عمل میں لائی جائے۔ جب بخت خاں دہلی میں وارد ہوا اور فوجی کمیٹی کا قیام عمل میں آیا جس کا آئین جمہوری تھا اور جس کے قواعد کی پابندی پر زور دیا گیا تو شاہی خاندانوں کے ذیل طبع فوجی سرداروں اور امیروں کا وہ انبوه جن پر بہادر شاہ کی عارضی حکومت کی مجلس مشاورت پہلے چند ہفتوں کے دوران مشتمل تھی یکسر منتشر ہو گیا۔

۴۔ دہلی سے باہر وہابی

ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے بہت پہلے وہابی تحریک کے راہنما شمالی ہندوستان کے تمام اہم مراکز میں اپنی تنظیم کا جال بچھا چکے تھے اور علاقائی خلیفہ اور معتبر کارکن مقرر کر چکے تھے۔ ۱۸۳۱ء میں سید احمد بریلوی کی وفات کے بعد انھوں نے دکن کے مسلم مراکز جیسے حیدرآباد اور میسور اور وسطی ہندوستان اور راجپوتانہ کی بعض ریاستوں مثلاً بھوپال، ٹونک اور بے پور وغیرہ کے ساتھ بھی رابطہ قائم کر لیا تھا۔ اچھا و نیوں اور ہندوستانی سپاہ کی فوجی کمیٹیوں میں ان کا اثر و رسوخ ۱۸۴۰ء ہی میں ظاہر تھا۔ مختصر یہ کہ یہ کہنا بجا ہو گا کہ ۱۸۵۷ء تک وہابیوں نے ایک ملک گیر سیاسی تنظیم قائم کر لی تھی۔ خاص طور پر علاقہ دو آب میں یعنی دہلی سے الہ آباد تک ہر قابل ذکر قصبے میں وہابیوں اور دوسرے احیائے اسلام کے حامیوں کا منظم اور کارکن گروہ موجود تھا جو انگریزوں سے نفرت کرنے میں متحد اور عام بغاوت میں شریک ہونے کے لیے بیتاب تھا۔ درحقیقت اسی نے وہابی اور تنظیمی بنیاد فراہم کی جس نے بخت خاں اور دوسرے وہابی راہنماؤں کو دہلی کی عبوری حکومت بٹھانے میں مدد دی۔

۱۸۵۷ء کا آغاز ملک کے دیہاتوں میں چپاتیوں کی تقسیم کے ساتھ ہوا ساتھ ہی یہ افواہیں پھیلانی گئیں کہ برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے والا ہے اور ہندوستانی فوجی کمیٹیوں میں مشورے ہونے لگے اس کے جلد بعد بابرک پور میں کار توسوں کا واقعہ ہوا۔ پھر یہ آثار دکھائی دینے لگے کہ کوئی نہ کوئی عام شورش پیا ہونے والی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ لوگوں میں سرگوشیوں کی مہم کے ذریعے سائے شمالی ہندوستان میں ایسی شورش کی مقررہ تاریخوں کا بھی غلام میں اعلان کر دیا گیا۔ ساتھ ہی اعلیٰ سطح پر راہنماؤں نے ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ قائم کیا جیسے احمد اللہ جس کا تعلق مسلمانوں کی

شہزادہ مرزا نعل کی جگہ بی کی قوم پرست فوجوں کی کمان سنبھال لی تو اس نے سپہ سالار کا لقب اختیار کیا۔ بخت خاں براہِ اعتبار سے ایک کفر اور متعصب دیوانی تھا جو وہابی تنظیم کاروں کے ایک دستے کے ساتھ دہلی آیا اور اپنے روحانی مرشد مولوی سرفراز علی کو ہزاروں مجاہدین کے لشکر کا امام مقرر کیا۔ یہ وہابیوں کے جوشِ عمل کا فیض تھا کہ شروعات میں تدبیر جنگ کی سنگین غلطیوں اور شاہی خاندان کی سیاسی نا اہلیت کا رے کے باوجود فوج کا حوصلہ آخری دم تک بلند رہا۔ وہابی مجاہدین نے دشوار حالات میں نہ صرف جنگ کو جاری رکھا بلکہ دشمن پر وار کرنے میں پہل بھی کی حالانکہ ممبئی وطن کی قوتِ مزاحمت زائل ہو چکی تھی۔ وہابیوں کے جوش کا اندازہ کچھ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ بخت خاں کے لشکر میں ہرنو جی نے انگریزوں کے ساتھ آخری دم تک لڑنے کا حلف لیا تھا۔ جب دہلی فتح ہو گئی تو پہلے بخت خاں نے بہادر شاہ کو یہ ترغیب دینے کی کوشش کی کہ وہ اس کے ساتھ چلے اور کسی بہتر مقام پر دوسرا محاذ پیدا کرنے میں مدد دے۔ جب بادشاہ نے انکار کر دیا تو بخت خاں محمدی میں احمد الشہ کی عارضی حکومت میں شامل ہو گیا اور وزیرِ دفاع اور سپہ سالار اعظم ہوئے۔ آخر جب برطانوی حملے کی تاب نہ لا کر انھیں ممبئی وطن کے آخری گڑھ، محمدی سے دست بردار ہونا پڑا اور احمد الشہ کو دغا بازی سے ہلاک کر دیا گیا تو بخت خاں نانا صاحب اور دوسروں کے ساتھ سرحد پار کر کے پناہ میں داخل ہو گیا۔

بخت خاں اور وہابیوں کے تحت دہلی کا نظامِ حکومت جمہوری پالیسیوں کے اعتبار سے قابلِ مطالعہ ہے۔ ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ بخت خاں نے عام استعمال کی چیزوں مثلاً نمک اور کھانا پر محصول بنادیا تھا۔ ذخیرہ اندوزی کو قابلِ سزا جرم قرار دیا تھا اور پانچ بیگہ زمین معافی دائی تھی جو بخت خاں نے میر اپنی جان دے گا۔ ہم محبِ وطن فوج کے آخری دم تک لڑنے کے حلف کا بھی ذکر کر چکے ہیں اور ان کے حیرت انگیز حوصلے کا بھی جب دشمن نے انھیں چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ بخت خاں کے تحت حکومت کی بنیاد عوام کی حمایت اور فوج (جس میں اکثریت باہر سے آنے والوں کی تھی) اور شہر کے صنعت کاروں اور مزدوروں کے تعاون پر تھی۔ بخت خاں خود تحریکِ احیا کا روح رواں تھا۔ اس کی عادتیں سادہ تھیں اور وہ عام سپاہی کی طرح زندگی بسر کرتا اور چلتا پھرتا تھا۔ جب پہلی بار دہلی میں وارد ہوا تو اس نے کوئی پہچان بھی نہ سکا اور اس کی بھرتی صورتِ سادہ لوحی

پٹنہ : پٹنہ میں اس سے پہلے کہ صادق پور کے وہابی راہنما کوئی قدم اٹھا سکتے انگریز کشترنے ان کو گرفتار کر لیا۔ البتہ ایک مقامی کتب فروش نے جس کا وہابی مرکز کے ساتھ قریبی تعلق تھا تحریک مزاحمت کی قیادت سنبھال لی اور مجاہدین کا ایک مسلح دستہ منظم کیا۔ اس ہنگامے میں ایک انگریز کی موت واقع ہوئی۔ شورش اتنے بڑے پیمانے پر تھی کہ اس کو فرو کرنے کے لیے مکہ سپاہیوں کو بلوانا پڑا۔^{۶۹}

اگرہہ : اگرہہ کے لوگوں نے فوراً مشہور وہابی عالم اور سرجن ڈاکٹر وزیر خاں کی سرکردگی میں مجاہدین کا ایک لشکر تیار کیا اور قلعے میں مقیم برطانوی فوج کا محاصرہ کر لیا مگر ڈاکٹر وزیر خاں کی اہمیت اس سے کہیں زیادہ تھی جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اسے وہابیوں کے مرکزی راہنماؤں کے زمرے میں شامل کیا گیا وہ بخت خاں احمد سرفراز علی کے پیچھے پیچھے دہلی آیا اور پھر لکھنؤ اور محمدی اس کے بعد وہابی مقامی تحریک مزاحمت میں شامل ہو گئے۔

حیدر آباد : جیسا کہ ہم جانتے ہیں مبارز الدولہ کے عہد سے ہی حیدر آباد وہابیوں کا ایک طاقتور مرکز تھا۔ مسلمان فوجیوں میں اچانک اسلام کا جذبہ خاص طور پر شدت کے ساتھ پایا جاتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی کے دوران اگرچہ نظام نے مسلمانوں کو تحریک میں شرکت کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن دو مشہور وہابی راہنماؤں طرہ باز خاں اور مولوی علاء الدین نے برطانوی ریزیڈنسی پر ایک فوجی حملے کی تنظیم کی۔ یہ حملہ ناکام ہو گیا اور وہابی راہنما گرفتار کر لیے گئے۔ بعد میں طرہ باز خاں کو گولی سے اڑا دیا گیا اور مولوی علاء الدین کو جلاوطن کر کے انڈیمان بھیج دیا گیا۔^{۷۰}

الہ آباد : جوں ہی بغاوت کی خبر الہ آباد پہنچی قلعہ میں مقیم ہندوستانی فوجیوں نے برطانوی فوجیوں کو قتل کر ڈالا اور گولہ بارود اور فوجی گولہ پم قبضہ کر لیا۔ اس اثنا میں مشہور وہابی راہنما یاقوت علی نے جو پہلے جیل میں رہتا تھا اور پھر الہ آباد شہر میں سکونت اختیار کر لی تھی، بہادر شاہ کے نام پر سب زعم لہرایا اور قوم پرست فوجیوں کے راہنما رام چندر کے ساتھ لکھنؤ کا صمد مقام خسرو باغ میں قائم کیا۔ یاقوت علی کیا تو دہلی کی مرکزی حکومت کی طرف سے اختیارات ملے تھے یا مقامی راہنماؤں نے اسے ضروری اختیارات تفویض کیے۔ بہر حال دہلی کے بادشاہ کی طرف سے وہ صوبیدار الہ آباد کی حیثیت سے فرائض انجام دیتا رہا۔ وطن دوست سپاہیوں کی ابتدائی فتح کے بعد انھیں شکست ہوئی اور انگریزوں نے اُسے معزول کر دیا۔ اس کے بعد یاقوت علی لکھنؤ میں احمد اللہ کے ساتھ جالا اور تحریک مزاحمت میں شریک ہو گیا یہاں تک کہ اُسے نیپال کی سرحد پر گرفتار کر لیا گیا۔ ہم پہلے ہی اس کے مقدمہ اور^{۱۸۵۷} میں جلا وطنی کا ذکر کر چکے ہیں۔

Association (مجلس ملی) کی بنیاد رکھی تاکہ مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگریس سے علیحدہ کر دیا جائے تو لہذا (پنجاب) کے وہابیوں نے کانگریس کی حمایت میں فتوؤں کی ایک کتاب بعنوان نصرت الابرار شائع کی۔ یہ کتاب ایک سو فتوؤں پر مشتمل تھی جن میں دو فتوے دیوبند کے راہنماؤں کے تھے یہ اسی طرح جب پہلی عالمگیر جنگ چھڑی تو سرحد پر واقع وہابی مرکز نے کابل میں پہلی "آزاد حکومت ہند" کے قیام میں نمایاں حصہ لیا۔ جنگ کے خاتمے پر ہم دیکھتے ہیں کہ وہابیوں نے مہاتما گاندھی کی شروع کی ہوئی تحریک عدم تعاون میں بھی شرکت کی اور اس کی راہنمائی بھی کی۔ ایک وہابی مرکز اب بھی سرحد پر موجود ہے گواہ کوئی سیاسی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ ۳۲

یہ کہنا بجا ہوگا کہ فضل حق خیر آبادی (۱۸۵۷ء) کے مسلمانوں کی روح تھے، اگرچہ اصطلاحاً وہ خود وہابی نہ تھے بلکہ ان کے عقائد اور مذہبی رسوم کے مخالفت تھے پھر بھی انھوں نے استقلال کے ساتھ انگریزوں کے خلاف وہابیوں کی سرگرمیوں کی حمایت کی۔ انھوں نے اپنی کتاب "رسالہ خدیہ" میں جو انڈیا میں ان کی قید کے دوران ششہ عشری میں لکھی گئی۔ انھوں نے اپنے برطانیہ کنونٹ کو واحد صحیح راستہ قرار دیا جو ایک مسلمان اختیار کر سکتا تھا خواہ وہ وہابی ہو یا غیر وہابی۔ اس سے ۱۸۵۷ء کے واقعات میں وہابیوں کو بحیثیت مجموعی مسلمانوں کے تسلیم شدہ ناہنہ بننے میں مدد ملی۔ اگر برطانوی حکام وہابیوں کو ایک جنگ باز طبقہ اور سلطنت کے لیے مستقل خطرہ کا سبب تصور کرتے تھے تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ۳۳

حواشی

۱. لفظ "وہابی کا استعمال تقیاً صحیح نہیں کیوں کہ نام نہاد ہندوستانی وہابیوں کے سیاسی مقصد اور ان کے عام سماجی نظریات نجد کے عبدالوہاب (وفات ۱۸۰۶ء) کے عقائد سے اخذ نہیں کیے گئے تھے بلکہ اس سے قبل دہلی کے شاہ ولی اللہ (وفات ۱۷۶۲ء) کی تعلیمات سے تھے اس لیے ایسے اسلام کے بعض حابیوں مثلاً عبید اللہ سندھی (۱۹۲۸ء - ۱۸۶۱ء) غلام سرور اور اہل خاں نے اپنے آپ کو ولی الہی یا شاہ ولی اللہ کہہ کر اپنا پناہ لیا۔ البتہ میں نے اس لفظ کو اس کی مقبولیت اور تاریخی اہمیت کے سبب برقرار رکھا ہے۔

Trial of the Emperor of Delhi

۲. History ۳. شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کے مختصر جائزے کے لیے ملاحظہ فرمائیں

اسی قسم کے چھوٹے ہیما نے پرہنگاموں کی اطلاعات ملی گڑھ، شاہجہانپور، بریلی، باس اور کی روپ
مقامات سے بھی وصول ہوئیں۔ پنجاب اور صوبہ سرحد میں چھاؤنیوں کے علاقے بھی مستثنیٰ نہ تھے۔
ہم ان تفصیلات کو دارالعلوم دیوبند کے بانی کے سرسری ذکر کے ساتھ ختم کرتے ہیں (یہ دارالعلوم اتر پردیش
کے ضلع سہارنپور میں واقع ہے)۔

شاملی، میرٹھ کے نزدیک شاملی میں احيائے اسلام کے حامیوں کی مقامی جماعت نے اپنا نام
سالار اور قاضی منتخب کیا تاکہ باغی سرکار کا بنیادی مرکز قائم کیا جائے۔ پھر انگریزوں کے مقامی توپخانہ
پر حملہ کرنے کے لیے فی انور مسلح مجاہدین کو منظم کیا۔ چونکہ تحریک مزاحمت جلد ہی ناکام ہو گئی اور
دہلی کی عارضی حکومت ٹوٹ گئی۔ شاملی کی شورش کے رانہا عرب کو ہجرت کر گئے البتہ محمد قاسم نے جو
شاملی کی ہم میں شریک تھے دیوبند کے دارالعلوم یا مذہبی درس گاہ کی بنیاد رکھی۔ اس سلسلے میں انہوں
نے ادارے کے بنیادی قواعد مرتب کیے اور اپنے مریدوں کو سرکاری امداد قبول کرنے سے منع کیا، انگریزی
زبان کی تعلیم بھی ممنوع قرار دی۔

۵۔ انقلاب کے بعد

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد کئی مقامات پر ساری مسلم آبادی کو قتل کر دیا گیا۔ تمام شاملی ہندوستان
کو جن میں ممتاز علما بھی شامل تھے توپوں سے اڑا دیا گیا۔ بہتوں کو انڈیا ہاؤس کی لعزہ بری بستی کو بھیج کر
ملک بدر کر دیا گیا۔ حقیقت انڈیا ہاؤس میں قیدیوں کا جو پہلا جھلپ تھا اس میں بغاوت کے ایسے مشہور معروف
وہابی رانہا بھی شامل تھے جیسے دہلی کے مفتی مظہر کریم اور لکھنؤ کے منشی غنایت احمد۔ ان کے پیچھے
پچھے انبالہ (۱۸۵۷ء) اور پٹنہ (۱۸۵۹ء) کے وہابی مقتدا کے مجرم بھی پہنچ گئے۔ مہاراجہ کے
تیلے پٹنہ کے مولانا احمد اللہ نے جسے جلا وطن کر کے انڈیا ہاؤس بھیجا گیا، والسرائے ہند لارڈ ڈیویو کے قتل
کی سازش منظم کی جب ۱۸۵۷ء میں وہ سرکاری دوسے پر اس بستی میں وارد ہوا۔ یہ وہابی رانہاؤں
کے غیر فانی جوش اور استقلال کی قابل قدر شہادت ہے۔ اس اثنا میں ستانہ کا وہابی مرکز کام
کرتار بابہ مرکز جس کے ساتھ ہماری بے وفار علیا اور سرحد پار کے دشمنوں کی امیدیں یکساں
طور پر وابستہ ہیں (پٹنہ)

یہ ذکر کرنا باعث دل چسپی ہے کہ ۱۸۸۵ء میں جب سرسید احمد خاں نے Patriotic -

- ۲۰۔ "جب ایک بار ذمہ دار (معتبر) مسلمانوں کی اتفاق رائے سے امام کا انتخاب ہو جاتا ہے تو پھر اس کے ہاتھوں بیعت میں تاخیر کرنا جائز نہیں۔" ایضاً جلد دوم صفحہ ۷۷۔
- ۲۱۔ مرزا حیرت، حیات طیبہ صفحہ ۲۷۸
- ۲۲۔ ایضاً صفحہ ۲۸۲، "ناجائز محمولات" (Illegal Impositions) کے لیے لفظ "مال ہائے ناحق" کا استعمال کیا گیا ہے۔
- ۲۳۔ یہ فتویٰ ایک حدیث کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں محمد اسماعیل: "منصب امامت"
- ۲۴۔ اس سلسلے میں وہ اشعار ملاحظہ فرمائیں جو "حریق الاشرار" سے محمد اسماعیل کی تصنیف "تقوۃ الاسلام" میں منقول ہیں
- ۲۵۔ محمد اسماعیل بحوالہ تصنیف
- ۲۶۔ ہنزہ: بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۰۲
- ۲۷۔ وہابی رہنماؤں سے متعلق سرسید کے خیالات جو یہاں بیان کیے گئے ہیں ۱۸۴۷ء میں پہلی بار ان کی تصنیف "آثار الصنادید" باب چہارم (۱) میں شائع ہوئے تھے لیکن کتاب کے بعد کے مطبوعات میں سے حذف کر دیے گئے تھے۔ اب انجمن ترقی اردو، پاکستان نے اس باب کو دوبارہ بعنوان "تذکرہ اہل دہلی" (اردو) شائع کیا ہے۔
- ۲۸۔ مومن خاں: کلیات
- ۲۹۔ وہ ایک شعر میں اس کا حوالہ دیتا ہے ملاحظہ فرمائیں: مومن خاں دیوان فارسی (مسودہ)
- ۳۰۔ مومن خاں: بحوالہ تصنیف
- ۳۱۔ سرسید احمد خاں: بحوالہ تصنیف
- ۳۲۔ ایضاً صفحہ ۸۰
- ۳۳۔ چراغ علی کی رائے تھی کہ جہاد فرض عین (حتی اور ٹھکی فرض) نہیں بلکہ فرض کفایہ یعنی اختیاری اور رسمی فرض ہے۔ ملاحظہ فرمائیں: "تحقیق الجہاد" صفحہ ۱۳۷
- ۳۴۔ اس پیمانہ آتائین کی مثال بیچے جو دہلی کے ایک رئیس کی ملازمت میں تھا جو تلاش شہادت میں باغیوں سے مل گیا۔ ملاحظہ فرمائیں، "آغا مزاجیک" کا نامہ سرودی صفحہ ۷
- ۳۵۔ ہنزہ: بحوالہ تصنیف صفحہ ۵
- ۳۶۔ ایضاً صفحات ۹۰-۸۴ برائے تفصیلات

- Philosophy -- Eastern and Western جلد اول مقال متعلق ولی اللہ۔ اس کے ہولوں اور اسلام کی فلسفیانہ تفسیر کے تفصیلی مطالعے کے لیے لائحہ فرمائیں: حجت اللہ البانہ (نسخہ عربی، مطبوعہ قاہرہ)
- ۴۔ محمود: صحیفہ بیوسلطان جلد دوم صفحہ ۲۴۴
- ۵۔ ایضاً صفحات ۵۲-۲۵۰
- ۶۔ ایضاً صفحہ ۲۳۸
- ۷۔ شاہ عالم کے نام اپنے خط مورخہ ۲ اگست ۱۷۸۶ء میں وہ اپنے آپ کو 'خادم دین محمدی' -
(ant of the faith of Mohammad) کہتا ہے۔ ایضاً جلد دوم صفحہ ۸
- ۸۔ ایضاً جلد اول صفحہ ۲۸۱
- ۹۔ ایونس بیل Memoir of General Briggs صفحہ ۲۴
- ۱۰۔ جان بریڈشا Sir Thomas Munro صفحات ۲۶-۱۳۵
- ۱۱۔ بحوالہ مقام
- ۱۲۔ محمود: بحوالہ تصنیف جلد اول صفحہ ۲۹
- ۱۳۔ شعر متعلقہ حسب ذیل ہے:-

اعتبارِ صبر و طاقت خاک میں رکھوں غلغلہ

نوبتِ ہندوستان نے کب ساتھ پیو کا دیا

(Trust and patience be damned oh Zafar!
When did the soldiery of India support Tipu?)

منقول از تصنیف ایراج علی P. 182 Bahadur Shah Zafar

۱۳۔ انھوں نے یہ یقین کر کے "زمینِ فدا کی ملکیت ہے اور پیداوار اس کی جو اس زمین پر رہ چلا تاج" منقول از مقالہ اشرف

۱۵۔ چودھری Notes on the Muslim Question (مسودہ) صفحہ ۱۲

۱۶۔ ایضاً صفحہ ۱۱ Civil Disturbances in India صفحہ ۱۱۳۔ این

۱۷۔ چودھری: بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۱۳ The Indian Musalmans. صفحات ۱۰۱-۱۰۲

۱۸۔ چودھری: بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۱۳

۱۹۔ عبدالعزیز افتادہ غریزی۔ جلد اول صفحات ۱۶-۱۴

۴۹۔ مثال کے طور پر عوامی فوج کے رہنماؤں نے لکھنؤ میں مرزا پر جیس نذر کو جو اودھ کے تخت پر بیٹھے
کا خواہاں تھا صاف صاف بتا دیا کہ تمہارا مقام اودھ پر شہنشاہِ دہلی ہی تعیین کریں گے۔ جب شاہی
فرمان پہنچا جس نے بحیثیت حکمران اودھ اس کی تقرری کی تصدیق تھی تو اکیس توپوں کی رسی
سلامی دی گئی اسی طرح جب سکے کا سوال پیش ہوا تو فوجی سالاروں نے اس تجویز کو قبول کرنے
سے انکار کر دیا کہ سکے حکمران اودھ کے نام پر جاری کیے جائیں۔ یہ شہنشاہِ دہلی کا حاصل شاہی حق
تھا اور اسے برقرار رکھا گیا۔ درحقیقت حکومت اودھ کے بعض عہدے داروں کو جن میں ۱۵ سالار
اعظم اور صوبہ دار بھی شامل تھے مرکزی حکومت مقرر کرتی تھی اور بہادر شاہ کا سرکاری اخبار نویس
ہمیشہ دربار لکھنؤ میں حاضر رہتا تاکہ تو اعد و روایات ک ہر خلاف و ردی کی اطلاع پایہ تخت
کو بھیجے۔ یہ انہی عام روایات کے سبب ہی تھا کہ جونہی اودھ میں حکومت قائم ہوئی ایک معتمد
نجات سفیر رواج کے مطابق نذر کے ساتھ دہلی کو روانہ ہوا اور جب ۱۶ نومبر ۱۸۵۷ء کے دن
انگریزوں کے ہاتھوں دہلی کے قتل عام کی خبر لکھنؤ میں پہنچی تو چھ سات انگریز قیدیوں کو فی الفور
بطور انتقام قتل کر دیا گیا۔

(کمال الدین حیدر، تاریخ اودھ جلد دوم صفحات ۴۰، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱

- ۲۷۔ ایضاً صفحات ۱۲-۱۳، ۱۸۲۵ء میں دوام و بابی راہنما ولایت علی اور مولوی سلیم دکن کو گئے اور مبارز الدولہ کے تحت ایک طائفہ خفیہ تنظیم قائم کی تھی۔ ۱۸۳۹ء میں برطانوی ریزیڈنٹ کو اس تنظیم کا پتہ چل گیا۔ آخر کار مبارز الدولہ کو قلعہ گوکنڈہ میں قید کر دیا گیا اور وہیں ۱۸۵۱ء میں نے انتقال کیا *Freedom Struggle in Hyderabad* جلد اول صفحات ۲۳-۲۸
- ۲۸۔ اشرف: بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۳
- ۲۹۔ ہنڑ: بحوالہ تصنیف برائے تفصیلات
- ۳۰۔ ڈنٹ *The Indian Rebellion* صفحہ ۱۹۵
- ۳۱۔ منقول تصنیف ڈیساٹی *Social Background of Indian Nationalism* صفحات ۸۲-۸۳
- ۳۲۔ مایسن *The Indian Mutiny of 1857* دیا چ صفحہ ۷۱۱
- ۳۳۔ ڈنٹ: بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۸۱، اس میں ہندوستانیوں کے مختلف طبقات کا ذکر آتا ہے جنہوں نے انگریزوں کا ساتھ ۱۸۵۷ء میں دیا۔
- ۳۴۔ ذکا اللہ: تاریخ غرور وغیرہ
- ۳۵۔ *India Today* زور دی مارچ ۱۹۵۲ء صفحہ ۵۵
- ۳۶۔ کے: *Mutiny papers misc.* 727
- ۳۷۔ برطانوی حکام نے بہادر شاہ کو پہلے ہی مطلع کر دیا تھا کہ اُسے اپنے شاہی خاندان کے دیگر اراکین کے ساتھ لال قلعہ کو خالی کرنا ہوگا اور کسی کو اپنا جانشین نامزد نہ کرنا ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں تیموریوں کا نام تک لوگوں کی یاد سے مٹنے والا تھا۔ بہادر شاہ ایک رقت انگیز شہر میں حکومت کے خاتمے کے احتمال کی طرف اشارہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "کار و بار سلطنت صرف تک محدود ہے۔ اس کے بعد اس کا کوئی جانشین ہوگا اور نہ ہی مغلیہ حکومت کا نام و نشان رہے گا۔" (منقول از تصنیف ذکا اللہ، صفحہ ۳۱۰)
- ۳۸۔ سلیم غم و غنچہ کے ساتھ لکھتا ہے کہ راجہ دھولپور اور بڑھیکھنڈ کے سردار جو انگریزوں کی پروردہ ہیں اور انہیں بہادر شاہ کی حکومت سے کسی فیض کا احتمال نہیں، ابھی تک اپنی ہر متوجہ پر اپنے لقب کو یوں ظاہر کرتے ہیں "خادم و خانہ زاد شہنشاہ، مجاہد دین اسلام"
- (*Rambles and Recollections* p 309)

کا دعویٰ رکھتا تھا۔ جو چیز واقعی معنی خیر ہے وہ یہ حقیقت ہے کہ ایک اطلاق کے مطابق اس کا باب ٹیپو کا درباری رہ چکا تھا ہر حال اس نے غالباً پہلے حیدرآباد میں تعلیم پائی اور پھر لندن میں۔ اس کے بعد ایران اور عرب سے ہو کر واپس ہندوستان کو آگیا۔ ہندوستان میں واپس آنے نے بعد اس کی داستان سبزی بڑی طویل اور دل چسپ ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ فیض آباد میں سکونت اختیار کرنے سے پہلے وہ راجپوتانہ میں سانجھ، جے پور اور ٹونک گیا، پھر گوالیار (غالباً اپنے پیر محراب شاہ کا نیاز حاصل کرنے کے لیے جس کی اتنی قدر و منزلت تھی کہ اس کا نام محمدی حکومت کے ریکوں پر مذکور تھا) دہلی اور آگرہ کو۔ نظریے کے اعتبار سے وہ احیائے اسلام کا حقیقی حامی تھا۔ دہلی کے قیام کے دوران میں اس کی راہ درسم مفتی صدر الدین اور صدر دہلی فضل حق جیسے اشخاص کے ساتھ تھی فیض آباد میں انگریزوں نے اُسے باغیانہ سرگرمیوں کی بنا پر گرفتار کر لیا اور جب لکھنؤ میں بناوت پیا ہوئی، وہ پہنچ چھانسی کا منتظر تھا۔ اس کے بعد لکھنؤ میں تحریک مزاحمت کی کہانی اس کے استقلال، ہمت، صبر و تدبیر اور سپہ گری کے جوہر کی داستان ہے جن کا اظہار اس نے برطانوی فوج کے تربیت یافتہ جرنیلوں کے خلاف اذیوتیں کیا۔ جب دہلی کا پور اور الہ آباد انگریزوں کے ہاتھوں مفتوح ہو گئے تو لکھنؤ نے قومی مزاحمت کا جھنڈا بلند کیے رکھا۔ جب اس کی حفاظت ناممکن ہو گئی تو احمد اللہ اور دوسرے رکنز کے وطن پرست راہنما شاہجہانپور میں لڑتے رہے اور بالآخر وہ محمدی میں مورچے بنا کر ڈٹ گئے جب کہ احمد شاہ بادشاہ اور نئی حکومت کا سربراہ تھا۔ اب اس نے احیائے اسلام کے حقیقی علم بردار کی حیثیت سے حامی دین محمد کا لقب اختیار کیا اور اپنے روحانی مرشد، پشواہ شاہ کے نام کے پیکے جاری کیے لیکن جلد ہی ۱۵ جون ۱۸۵۷ء کے دن سے دعا اڑی سے قتل کر دیا گیا (انتظام اللہ شہابی: ایٹ

انڈیا کینی اور باغی، صفحات ۲۹-۲۸) وہ ایک رویداد تھا اور ماں کے ناتے بخت خاں کی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ وہ ایک رویداد تھا اور ماں کے ناتے سے اور وہ کے شاہی خاندان سے تعلق رکھنے کا دعویٰ کرتا تھا۔ ایک اطلاق کے مطابق جنگ افغانستان میں اس نے ایک معمولی رسالہ کی حیثیت سے برطانوی فوج کی خدمت انجام دی تھی۔ اس کے بعد ترقی پا کر وہ پہلے افسر توپخانہ بنا اور بالآخر چیف میں صوبیدار کے عہدے پر فائز ہوا۔ ۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد ہم اُسے تھوڑی دیر کے لیے بریلی میں دیکھتے ہیں جہاں اس نے انگریزوں کو وہیلکھنڈہ سے لکھنؤ کے لیے نواب، خاں کی مدد کی۔ (یہ نواب

ملکہ مظفر کے خلاف جنگ چھڑنے کا الزام لگایا تو اس نے بڑے وقار کے ساتھ اپنے عمل کو حق قرار دیا اور اعلان کیا کہ — میں اپنے آپ کو بہادر شاہ کا نائب تصور کرتا تھا۔ اسے عمر بھر کے لیے عہدہ شہر کی سزا دی گئی۔ اس نے اس سزا کو میان سے مخوف ہونے کا اشارہ تک دیے بغیر خوشی کے ساتھ قبول کیا۔ (The Times, London, ۱۴ جون ۱۸۵۷ء)

۵۳۔ کنھیالال، بحوالہ تصنیف صفحہ ۶

۵۴۔ جٹا شکر جٹا:

The Patna Conspiracy of 1857

Indian Historical Records Proceedings, 1956

۵۵۔ اس بہادر مغل شہزادے کے بارے میں تفصیلات میسر نہیں ہیں۔ وہ مرزا ناظم کامیاب اور شاہ کا نواسہ تھا۔ کسی وقت ۱۸۵۷ء میں یعنی بغاوت پھوٹنے سے پہلے وہ مکرگج پر روانہ ہو گیا تھا واپسی پر اسے یہ دیکھ کر کہ انگریزوں کے خلاف ملک گیر بغاوت پھیل چکی ہے، بڑا اطمینان ہوا۔ اندہ کے باغی فوجی اور گوالیار اور دھولپور کے افغان مجاہدین راستے میں اس کے ساتھ شامل ہوئے اور اس فوج کے ساتھ اس نے آگرہ کا محاصرہ کر لیا اور پھر میواڑ کو روانہ ہو گیا۔ اس وقت غالب دہلی انگریزوں کے ہاتھوں مفتوح ہو چکی تھی، جب وہ پایہ تخت میں وطن دوست راہنماؤں سے رابطہ پیدا کر رہا تھا۔ بہر حال ہم دیکھتے ہیں کہ وہ فرخ آباد اور شاہجہانپور (جو مجاہدانہ وطن کے گروہ تھے) کے راستے سے لکھنؤ کی جانب روانہ ہوا تاکہ احمد اللہ کے ساتھ مل جائے۔ جب اسے دعوت دی گئی تو وہ محمدی میں احمد اللہ کی عارضی حکومت میں شامل ہونے پر رضامند ہو گیا اس کے بعد اس کی حرکت و سکنت پر وہ تاریکی میں ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ وہ سرحد پار کر کے روس چلا گیا (کمال الدین حیدر، بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۲۶۸) ایک اور بیان ہے اسے دوسرے مقامات و ہالی علما کی صحبت میں پاتے ہیں جیسے محمد اسحاق، حاجی امداد اللہ وغیرہ جو تحریک مزاحمت کی ناکامی کے بعد عرب کو فرار ہو گئے تھے۔ ایک اطلاع کے مطابق ۱۸۵۷ء میں عرب میں اس کا انتقال ہو گیا۔ (انتظام اللہ تہابی، غدر کے چند علمائے صفحہ ۱۳۵)

۵۶۔ ایسن، بحوالہ تصنیف صفحات ۱۸-۱۷

۵۷۔ مولوی احمد اللہ، ۱۸۵۷ء کی تحریک میں ایک حیرت انگیز ہستی ہے۔ وہ شمالی ہندوستان میں نہیں بلکہ مدراس کا رہنے والا تھا۔ وہ گوکندہ کے قطب شاہی خاندان کی اولاد سے تھے

تیار کر دیے گئے تھے۔ (غالب: اردو خطوط برائے تفصیلات)

۶۲۔ غالب: کلیات غالب صفحہ ۱۹۲

۶۳۔ ایسن کی رائے ہے کہ چپاٹیوں کا منصوبہ احمد اللہ نے تیار کیا تھا۔ اس وقت کئی ایک بھوش واپس (مستقبل کے واقعات سے متعلق پیشگوئیاں) کا چپا تھا ذکار اللہ نے اپنی "تاریخ" (دجلہ نصیف) میں فارسی شعر کی صورت میں ایک پیش گوئی کا حوالہ دیا ہے جس کا مقصد غالباً یہ تھا کہ مسلمانوں کے روشن خیال نسلے کو متاثر کیا جائے۔

۶۵۔ غالب: بحوالہ تصنیف

۶۶۔ اس برطانوی جاسوس کو ایک بہت ہی اچھا موقع ملا۔ انھوں نے ہندوؤں کے مقبول لیتا ہونان کے نام کا ایک جھنڈا نکالا اور اسے باغیوں کے کیمپ کے بیچ میں پیل کے درخت پر لگا دیا۔ اس دھوکے کا پتہ نہ ہوا اس وقت چلا جب برطانوی توپوں نے گورہ باری کے لیے اس سے نشانے کا کام لینا شروع کر دیا (کمال الدین حیدر: بحوالہ تصنیف صفحات ۸۷-۲۸۶ برائے تفصیلات)

۶۷۔ علی محمد شاد: بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۷۸

۶۸۔ اصل کے لحاظ سے وزیر خاں بہار کے ایک افغان خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ انگریزی تعلیم کے لیے وہ مرشد آباد گیا۔ اس کے بعد طب کے مطالعے کے لیے اسے انگلستان بھیجا گیا۔ وہاں سے وہ سندھ یا فترہ سرجن بن کر لوٹا۔ پہلے کلکتے کے ایک ہسپتال میں سرجن کے عہدے پر فائز ہوا اور پھر آگرہ میں جہاں احمد اللہ سے اس کی راہ ورسم ہو گئی۔ اس نے وہاں ایک مجلس علم قائم کی۔ اسے یونانی اور عبرانی کے مطالعے کا شوق تھا اور عیسائی مبلغوں کے ساتھ مناظروں میں شریک ہوا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں جب وہ دہلی میں پہنچا تو اسے بہادر شاہ کی کونسل کا رکن نامزد کر دیا گیا۔ محمدی کی حکومت میں بھی اس کا یہی رتبہ تھا

۶۹۔ اشرف: بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۷

۷۰۔ حسین احمد: بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحات ۲۲۷-۲۲۳

۷۱۔ مناظر احسن گیلانی: "سوانح قاسمی" جلد دوم صفحہ ۲۲۱۔ یہ بیان کرنا دل چسپی کا موجب ہے کہ دیوبند کے دارالعلوم کے پرنسپل اور کانگریسی حسین احمد مدنی نے حال ہی میں اس خطاب کو قبول کرنے سے انکار کر دیا جو صدر جمہوریہ ہند نے انھیں عطا کیا۔

۷۲۔ حسین احمد: بحوالہ تصنیف صفحہ ۷۱

بریلی میں عارضی حکومت کا روہیلہ سربراہ تھا، بریلی سے وہ مانا صاحب کی فوج کے لیے فرخ آباد اور بڑوان
سے سپاہی بھرتی کرنے میں مدد کو گیا۔ آخر کار چودہ ہزار فوجیوں، رسالہ کے تین دستوں، توپخانہ
اور بریلی سے ہتھیارے ہوئے چند لاکھ نقد روپوں کے ساتھ وہ دہلی کو روانہ ہوا (کمال الدین حیدر
بحوالہ تصنیف)

۵۹۔ مولوی سرفراز علی جوہر پور کے کراست علی کاٹریہ، سید احمد بریلوی کا شہر خلیفہ اور وہابی تحریک
میں ایک متاثر رکن تھا (کمال الدین حیدر: بحوالہ تصنیف صفحہ ۴۴۵)

۶۰۔ دہلی میں آنے والے وہابی مجاہدین میں جے پور، جمنی، حصار، بھوپال اور نصیر آباد کے چھ ہزار مجاہد
کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ والی سوات اخوند کے تحت جو وہابیوں کا مشہور و معروف سرپرست
اور حامی تھا، سرحد پر واقع وہابی مرکز نے چودہ ہزار مجاہد بھیجنے کی پیش کش کی۔ ٹونک نے چھ سو
کا دستہ بھیج دیا اور دو ہزار کا اور جتھا بھیجنے کا وعدہ کیا۔ دوسوا دہی نجیب آباد سے پہنچ گئے
جو ایک قدیم روہیلہ مرکز تھا (اب اتر پردیش کے ضلع بجنور میں واقع ہے)۔ امیر احمد علی
بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۴۲۔ نیز ملاحظہ فرمائیں حسن نظامی: ”غدر کی صبح و شام“ برائے تفصیلات۔

۶۱۔ جب دہلی مفتوح ہو گئی اور بہادر شاہ دہشت زدہ تھا تو بخت خاں نے ناکامی کے سبب
کی وضاحت کی۔ یعنی انھوں نے ابتدائی غلطی یہ کی کہ شہر دہلی کو لڑائی کے اڈے کے طور پر
منتخب کیا جب کہ رنج (پہاڑی) کی بلندیوں پر دشمن قابض تھا۔ اس نے یہ بھی بیان کیا کہ کس
طرح شہزادہ مرزا مغل جو ایک احمق تھا اور جس نے ازراہ شوق کمان سنبھالی، معاملہ
چھوٹ کر دیا (امیر احمد علی: بحوالہ تصنیف صفحات ۱۳۹-۱۳۸)

۶۲۔ ۱۸۵۷ء کو جب برطانوی فوجی دستے دہلی کے اندر گھسنے میں کامیاب ہو گئے تو وہابیوں
نے مسلمانوں کو جامع مسجد کے علاقے میں جمع کیا اور اپنے ابتدائی حملے میں برہمتی ہوئی برطانوی
فوج کی صفوں کو پساکر کے بھگا دیا اور دشمن کے چار سو جوان مارے گئے (حسن نظامی: ”غدر کی
صبح و شام“ برائے تفصیلات) بالآخر جب جامع مسجد کے علاقے پر دشمن کا قبضہ ہو گیا تو عین
کوٹوالی تک ایک فرنگی لیے رستے پر سوائے کشتیوں کے پشتوں کے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔
(ظہیر دہلوی: داستان غدر صفحہ ۱۲-۱۱۳) یہی وجہ ہے کہ مدت تک مسلمانوں کو جامع مسجد
والگاشت نہ کی گئی۔ برطانوی حکام اس مسجد کو مسمار کرنے کا منصوبہ باندھ رہے تھے جیسا کہ
انھوں نے کئی دوسری مساجد شہید کر دی تھیں۔ البتہ اس علاقے میں مسلمانوں کے اکثر مکانات

- "فخری جہاد"، علمائے دہلی (اُردو)، بقیعہ آغا حیدر صاحب، حیدر آباد دکن
- The Freedom Struggle in Hyderabad 1956 جلال حیدر آباد دکن
- غالب: ملاحظہ فرمائیں "مرزا اسد اللہ خاں"
- غلام رسول تہر: "سید احمد شہید" (اُردو) لاہور ۱۹۵۲ء
- حسن نظامی: "غدر کی صبح و شام" (اُردو) ۱۹۲۶ء
- حسن نظامی: "معاشرہ دہلی کے خطوط" (اُردو) دہلی ۱۹۲۵ء
- History of Philosophy: Eastern and Western دو جلد، وزارت تعلیم، حکومت ہند، لندن ۱۹۵۲ء
- ہنٹر-ڈیلو-ڈیلو، The Indian Musalmans. کلکتہ، ۱۹۴۵ء
- حسین احمد دہنی: "نقص حیات" (اُردو) دو جلد، دیوبند ۱۹۵۲ء
- امام خاں نوشہری: "تراجم علمائے حدیث ہند" (اُردو) جلد اول، دہلی ۱۹۳۸ء
- India Today، رسالہ ماہانہ، الآباد
- Indian Historical Records Commission Proceedings 1955-1956
- انتظام اللہ شہابی: "غدر کے چند علماء دہلی"
- اسماعیل شہید: "منصب امامت" (فارسی) دہلی
- اسماعیل شہید: "تقوۃ الاسلام" (فارسی) لاہور
- کمال الدین حیدر: "تاریخ اودھ" (اُردو) جلد دوم، کلکتہ ۱۸۶۸ء
- کھنیا لال: "تاریخ بغاوت ہند" (اُردو) کلکتہ ۱۹۱۶ء
- کے: Mutiny Papers. (قلمی نسخہ) انڈیا آئنس ریکارڈز، ہوم سیریز، لندن
- خلیق احمد نظامی: "شاہ ذل اللہ کے سیاسی خطوط" (اُردو) دہلی ۱۹۵۰ء
- "خطوط سید احمد بریلوی" (فارسی قلمی نسخہ) برٹش میوزیم، لندن
- محمود بنگلوری: "نعیمہ میوسلطان" (اُردو) دو جلد، لاہور، ۱۹۴۶ء
- "عمارِ عظیم" یعنی "تاریخ بغاوت ہند" ۱۹۴۶ء، ملاحظہ فرمائیں کھنیا لال مذکورہ بالا۔
- مابین کرنل جی بی: The Indian Musalmans of 1857 لندن، ۱۸۹۱ء
- منافرا حسن گیلانی: "سوانح قاسمی" (اُردو) دو جلد، دیوبند، ۱۳۴۵ھ

۷۲۔ محمد علی قصوری "تاریخ سیاست" میں ۱۹۵۱ء، ملاحظہ فرمائیں "کتابیات"

۷۳۔ "التوراة الهندیہ" کے نام سے بھی موسوم ہے۔ ملاحظہ فرمائیں "کتابیات"

۷۵۔ وہ کہتا ہے: "میں نے کوئی جرم نہیں کیا، سوائے اس کے کہ مجھے انگریزوں (یاد دوسرے کا فرقہ) کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں۔ میں ان کے لیے کسی غمخواری کا اظہار نہیں کر سکتا۔ یہ ایک شہرہ عام حکم قرآن کے عین مطابق ہے جس میں ہدایت کی گئی ہے کہ مومن ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات نہ رکھیں (عبدالشہید خاں شیروانی: "باغی ہندوستان" صفحہ ۴۸۸) جب دہلی میں اس پرتوتی جہاد پر دستخط کرنے کا الزام لگایا گیا تو اس نے صاف اس الزام کا اعتراف کر لیا۔ اگرچہ شہادت نہ ملنے کی بنا پر وہ بری ہو سکتا تھا۔

۷۶۔ ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ ہنٹر The Indian Musalmans انتساب

کتابیات

عبدالعزیز دہلوی: "فتاویٰ عربیہ" (فارسی) دو جلد ۱۳۲۱ھ
عبداللہ: "جنگ ستان و ملکہ" (فارسی قلمی نسخہ) برٹش میوزیم، لندن
عبدالشہید خاں شیروانی: "باغی ہندوستان" (اردو) بجنور، ۱۹۴۶ء
آغا زبیر: "کالنامہ سروری" (اردو) علی گڑھ، ۱۹۲۳ء
محمد علی شاد: "تاریخ صوبہ بہار" (اردو) عظیم آباد، ۱۸۶۵ء
امیر احمد علوی: "بہادر شاہ ظفر" (اردو) لکھنؤ، ۱۹۵۵ء
اشرف کے: "ایم۔ کیو۔ ایس۔ پاری آن انڈیا۔ رپورٹ" (مسودہ)

بیل: "سجریونس: Sir Thomas Munro. ۱۸۹۷ء
بریڈ شاہان: "Memoirs of General Briggs ۱۸۸۵ء

چودھری ایس۔ بی.: "Civil Disturbances During the British Rule in India (1765-1857 Calcutta 1955

چراغ علی: "تحقیق الجہاد" (اردو) لاہور

ڈن۔ ریلورنڈ الگزینڈر: "The Indian Rebellion ۱۸۵۸ء

لندن ۱۸۵۸ء

بنے نگہوش

بنگال کا روشن خیال طبقہ اور انقلاب

اس مقالے میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی طن بنگال کے روشن خیال طبقے کی بے رخی کے رویے کی تحقیق کی جائے۔ بنگال کی سماجی تاریخ کے طالب علموں کے لیے یہ بے رخی ایک پریشان کن مسئلہ رہی ہے جس کی کوئی خاطر خواہ وضاحت پیش نہیں کی جاسکی۔ اس کی وجہ صرف انیسویں صدی کے وسط کا وہ جذبہ وفاداری نہیں جس کا خیال روشن خیال طبقہ کرتا تھا۔ ان کی وفاداری کبھی بھی غلاموں کی سی وفاداری نہیں تھی بلکہ اس پڑھے لکھے مجدد طبقے کی وفاداری تھی جو نئے سماج میں اپنے تاریخی رد اور اپنے مفاد کا پورا پورا شعور رکھتا تھا۔

اس لیے بنگال کے روشن خیال طبقے کی وفاداری مشروط تھی۔ جب تک برطانوی حکام پڑھے لکھے لوگوں کے طبقاتی مفاد کے حق میں کام کرتے ان کی وفاداری یقینی تھی ورنہ نہیں۔ جدید بنگال کے روشن خیال طبقے کی پہلی پشت کے سن بلوغ سے لے کر گذشتہ صدی کی تیسویں دہائی تک انگریز حکمرانوں کے ساتھ کئی بار ان کی جھڑپیں ہوئی تھیں اور کئی موقعوں پر انھوں نے جأت کا اظہار کیا تھا اس لیے یہ کہنا غلط ہوگا کہ انیسویں صدی کے وسط میں بنگال کا روشن خیال طبقہ باغیوں کی جو مخالفت کرتا تھا وہ محض ان کے حکمرانوں کے جذبات کی صدا ہے بازگشت تھی۔ اس معاملے میں ان کا اپنا نقطہ نظر اور اپنی رائے تھی۔ اس مقالے کا بڑا مقصد یہ ہے کہ اس نقطہ نظر کو معلوم کیا جائے اور متعلقہ مواد کی روشنی میں اس کے اسباب کا جائزہ لیا جائے

۱۸۵۷ء کے انقلاب کی اصل مابیت اور ممکن اسباب پر سو سال کے مباحثہ کے بعد کی موزین

”مرآة الانظار“ یعنی ”تاریخ صوبہ بہار“ مصنفہ علی محمد شاد

مرزا اسد اللہ خاں، ”کلیات غالب“ (فارسی) لکھنؤ، ۱۳۸۲ھ

”عودِ ہندی“ (اُردو) علی گڑھ، ۱۸۲۶ھ

”اُردو علی معنی“ (اُردو) لاہور، ۱۹۳۲ھ

مرزا حیرت دہلوی، ”حیاتِ لطیفہ“ (اُردو) امرتسر، ۱۹۳۲ھ

مولوی محمد اسماعیل: ملاحظہ فرمائیں اسماعیل شہید

محمد علی قصوری: ”مشاہداتِ کامل و پاکستان“ (اُردو)

”تاریخ و سیاست“ رسالہ سرمایہ، کراچی ۱۹۵۱-۵۲ھ

مومن خاں مومن: کلیاتِ مومن (اُردو) کراچی، ۱۹۵۵ھ

مومن خاں مومن: ”دیوانِ فارسی“ (فارسی سسودہ) مجموعہ شیعیت، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

نظای بیرونی: ”انقلابِ دہلی“ (اُردو) بھاؤن، ۱۹۳۱ھ

رام بہائے تنشا: ”تاریخ صوبہ اودھ“ (اُردو) لکھنؤ، ۱۸۶۶ھ

رئیس احمد جعفری: ”بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد“ (اُردو) لاہور، ۱۹۵۵ھ

سارکر۔ وی۔ ڈی: ”وی۔ ڈی: Indian War of Independence“ دو جلد، کلکتہ، ۱۹۳۰ھ

مسید احمد خاں: ”تذکرہ اہل دہلی“ (اُردو) کراچی، ۱۹۵۵ھ

سین۔ سر ڈیو۔ ایچ۔

Rambles and Recollections of an Indian Official, Oxford 1915

Memoirs of William Hickey, Volume 1, London 1913-1915

Times, The London 1857-1872

Trial of Ex-king of Delhi. J. R. Department.

شاہ ولی اللہ: ”مجتبى اللہ الباقى“ (عربی) دو جلد، قاری، ۱۳۵۲ھ

شاہ ولی اللہ: ملاحظہ فرمائیں خلیق احمد نظای

Wellesley Papers, India Office Records, Home Misc. Series

نظیر دہلوی: ”داستانِ غدر“ (اُردو) لاہور

ذکاء اللہ: ”تاریخ عروجِ انگلیشیہ ہند“ (اُردو) دہلی، ۱۹۰۲ھ

کرنے کی واقعی اشد ضرورت تھی اور اس میں بغاوت کے جن اسباب کا خدشہ ظاہر کیا گیا تھا وہ حقیقی تھے اگرچہ صرف یہی نہ تھے۔

مہاجر جنرل ایچ۔ ٹی۔ ٹیکر نے جو کئی سال بنگال کی فوج کے ایڈ جوائنٹ جنرل رہے تھے، بغاوت کے ممکن اسباب کے بارے میں ۱۹ جولائی ۱۸۵۷ء کو "ٹائمز لندن" کے نام ایک خط لکھا یہ خط ایک بیشش بہادر ستادیز ہے کیوں کہ یہ بنگال کے فوجی عملے کے ایک نہایت تجربہ کار افسر علی افسر کی رائے پیش کرتا ہے مگر لکھتا ہے :-

"جناب محترم! اس وقت جب کہ سارا ملک بنگال میں بغاوت کے اسباب پر تکیاں آرائی کر رہا ہے۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ میں چند باتیں بطور تشریح پیش کروں جن سے مجھے یقین ہے کہ لوگوں میں اعتماد پیدا ہوگا۔ حال ہی میں یہ خیال عام طور پر دیسی باشندوں اور خاص طور پر دیسی فوج کے دلوں میں گھر کر گیا ہے (خواہ کیسے ہی یہ خیال ان تک پہنچا) کہ سرکار کا ارادہ ان کو بے دین کرنے اور فوجیوں کو عیسائی بنانے کا ہے۔ حالیہ قوانین جو نسبتاً عجلت میں ایسے مسائل کے بارے میں بنائے گئے جن کا گہرا تعلق دیسی لوگوں کے جذبات اور مذہب کے ساتھ ہے اور بنگال کے ملکی طریقہ تعلیم میں بڑے پیمانے پر تبدیلیاں اور ہمارے بعض کمزور اور جاہل مذہب کے دیوانوں کے عاقبت نااندرشی اور غیر دانشمندی کے طور طریقے فوجیوں کو ہماری حکومت کے خلاف زبردست بدگمانیوں پر مائل کرنے کے لیے کافی ثابت ہوئے ہیں۔ فوجیوں کی نگاہ میں مرشد پرستی اور مذہبی تعصب سب سے بڑا اصول ہے۔ درحقیقت تقسیم ہندو جنت میں برسوں سے برہمنوں کا اثر و رسوخ خطرناک حد تک غالب ہے۔

اس سلسلے میں اب میں ایک اہم ترین ہندوستانی سرسید احمد خاں کے آنکھوں دیکھے حال کیا بیان پیش کروں گا۔ چونکہ یہ بیان ہندوستان کے مسلم فرقے کے ایک ممتاز راہنما کے قلم سے ہے جو بغاوت کے دوران ہندوؤں کی نسبت بجا طور پر زیادہ رنجیدہ خاطر تھے اور بنگال سے باہر بغاوت کے طوفانی مراکز میں موجود تھے اس لیے سرسید احمد کے بیان کو خاص وقعت حاصل ہے۔ اپنی تصنیف "رسالہ اسباب بغاوت ہند" (An Essay on the causes of the Indian Revolt) میں سرسید احمد نے لکھا:-

مذہب میں مداخلت کے اس خوف کو بغاوت کا ایک بہت بڑا سبب قرار دیا۔ انھوں نے لکھا:-
"اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام اشخاص، دانایا نادان، معزز یا غیر معزز، کا خیال تھا کہ حکومت واقعی دل و جان سے لوگوں کے مذہب اور رسم و رواج میں دخل دینے، سب کو، خواہ ہندو ہوں یا مسلمان عیسائی بنانے اور ان کو یورپی طور طریقے اور عادات اپنانے پر مجبور کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ مرشدانہ یہ

میں اتفاق رائے نہیں ہو سکا۔ اگر ہم دیکھیں کہ فریڈرک انڈیا، انجمن مین، بنگال برکار و کلتوریو ہندو پیٹریٹ اور دوسرے اخبارات و رسائل کا بغور مطالعہ کریں تو ہمیں یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے اصل اسباب سماجی اور مذہبی تھے اور سیاسی اسباب ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ بات اہم ہے، خاص طور پر اس حقیقت کے پیش نظر کہ بنگالوں میں روشن خیال طبقے کا رویہ بغاوت کے اصل اسباب کے تجزیے پر منحصر تھا۔ سیاسی اور معاشی اسباب کو بالکل نظر انداز نہیں کیا گیا لیکن ان کا جائزہ تاریخی نقطہ نگاہ سے لیا گیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ اسباب اس نوعیت کے متوسط شہری طبقے کے مفاد کے منافی ہیں جس کا بنگالیوں میں روشن خیال طبقہ ایک جز تھا۔ پہلے ہم بغاوت کے مذکورہ بالا اصلی اسباب پر بحث کریں گے۔

اپریل اور مئی میں بغاوت کے تیزی کے ساتھ پھیلنے پر لارڈ کینگ نے ایک اعلان جاری کیا جو ۱۲ مئی ۱۸۵۷ء کے *Calcutta Gazette Extra-ordinary* میں شائع ہوا۔ یہ حسب ذیل ہے۔

”گورنر جنرل ہند نے بنگال کی فوج کو آگاہ کیا ہے کہ وہ افواہیں جن سے بعض رجمنٹوں کے آدمیوں میں ریشک پیدا ہو گیا ہے کہ حکومت ہندوستان ان کے مذہب پر حملہ کرنے اور ہماری ذات پات کو نقصان پہنچانے کی تدبیر سوچ رہی ہے، محض شرارت بھرے جھوٹ ہیں۔
 نہ صرف فوج میں بلکہ لوگوں کے دوسرے طبقوں میں بھی جاری ہے۔۔۔ ایک بار پھر گورنر جنرل تمام لوگوں کو ان دغا بازوں کے خلاف متنبہ کرتے ہیں۔“

اگر مذہب اور ذات پات کے معاملات میں سرکاری مداخلت متنبہ کرتے ہیں۔
 پریشانی کا سبب نہ ہوتا تو ایسا اعلان جاری کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ وارن ہیسٹنگز کے عہد سے ان کی یہ قطعی پالیسی تھی کہ قدیم سماجی اور مذہبی رسم و رواج کے معاملے میں ہر ممکن مصالحت کا رویہ اپنائیں اور آہستہ آہستہ تبدیلیاں اور اصلاحات عمل میں لائیں۔ وہ نرمی اور مصالحت کے ساتھ تبدیلی لانے کی توقع رکھتے تھے اور یہ اس زمانے کے قدامت پسندانہ میں تھی ممکن تھا جب روایتی معاشرے میں کم سے کم مداخلت کی پالیسی اختیار کی جائے۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ انیسویں صدی کے اوائل کی اکثر سماجی، تعلیمی اور مذہبی اصلاحات کی تحریکیں بنگال کے نئے شہری متوسط اور روشن خیال طبقے نے شروع کیں تاکہ برطانوی حکمرانوں نے۔ اس لیے حکمرانوں کے نقطہ نگاہ سے مذکورہ بالا اعلان جاری

حسب ذیل تھا۔ ۳۰

”اس بات کی خاص اہمیت طرکھی جائے کہ ادنیٰ ذالوں کے تمام آدمیوں کو نہ بھرتی کیا جائے مثلاً چھوٹے موٹے دوکاندار، کاتب، جام، تیلی، گڈریے، چھپر بند، پنواڑی، بھڑکھوٹے، تلی، کبار، حلوانی، مالی اور بہت سے دوسرے جو ادنیٰ پیشوں میں کام کرنے کے عادی ہیں۔“
ایک بنگالی رجسٹر کی ترکیب عام طور پر اس طرح تھی: — برہمن ۳۵۰، راجپوت ۳۵۰ مسلمان ۱۵۰، اعلیٰ ذالوں کے ہندو ۱۵۰

اس قسم کی فوج میں ہر قسم کے مذہبی پرچار سے متاثر ہونے کی ذمہ دہت صلاحیت ہوتی چلیے تھی اور بنگالی فوج میں واقعی پیدا ہو گئی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے پر متضاد خیالات کی پوری پوری چھان بین کے بعد کلکتہ ریلویوں (۱۸۵۷ء) اس نتیجے پر پہنچا کہ بنگال کے اندر کامی سبب وہ مکمل بے قاعدگی اور نافرمانی کی ذہنیت تھی جو بنگالی فوج کے برہمنوں کا خاصہ تھی۔

بغاوت کے مذکورہ بالا سماجی اور مذہبی اسباب اور بنگال کی فوج میں ادنیٰ ذات کے غیر بنگالیوں کی موجودگی نہایت اہم امور تھے جو نئے بنگالی متوسط طبقے کے بالعموم اور پڑھے لکھے لوگوں کے رویہ کے بالخصوص موجب تھے۔ انیسویں صدی کے اولین نصف کے دوران جو سماجی اور تعلیمی تحریکیں کے بعد دیکھے گئے چلائی گئی تھیں ان پر یکے بعد دیگرے نئے متوسط اور روشن خیال طبقوں نے متواتر اور جم کر اثر کرنے کے بعد اپنا اثر قائم کر لیا تھا۔ رام موہن رائے اور ان کے ساتھیوں نے جنھیں نوجوان بنگال کے ڈیروزیں (Deozis) کہتے تھے، برہمنوں اور ویدیاگر کے مریدوں نے غازیوں کی طرہ سماجی اور مذہبی قدامت پسندی کی تمام قوتوں کے متحدہ حمائے کے خلاف جنگ کی۔ ان سماجی جنگوں کی شدت کی ایک جھلک ان کی تصنیفات اور بیانات سے ظاہر ہے۔ ان میں سے چند قابل ذکر ہیں۔

نوجوان بنگال کے دو اہم ترین اخبارات یہ تھے، ”دی انکوئیرر“ The Enquirer (انگریزی) اور ”گیان الویشن“ (بنگالی بمعنی جستجوئے علم) جس نصب العین کے لیے نوجوان بنگال نے جنگ کی۔ ان کے اخبارات کے نام سے ظاہر ہے The Enquirer کا مدیر کرنل موہن بیزئی تھا اور گیان الویشن کا دکنشائین کمر جی تھا۔ دونوں سرکردہ ڈیروزیں تھے۔ ”انکوئیرر“ (The Enquirer) نے جولائی ۱۸۵۷ء میں کٹر ہندو فرقے کے غیظ و غضب کے بارے میں یوں لکھا:

”مذہبی ظلم، ستم اب بھی جاری ہیں، مذہب کے متعصب دیوانے الزام تراشی میں مصروف ہیں

بغاوت کا اہم ترین سبب تھا۔

”عیسائی مبلغوں نے بھی دین عیسوی کی تبلیغ کا ایک نیا طریقہ رائج کیا تھا۔ مذہبی رسائل بصورت سوال و جواب شائع اور لوگوں میں تقسیم ہونے لگے۔ وہ اپنی مرضی سے مسلمانوں کی مسجدوں اور ہندوؤں کے مندروں اور میلوں میں اکثر تبلیغ مذہب کی خاطر جاتے جس پر کوئی شخص حکام کے خوف کی وجہ سے اعتراض کرنے کی جرأت نہ کرتا۔ اس کے علاوہ بعض ضلعوں میں انھیں اپنے ساتھ تھانے کا ایک سپاہی یا چپر اسی لے جانے کی بھی اجازت تھی۔ یہ لوگ صرف دین عیسوی کی تبلیغ پر لگنا نہ کرتے بلکہ دوسرے مذاہب کے مقدس مقامات اور قابل تعظیم ہستیوں کا بہت بے ادبی کے ساتھ ذکر کرتے جس سے سننے والوں کو بہت دکھ اور رنج ہوتا اور لوگوں کے دلوں میں حکومت کے تیش نفرت پیدا ہوتی تھی۔“

سر سید احمد نے کلکتہ کے ایک شخص ڈیو۔ ای۔ ایڈمنڈ کے ایک خط کا حوالہ دیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ چوں کہ ملک کے تمام حصوں کو ریلوں، دفاعی جہازوں اور برقی تاروں کے ذریعے ایک دوسرے کے ساتھ تیزی سے ملایا جا رہا ہے اس لیے اب بنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کرنے کا وقت ہے کہ آیا ایسی تھا بھی ہونا مناسب ہے یا نہیں۔ یہ مذہب عیسائیت ہے جو ہندوستان میں مختلف فرقوں اور طبقوں کو متحد کر سکتا ہے۔ اس خط پر جو کلکتہ کے عوام اور سرکاری ملازمین میں مشتہر کیا گیا، سید احمد نے نکتہ چینی کرتے ہوئے لکھا:

”یہ ایک حقیقت ہے کہ ان خطوط کے پہنچنے پر دیسی باشندے ایسے دہشت زدہ ہو گئے کہ ان کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا ہو اور ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ہو۔ سب کو یقین ہو گیا کہ میت سے جس گھڑی کا ڈر تھا، آخر آ پہنچی۔ اب پہلے سرکاری ملازموں کو اور پھر ساری آبادی کو دین عیسوی قبول کرنا پڑے گا۔“

ان احمق کے علاوہ بنگالی فوج کی ارتقا کی تاریخ، اس کی ترکیب اور بھرتی کرنے کے قواعد بھی قابل غور ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ کلایونے ایک ہالین بھرتی کی جو اس کے تحت پلاسی میں لڑی اور جو بنگال کی فوج کی بنیاد تھی، چوں کہ یہ شمال مغربی علاقوں کی جگہ آبادی سے بھرتی کی گئی تھی اس لیے یہ زیادہ تر اونچی ذات کے آدمیوں پر مشتمل تھی جو ہر خطرے کا سامنا کرنے پر آمادہ تھے مگر سپاہی کے ادنیٰ فرائض سے کراہیت کا اظہار کرتے تھے جب کہ مدد اس اور بھتی کی رشتیں، جن میں مختلف نسلوں اور ذاتوں کے آدمی دوسرے سے ملتے اور بھائیوں کی طرح رہتے، عام طور پر زیادہ فائدہ مند اور فرماں بردار تھیں۔ بنگالی فوج کے بھرتی کے قواعد میں ایک پر امرات

زمین نوجوان مثلاً کرشن موہن، مدھو موہن دت (مشہور شاعر) اور کئی دوسرے عیسائی ہو گئے۔
تبدیلی مذہب کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ عیسائیت سے متعلق خطبوں اور مناظروں کا اہتمام کیا
جاتا جس میں کالج کے طلباء اور تعلیم یافتہ لوگ بھاری تعداد میں حصہ لیتے۔ ڈن نے جس مجلسی لمپل کی تصویر
لی تھی اس سے بے حد خوشی ملے بلغمین چشم پوشی کرتے۔ ہندو کالج کے حکام چرکس ہو گئے اور خیال
کرنے لگے کہ ان کا مذہب خطرے میں ہے۔ اس لیے انہوں نے فیصلہ لیا کہ جو طالب علم ان خطبوں اور
مناظروں میں شامل ہوگا اسے کالج سے خارج کر دیا جائے گا۔ ۵۹-۱۸۶۰ء کے دوران حالات
انتہائی ابتری کی طرف بڑھ رہے تھے۔ صورت حال ایسی نازک ہو گئی کہ برہو بھائیوں اور دوسرے
مصلحین نے تتو بوہنی میں دیوندر ناتھ ٹیگور (والد رابندر ناتھ ٹیگور) کی زیر قیادت ایک مجلس منعقد
کی اور اُس وقت مصلحت اس بات میں دیکھی کہ قدامت پرست دھرم سبھاؤں کے ساتھ جوان
کے دشمن تھے، عیسائی مصلحین کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک متحدہ محاذ بنایا جائے۔ ۶۰-۱۸۶۰ء تتو بوہنی پٹرکا
میں ادارتی مضامین کا ایک سلسلہ شائع ہوا جن میں عیسائی مصلحوں کی مذمت کی گئی، لیکن یہ تمام گوشیں
مشریوں کی سرگرمیوں کو روکنے میں ناکام رہیں بلکہ ان کو اتنی جرأت ہوئی کہ انہوں نے ستمبر
۱۸۶۰ء میں بمقام کلکتہ بنگال کے تمام مشریوں کی ایک مجلس عام منعقد کی۔ اس مجلس کے خاتمے
پر یورپ اور امریکہ کی تبلیغی انجمنوں سے زیادہ آدمیوں اور روپے کی امداد اور معاون کی اپیل
لگائی تاکہ زیادہ جوش و خروش کے ساتھ تبلیغی سرگرمیوں کو جاری رکھا جائے۔

عیسائی مصلحوں کی ان زیادتیوں کو روکنے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ بنگال کے مصلحین
نے اپنی سماجی اور تعلیمی اصلاحات کی جدوجہد کو مذہب کے خلاف جہاد کی راہ سے الگ تھک رکھا
زیادہ تو برہو سماجی مسائل پر مرکوز کی جاتی جیسے ہندو بیوہ کی دوبارہ شادی، بچپن کی شادیوں کی نفی،
ذات پات کی تفریق، ایک سے زیادہ شادیوں کا دستور، عورتوں کی تعلیم اور نجات وغیرہ۔ وسط صدی
کی سماجی تحریکات میں پنڈت الیور چندر دویا ساگر نے ایک مرکزی حیثیت حاصل کی زیادہ تر
ان کی اور ان کے ایک رفیق کد اکشے کمار دت کی مسلسل کوششوں کی وجہ سے بیوہ کی دوبارہ
شادی تعلیم نسواں کے حق میں اور ایک سے زیادہ شادیوں اور بچپن کی شادیوں کے رواج کے
خلاف تتو بوہنی پٹرکا اور دوسرے اخبارات کے کالموں کے ذریعہ مہات شروع کی گئیں۔ دویا
نے عیسائی مصلحوں اور قدامت پرست ہندوؤں کو اپنے حملے کا سیدھا نشانہ بنایا۔ ان کے
ترسے دلائل اور انسان دوستی تھے۔ ان کا جھکاؤ سوائے ہندومت کے کسی اور مذہب کا طوفان

گرم سہا تشدد پر مائل ہے وہ نہیں جانتے کہ کیا کر رہے ہیں (کثر ہندوؤں کی دھرم سہا کو جو نوجوان
 مصالچین کے خلاف ہنگامے کرتی رہتی تھی، طنزاً گرم سہا کہتے تھے) مذہبی دیوانوں کا شعر ہے
 ”حقہ پانی بند کرو“۔ یہیں اہید ہے کہ ”ثابت قدمی“ روشن خیال لوگوں کے پاس اس کا جواب ہے
 گرم سہا میں ابال آ رہا ہے۔ اسے کھولنے کی حد تک پہنچے دو۔ مذہبی دیول نے غضب ناک میں نہیں
 مشعل بونے دور آزاد خیال کی آواز ایک رومن کی آواز ہونے دو۔ رومن نہ صرف عمل کرنا جانتا ہے
 بلکہ سختی جھیلنا بھی جانتا ہے۔ ”حقہ پانی بند“ کا ڈھنڈورا گھر پٹنے دو۔ چند تو کو سماج برادری سے
 خارج ہونے دو۔ یہ ایک جماعت منظم کریں گے جو ہم صدق دل سے چاہتے ہیں۔

اگرچہ کرشن مومن خود ایک کٹر بنگالی برہمن خاندان سے تھا، پھر بھی اس نے اپنے فرقے کی
 سختی طے کیے۔ اس نے ایک نازک بعنوان دی پر کی کیوڈ (The Persecuted) لکھا جس
 کی تمہید میں اس نے بیان کیا ہے

”ہندو فرقے کے بارہ سوخ افراد کی سیاہ کاریوں اور بے اصولیوں کی تصویر ان کی آنکھوں
 کے سامنے کھینچی گئی ہے۔ اب وہ برہمنوں کی عیاریوں اور دغا بازیوں کو صاف صاف دیکھیں گے
 اور ان سے اپنے آپ کو بچا سکیں گے۔“

ناٹک کا ایک کردار بنی لال کہتا ہے: ”اب جب کہ علم نے آگے بڑھنا شروع کر دیا ہے
 ہندو مت منہ کے بل گرب گا اور دھرم سے گرے گا۔ اصلاح مذہب ضرور ہوگی اور لوگوں کے دل
 حسد کی آگ سے جلیں گے۔ تعصب اور آزاد خیالی زیادہ مدت تک ایک ہی چھت کے نیچے چھت
 میں شگاف کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔“

قدامت پسند ہندوؤں کی گیدڑ بھکیوں کے خلاف بنگال کے نوجوان مصالچین کا یہ
 تھا۔ اس سے ان کی بے مبری، جنگ جوں اور عدم مصالحت ٹپکتی تھی۔ یہ کون دانائی یا دور اندیشی
 کی بات نہیں تھی لیکن مصالچین کے غلوں، جوش اور عقیدت میں کوئی شک نہ تھا۔ جب اصلاح
 سے مراد اصلاح مذہب تھا اور مذہب سماج کا بڑا ستون تھا تو نوجوان ڈیروزینوں (مصالچین)
 لیے مذہب کو جن کر سیدھے حلے کا نشانہ بنانا ایک فطری فعل تھا۔ (اگرچہ حکمت عملی کے اعتبار سے)
 غلط تھا) مذہب کے تئیں اس ڈیروزین رویے نے مشرعوں کے لیے دین عیسوی کی تبلیغ کا ایک
 تاریخی موقع پیدا کر دیا۔

یاد رہی ڈنٹ کی طرح کئی مقتدر شخصیتیں اس میدان میں سرگرم ہو گئیں۔ معزز خاندانوں

نے رجعت پسندوں کے لامحدود وسائل کے خلاف لڑائیاں زیادہ تر انگریزوں کی مدد سے جیتی تھیں۔ ساتھ ہی یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ بغاوت کرنے والوں اور ان کے مذہبی رجعت پسندی کے نعرہ جہاد کی مخالفت کر کے بنگال کا روشن خیال طبقہ قدامت پسند برطانوی حکمرانوں کے موقف کی بھی مخالفت کر رہا تھا جو اپنی پارٹی کے آزاد خیال لوگوں کی سختی کے ساتھ نکتہ پسینی کر رہے تھے اور ان پر الزام رکھ رہے تھے کہ وہ سماجی اصلاحات میں عجلت سے کام لے کر بغاوت کا موجب بن رہے تھے۔

۲

سیاسی، اقتصادی اور سماجی اسباب کی بنا پر بھی بنگال کے روشن خیال طبقے نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی مخالفت کی۔ جدید سماج میں چیدہ لوگوں کے انتخاب سے متعلق کارل منیم کہتا ہے: **مگر ہم تاریخ میں نظر میں اس کا جائزہ لیں کہ چیدہ لوگوں کا انتخاب کس بنیاد پر عمل میں آ رہا ہے تو ہمیں تین واضح اصول نظر آتے ہیں:** خاندان، جائداد اور طبقہ۔ **طبقہ:** امر اور اپنے چیدہ نمائندوں کو بنیادی طور پر خاندان کی بنا پر چھٹتا تھا خصوصاً اس وقت جب اس نے اپنے قلم جمالیے تھے۔ بشہری متوسط طبقے نے آہستہ آہستہ ایک اور اصول کا بھی اضافہ کیا یعنی اصول دولت جو پڑھے لکھے طبقے کے چیدہ لوگوں پر بھی صادق آتا تھا کیوں کہ تعلیم کا موقع کم و بیش صرف امیروں ہی کے بچوں کو حاصل تھا۔ یہ صحیح ہے کہ ابتدائی دور میں بھی استعداد کا اصول کسی قدر دوسرے دو اصولوں کے ساتھ شامل تھا لیکن یہ جدید جمہوریت (جب تک اس میں توانائی ہے) ہی کا فیض ہے کہ استعداد سماجی کامیابی کا معیار بن گیا۔ **حیثیت سے روز افزوں اہمیت اختیار کرتی جا رہی ہے۔**

انیسویں صدی کے پہلے نصف کو ہم بنگال کے جدید شہری متوسط طبقے کا ابتدائی دور کہہ سکتے ہیں۔ روشن خیالوں کے انتخاب کے طریقوں میں اصول استعداد کو خاندان اور جائداد کے دو اصولوں کے ساتھ شامل کیا گیا تھا۔ بغاوت کے وقت بنگالی روشن خیالوں کی دوسری اور تیسری پشت میں تین اصولوں میں سے کم از کم اصول خاندان یقیناً متروک ہو رہا تھا۔ بنگالی سماج میں روشن خیالوں کے انتخاب کے لیے دولت اور استعداد کے اصول موثر معیار بن رہے تھے۔ بنگال کے پڑھے لکھے لوگوں کی بڑھی اکثریت خوش حال، اعلیٰ، متوسط طبقوں کے کنبوں سے تعلق رکھتی تھی جنہوں نے ادنیٰ

نہ تھا اور وہ جانتے تھے کہ ہر مذہب کے اپنے اعتقادات اور توہمات ہوتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ اپنے ساتھی مصلحین یعنی ڈیروزیوں اور برہموسبھیوں سے اختلاف رکھتے تھے۔ دیا ساگر کے بے لاگ اور متوازن رویے نے اس زمانے کی سماجی تحریکات پر بخیر اثر ڈالا۔ خاص طور پر ڈیروزیوں کی مذہب کے خلاف انتہا پسندی پر۔ لیکن اس کی چلائی ہوئی تحریکوں سے قدامت پسند دھرم بھائی ایسے برائیتیں ہوئے کہ انھوں نے مسات اور بخیرگی کو بالائے طاق رکھ کر مصلحین کو بے دینوں کا ایک گروہ قرار دیا جسے فتنہ پرداز پادریوں نے گمراہ کر رکھا تھا۔ یہ حملے جواں حملوں کا موجب ہوئے جب ۱۸۵۶ء کے ایک ہندوہ کی رو سے ہندو یوہ کی شادی دوبارہ قانوناً جائز قرار دی گئی اور دسمبر ۱۸۵۶ء میں بمقام کلکتہ ترقی پسندوں نے اس قانون کے اختیار کے تحت پہلی ایسی شادی بڑی دھوم دھام سے منائی تو بحث و مباحثہ کی گرمی اشتعال کی حد تک پہنچ گئی۔ یہ بحث زیادہ تر مذہبی تھی۔

۱۸۵۷ء کے آغاز میں بنگال کے سارے سماج میں ہیجان پایا تھا۔ قدامت پسند ہندو اور باہل اور توہم پرست لوگ مصلحین کی نمایاں کامیابیوں پر بدحواس ہو گئے۔ مذہبی دیوانوں کا گڑھ اب منہدم ہونے والا تھا۔ رام موہن، ڈیروزیں، برہموسبھائی اور دیا ساگر کے پیرو اس گڑھ کے بعض بھاری ستونوں کو کچلے بعد دیگرے سہا کر رہے تھے۔ دھرم بھائی اسے برطانوی حکمرانوں اور ان کے ایجنٹوں یعنی میسائے مشنریوں کی محض ایک سازش خیال کرتے تھے جس کا مقصد تمام لوگوں کو ان کے مذہب کو برباد کر کے عیسائی بنانا تھا۔ صدائے احتجاج بلند سے بلند تر ہونے لگی۔ اس شور، افراتفری اور ہنگامے کے درمیان اس شک کی بنا پر کہ کارٹوس گائے اور سوہ کی چربی سے آلودہ کیے جاتے ہیں۔ کلکتہ سے چند میل دور بارک پور میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ یہی

دھرم بھائی کی سپاہیوں کی شکایات نے مذہبی رنگ اختیار کر لیا۔ سپاہیوں نے عین اس وقت مذہب میں مداخلت کے خلاف شور برپا کیا جب روشن خیال طبقہ شہر میں قدامت پسند ہندوؤں کے اسی ہنگامے کی مخالفت کر رہا تھا۔ بنگال کا روشن خیال طبقہ بنگالی فوج کے اعلیٰ ذات ہندوستانی اور راجپوت عنصر سے پوری طرح باخبر تھا اور ان کے مشہور مذہبی تعصب اور قدامت پسندی سے بھی واقف تھا اس لیے وہ قسطنطنیہ طور پر ان کو سماجی رجعت پسندوں کا طرفدار سمجھتا تھا۔ ان حالات میں ان کے لیے سوائے ان کی مخالفت کرنے کے کوئی اور چارہ نہ تھا۔ باغیوں اور ان کے مقصد کی حمایت کرنا اس وقت ان اصولوں اور عقیدوں کے منافی تھا جن کے لیے روشن خیال نے نصف صدی سے زیادہ جدوجہد کی تھی۔ انھوں نے برطانوی حکمرانوں کا ساتھ دیا کیوں کہ انھوں

حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے، لوگوں کی بے اطمینانی کے مندرجہ ذیل اہم سبب کا ذکر کرتا ہوں:

”اس میں کوئی شک نہیں کہ طریقہ امتحان سے حکومت ملک میں لائق آدمیوں کی خدمات حاصل کرنے کے قابل ہوگئی لیکن یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ اس کے عمل سے اکثر ایسے اشخاص کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا جاتا ہے جنہیں ان کے ہموطن انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ قابلیت کی سند عطا کرنے میں خاندانی تعلقات، اعلیٰ ذات یا سماجی وقار کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا۔“

سید احمد کے اس نکتے پر تبصرہ کرتے ہوئے رجیڈنٹ پمپل نے ایک یادداشت میں لکھا (ضمیمہ

متن مقالہ):

”ان کا بیان ہے کہ اونچی ذات، خاندان اور اعلیٰ تعلقات رکھنے والے بہت تھوڑے سی باشندوں کو ملازمت میں لیا جاتا ہے اور ایک سخت طریقہ امتحان کی وجہ سے استعداد کو کلیتہً ترجیح دی جاتی ہے۔ یہ بیان بہت حد تک درست ہے۔ مصلحت اسی میں ہے کہ اب اعلیٰ طبقات کو پہلے سے زیادہ مواقع میسر ہوں اور ساتھ ہی قابلیت کے مخصوص معیار پر بھی تاکید روا رکھی جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ متوسط طبقات اور روشن خیال لوگوں کے انتخاب میں تاخیر، استعداد کافی سختی کے ساتھ عمل کر رہا تھا اور دور رس سماجی اثرات پیدا کر رہا تھا۔ اس سے قدیم معاشرے کے اثر نا اور اہل اہل صفوں اور ان کی لاڈلی اولاد میں بے اطمینانی پھیل رہی تھی۔ ۱۸۷۱ء کی بغاوت میں انھوں نے ذات اور جاگیر پر مبنی اپنے کھوئے مقام کو از سر نو حاصل کرنے کا موقع دیکھا۔ صرف بنگال کے روشن خیال طبقے کو بلکہ ہندوستان کے باہم ہندو اور مسلم، بنگالی اور غیر بنگالی تعلیم یافتہ متوسط طبقے کو ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی کامیابی کے امکانات میں قدیم معاشرے کی بجائے انسانی جس کے نصب العین اور اصول تمام ترجعت پسندانہ تھے۔ لیفٹننٹ راجہ ایک راجہ حقیقت بیان کر رہا تھا جب اس نے کہا: ”جن لوگوں نے انگریزی خیالات اور مابعد سب سے زیادہ فیض پایا ہے انھوں نے حالیہ فتنہ و فساد میں سب سے کم حصہ لیا ہے۔۔۔۔۔ مجھے حقیقی طور پر تعلیم یافتہ ایک ہندوستانی کی مثال بھی معلوم نہیں جس نے باغیوں کے ساتھ شامل ہونا تو درکنار ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار بھی کیا ہو۔“

بعض اوقات یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ مسلمانوں نے نہیں بلکہ صرف تعلیم یافتہ ہندوؤں نے ہی ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی مخالفت کی تھی۔ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ غدر کے دوران ہندوؤں کی نسبت مسلمان زیادہ آزرہ خاطر تھے لیکن سید احمد خاں نے ایک رسالہ بعنوان - *An Account of the Royal Moham* - میں اس بیان کی تردید کی۔ رسالے میں ان کا مقصد یہ ثابت

متوسط طبقے کے ترقی کے مرحلے طے کیے تھے

انہوں نے اپنا اقتصادی نظام تجارت اور سوداگری سے اور ملی معیار نئی انگریزی سے بلند کیا تھا۔ بغاوت کے دوران اہل علم و ادب کا بڑا گروہ جن کی اکثریت ایسے کہنوں کے کتنی تھی مذکورہ ذیل اشخاص پر مشتمل تھا۔

پرسن کارٹیگور، دیندر ناتھ ٹیگور، رام گوپال گوشت، پیاری چند مترا، کشور چند مترا، موہن بیزنی، ہر چند گوشت، رسک کرشن ملک، رادھاناث سکدر، ہریش چندر کرجی، راجناتھ مترا، امیکل موصدن دت، لال بہاری دے، جتندر موہن ٹیگور، دکش نارائن کرجی، بگریش گوشت، پنڈت ایشور چندر دویا ساگر اور بیس پچیس سال کے بعض نوجوان مثلاً بنکم چندر چٹ کیش چندر سین، کر سواداں پال اور دوارکاناتھ مترا۔

ان میں سے بعض نئے بنگالی زمینداروں کی اولاد تھے۔ یہ نو دولتوں کا ایک طبقہ بنو بہت دوائی کے فیض سے قدیم زمیندار امرا کی راگہ سے پیدا ہوا۔ اصل میں یہ لوگ بنے اور (لال اور ایجنٹ) تھے جنہوں نے بڑی بڑی زمینیں زمین کی خریداری میں لگا دیں۔ خود زمین نہ رہتے بلکہ شہروں میں رہنے لگے جس کی وجہ سے امرا کے نئے شہری طبقہ میں بھاری اضافہ ہوا۔ خیال کے انتخاب میں دولت کا حصول اس قدر فیصلہ کن اور اہم تھا کہ دیندر ناتھ ٹیگور، رام گوشت اور پیاری چندر مترا جیسے ممتاز بنگالی علما و فضلا نے کاروبار کے ذریعہ دولت جمع کرنے کے لیے بے حد کوشش کی۔

بنگال میں اب علمی ہم جو تجارتی ہم جو بھی بن رہے تھے۔ نئے شہری ماحول میں خاندان اور جہاد کی اب خاص وقعت نہ رہی اور جہاں شخصی وقار کی اہمیت بڑھ رہی تھی عقل کی برتری بھی سماج میں درجہ بلند ہونے کا وسیلہ ہو سکتی تھی اور اس کے دور رس اثرات ہو سکتے تھے۔ و دیا ساگر کے سے لوگوں نے جو غریب متوسط طبقے کے کہنوں سے تعلق تھے اسی وسیلے سے اپنا رتبہ بڑھایا تھا لیکن دولت کے حصول سے بھی انہوں نے کبھی چشم پوشی کی۔ و دیا ساگر کو بھی دولت اور استعداد کے دو معیاروں میں توازن قائم کرنے کے لیے طلبہ اور اشاعت کا آزاد کاروبار شروع کرنا پڑا۔ بنگال میں وہ اس پیشے کے بانیوں میں سے تھا سماج میں اس اصول استعداد کے عمل اور اس کے اثرات کی وضاحت کے لیے مثال پیش کرتا ہوں جو بہت اہم ہے۔ سید احمد بغاوت کے اسباب پر اپنے مقالے میں (ج)

ساتھیوں لکھتا ہے^{۱۳} :

”جنگالی کبھی بھی فوجی قیادت کے ذریعہ شان و شوکت کے خواہاں نہیں رہے۔ ان کے مشاغل اور کارنامے کلیتاً غیر فوجی ہیں۔ ان کی قوی اور ہرگز ذہانت انھیں دقیقہ رسی اور دورانہشی کے اہل بناتی ہے۔ وہ امید رکھتے ہیں کہ ان انگریزوں کو جو خود مختار کونسل یا پارلیمنٹ میں لوگوں کے نمائندے بن کر بیٹھے ہیں ان کی عقل سلیم اور انصاف پر وہی کا واسطہ دے کر جو بھی مناسب موقع آئے گا وہ قانونی اور آئینی طریقوں سے اپنے غیر ملکی حکمرانوں کے ساتھ مساوات کے درجے کی طرف اور بڑھیں گے اور ایشیا میں سب سے بڑی اور مستحکم سلطنت کے معاملات کے اہتمام میں ذمہ داری اور عزت کے ساتھ شریک ہوں گے۔“

ان کا خیال تھا کہ ہندوستان کے ان جاگیردار آقاؤں سے قانون اور آئین کی اپیل کرنے کا موقع نہیں آئے گا جو برطانوی حکمرانوں سے اپنا کھویا ہوا اقتدار بچھٹنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور ایسے سماجی نظام میں جس پر بادشاہوں اور امیروں کا غلبہ ہو ایسا وقت نہ آئے گا جب متوسط طبقے اپنے حکمرانوں کے ساتھ برابری کا درجہ پاسکیں۔

برطانوی حکومت کے زیر اثر جو نئے متوسط طبقات پیدا ہوئے انھیں ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں امید کی کوئی جھلک دکھائی نہ دی۔ ان کی امیدیں یورپ اور انگلستان کے متوسط طبقے کی سیاسی، معاشی اور سماجی میدانوں میں کامیابی کے ساتھ وابستہ تھیں۔ ان کی نگاہ میں برطانوی حکمران ان ”متوسط طبقات“ کے نمائندے تھے اور انھوں نے اپنے طبقاتی مفاد کی خاطر ان کے فحش قدم پر چلنے میں زیادہ مصلحت دیکھی بجائے اس کے کہ جاگیرداری کے مزدور گھوڑے کی سواری کریں۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے ۱۸۵۷ء کے باغیوں کی صاف صاف مذمت کی۔

حواشی

۱۔ سید احمد خاں : *An Essay on the Causes of the Indian*

Revolt. صفحات ۱۵-۸

۲۔ ٹی۔ رائس، یوز : *A History of the Indian Mutiny.* طبع ۱۹۰۲ء

۳۔ دسمبر ۱۸۵۷ء کے ”کلکٹر رپورٹ“ صفحہ ۴۸ پر منقول

کرنے کا تھا کہ کسی تعلیم یافتہ یا معزز مسلمان نے بغاوت میں حصہ نہیں لیا اور جو لوگ دست
میں اپنے آپ کو "مولوی" کہتے تھے وہ "عیار" تھے۔

اس لیے فوجی بغاوت سے مخالفت کے معاملے میں ہندو یا مسلم اور بنگالی یا غیر بنگالی
کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا بلکہ یہ مجموعی طور پر پڑتے تھے طبقے کے سماجی اور معاشی
کے تحفظ کا سوال تھا جو ہندوستان میں برطانوی حکومت کے نئے معاشرتی حالات کے تحت پیدا
تھا۔ ان کی ابتدا اور ترقی دولت اور استعداد کی ایسی آزاد محکمتوں کی۔ مین منت تھی جو ان کی
میں اس سماج میں ناپید ہوں گی جس کا نقشہ بغاوت کے جاگیردار رہنماؤں کے ذہن میں تھا۔

تعلیم یافتہ متوسط طبقے کا بڑھتا ہوا سیاسی شعور بغاوت سے اس کے مخالفانہ رویہ
جزوی ذمہ دار تھا۔ وہ اس سماج میں اپنے سیاسی پارٹ سے آگاہ تھے جس نے انہیں پیدا کیا
ان کے حکمرانوں کے وطن انگلستان سمیت یورپ میں ہر جگہ آزادی، برابری اور برادری کے
تلیے متوسط طبقات کا غمہ شروع ہو رہا تھا۔ رام موہن کے زمانے سے بنگال کا تعلیم یافتہ متوسط
یورپ اور امریکہ میں اپنے ساتھیوں کی ہر فتح پر کھم کھلا خوشیاں منا رہا تھا۔

جب انگلستان کے دارالعوام میں گزشتہ صدی کے ۳۹-۳۸ء کے دوران اہم ریفرنڈم
پیش کیے گئے اور انگریزوں کے متوسط طبقات نے صنعتی انقلاب کے بعد سماجی اصلاحات کے
سلسلے کے ذریعے قابل قدر فتوحات حاصل کیں تو بنگال کے روشن خیال طبقے نے اس خبر کا غیر
خوشی کے نعروں کے ساتھ کیا۔ جب جولائی ۱۸۵۷ء میں ایک دن اصلاحات کی خبر کلکتہ پر
سرگردہ ڈیروزین جریدے نے اس پر پرجوش تنقید کی۔ پادریوں نے اس تنازع کو نوٹ کر
ہوئے لکھا؟

"The Enquirer" (دی انکوائر) کا اگلا شمارہ خاص طور پر آتش بیانی کا مرقع
آتا تھا۔ جس قدر دلادیزی اور جادو بیانی یونان اور روم کی داستان آتھ ہی میں پائی جا رہی
اسے جوش اور مسرت کے ساتھ دہرایا گیا ہے۔ انگلستان کے ریفرم بل میں ماحولی اصلاح کے اثر
دیکھے گئے ہیں۔ "مرحبا! اے آزادی! مرحبا! کا پرجوش نعرہ گونج اٹھا۔

یہ کلمات بنگال کے تعلیم یافتہ متوسط طبقے کے سیاسی شعور کا تین ثبوت پیش کرتے ہیں
سے ان ارمانوں کا بھی اظہار ہوتا ہے جن کے حصول کی توقع وہ بے تابی کے ساتھ کر رہے تھے
ہندو پیٹریٹ (The Hindu Patriot) بغاوت کے دوران اس سے متعلق تنقید کر

Educated Natives

- ۱۰- دن، الجوالہ تصنیف صفحہ ۶۴۸
- ۱۱- "دی ہندو پریٹ" *The Hindu Patriot* مورخہ ۲۴ جون ۱۸۵۶ء
- ۱۲- "The Sepoy Mutiny and its action upon the People of Bengal."

۴۔ دی انکوائری (The Enquirer) کی پرانی فائل نہیں ملی۔ ایگزینڈر ڈنٹ نے اپنی کتاب "انڈیا اینڈ انڈیا شن" (۱۸۳۷ء) میں اس کے بعض اقتباسات نقل کیے ہیں۔ یہ اقتباسات ریورنڈ ڈنٹ کی کتاب سے لیے گئے ہیں۔ صفحات ۶۲۸-۶۲۹، ۶۵۲-۶۵۳۔

۵۔ بالوکرشن موہن بیسرجی: "دی پرسی کیونڈ" The Persecuted or Dramatic Scenes, Illustrative of the present state of Hindu society in Calcutta (Calcutta 1831)۔
۶۔ دی بندر ناتھ ٹیگور کی بنگالی زبان میں آپ بیتی "آتم چرت" مرتبہ ستیش ویدیا بھوشن باب تیرھواں۔

۷۔ متو بودھنی پتر کا "یکم جیسٹ" ۱۸۶۶ء شک سمت (۱۸۴۵ء) یکم پوس ۱۸۶۶ء شک سمت (۱۸۴۵ء)۔

۸۔ ایضاً یکم بھادوں ۱۸۶۶ء شک سمت (۱۸۴۵ء) بچپن کی شادی اور ایک سے زیادہ شادیوں کے رواج سے متعلق، یکم کانگ ۱۸۶۸ء شک سمت (۱۸۴۶ء) تعلیم نسواں سے متعلق، پچاس گن ۱۸۶۶ء شک سمت (۱۸۵۲ء) بیوہ کی دوبارہ شادی سے متعلق ویدیا ساگر کا دستخطی مقالہ، چیت ۱۸۶۶ء شک سمت (۱۸۵۲ء) مقالہ اکٹھے کاروت متعلقہ شادی بیوہ۔ آگن (نومبر-دسمبر) ۱۸۶۶ء شک سمت (۱۸۵۵ء) مقالہ بیوہ کی دوبارہ شادی سے متعلق، چیت (۱۸۵۵ء) ایک سے زیادہ شادیوں کے رواج کے متعلق، بھادوں ۱۸۶۸ء شک سمت (۱۸۵۴ء) ایک سے زیادہ شادیوں کے متعلق، پوس ۱۸۶۸ء شک سمت (۱۸۵۴ء) بیوہ کی دوبارہ شادی سے متعلق، پوس ۱۸۶۹ء شک سمت (۱۸۵۴ء) بیوہ کی دوبارہ شادی سے متعلق، کارل مینیم: "مین اینڈ سوسائٹی"۔

۹۔ سید احمد خاں: بحوالہ تصنیف صفحات ۴۲-۴۳۔
۱۰۔ میڈیکل کالج، کلکتہ کے طلبہ میں تقسیم سندت (ڈپلوئے) کے موقع پر تقریر مورخہ ۱۹ اپریل ۱۸۵۹ء کلکتہ منتحلی ریویو۔

۱۱۔ ۱۸۵۹ء کے ادارہ میں تقریر مذکورہ کی حمایت: Calcutta Monthly Review
The Mutiny and the

پلٹنے کی سزا دی جاتی۔

”مصنف نے وہی سزا اس ہندوستانی کو دینے کی حمایت کی جو ۱۸۵۷ء کے غدر کے بارے میں کچھ لکھنے کی جرأت کرے۔“

پس ہندوستانیوں کو اس مباحثے میں کسی رائے کے اظہار کی مجال نہ تھی لیکن ہمارے باغی بزرگ بہادری کے کارنامے انجام دے کر اور اپنا گرم خون بہا کر ایسی داستان چھوڑ گئے جس کا بیان الفاظ کا محتاج نہیں ہے۔ یہ افسوس کا مقام ہے کہ ۱۸۵۷ء کی صد سالہ یادگار کے اہم سال میں بلند پایہ ہندوستانی مورخین پرانی بحث کو چھیڑیں اور نئی کتابیں لکھ کر برطانوی مہنشاہیت پر توں کے لفظ نظر کی حمایت میں رورعایت سے کام لیں۔ اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستانی عالموں پر برطانوی فنِ تاریخ نگاری کا کتنا گہرا اثر ہے اور ہندوستان کے قومی اندازِ فکر میں کتنے بڑے نقائص ہیں جنہیں دور کرنا ہے۔

یہ بحث پہلے خود برطانوی حکمران طبقے میں چھڑی۔ ایٹ انڈیا کمپنی کے حامیوں نے ہندوستانی بغاوت کو محض فوجی غدر قرار دے کر اس کی وقعت کو گھسایا تاکہ کمپنی کی حکومت کی کمزوریوں کو چھپایا جائے۔ ایٹ انڈیا کمپنی کے مخالفوں یعنی برطانیہ کے صنعتی، شہری متوسط طبقے کے نمائندوں نے مذکورہ بالا لفظ نظر کی حامیوں کو ناش کیا اور دعویٰ کیا کہ یہ ایک قومی بغاوت تھی نتیجہ انھوں نے یہ افذ کیا کہ کمپنی کی حکومت کو ختم کر دیا جائے اور برطانوی حکومت ہندوستان کو اپنے تحت کر لے۔ لارڈ کیننگ نے غیر جانبداری کا رویہ اختیار کیا تاکہ کوئی فریق ناراض نہ ہو۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے برطانوی مورخ کے کا بیان ہے کہ کیننگ نے اپنے دل میں کہا ”کیا یہ محض فوجی غدر ہے جس کا میں مقابلہ کر رہا ہوں؟ ایسا نہیں لگتا تھا کہ ایسے ہنگامے کی ابتدا بلا کسی بیرونی تحریک کے صرف فوجیوں کے جذبات سے ہوئی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ جو سرگرمیاں اس وقت رونما ہوئیں وہ خالص فوجی شورش کا نتیجہ رہی ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایسے خارجی اثرات کام نہیں کر رہے تھے جن سے ایسی ذہنی کیفیت پیدا ہوئی جو بڑھ کر خوفناک نتائج کا موجب ہوئی۔“

”اس نے جلد ہی غدر کا ذکر کرنا ترک کر دیا اور اسے ایک شورش اور ایک بغاوت کا نام دیا۔ سال کے شروع میں وہ سیاسی اسباب کے خیال کو کچھ اہمیت دینے پر مائل تھا۔ جیسا کہ اس نے متعدد بار لکھا۔“ لیکن اب اس معاملے کے بارے میں اس کا شک رفع ہونے لگا۔ اُس نے برطانیہ کے وزیر ہند کو لکھا کہ مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بغاوت برہمنوں نے مذہبی حیلوں بہانوں

پی۔سی۔جوشی

ہماری تاریخ میں ۱۸۵۷ء

افوجی غدر یا قومی بغاوت؟

اس سال ہندوستان ۱۸۵۷ء کی قومی بغاوت کی صد سالہ یادگار بنا رہا ہے۔ یہ ہمارے قومی ارتقا میں ایک عہد آفریں واقعہ ہے۔ یہ ایک عظیم واقعہ ہے جسے وطن پرست ہندوستانی جدید قومی تحریک آزادی کی بنیاد تصور کرتے ہیں۔ پھر بھی یہی واقعہ اس بحث کا شکار ہے کہ آیا یہ محض "افوجی غدر" تھا یا قومی بغاوت؟

داستان کا صحیح ہندوستانی پہلو پوری طرح معلوم نہیں۔ اس کی وجہ صرف یہی نہیں کہ تاریخی رکارڈ چھوڑ جانا ہندوستانیوں کی روایت نہیں رہی بلکہ اس وقت برطانوی عہد حکومت میں ایسے حالات تھے کہ اگر کوئی ایسی کوشش کرتا تو اپنی جان خطرے میں ڈالتا۔ چند ہندوستانیوں نے اگر ۱۸۵۷ء سے متعلق کچھ لکھا تو یہ انگریزوں کی حمایت میں تھا۔ "جنگالی پریس" سے کیسے پینا جائے؟ "The Bengali press: How to deal with it" اس عنوان کے ایک مقالے سے جابرانہ برطانوی رویہ ظاہر ہے۔ یہ مقالہ ۱۸۹۶ء کو اس وقت کے ایک بہت مقتدر برطانوی رسالے "Pioneer" میں شائع ہوا تھا۔

"جہاں تک موجودہ پشت کو یاد ہے، ہم جانتے ہیں کہ انگریز خود اپنے اخبار نویسوں کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھتے تھے۔ اگر کوئی شریف النفس اور خوش طبع صحافی بھول کر پرنس ریجنٹ (نائب السلطنت) کو چالیس سالہ بانکا کہہ دیتا تو اسے دو سال کی قید با مشقت کی سزا دی جاتی۔ اگر کوئی پادری انقلاب فرانس کی تعریف کرتا اور پارلیمانی اصلاح اور منصفانہ نیابت کی حمایت کر دیتا تو اسے لوہے کی بیڑیاں پہن کر کام کرنے اور حقیر ترین مجرموں کے ساتھ دلدل میں پھیل

سکتی۔ اس وقت یہ توقع تھی کہ یہ سیلاب امنڈ کر فرنگی عنصر کو نیست و نابود کر دے گا اور جب بغاوت کا طوفان تھم کر مناسب حدود کے اندر سمٹ جائے گا تو وطن پرست ہندوستانی غیر ملکی حکمرانوں کے پیچھے سے نجات پا کر کسی والی ریاست کے عصائے حکومت کے سامنے سر تسلیم خم کریں گے۔ ہر حال اس تحریک نے اب ایک زیادہ اہم رنگ اختیار کیا۔ یہ تمام قوم کی بغاوت بن گئی جسے من گھڑت زیادتیوں کو بیان کر کے بھڑکایا گیا اور نفرت اور تعصب کے بل بوتے پر اس کی خام خیالیوں کو برقرار رکھا گیا۔^۵

”دی لندن ٹائمز“ *The London Times* کے مشہور نامہ نگار سر ڈیوٹرسل نے لکھا: ”یہاں نہ صرف غلاموں کی جنگ اور کسانوں کی بغاوت بکجا ہو گئی بلکہ اجنبی حکومت کا جھگڑا اٹار بیٹھنے، ہندوستانی وایان ریاست کے کامل اقتدار کو بحال کرنے اور ملکی مذہب کا پورا غلبہ قائم کرنے کی غرض سے یلیک مذہب کی جنگ، نسل کی جنگ، انتقام کی جنگ، امید کی جنگ اور قومی غم کی جنگ تھی۔“^۶

کرنل مائین نے فوجی غم کے نظریے کی بنیاد پر بغاوت سے متعلق تین جلدوں پر مشتمل ایک تاریخ لکھی۔ بغاوت دہنے کے اٹھ سال بعد وہ پھر ہندوستان آیا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے واقعات کے بارے میں زندگی کے مختلف شعبوں کے لوگوں کے ساتھ بات چیت کی اور اپنی بعد کی نسبتاً مکمل تھمت کی تصنیف ”دی انڈین میوٹی آف ۱۸۵۷ء“ (*The Indian Mutiny of 1857*) میں شائع ہوئی۔ اس نے میں تسلیم کیا کہ بغاوت کی پشت پر قومی عنصر کا غلبہ تھا۔ یہ تصنیف ۱۸۹۱ء میں شائع ہوئی۔ اس نے لکھا: ”حالات نے مجھ پر یہ ثابت کر دیا کہ ان لوگوں کے دلوں میں اچھو سال تک ہمارے نہایت غصے اور وفادار خادم رہے، ملاوت اور نفرت کی آگ بھڑکانے میں خارجی اسباب بروئے کار تھے یہ ملاوت اور نفرت ذاتی نہیں بلکہ ایک قومی جذبہ تھا۔“^۷

اب ہم ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے گڑھ یعنی اودھ کی شورش سے متعلق برطانوی مؤرخین کے بعض معنی خیز خیالات کا ذکر کرتے ہیں۔ میکلوڈ انس کا بیان ہے کہ ”کم سے کم اہل اودھ کی جدوجہد کو جنگ آفاقی قرار دینا چاہیے۔“ گورنر جنرل کے نام کوٹ آف ڈائریکٹرز کی خفیہ کمیٹی کے ایک خط مورخہ ۱۹ اپریل ۱۸۵۷ء میں لکھا ہے: ”جنگ اودھ کے عوامی جنگ کا رنگ اختیار کرنے کی وجہ بادشاہ کی ناگہانی معزولی اور لگان کا سرسری تصفیہ ہے جس نے زمینداروں کی ایک بڑی تعداد کو اپنی زمینوں سے محروم کر دیا ہے۔“

ان حالات میں جو سرکر آریاں اودھ میں ہوئیں ان کی حیثیت ایک جائز جنگ کی ہے نہ کہ بغاوت کی۔^۸

اور دوسروں نے سیاسی مقاصد کی بنا پر چپاکی ہے۔ سلطنت ہندوستان میں آگ لگی ہوئی ہے۔
 کارل مارکس "دی نیویارک ڈیلی ٹریبیون" *The New York Daily Tribune*
 کے نام اپنے ایک بلا دستخط مراسلے میں مخالف پارٹی کے رہنما ڈسرایلی کی تقریر مورخہ ۲۷ جولائی ۱۸۵۷ء
 کا حوالہ دیتا ہے اور اس پریوں رائے زنی کرتا ہے:

• پچھلے دس سال تک ڈسرایلی اس حقیقت کا قائل تھا کہ ہندوستان میں برطانوی سلطنت
 کی بنیاد پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے پرانے اصول پر قائم تھی۔ لیکن اس اصول پر عمل کرتے وقت
 ہندوستان کی مختلف قوموں کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ ان کے مذہب میں مداخلت سے احتراز کیا جاتا تھا۔
 اور زمیندار شرفا کی حفاظت کی جاتی تھی۔ دیسی فوج ملک کی شوٹل پسند ذہنیتوں کو جذب کرنے کا ایک
 وسیلہ تھی لیکن پچھلے کچھ سالوں سے حکومت ہند نے ایک نیا اصول اختیار کیا ہے یعنی قومیت کو تباہ کرنے
 کا اصول۔ اس اصول کو والیان ریاست کی جبری بربادی، جاگیروں کے بندوبست میں خلل اندازی اور
 لوگوں کے مذہب میں مداخلت کے ذریعے عمل میں لایا گیا ہے۔
 ڈسرایلی اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ موجودہ ہندوستانی شوٹل فوجی غدر نہیں ہے بلکہ ایک

قومی بغاوت ہے جس کے ہندوستانی سپاہی سرگرم آدرکار ہیں۔ وہ اپنے خطبے کے آخر میں برطانوی حکمران
 کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ موجودہ ظلم و ستم کی راہ اختیار کرنے کے بجائے ہندوستان کی اندرونی حالت کو
 سنوارنے پر اپنا توجہ مبذول کرے۔

اب ہم محض برطانوی مورخوں اور وقائع نگاروں کے خیالات کا ذکر کرتے ہیں۔ اس زمانہ
 میں وہ صاف گوئی سے کام لیتے تھے اور بعد کے انگریز ماہرین کی طرح ریاکاری سے اپنی راستبازی
 اور پارسی کا دعویٰ نہیں کرتے تھے۔

جوشن میکارتھی کا بیان ہے: "حقیقت یہ تھی کہ ہندوستانی جزیرہ نما کے شمالی اور شمال مغربی
 صوبوں کے بیشتر حصے میں برطانوی اقتدار کے خلاف دیسی قوموں کی بغاوت پھیل ہوئی تھی۔ اس میں
 صرف سپاہی ہی نہیں شامل تھے کسی بھی لحاظ سے یہ محض فوجی غدر نہ تھا۔ یہ فوجیوں کی شکایات،
 قومی نفرت، مذہبی تعصب اور ہندوستان پر برطانوی قبضے کے خلاف علم و غصہ کا بلاجلا اظہار تھا۔ اس
 میں ہندوستانی والیان ریاست بھی شامل تھے اور ہندوستانی فوجی بھی۔ مسلمان اور ہندو عیسائیوں کے
 خلاف متحد ہونے کے لیے اپنی گذشتہ مذہبی کدورتوں کو بھول گئے۔"

چارلس ہل نے لکھا ہے "بالآخر پانی سر سے گزر گیا اور ہندوستانیوں کی رگ رگ میں نفرت

طرف سے انھیں روکنے کی کوئی کوشش نہ کی جائے گی۔ ۱۳۷

پادری کینڈی نے بیان کیا: "بغاوت نے بیشتر معاملات میں ذاتی مفاد کے خیال کو اور سابق آقا کے ساتھ وفاداری کے خیال کو بالکل مٹا دیا۔ ایسے حالات میں حکومت کا وفادار رہنے کی تہمت ناقابل برداشت تھی۔ یہ سبھی جانتے ہیں کہ چونکہ سپاہی ہماری ملازمت میں ڈٹے رہے ان کو نہ صرف ان کے ساتھ، بلکہ عام طور پر ان کی ذات کے لوگ بھی برادری سے خارج تصور کرتے ہیں۔ وہ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ اپنے گھروں کو جلنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتے کیوں کہ نہ صرف انھیں لعن طعن کی جائے گی اور بلوراز عنایات سے محروم رکھا جائے گا بلکہ ان کی جان کے بھی لالے پڑ جائیں گے۔" ۱۳۸

اگر سپاہیوں اور دوسرے لوگوں کا جو انگریزوں کی ملازمت میں تھے اس کامیابی کے ساتھ حقہ پانی بند کیا جاسکتا ہے تو کیا یہ اس بات کی قطعی شہادت نہیں کہ ۱۸۵۷ء کی شورش ناسیت کے اعتبار سے ایک قومی انقلاب اور عوامی بغاوت تھی!

اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر آر۔ سی۔ موندملہ لکھتے ہیں کہ "شورش کی ناکامی کا سبب یہ بھی تھا کہ رہنماؤں، سپاہیوں اور عوام کے سامنے کوئی بلند نصب العین نہیں تھا۔" ۱۳۹
اب ہم مشہور مثالوں کی بجائے ایسی مثالیں لیں گے جن کے بارے میں لوگوں کو بہت کم معلوم ہے۔ یہ مثالیں بغاوت کے اہم مراکز کی نہیں ہیں بلکہ دور افتادہ علاقوں کی ہیں، نہ ایسے وقت کی ہیں جب بغاوت کی لہر زوروں پر تھی اور بہادری کے جوہر دکھانا آسان تھا بلکہ اس وقت کی ہیں جب بغاوت ٹھنڈی پڑ رہی تھی۔

دہلی اور کھنؤ کے فتح ہونے کے بعد برطانوی کمانڈر انچیف سر کوئن کیمپ ہیل نے یہ منصوبہ باندھا کہ تین بڑی افواج اودھ اور دو آب کے باغیوں کو گھیر کر فتح گڑھ کی جانب دھکیل دیں اور پھر انھیں ختم کر دیں۔ جنرل وال پول نے کانپور سے کوچ کیا لیکن باغیوں کے ایک چھوٹے سے دستے نے اُسے اٹاؤہ میں رکنے پر مجبور کر دیا۔ "ان کی تعداد قلیل تھی اور وہ دستی بندو قوں سے مسلح تھے لیکن ناامیدی نے ان کے اندر نئی روح پھونک دی تھی اور وہ دستی بندو قوں سے مسلح تھے مرنے کا ہتھیار کیے ہوئے تھے۔" وال پول نے اس مقام کا معائنہ کیا۔ فوج کے قیام کے اعتبار سے اس جگہ کی کوئی اہمیت نہ تھی اور اس پر آسانی سے دھاوا ہو سکتا تھا لیکن باغیوں پر سامنے سے بھی ممکن تھے۔ یہی طریقہ پہلے آزمائے گئے۔ دستی بم اندر پھینکے گئے۔ جلتی پیل کے دھوئیں سے

اودھ کی جدوجہد کمال عروج پر تھی۔ اس کی بنیاد بہت ہی وسیع اور اس کی جڑیں نہایت گہری تھیں۔ اس کے سامنے ہر چیز خس و فاشاک کی مانند پڑ گئی لیکن ماہیت کے اعتبار سے یہ دوسرے مقامات کی جدوجہد سے مختلف تھی۔ فرق صرف شدت کا تھا۔ دشمن، مشکلات، مسائل، شوش کرنے والے اور ہٹا دہی تھے۔ ایسے حالات میں اگر ہم یہ کہیں کہ اودھ میں یہ ایک جنگ آزادی تھی لیکن باقی صوبوں میں نہیں تو اسے تو عقل سلیم تسلیم کرتی ہے اور نہ تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے۔ اس کے برعکس سائنٹک طریقہ تحقیق کا تقاضا ہے کہ اگر ۱۸۵۷ء جیسے عبوری دور میں بغاوت کی اصل ماہیت کا مطالعہ کرنا ہے تو اودھ جیسے علاقے میں کرنا چاہیے جو شورش کے معاملے میں بہت آگے تھا۔ بغاوت کی خصوصیت کو پرکھنے کے لیے ایک اور کسوٹی یہ ہے کہ ہم یہ معلوم کریں کہ کتنے لوگ برطانوی سرکار کے وفادار رہے اور ان لوگوں کے بارے میں اکثریت کا کیا رویہ تھا۔

اگر ان ہندوستانی انسرول کی فہرست تیار کی جائے جو بغاوت زدہ ضلعوں میں ملازم تھے ہوئے۔ اس کی تصدیق ان اطلاعات سے ہوتی ہے جو ضلع مجسٹریٹوں نے بغاوت کی کیفیت کا جائزہ لیتے ہوئے گورنر جنرل کو بھیجیں۔

ضلع مجسٹریٹ ہے۔ ڈیپوٹریٹر ہے۔ ۲ جنوری ۱۸۵۷ء کو کانپور کے بارے میں لکھا: "ہندوستانی ملا کی غداری کا بھی بڑے بڑے ضلع میں بہت بڑا اثر پڑا۔ ڈپٹی کلکٹر کی سرکردگی میں سی آء اے، جیک سے دشمنوں کو منظم کرنے میں بہت سرگرم حصہ لیا۔ جب میں پہلی بار یہاں پہنچا تو میں نے اس غداری کے جرم میں جس نے تمام ملا کو بگاڑ دیا تھا اس کو موت کی سزا دی۔" ۱۰

کمشنر ہے۔ ڈیپوٹریٹر۔ پکنے نے ۲۰ نومبر ۱۸۵۷ء کو جھانسی کے متعلق لکھا: "ملا اور ماتحت ملی ملازمین کا رویہ عام طور پر بڑا یا غیر جانب دار تھا۔" ۱۱

کمشنر ایف۔ ویس نے ۱۵ نومبر ۱۸۵۷ء کو شمال مغربی صوبجات کی حکومت کے مسیکری عرصے میں ٹس سے مس نہ ہوئی۔ ایسا دکھائی دیتا تھا گویا انھوں نے لوگوں کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا ہے کہ کوئی ایک دوسرے کے کام میں دخل نہ دے گا۔ اور یہ کہ اگر دیہات کے لوگ پولیس کو تنہا نہیں ان کے حال پر چھوڑیں اور انھیں تنخواہ لینے دیں تو دیہاتی جو بھی جرم چاہیں کر سکتے ہیں اور پولیس کی

کے جن پر کوئی بھی قوم فخر کر سکتی ہے اور جنہیں برطانوی مورخوں نے بھی خراج تحسین ادا کیا ہے۔
 لیکن نے فیض آباد کے مولوی احمد اللہ کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے :

”مولوی غضب کا آدمی تھا۔ بغاوت کے دوران بحیثیت ایک فوجی سالار کے اس نے اپنی
 ت کے کئی ثبوت دیے۔ کوئی بھی دوسرا آدمی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے سرکولن کیمپ بل کو
 نہ جنگ میں دوبارہ سپا کیا۔ اگر محب وطن سے مراد وہ شخص ہے جو وطن کی آزادی کے لیے، جسے
 نصائی کے ساتھ سلب کر لیا گیا ہو، سازش اور جنگ کرتا ہے تو یقیناً مولوی ایک سچا محب وطن ہے
 نے کسی کے قتل سے اپنی تلوار کو آلودہ نہیں کیا تھا۔ اس نے کسی کے قتل سے چشم پوشی نہیں کی تھی۔ اس
 ان اجنبیوں کے خلاف جنہوں نے اس کے ملک پر قبضہ کر رکھا تھا، میدان کارزار میں بڑی جانمردی اور
 نامزدی کے ساتھ اور باعزت طریقے سے جنگ کی تھی۔ اس کی یاد تمام قوموں کے بہادروں اور سچے لوگوں
 کی مستحق ہے۔“

جھانسی کی رانی، ماتیا ٹوپے، کنور سنگھ اور بہت سے دوسرے مقامی راہنماؤں کے بارے
 خود انگریزوں کی طرف سے شاندار خراج تحسین کی کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔
 اس لیے ہیں چاہیے کہ ہم از سر نو ان لوگوں اور راہنماؤں کی عزت کرنا سیکھیں جنہوں نے انگریزوں
 خلاف ۱۸۵۷ء کی قومی بغاوت میں اپنا فرض ادا کیا۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت سے متعلق مارکس کا خیال ہمارے لیے بڑا احساس آفریں ہے۔ ہندوستانی
 سے موصول ہوئیں، ۱۷ جون تک کی دہلی کی خبروں کی بنیاد پر اس نے ”نیویارک ڈیلی ٹریبون“ کے نام
 جولائی ۱۸۵۷ء کے ایک بلا دستخط مراسلے کو ان الفاظ کے ساتھ ختم کیا:
 ”آہستہ آہستہ ایسے راز فاش ہو جائیں گے جن کی بنا پر خود جان بُل کو اس بات کا یقین ہو جائے
 کہ جسے وہ ایک فوجی غدر تصور کرتا ہے وہ درحقیقت ایک قومی بغاوت ہے۔“

ہندوستان کے مورخ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی ماہیت کے بارے میں جتنی بھی بحث کریں لیکن ہندوستانی
 تسلیم کر چکے ہیں کہ یہ ہماری قومی تحریک کا سرچشمہ ہے۔ قوم کے دل و دماغ پر ۱۸۵۷ء کی میراث کا اثر
 قدر غالب ہے کہ ڈاکٹر آر۔سی۔ موزمدار بھی اپنی تحقیق کو مندرجہ ذیل الفاظ کے ساتھ ختم کرتے ہیں:
 ۱۸۵۷ء کی شورش ہندوستان میں برطانوی حکومت کے لیے وسیع پیمانے پر پہلی بڑی اور
 راست چنوتی کی حیثیت سے ہمیشہ تاریخ میں یادگار رہے گی نصف صدی بعد شروع ہونے والی آزادی
 تحریک کو اسی تحریک سے روشنی ملی۔ ۱۸۵۷ء کی یاد نے ہماری آزادی کی تحریک کو تقویت دی

محصور باغیوں کا دم گھونسنے کی کوشش کی گئی لیکن سب کچھ بے سود ثابت ہوا۔ ششگاہوں میں سے باغی حملہ آوروں پر متواتر اور موثر فائر کرتے رہے اور تین گھنٹے تک انھیں نزدیک نہ پھٹکنے دیا۔ آخر اس جگہ کو بارود سے اڑا دیئے گا فیصلہ کیا گیا۔ اس مقصد کے لیے پورے شیر نے انجینئر سیریل کی مدد سے کار تو سوں کے ساتھ ایک بارودی سرنگ بنائی۔ اس دھماکے نے مدافعت کرنے والوں کو وہ شرف شہادت بخشا جس کی وہ تمنا کرتے تھے۔ اس سے وہ مکان کے بلے میں ہی دفن ہو گئے۔ ۱۵۔

۲۵ فروری ۱۸۵۷ء کو زبردست نیپالی اور انگریزی فوجوں نے گھاگرا کو پار کیا اور غنبر پور کی لائن کو چڑھ گیا۔ راستے میں ایک گھنے جنگل میں ایک مضبوط قلعہ تھا۔ جنگی اعتبار سے اس کی بڑی اہمیت تھی۔ اس میں صرف ۲۲ باغی مقیم تھے۔ اس پر دھاوا بولا گیا۔ اس قدر قوت اور عزم کے ساتھ اس کی مدافعت کی گئی کہ اس پر قابض ہونے سے پہلے حملہ آوروں کے سات جوان ہلاک ہو گئے اور ۲۳ گھائل تمام محاذی قلعوں نے اپنے مورچوں پر ہی جانیں قربان کیں۔ ۱۶۔

ہار دیکھ کر گھلا پور میں ایک مقامی شورش شروع ہوئی لیکن اسے دبا دیا گیا۔ جب باغیوں کو توپوں کے منہ پر رکھ کر اڑایا جا رہا تھا تو برطانوی افسر جیکب نے انھیں جان بخشی کی پیش کش کی بشرطیکہ وہ اپنے ساتھیوں کے نام بتا دیں۔ وہ ناکام رہا۔ بعد میں اس نے اپنے تجربات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا: "لیکن یہ بیان کرنا دشوار ہے کہ کس قدر حیرت انگیز رازداری کے ساتھ سازش عمل میں لائی گئی۔ دورانہشی کے ساتھ تدبیر کی گئیں اور کتنی احتیاط کے ساتھ سازش کرنے والوں کے ہر گروہ نے جدا جدا پہنچائی جاتی رہی۔ اور پھر جس وفاداری کے ساتھ انھوں نے ایک دوسرے کا ساتھ دیا وہ بھی کم قابلِ تعریف نہیں ہے۔" ۱۷۔

جب انگریزوں نے کھنڈ کو تباہ و برباد کیا تو بعض بیگمات ان کے ہاتھوں گرفتار ہوئیں۔ بکستان نے ان خواتین سے پوچھا "کیا تم اب بھی یہ نہیں سمجھتی کہ جدوجہد ختم ہو چکی ہے؟" انھوں نے جواب دیا: "ہمیں ہلاک نہیں ہے کہ آخر میں تمہیں شکست ہوگی۔" ۱۸۔ شکست فاش کے بعد بھی اس قدر خود اعتمادی اس انقلابی روح کی علامت تھی جسے فوجی بغاوت نے بیدار کیا تھا۔

جب بغاوت کی راہنمائی کا سوال اٹھتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر موزمدار کے سربراہانگریز راہنماؤں اور جاگیردار باغی راہنماؤں کے درمیان ناپائیدار معاہدوں کا ایسا سمجھوتہ ہوا ہے کہ وہ بلا امتیاز تمام باغی راہنماؤں کو ملامت کرتے ہیں۔ وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ بغاوت نے بعض ایسے بڑے راہنما

نا اقتدار قائم رکھنے کی تدبیر کی۔ مختلف نسلوں، قبیلوں، ذاتوں، مذاہبوں اور مطلق العنان ریاستوں کا تجربہ بغیر نیالی وحدت کے اعتبار سے ہندوستان کہلاتا ہے۔ اس کے ان مختلف اجزاء کا باہمی اختلاف ہی طانوی اقتدار اعلیٰ کی اصلی بنیاد بنی رہی۔ بعد میں اقتدار اعلیٰ کے حالات میں تبدیلی ہوئی ہے۔ سندھ پنجاب کی فتح کے ساتھ انگریزوں کی ہندوستانی سلطنت نہ صرف تدریجی حد و تک پہنچ چکی تھی، بلکہ دھندلار دیسی ریاستوں کے آخری آثار بھی مٹائے جا چکے تھے۔

”اب یہ ایک حصے کی مدد سے دوسرے حصے پر حملہ کرتی تھی بلکہ یہ سب کے سر پر سوار تھی۔ سارا ہندوستان اس کے قدموں پر تھا۔ فتح کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ اب یہ فتح بن چکی تھی۔“^{۳۲} ایک اور مقالے میں مارکس نے ہندوستان میں کمپنی کی حکومت کو یورپی استبدادیت قرار دیا۔ جو ایشیائی استبدادیت پر مسلط تھی۔^{۳۳}

دیسی ریاستوں سے متعلق ایک اور مضمون میں مارکس پھر پرمز اور معنی خیز الفاظ میں اس بات پر غور فرماتا ہے جس نے انگریزوں کو ہندوستان پر فتح حاصل کرنے کے قابل بنایا اور بالآخر ان کی حکومت کے خلاف بغاوت کا موجب بنی۔

”جب ناخاندہ برطانوی مہانوں نے ہندوستان کی سرزمین پر ایک بار قدم رکھ دیا اور پھر قبضہ جمانے کی ٹھانی تو اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ والیان ریاست کے اقتدار کو جبر سے زوال کے ذریعے زائل کیا جائے۔ والیان ریاست کے سلسلے میں انگریزوں کو اس قسم کے حالات کا سامنا تھا جیسے قدیم رومیوں کو ان کے اتحادیوں کے سلسلے میں تھا اس لیے وہ رومی سیاست دانوں کی تقلید پر چلے۔ ایک انگریز مصنف کے قول کے مطابق ”حریفوں کو کھلا پلا کر تن و مند کرنے کا تھا۔ جس طرح بیٹوں کو پال پوس کر لیتے ہیں۔“^{۳۴} بلکہ اسے یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ قدیم روم کے طریقے سے ان کی رفاقت حاصل کرنے کے بعد ایٹ انڈیا کمپنی نے پہنچ ایٹ

Change Alley) کے جدید ڈھنگ سے ان کا کام تمام کر دیا۔ ان معاہدوں کو پورا کرنے کے لیے جو والیان ریاست نے کمپنی کے ساتھ کیے تھے انھیں انگریزوں کی عادی سود پر بڑی بڑی قرض لینی پڑیں۔ جب پریشانی انتہا تک پہنچ جاتی تو قرض خواہ ہوجاتے۔ پہنچ کس دیا جاتا، اور والیان ریاست اس بات پر مجبور ہو جاتے کہ یا تو وہ اپنے علاقے کو اس طرح سے کمپنی کے حوالے کر دیں یا جنگ شروع کر دیں۔ پہلی صورت میں وہ اپنے غاصبین کے حوالے کر دیے جاتے اور دوسری صورت میں غداروں کی حیثیت سے گدی سے اتار دیے جاتے۔

اس کے مجاہدین کے دلوں میں بہت سی روح پھونکی، خوفناک جدوجہد کے لیے ایک تاریخی بنیاد بنی اور اُسے ایک ایسا اخلاقی محرک غطا کیا جس کی وقعت میں مبالغہ کرنا ممکن نہیں۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت نے، جس کی عظمت غلط بیانیوں کے باوجود بڑھتی گئی، ہندوستان میں برطانوی حکومت کے مفاد کو بڑھاتا پہنچایا اتنا خود بغاوت سے بھی پہنچا ہو گا۔ ۲۱

یہ مسئلہ کہ آیا ۱۸۵۷ء کی جدوجہد ایک فوجی شورش تھی یا قومی بغاوت، اس طرح سامنے ہے کہ اس جدوجہد سے والہنہ سیاسی، معاشرتی اور نظریاتی مسائل کی ماہیت اور حریفوں کے کردار کے ساتھ پیش کیا جائے اور غلوں دل کے ساتھ ان کا تجزیہ کیا جائے۔ مختصر یہ کہ ایک معقول تاریخی جائزہ کا تقاضا ہے کہ یہ صحیح طور پر بیان کیا جائے کہ کون کس کے ساتھ اور کس لیے لڑ رہا تھا۔ اس مقالے کو شش کی محنت ہے کہ مذکورہ بالا طریقے سے اس بحث طلب مسئلے کی تحقیق کی جائے۔

۲۔ فرنگی راج کے خلاف

ایسٹ انڈیا کمپنی کی فتح ہند کی داستان ساری دنیا میں مشہور ہے۔ مارکس نے اسے

ہندوستان میں انگریزوں کا اقتدار کس طرح قائم ہوا؛ مغل اعظم کے اقتدار کو مغل نے، صوبیداروں کی قوت کو مرہٹوں نے اور مرہٹوں کی طاقت کو افغانوں نے نقصان پہنچایا اور یہ سب ایک دوسرے کے خلاف جدوجہد میں مصروف تھے تو انگریز بیچ میں آدھکے اور سب کو مغلوں سے لیا۔ یہ ایک ملک ہے جہاں نہ صرف ہندو اور مسلمان بلکہ قبیلے قبیلے اور ذات ذات میں تفرقہ ہے ایک سماج ہے جس کے ڈھانچے کی بنیاد ایک قسم کے توازن پر ہے جو اس کے افراد کے مابین منافرت کی گندشتہ تاریخ سے ناواقف بھی ہوں تو کیا اس بین اور ناقابل تردید حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں کہ اس وقت بھی ہندوستان کو ہندوستانی ہی فوج کی مدد سے جو ہندوستان ہی کی دولت پرستی انگریزوں کی غلامی کے چنگل میں جکڑ کر رکھا گیا ہے۔ ایسی صورت میں ہندوستان محکوم ہونے سے بچ سکتا تھا۔ ۲۲

غظیم بغاوت شروع ہونے کے بعد ۱۵ جولائی ۱۸۵۷ء کو "دی نیویارک ڈیلی ٹریبیون" مارکس نے اپنے ایک بلا دستخط مقالے میں یوں لکھا: "برطانیہ نے ڈیڑھ سو سال تک سلطنت

ہے۔ بغاوتِ ہند کے قدامت پسند برطانوی مورخ مائین کا بیان ہے: ”الحاقِ اودھ کے لیے خواہ کوئی بھی جواز پیش کیا جائے یہ حقیقت ناقابلِ تردید ہے کہ جس طریقے سے اس پالیسی پر عمل کیا گیا اس کے پیش نظر یہ پالیسی نہ صرف مصالحت پیدا کرنے میں ناکام رہی بلکہ ہندوستان کا ہر طبقہ انگریزوں سے بیزار ہو گیا۔“ ۲۸

گبنس نے جو اس وقت لکھنؤ میں کسٹرن مایات تھا بعد میں اس علاقے میں قومی بغاوت کی رپورٹ تیار کی اور ان ہندوستانیوں کے بیانات قلمبند کیے جن کی اس کے ساتھ راہ و رسم تھی۔ ان میں سے ایک بیان میں یہ کہا گیا: ”اسی طرح ہندوستان کے لوگ بھی کہتے ہیں کہ ملکِ اودھ بادشاہ کا ہے۔ حکومت اس نے اچھے ڈھنگ سے کی ہو یا بُرے ڈھنگ سے لیکن اس نے کسی طرح بھی نگرینوں کے ساتھ وفاداری کا بیمان نہیں توڑا اور نہ ہی اس میں کوئی رخِ زہِ ڈالا۔ اگر برطانوی سرکار اس بادشاہ کو تخت سے مزل کر سکتی ہے جو ہمیشہ اس کا وفادار رہا تو پھر کون سا خود مختار نواب یا راجہ محفوظ ہے۔“ ۲۹

زیادہ دور اندیش اینگلو انڈین سیاستدانوں نے برطانیہ کی اس جارحانہ اور استبداد کن پالیسی کے انقلابی نتائج کو صاف طور پر بھانپ لیا۔ مثال کے طور پر سر جان میلکم نے بہت پہلے متنبہ کر دیا تھا کہ ”سرداروں کے موروثی حقوق اور ان کے پیروؤں کی وفاداری سب کا خاتمہ ہو گیا ہے وہ رابطے اور تعلقات جو پہلے مجلسِ امن و امان کی مضبوط ترین کڑیاں تھے چوٹیں کھا کر ٹوٹ گئے ہیں اور بے اطمینانی اور بغاوت کے عناصر میں بدل گئے ہیں۔“ ۳۰

کمپنی کی سرکار نہ صرف سیاسی جبر کی حکومت تھی بلکہ مالی امتیاز کا نمونہ تھی جو ہر ہندوستانی کی آنکھ میں خار بن کر کھسکتی تھی اور بار بار یہ کہنا کہ حکومت کا شروع ہی سے یہ خاصہ تھا اور اس نے ناگزیر نتائج پیدا کیے۔ شور جو ہندوستان میں پنی کے اقتدار کے قیام کے آغاز میں لکھا کرتا تھا اس کا بیان ہے کہ: ”ہندوستانیوں کی ناپاک اور ذلیل کافروں سے زیادہ وقعت نہیں۔“ ۳۱

۱۸۵۷ء میں ”سیر المتاخرین“ کے مصنف نے تلخی کے ساتھ یہ قلمبند کیا کہ ”انگریز شاہِ وند وادی یہاں اگر ہم میں سے کسی کے ساتھ ملتے ہیں۔“ ۳۲ ”سیر المتاخرین“ کے فرانسیسی مترجم نے لکھا کہ ”ہندوستان میں ہر انگریز میں یہ رجحان نظر آتا ہے کہ وہ ہندوستانیوں کی ساری قوم کو انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں گویا یہ ایک بے جان شے ہے جسے بلا تامل اور حسبِ مرضی کام میں لایا جاسکتا ہے۔“ ہندوستانیوں نے ان تمام ذلتوں کو گوارا کیا جو ایسے نسلی امتیاز کے رویے سے پیدا ہوتی ہیں

جاتے۔ اس وقت ہندوستانی ریاستوں کا رقبہ ۶۹۹۹۶۱ مربع میل تھا اور آبادی ۱۲ تھی۔ البتہ اب وہ برطانوی حکومت کے حلیف نہیں تھے بلکہ کئی قسم کی شرائط پر اور کئی طرح کے اور حفاظتی نظام کے تحت اس کے متوسل تھے۔ ان معاہدوں کی ایک مشترک بات یہ تھی کہ ریاستیں دفاع، سفارتی تعلقات اور گورنر جنرل کی مداخلت کے بغیر اپنے باہمی تنازعوں اور جنگوں کے حق سے دست بردار ہو گئیں۔

جن شرائط کے تحت ان کی نام نہاد آزادی قائم ہے وہی ان کے مستقل ہیں اور ان ہی کی وجہ سے ان میں اصلاح کی اہلیت نہیں ہے۔ عضوی ضعف ان سرشت ہے جیسا کہ ہر اس وجود کے ساتھ ہوتا ہے جو دوسروں کے رحم و کرم پر جیتا۔ معاہدوں سے پیدا ہوئی برائیوں کی یہ صحیح عکاسی ہے۔ جب ہم ماضی کی طرف دیکھتے ہیں واضح ہو جاتی ہے کہ موجودہ صدی کے ابتدائی بیس تیس برسوں میں ہندوستان کے منہ پر پہنچے مارکس نے ان کے خدو خال کی واضح نشاندہی اس وقت کر دی تھی جب یہ رونما ہو رہے تھے۔

ہم عصر برطانوی مصنفین میں جو زیادہ دوراندیش تھے انہوں نے بھی اس دیکھ لی تھی جس کا تجزیہ مارکس نے اتنی وضاحت سے کیا۔ مثلاً ولیم ہوٹ نے لکھا، "ہندوستانی والیان ریاست کو ان کے علاقوں سے محروم کرنے کا جو طریقہ زیادہ سے بجا جا رہا ہے اور وہ بھی حق اور مصلحت کی مقدس ترین دلائل کے ساتھ، ایسا نظام ہے جو رومانی ایذا رسانی سے زیادہ خوشنا اور شاندار ہے جس کی کوئی نظیر اور پھر بقول گرانٹ ڈون: "ان کے پایہ تخت میں برطانوی ریڈیڈنٹ کو کی بربادی کا سبب تھا کیوں کہ ان افسروں کا ایک فرض تفرقہ پیدا کرنا تھا۔" ۲۷

ڈیہوڑی کے عہد حکومت کے ساتھ بے اصول الحاق اور اونچے سے اونچے والیان ریاست کے وظیفوں میں تخفیف کی نئی جا بزا پالیسی کا آغاز ہوا جس کی وجہ سے ایک اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ حقائق سے سبھی واقف ہیں الحاق اور دھکے مثال اس بالخصوص اس بلچل کو ظاہر کرتی ہے جو برطانیہ کی ناقابل تسکین جارحیت اور بے اصول پالیسی نے سارے ملک میں پیدا کر دی تھی۔

الحاق کی پالیسی کی ماہیت اور اس کے نتائج کو دیکھنے کے لیے اودھ کو

نتیجے کا خاتمہ ہے۔ اس نے اس طبقے کو کیتا نیست و نابود کر دیا ہے۔ (سوال نمبر ۱۲۳) اس وقت وہ قدرتی طور پر اس سے غیر مطمئن ہیں۔ یہ آزدگی اس لیے نہیں ہے کہ یہ ایک غیر ملکی حکومت ہے بلکہ اس لیے کہ یہ ایسی حکومت ہے جس کے ساتھ ان کا کوئی مفاد وابستہ نہیں اور جس سے انھیں کسی چیز کی امید یا توقع نہیں ہے۔ ۳۷

بغاوت کے دوران سرسید احمد خاں نے انگریزوں کی خدمت انجام دی اور اس کے فروہ جانے کے بعد اپنی مشہور کتاب *The Causes of the Indian Revolt* (اسباب بغاوت ہند) لکھی جس میں انھوں نے لکھا: ”ہندوستان کے باشندوں بالخصوص مسلمانوں کی بے اطمینانی کا ایک اور سبب ہندوستانوں کو اعلیٰ عہدوں سے محروم رکھنا تھا۔ ابھی چند ہی سال ہوئے مسلمان اپنی حکومت کے تحت جلیل القدر عہدوں پر سرفراز تھے اور ان کی تنہا اور امید اب بھی ان کے دلوں میں باقی ہے۔ برطانوی حکومت کے تحت دنیا کی نگاہ میں وہ اپنی عزت بڑھانے کے آرزو مند تھے لیکن ان کے لیے کوئی راستہ کھلا نہ تھا۔ اس حکومت کے ابتدائی ایام میں بے شک بلند تہ ہندوستانوں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کرنے کے لیے چنگایا لیکن آہستہ آہستہ یہ دستور جاتا رہا۔ ۳۸

چنانچہ اعلیٰ سرکاری ملازمتوں سے ہندوستانوں کو محروم رکھنا ایک ہندوستان شکن پالیسی تھی اور اس کے خلاف ہندوستان کے اعلیٰ طبقوں کی جائز ہزاری ایک اہم قومی عنصر تھا جو انگریزی حکومت کے خلاف ہندوستانوں کی بغاوت کا سبب تھا۔

اس پر طرہ یہ کہ جہاں تک ہندوستانی عوام کا تعلق ہے انھوں نے برطانوی نظام حکومت کو بدعنوانیوں میں مبتلا پایا کیوں کہ یہ غیر ملکی تھا۔

پرچرڈ ”ہماری عدالتوں کی رشوت خوری اور ضمیر فروشی“ کا شکوہ کرتا ہے اور اس نکتہ چینی میں وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کے علاوہ انگریزوں کا قانونی غنا بطہ جاہل کسان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ مقدمہ کے لیے وہ وکیل ذکر کرتا تھا۔ قدیم دستور کے مطابق عدالت کے دروازے سب پر کھلے تھے اور غریب سے غریب کسان بھی اپنا دعویٰ بلا روک ٹوک پیش کر سکتا تھا۔ امیروں اور عیاروں کے ہاتھ میں عدالتیں جبر و ستم کا آلہ کار بن گئیں۔ جھوٹا دعویٰ کرنے کے لیے جھوٹے گواہوں کو خریدنا جاسکتا تھا اور جعلی دستاویز تیار کی جاسکتی تھیں۔ صدر عدالت آگرہ کے ایک جج ریکس کا بیان ہے کہ ”شمال مغربی صوبہ کے لوگ ہمارے ضابطہ دیوانی کو پسند نہیں کرتے“ اور پسند نہ کرنے کی معقول وجہ ہے۔ ۳۹ برطانوی حکمرانوں نے پنجایت کی قسم کے مقامی اداروں کو تمام انتظامی معاملات کے دائرے سے خارج کر دیا۔

اور بالآخر انھوں نے نسلی امتیاز پر مبنی غیر ملکی حکومت کے خلاف اپنی جدوجہد شروع کی۔ "دی لندن ٹائمز" نے رسل کو نامہ بنگار کی حیثیت سے بغاوت کی خبریں فراہم کرنے کے لیے بھیجا۔ بنارس کو جاتے ہوئے راستے میں اس نے دیکھا کہ "کسی بھی حالت میں کسی گورے کی گاڑی پر دوستانہ نگاہ نہیں ڈالی جاتی۔ آنکھ کی زبان پر کون شہر کر سکتا ہے اور کس کو غلط فہمی ہو سکتی ہے؟ میں نے صرف اسی سے سمجھ لیا ہے کہ بعض اوقات بہت سے لوگ ہماری قوم سے ڈرتے بھی نہیں ہیں اور نفرت تو سب ہی کرتے ہیں۔" ۲۴

استبداد اور نسلی امتیاز پر مبنی برطانوی حکومت کا ایک اور براہ راست نتیجہ ہندوستان کے باشندوں کو ذمہ داری کے تمام اعلیٰ عہدوں سے محروم کرنا تھا۔

نظام حکومت میں ہندوستانیوں کے تقرر کی حمایت کرتے ہوئے سر تھامس مرنون نے ۱۸۱۵ء میں لکھا، "غیر ملکی فاتحین نے ہندوستان کے اصلی باشندوں پر تشدد روا رکھا تھا اور اکثر جو رسوم ڈھایا تھا لیکن کسی نے ان کے ساتھ ایسا حقارت آمیز سلوک نہیں کیا تھا جیسا ہم نے کیا ہے۔ کسی نے تمام لوگوں کو یہ کہہ کر رسوا نہیں کیا تھا کہ یہ اقتدار کے قابل نہیں ہیں، دیانتداری سے عاری ہیں اور صرف اس لائق ہیں کہ انھیں وہاں کام پر لگایا جائے جہاں ان کے بغیر چارہ نہ ہو۔ ایک قوم جو ہماری محکوم ہو گئی ہے اس کی تذیل میری نگاہ میں نہ صرف کم ظرفی ہے بلکہ ناقابل اندیشی بھی۔" ۲۵

بمبئی کونسل کے ایک رکن کی روداد میں مایوسی اور بے اطمینانی کی لہر کو اور بھی زیادہ سنجیدگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے: "متعدد ممتاز دلہی انسر جو پرانے نظام کے درہم برہم ہونے سے بیکار ہو گئے ہیں سازشوں اور شکایتوں سے بے اطمینانی کے جذبے کو زیادہ شدت کے ساتھ قائم رکھنے اور وسیع تر علاقے میں پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔" ۲۶

حکمران برطانوی طبقے کے زیادہ دانش مند لوگوں نے پہلے ہی اس صورت حال کے خطرے کو صاف صاف بھانپ لیا تھا۔ مثال کے طور پر ہم کچھ سوالات اور ان کے جوابات پیش کرتے ہیں جو پارلیمنٹری کمیٹی منعقدہ ۱۸۳۴ء کے سامنے کیے گئے۔

سوال نمبر ۱۳۸، صدر: کیا تم سمجھتے ہو کہ ہندوستان میں ہماری حیثیت کو کوئی مستقل خطرہ

درپیش ہے؟

ہنری رسل: بارود خانہ بھرا ہے۔ اگرچہ فی الحال کسی چنگاری کے گرنے کی توقع نہیں ہے۔ سوال نمبر ۱۴۰، ہندوستان میں ہماری داخل حکومت کی سب سے بڑی شرارت ہندوستانیوں کے معزز

اس واقعہ کی انقلابی اہمیت کو ہر جگہ تسلیم کیا گیا ہے۔ چارلس ہال نے اس کی کیفیت کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے: ”میرٹھ کے سپاہیوں نے فی الفور ایک قائد ایک علم اور ایک نصب العین پایا۔ خندہ کو ایک انقلابی جنگ میں بدل دیا گیا۔“ ۴۴

بہادر شاہ ایک سست طبع اور خستہ حال ضعیف تھے لیکن اس تاریخی جدوجہد میں اس سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ دہلی کے عظیم مغل خاندان کے مطلق العنان شہنشاہوں کے طویل اور غیر قطع سلسلے کے حقدار وارث کی حیثیت سے بہادر شاہ کو ہندوستان کے روایتی خود مختار فرمان روا کے طور پر ہندوستان کے سیاسی نظام میں ایک اہم مقام حاصل تھا۔ انگریزوں نے صورت حال کو اسی وقت سے سمجھا اور اس سے فائدہ اٹھایا جب لارڈ کلیک نے ۱۵ ستمبر ۱۸۵۷ء کے دن دریائے جمنا کو پار کیا اور برطانوی فوجیں پہلی بار شہر دہلی میں داخل ہوئیں۔ اسی وقت یہ فیصلہ کیا گیا کہ مغل بادشاہ کو اسی وقار کے ساتھ برقرار رکھا جائے جو اسے حاصل ہے۔

دہلی میں برطانوی افسر ٹکاف کا بیان ہے: ”اس پالیسی کو بہتر تصور کیا گیا کہ شہر میں دو عمل کو گوارا کیا جائے اور مغل خاندان کے نام نہاد وقار کو برقرار رکھا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ بادشاہ کی معزول سے ہندوستان کے مسلمانوں کی ساری قوم دہشت زدہ ہو جائے۔ یہ بات کندترین ذہن پر بھی روشن تھی کہ دہلی میں حقیقی اقتدار نئی قوت کے ہاتھ میں تھا اگرچہ بظاہر لوگوں کی نگاہ میں بادشاہ ہی ہندوستان کا فرمان روا تھا۔ جب تک قدیم خاندان کا سایہ باقی ہے یہ عزت و جاہ کا سرچشمہ رہے گا اور صرف اسی کا حکم قابل احترام ہوگا۔ شہزادے اب بھی اسی خطاب سے سرفراز تھے جو بادشاہ نے انھیں عطا کیا تھا۔ ہر قسم کے مروجہ سکے موجودہ بادشاہ کے نام سے ہی جاری ہوتے رہے۔ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی گندمی کے وارثوں کی منظوری کے لیے درخواست اب بھی اسی کی خدمت میں پیش کی جاتی اور جب وقتاً فوقتاً یہ درخواستیں رد ہو جاتیں تو ریزیدنٹ کی خدمت میں اپیلیں بھیجی جاتیں تاکہ وہ مغل بادشاہ پر اپنا اثر و رسوخ ڈال کر اپنے سائلوں کی درخواستیں منظور کرائے۔ جب خطرناک فسادات پیدا ہوتے، جیسا کہ بعد میں ہوئے تو برطانوی حکام سے پناہ کے لیے وہ بادشاہ کی طرف رجوع کرتے۔“

”بادشاہ ہر توہین گوارا کرتا رہا اور آہستہ آہستہ اس نے از سر نو اقتدار اعلیٰ حاصل کر لیا۔ اس لیے کہ ہندوستانیوں نے اپنے شہنشاہ کے لیے ایک ذلیل بادشاہ کا درجہ قبول کیا لیکن یہ امکان ہمیشہ موجود تھا کہ وہ اپنا کھویا ہوا اقتدار دوبارہ حاصل کرے گا۔ اس لیے وہ انتظار کرنے پر قانع تھے جب

اسن برقرار رکھے، اپنے حقوق کی حفاظت کرنے اور حکومت کے میں اپنے فرائض انجام دینے کے لیے یہ روایتی انتظامی ادارے تھے۔ انگریزوں نے ایک الگ بھاڑے کے سپاہیوں کا پولیس محکمہ ان پر مسلط کر دیا۔

یہ مظاہرہ اسی نظام کے خلاف تھا کہ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان کے لوگوں نے جب بھی ان کو موقع مل سکا تھا، انہیں کچھری، خزانے وغیرہ کو تباہ کر کے اپنی نفرت کا اظہار کیا۔

اگر اس بات کو ذہن میں رکھا جائے کہ انگریزی نظام ہندوستانی روایت کے منافی اور ہندوستانیوں کے مفاد کے لیے مضر تھا اور خود ہندوستانی اسے خصوصیت کی نگاہ سے دیکھتے تھے تو یہ نفرت آسانی کے ساتھ سمجھ میں آجاتی ہے۔ ہم عصر برطانوی افسر اس سے واقف تھے اور ان میں جو زیادہ سنجیدہ مزاج تھے وہ اس کیفیت پر پریشان تھے۔ انھوں نے برطانوی پارلیمنٹ کے اندر یہ معاملہ اٹھایا۔ رسل نے بڑی صاف گوئی سے کام لیا جب اس نے کہا: ”یہ نظام بنیادی طور پر انگریزی ہے، اس میں ہندوستانیت کا شائبہ بھی نہیں۔ نہ یہ ملک کے پڑنے دستور کے ساتھ کوئی مطابقت رکھتا ہے اور نہ اس کے باشندوں کے خیالات و عادات کے ساتھ۔ ہندوستان کے لوگوں کو ہمارے نظام پر کوئی اعتماد نہیں۔ ہماری حکومت کو ان کے خیالات کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں۔ اگر دوسری ریاستوں کے لوگ جنھیں یہ فوائد حاصل نہیں ہماری حکومت میں منتقل ہو جائیں تو وہ اسے عظیم ترین مصیبت خیال کریں گے جو ان پر نازل ہو سکتی ہے۔“ ۲۰ سر جان ملکم اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ملک کے تمام طبقوں نے ”سوائے ایک ایسے نظام کے کچھ نہ دیکھا جو ان کے فوری زوال اور بالآخر تباہی کا سبب تھا۔“ ۲۱ اس سے بہت پہلے شور نے صورت حال کو ان معنی خیز کلمات میں بیان کیا تھا ”ہماری سلطنت ریت کے ایک جزیرے کی مانند ہے جسے کسی سیلاب نے اُبھارا ہو۔ نہ تو کوئی بند باندھے گئے ہیں اور نہ ہی کوئی درخت لگائے گئے ہیں جن کی جڑیں نیچے پھیل کر ایک دوسری کو جکڑ لیں۔“ ۲۲ دسویں میں لکھا: ”ہندوستان کے باشندے ہر لحاظ سے دنیا کے تمام باشندوں کی مانند ہیں۔ وہ اپنی عادات و رسوم کو غیر ملکیوں کی عادات و رسوم کی نسبت زیادہ پسند کرتے ہیں۔“ ۲۳

قدیم ملک کے روایتی دارالسلطنت کو برطانوی غلامی کے جوئے سے آزاد کیا اور اکبر کے محمود وارث بہادر شاہ کے سر پر شہنشاہ ہندوستان کا تاج رکھا۔

”ریڈ پمفلٹ“ (Red Pamphlet) کا مصنف رقمطراز ہے: ”تمام اودھ ہمارے خلاف آمادہٴ پیکار تھا۔ نہ صرف باقاعدہ فوجیں بلکہ سابق بادشاہ کی فوج کے ساتھ ہزار جوان، زمیندار اور ان کے نوکر چاکر اور دوسو پچاس قلعے جن میں سے بیشتر میں توہینِ نصب تھیں، ہمارے خلاف سرگرم کار تھے۔ انھوں نے کمپنی کے راج کے مقابلے میں اپنے اپنے بادشاہ کی خود مختار متوازی حکومت قائم کر دی ہے اور اتفاقِ رائے سے اس کی حمایت کا اعلان کر دیا ہے۔ اُن پٹن خواروں نے بھی جو فوج میں ملازم رہے تھے ہماری مخالفت کا اعلان کر دیا ہے اور ان کا ایک ایک آدمی بغاوت میں شریک ہو گیا ہے۔“ ۴۷

چنانچہ اودھ میں انگریزوں کو جس چیز کا سامنا تھا وہ نہ صرف ایک مسلح، منظم اور عوامی بغاوت تھی بلکہ ایک علاقائی حکومت تھی جس کی بنیاد قدیم خاندان کی، بحالی پر تھی اور جسے لوگوں نے مسلح سپاہیوں کی سرکردگی میں دیدہ دانستہ غیر ملکی کمپنی کی ظالمانہ سرکار کے مقابلے پر قائم کیا تھا۔ غیر ملکی مضرت رساں فرنگی راج سے ہمارے اجداد کی نفرتِ حب وطن کے جذبے کا اظہار تھی یہ آزاد اور خود مختار ہونے کے قومی عزم کا اظہار تھا کہ انھوں نے ۱۸۵۷ء کے انقلابی جہاد میں جان جو کھم میں ڈال کر ”فرنگی شیطان“ کے ساتھ جنگ کی۔ یہ خود مختار قومی حکومت قائم کرنے کی عوامی خواہش کا اظہار تھا کہ انھوں نے معزول شدہ شہنشاہوں اور بادشاہوں کو ان کی پرانی گدیوں پر بحال کرنے کی کوشش کی۔ چونکہ اس وقت قومی بیداری محدود تھی اس لیے ہمارے باغی بزرگوں نے ماضی کی طرف نگاہ دوڑائی اور مغل بادشاہ، مرہٹہ پیشوا اور نواب اودھ کو حکمرانوں کی حیثیت سے بحال کیا لیکن یہ سمجھنا قطعاً غلط ہے کہ وہ پس ماندہ اور رجعت پسند تھے۔ اس وقت کے حالات میں وراثت سے محروم بادشاہوں، پیشواؤں اور نوابوں کے ساتھ کٹھ جوڑ کے ذریعے ہی سے برطانوی غلبے کے خلاف وسیع ترین قومی اتحاد پیدا کیا جاسکتا تھا۔ کسی اور باب میں ہم یہ ثابت کریں گے کہ کئی زندگی پانے والے ہندوستانی عوام ہندوستان میں انگریزوں سے پہلے کی جاگیر دارانہ شخصی حکومت کو بحال نہیں کر رہے تھے بلکہ بہادر شاہ، مانا یا نواب اودھ کے تحت انقلابی حکومتوں پر ایک نئی جمہوری اہمیت کر رہے تھے۔ غیر ملکی فرماں رواؤں پر اپنے حکمرانوں کو ترجیح دینا اور اپنے حکمرانوں کی کوتاہیوں اور کمزوریوں کے ساتھ اپنے دھنگ سے اور اپنی قوت کے مطابق پٹننے کی ہمت اور جسارت رکھنا ایک صحت مند قومی جذبہ تھا۔ ہو بہو یہی کام تھا جو ۱۸۵۷ء کے ہندوستانی باغی راہنماؤں نے کیا۔ البتہ وہ ایسے تصورات اور

یہ معلوم ہوا کہ انگریزوں کا ارادہ حق وراثت کو ختم کرنے اور شاہی کنبوں کو ادھر ادھر منتشر کرنے کا ہے تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے جذبات مشتعل ہو گئے۔
 ”انگریز ایک ایسے آتش فشاں پہاڑ پر نکلے ہوئے تھے جو کسی بھی لمحہ ہلاکت خیزی کے ساتھ پھٹنے کو تیار تھا۔“ ۲۵

انیسویں صدی کے نصف اول میں مغل خاندان اب بھی ہندوستان کی خود مختار فرماں برداری کی علامت تھی۔ انگریز غاصبوں نے مغل بادشاہ کو اپنی حکومت کی آڑ کے طور پر نام نہاد بادشاہ ہند کی حیثیت میں برقرار رکھا تھا۔ باغی سپاہیوں نے مطلب براری کے برطانوی ڈھنگ اور مغل بادشاہی کی برقراری کے انگریزی حربے کو انھیں کے خلاف استعمال کیا۔ پہلا کام جو انھوں نے کیا کہ انگریزوں کو اس روایتی نشان سے محروم کر دیا اور اسے انگریزوں کے خلاف جنگ کے مقصد کی تکمیل کی غرض سے خود استعمال کیا اور اس کے آزاد ہندوستان کے تاجدار ہونے کا اعلان کیا۔

آزاد دہلی روایتی مغل بادشاہ کے تحت ایک خود مختار ریاست کی علامت بن گئی۔ اگرچہ بعض بلند پایہ ہندوستانی مورخ اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے۔ برطانوی حکمرانوں نے اسی واقعہ کو اس صورت حال کا انتہائی خطرناک پہلو سمجھا۔

ہندوستان کے قدیم پایہ تخت میں یہ نئی صورت حال ہی کے بعد دیکھے آنے والے تمام برطانوی سپہ سالاروں کے نام کیننگ کے ان تاکید کی احکام کا سبب تھی کہ جتنی جلدی ممکن ہو دہلی پر فیصل کن حملے کی تدبیر کی جائے۔ یہی سبب تھا کہ لارنس دہلی کو فتح کرنے کے لیے پنجاب سے تمام فوجیں بہترین سپہ سالاروں اور افسروں کو نکال لایا۔ آگن کی اس رضا مندی کی بھی یہی وجہ تھی کہ تالی پکنز کے خلاف برطانوی جنگ کے لیے جو برطانوی فوجیں مخصوص تھیں ان تمام کو کیننگ کے حوالے کر دیا جائے اور وہ خود کھلتے چلا آئے تاکہ برطانوی فوج اور افسروں میں زیادہ اعتماد پیدا ہو۔

لکھنؤ میں بھی ایسا ہی ایک آزاد علاقہ قائم کیا گیا تھا۔ اس لیے یہ دو مقامات انقلابیوں اور انگریز شہنشاہیت پرستوں کے جنگی منصوبوں میں تدبیر جنگ کے اعتبار سے اہم ترین محاذ بن گئے۔ مکاف کا بیان ہے کہ ”ہندوستان کے برائے گوشے کی جہاں فوجی شورش ہوئی اپنی مخصوص تاریخ تھی لیکن دہلی اور لکھنؤ سے زیادہ توجہ کے مرکز تھے۔ جب متواتر ایک رجمنٹ نے دوسری کے بعد بغاوت کی تو یعنی فوجیں آہستہ آہستہ مختلف اطراف سے شہر ہندوستان کے ان دوسریوں سے ایک ک جانب بڑھنے لگیں۔ فی الواقع دہلی میں ہی برطانوی اقتدار اصلی کے

پچھلے در پے نازل ہوئیں، وہ کتنی ہی پیچیدہ، اچانک اور تباہ کن رہی ہوں لیکن ان سب کا اثر سطحی تھا۔ انگلستان نے ہندوستان کا سماجی ڈھانچہ یکسر توڑ ڈالا ہے اور ابھی تک اذہر نوتعمیر کے آثار دکھائی نہیں دیتے۔ پرانی دنیا کے کھونے اور اس کی جگہ نئی دنیا بنانے سے ہندوستان کی موجودہ خستہ حالی میں ایک قسم کی انفرادی کارنگ پیدا ہو گیا ہے۔ ہندوستان برطانیہ کے زیر حکومت اپنی تمام قدیم روایات اور اپنے ماضی کی تمام تاریخ سے محروم ہو گیا ہے۔ یہ برطانوی ناخواندہ مہمان ہی تھا جس نے ہندوستانی دستکاری ختم کی اور چرخ تباہ کر دیا۔ برطانوی بھاپ اور سامنس نے ہندوستان کی سرزمین پر زراعت اور صنعت کا رشتہ اتھاہ منقطع کر دیا۔ ۴۹

مارکس نے اپنی ایک اور تصنیف میں اس مسئلے کو وسیع تر سطح پر پیش کیا: ”چین اور ہندوستان کے ساتھ برطانیہ کے تعلقات سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ نظام سرمایہ داری سے پہلے کے پیداوار کے قومی طریقوں کی اندرونی استواری اور مضبوطی نے غیر ملکی تجارت کے تباہ کن اثرات سے کس طرح مدافعت کی یہاں طریقہ پیداوار کو وسیع بنیاد چھوٹے پیمانے کی زراعت اور گھریلو صنعت کے اتحاد پر قائم ہے اس کے ساتھ ہی ہندوستان میں مشترک ملکیت پر مبنی پنچایتیں بھی ہیں۔ چین میں بھی ابتدائی نظام اسی قسم کا تھا۔ ہندوستان میں انگریزوں نے حکمرانوں اور زمینداروں کی حیثیت سے چھوٹی چھوٹی اقتصادی تنظیموں کا شیرازہ بکھیرنے کی خاطر اپنے بلا واسطہ سیاسی اور معاشی اقتدار سے کام لیا۔ برطانوی تجارتی ان تنظیمات پر انقلاب انگیز اثر ڈالتی ہے اور ان کو صرف اس حد تک پاش پاش کرتی ہے کہ اپنے سستے مال کے ذریعے ان کی کٹائی اور بنائی کی صنعتوں کو تباہ کر دے جو اس اتحاد کا قدیم اور لازمی جز ہیں۔“ ۵۰

قدیم معاشی نظام کی اس بربادی کا اہم ترین پہلو زرعی تعلقات کے ساتھ وابستہ تھا۔ یہ بات اہم ہے کہ ایک دور اندیش اینگلو انڈین سیاستدان سر تھامس منرو نے اپنی فراست کی بنا پر یہ پیش گوئی کی تھی: ”ہندوستان میں جن کے اختیار میں زمین کے مالیک کی تفصیل ہوتی ہے انھیں کے ہاتھوں میں ملک کے امن و امان کی باگ ڈور ہوتی ہے“ ۵۱ ہمارے ہندو بستہ آرمی کی جو بربادی انگریز حکمرانوں کے ہاتھوں ہوئی اس کا بہترین بیان کارل مارکس نے اپنے جواب طریقے سے یوں کیا ہے: ”اگر کسی قوم کی تاریخ معاشیات میں ناکام، بیہودہ اور عملی طور پر بولنے عالم تجربات کا پلندہ ہے تو وہ ہندوستان کے انگریزی نظام کی تاریخ ہے۔ بنگال میں انھوں نے انگریزی نظام آرمی کی بگڑی ہوئی نقل کی۔ جنوب مشرقی ہندوستان میں تھوڑی تھوڑی

خیالات نہ رکھتے تھے اور نہ ہی رکھ سکتے تھے جو ہندوستان کی قومی تحریک آزادی اور دوسری نوآبادیاتی تحریکات کو بیسویں صدی کے دوران میں ماحول ہوئے۔ لیکن ۱۸۵۷ء کی قومی بغاوت کا جدید قومی آزادی کی تحریکات کے معیار سے جائزہ لینا تاریخی بے اصولی ہے اور ہر لحاظ سے سائنٹیفک طریقے کے منافی ہے۔

لکھنؤ میں برہمچریوں کی قیادت والی لکھنؤ نے ایک اعلان جاری کیا جس میں یہ کہا گیا تھا: "تمام ہندو اور مسلمان جانتے ہیں کہ ہر انسان کو چار چیزیں عزیز ہیں: مذہب، عزت، جان اور مال۔ یہ چاروں چیزیں ملکی حکومت کے تحت ہی محفوظ ہوتی ہیں۔"

غرضیکہ مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ باغی راہنما کیوں برطانوی حکومت سے نفرت کرتے تھے اور کیوں انھوں نے اپنی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی۔ ۱۸۵۷-۵۸ء کی بغاوت کا بنیادی مقصد ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی تباہی اور اس کی جگہ ہندوستانی حکومت کا قیام تھا۔ پہلا ایک تجزیہ ہی قدم تھا اور دوسرا جدوجہد کا تعمیری جز تھا۔ اگر اس سے یہ شورش قومی بغاوت کا رنگ اٹھتا نہیں کرتی تو اور کس چیز سے کرے گی۔

۳۔ ایک معاشی نظام کی برابری

ہندوستان میں برطانوی فتح کا مطلب صرف یہ نہ تھا کہ اس پر غیر ملکی حکومت سبط ہوگی بلکہ اس سے بھی زیادہ بڑی بات یہ تھی کہ خود ہندوستان کے روایتی مجلسی نظام کو تباہ کیا گیا اور ایک نئے نظام کی جانب بڑھنے کے لیے راہ مسدود کر دی گئی۔ مارکس اس زمانے کا واحد مفکر تھا جس نے سائنٹیفک ڈھنگ سے اس المناک واقعے کا مطالعہ کیا۔ اس نے ہندوستان میں برطانوی شہنشاہیت پرستی کے کردار کو ایسے صحیح رنگ میں پیش کیا کہ بعد میں ہندوستانی علماء کی تحقیقات اس کے نتائج کی تصدیق ہوئی۔ اس تجزیے سے ہندوستانی محب وطن کو ہندوستان کی حقیقت حال کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد ملی اور ہندوستان کے قومی انداز فکر میں ترقی پسندانہ رجحان پیدا ہوا۔

۱۸۵۷ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر کی تجدید کے موقع پر برٹش پارلیمنٹ میں ہندوستان کی صورت حال پر بحث ہو رہی تھی تو مارکس نے اپنے ایک مقالے بعنوان "برٹش رولز ان انڈیا" (British Rule in India) میں لکھا،

"خانہ جنگیوں، حملوں، انقلابات، فتنوں اور قسطنطین کی جوبھی ہلاکتیں ہندوستان کی سرزمین

بذریعہ یہ کابلے شک رواج تھا لیکن بہت کم اور وہ بھی فریقین کی خواہش اور رضامندی کے ساتھ عمل میں آتا تھا۔

”انگریزی حکومت کے شروع زمانے میں جائداد آراضی کی فروخت اس کثرت کے ساتھ ہوئی کہ سارا ملک تروبالا ہو گیا۔

”قرض کی ادائیگی کے لیے زمین کی فروخت کا رواج بھی نہایت قابل اعتراض ہے۔ ساہوکاروں اور سود خوروں نے زمینداروں کو پیشگی رقم دے کر اس سے فائدہ اٹھایا ہے اور انھیں جائداد سے محروم کرنے کے لیے طرح طرح کی دغا بازی اور شرارت سے کام لیا ہے۔ انھوں نے دیوانی عدالتوں میں لاتعداد مقدمے دائر کیے ہیں۔ کچھ جھوٹے کچھ سچے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہ عام طور پر پرانے زمینداروں کو بے دخل کر کے چپکے سے ان کی جائدادوں پر قابض ہو گئے ہیں۔ اس قسم کے مصائب نے ملک کے طویل و عرض میں زمینداروں کو برباد کر دیا ہے۔

”برطانوی حکومت نے جو بندوبست مایہ کا طریقہ نافذ کیا ہے وہ اس کے لیے نہایت قابل فخر ہے لیکن یہ سابقہ تشکیلات کی نسبت بھاری ہے۔ پہلے کا شہکار کی اصلی پیداوار کے خاص حصے کی صورت میں مالیہ وصول کیا جاتا تھا۔ انگریزی سرکار نے جو لگان آراضی عاید کیے ہیں ان میں ناگہانی حادثات کی رعایت نہیں رکھی گئی ہے۔“ ۵۶

یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اس زرعی انقلاب نے فی الواقع دیہات میں تمام طبقوں اور فرقوں کو یکساں نہ کر دیا ہے۔ ڈاکٹر سین بجا فرماتے ہیں:

”صرف زمیندار اور تعلقدار ہی اپنے آبائی پیشوں سے محروم نہیں ہوئے، نئے قانون بیع نے کسان کو بھی یکساں طور سے پریشان کر دیا۔ وہ دائمی طور پر مقروض رہتا اور بنیا جو گاؤں کا ساہوکار تھا وہاں تدارق قرض خواہ نہ تھا۔ وہ بھاری سود وصول کرتا اور دغا بازی سے ہرگز دریغ نہ کرتا۔ پہلے قرض دار اپنے جاگیردار آقاؤں کے زیر سایہ محفوظ تھے لیکن نئے قانون نے غیر ادا شدہ قرضوں کے عوض زمین کی فروخت کی اجازت دے دی اور کسان زمین کے ساتھ اپنا پیشہ بھی کھو بیٹھتا۔ نہ صرف مشترکہ مصیبت کی وجہ سے بلکہ سرپرستی اور وفاداری کے روایتی تعلقات نے بھی زمین سے بے دخل کیے گئے زمیندار اور کسان کو متحد کر دیا۔ زمیندار اپنے گھاؤں میں رہتا تھا اور اگرچہ کسان اکثر اس کے ہاتھوں سختی جھیلتا لیکن پھر بھی مشکل کے وقت وہ اپنے آقا کی امداد اور ہمدردی پر بھروسہ رکھ سکتا تھا۔ بنیالبتہ باہر کا آدمی تھا۔ وہ کسان کے حقوق ملکیت اور اس کا قطع زمین مالی منافع کی خاطر خرید لیتا

آراضی کی تقسیم کا ڈھونگ رچا۔ شمال مغرب میں انھوں نے حق المقدور زمین کی مشترک ملک ہندوستانی گرام پنچایت کے ساتھ یہی کیا۔ ۵۲

برطانوی اصلاحات کا مطلب گرام پنچایت کے نظام پر مبنی ہندوستانی زراعت کی روایتی بنیاد کو سراہنا تھا۔ مارکس نے اس گرام پنچایت سسٹم کو ایک "ایسا سماجی نظام قرار دیا جو خاص خصوصیات رکھتا تھا۔ اسے دیہاتی نظام کہہ سکتے ہیں جس سے اس قسم کی ہر چھوٹی (پنچایت) نے آزاد تنظیم اور مخصوص زندگی کا رنگ پایا۔ ایک اور بدعت جو انگریزوں نے رائج کی وہ زمین کو نجی ملکیت قرار دینا تھا۔ دونوں بدعتوں کا مطلب ہندوستانی زراعت کی تباہی اور زمین داروں کی عام بے دخلی تھا۔

برطانوی شہنشاہیت پرستی کے نظریاتی مبلغوں نے اس اہم فرق کو جو برطانیہ کی زرعی پالیسی سے ظاہر تھا اور اس سے پیدا ہونے والے تباہ کن نتائج کو تسلیم کیا مثلاً سر جان اسٹرن کی لے اپنی کتاب "انڈیا، اس ایڈمنسٹریشن اینڈ پراگریس" (India, its Administration and Progress) میں جس نے ایک پوری پشت کے لیے تعلیمی نصاب کا کام دیہیان کیا ہے: "ہماری پالیسی یہ رہی ہے کہ زمین کی نجی ملکیت کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ سابقہ حکومتوں نے ایسی ملکیت کے وجود کو کبھی تسلیم نہ کیا۔ ۵۳

اس میں کس شک کی گنجائش نہیں کہ ان پر قرض کا بوجھ بہار حکومت سے پہلے کی نسبت اب زیادہ ہے کیوں کہ زمین کی نجی ملکیت کا حق دراصل ہم نے خود ہی پیدا کیا ہے۔ جب عملی طور پر ایسا کوئی حق نہ تھا تو نسبتاً کسی کی کوئی ساکھ بھی نہ تھی۔ جو کوئی زمیندار قرض لینے کا خواہاں ہوتا وہ وزرو ضمانت پیش کر سکتا تھا اس لیے مقروضیت بہت کم تھی۔ ۵۴

"اگر کوئی زمیندار مقررہ تاریخ پر مالہ جمع نہیں کر پاتا تو اس سے اس کی وجہ نہیں پوچھی جاتی بلکہ اس کی جائیداد ضبط کر دی جاتی ہے۔ ۵۵

ماننی کے اس زرعی نظام کے بارے میں جو انگریزوں نے رائج کیا اور جس سے عوام میں اتنی بیزاری تھی، سر سید احمد خاں کی رائے جاننا مفید ہوگا۔ انگریز سر سید احمد خاں کو بہت دانش مند اور قابل منتظم سمجھتے تھے۔ انھیں ہندوستان آراضی سے متعلق زندگی بھر کا ذاتی تجربہ تھا۔ اب میں ان کی کتاب "اسباب بغاوت ہند" سے چند اقتباس پیش کرتا ہوں۔

"سابقہ حکمرانوں کے عہد میں ملکیت آراضی کے حقوق کی خرید و فروخت، رہن اور انتقال

جلس کے توسط سے کی جاتی تھی جو بندوبست آراضی کو بند بنانے اور زمین پر صرف کاشتکاروں کا حق تسلیم کرنے کا منصوبہ باندھ رہی تھی۔

اٹھارویں صدی کے بعد ہندوستان ایک صنعتی دیش بھی تھا اور خوش حال زراعتی ملک بھی۔ کرگٹھے پریتے ہوئے ہندوستانی کپڑے اور دوسری ہندوستانی مصنوعات دنیا بھر میں مشہور تھیں اور ہندوستان کا مال ایشیا اور یورپ کی منڈیوں کو جاتا تھا۔ انگریزوں نے ہندوستان کی صنعت و حرفت کو تباہ کر دیا اور انھیں بالکل مختلف سمت میں ڈال دیا۔ ڈاکٹر ڈی۔ آر۔ گیندھل کا بیان ہے: "یوں تو زوال اٹھارویں صدی کے اختتام پر ہی شروع ہو گیا تھا لیکن انیسویں صدی کے وسط میں یہ نمایاں طور پر ظاہر ہوا۔" ۶۰

انخطاط کا یہ عمل غیر ملکی حکومت کے قیام سے شروع ہوا، ہندوستان کے دیسی درباروں کے خاتمے کی وجہ سے جو مال کی مانگ کے بڑے مرکز تھے (غیر ملکی اثر و رسوخ کے زور سے تیز ہوا اور غیر ملکی مال کے مقابلے میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔

شہری صنعت کے زوال سے زمین پر دباؤ ضرور بڑھ گیا لیکن اس لیے نہیں کہ لوگ شہروں سے ہجرت کر کے گاؤں کو جا رہے تھے (ایسا بالکل نہیں ہوا) بلکہ ان لوگوں کے رہ جانے کی وجہ سے جو عام حالات میں شہری صنعتوں میں جذب ہو جاتے۔" ۶۱

بنگال کی فتح کے بعد بنگال میں اور آگے چل کر سارے ہندوستان میں ہندوستان کو لوٹنے کے لیے تجارت کے جبری اور غیر مساوی طریقوں سے کام لیا گیا اور یہ ملک کی اقتصادی تباہی کا سبب ہوا۔ آر۔ پی۔ دت کا بیان ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کے حکمران طبقہ بن جانے کے بعد کس طرح صورت حال میں مائیتی تبدیل ہو رہی ہوئی، کس طرح زر مبادلہ کے توازن کو سارے تباہ بنانے اور کم سے کم قیمت پر زیادہ سے زیادہ مال حاصل کرنے کی فرض سے اقتدار کے ہتھکنڈوں کا روز افزوں استعمال ہونے لگا۔" ۶۲

اٹھارویں صدی کے اختتام تک اور خاص کر ۱۸۱۳-۲۲ء تک ہندوستان کے بارے میں برطانوی پالیسی میں تبدیلی آچکی تھی۔ غیر مہذب لوٹ کے ایک دور اور ہندوستانی صنعت و حرفت کی باقاعدہ تباہی کے بعد برطانیہ کے دولت مند طبقے نے جس کا صنعتی انقلاب مکمل ہو چکا تھا، ہندوستان کو اپنے مال کی کھپت، خاص کر برطانیہ کے بننے کپڑے کی منڈی کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ مارکس نے اس نمایاں تبدیلی کو محسوس کیا اور ۱۸۵۲ء کے دوران اپنے ایک مقالے

اس لیے بنیے اور کسان کے درمیان عام غور پر محبت یا زفاداری کا جذباتی رشتہ ممکن نہ تھا اور کسان اب بھی اپنے سابق جاگیردار آقا کا ساتھ دینے پر مجبور تھا۔ ۵۷

وسطی ہندوستان میں صورت حال یکساں طور پر خراب تھی۔ ڈاکٹر لوجس نے وسطی ہندوستان میں سر ہیوگ روز کے ساتھ خدمت انجام دی، بیان کرتا ہے: "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جاگیرداروں کے پے درپے ضبط کیے جانے کی وجہ سے ان کے مدت سے زبے ہوئے جذبات اس حد تک بھڑک اٹھے ہیں کہ ان پر قابو پانا مشکل ہے۔" ایک بوڑھے دیہاتی کے حوالے سے وہ مزید بیان کرتا ہے: "صاحب! جنگلات درخت دریا کنویں تمام دیہات اور تمام مقدس شہر سرکار کی ملکیت ہیں۔ انھوں نے سب کچھ چھین لیا ہے۔ ہر چیز! بتائیے ہم کیا کر سکتے ہیں؟" ۵۸

اس پس منظر میں بہادر شاہ کے باغیانہ اعلان کی اہمیت نمایاں ہے: "یہ ظاہر ہے کہ برطانوی سرکار نے لگان آراضی کی تشخیص کے وقت بھاری جماعت (مسکین، ٹھوس دیہاتے اور پھر مالگنداری کی عدم ادائیگی کی صورت میں جاگیرداروں کی جائیدادیں نیلام کر کے انھیں رسوا اور تباہ کیا۔" زمینداروں سے متعلق مقدمہ بازیوں بھاری قیمت کے اشارے اور عدالت کے غیر ضروری اخراجات کی وجہ سے مقدمہ باز کنگال ہوتے جا رہے ہیں۔ عدالتوں کی بدعنوانیاں زوروں پر ہیں اور مقدمے برسوں چلتے رہتے ہیں۔

"اس کے علاوہ زمینداروں کی جیب پر ہر سال اسکولوں، ہسپتالوں اور سڑکوں کے لیے چندوں کا بار پڑتا ہے۔ ایسی جبری وصولیاں بادشاہی حکومت میں قطعاً ممنوع تھیں بلکہ اس کے برعکس جماعت ہلکے ہوں گے۔ زمینداروں کی عزت و آبرو محفوظ تھی۔ ہر زمیندار اپنے علاقے میں خود مختار تھا۔ زمیندار اپنے آدمیوں اور روپے کے ساتھ اس جنگ میں شریک ہوں گے انھیں ہمیشہ کے لیے نصف لگان معاف کر دیا جائے گا۔ جو زمیندار صرف روپے کے ساتھ مدد کریں گے ان کا ایک چوتھائی لگان ہمیشہ کے لیے معاف کر دیا جائے گا۔ جو زمیندار انگریزوں کی حکومت کے دوران اپنی آراضی سے جائز طور پر محروم کیا گیا ہے اگر وہ بذات خود جنگ میں شریک ہو گا تو اس کی زمینداری بحال کر دی جائے گی اور اسے لگان کا چوتھا حصہ معاف کر دیا جائے گا۔" ۵۹

بہادر شاہ کے اعلان میں صرف زمینداروں کا ذکر کیا گیا ہے، کسانوں کا نہیں۔ یہ بات قابل توجہ ہے جس کی وضاحت ہم بعد کے کسی باب میں کریں گے۔ کسانوں کے مفاد کی حمایت

کنا تا تھا۔ بنگال کے مارواڑی لکھتی طبقہ کی وہی حیثیت تھی جو آگے چل کر شنگھائی کے یورپی تاجروں کے ایجنٹوں کو حاصل ہوئی۔ اس طاقتور طبقہ کا ظہور جس کے اقتصادی مفادات غیر ملکی تاجروں کے مفادات کے ساتھ وابستہ تھے اور جنہیں مسلمانوں کی حکومت سے پیدائشی نفرت تھی ہندوستان اولیٰ اشیا کی تاریخ میں بنیادی اہمیت کا واقعہ تھا۔ ۶۵۰ سنی اور برطانوی تاجروں کے یہ ہندوستانی کارندے گھماشتے اور بیٹے کہلاتے تھے۔ انھوں نے غیر ملکی سرمایہ داروں کے نائب گماشتوں کی حیثیت سے کام کیا اور ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں انگریز دوستی کا پارٹ ادا کیا۔

مذکورہ بالا صورت حال اور حکومت کی پالیسیوں کے بارے میں سمجھ دار ہندوستانیوں کا ردِ عمل کیا تھا؟

اہل حدیث کے بلند پایہ مسلمان عام علاقہ فضل حق خیر آبادی کے بیان کا حوالہ دینا مفید ہوگا انھوں نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں انہما کا پارٹ ادا کیا اور عرقتید کی سزا پائی۔

”انتدار حاصل کرنے کے بعد انگریزوں نے فیصلہ کیا کہ کھانے کی چیزوں پر پابندی لگا کر چارے اور غلے پر قبضہ کر کے اور کاشتکاروں اور کسانوں کو حقوق کا شتہ نے عوامی نقد روپیہ دے کر لوگوں کے مختلف طبقات کو مطیع کیا جائے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ غریب لوگوں اور دیہاتیوں کو اناج کی خرید و فروخت میں کھلی چھٹی نہ ہو اپنی قوم کے آدمیوں کو ترجیح دے کر یہ زرخیز کے گرانے بڑھانے پر اختیار رکھنا چاہتے تھے تاکہ بندگان خدا عیسائیوں کی اجارہ داری کے آگے تسلیم خم کر دیں اور اپنی ضروریات کے لیے عیسائیوں پر انحصار رکھنے کے لیے مجبور ہو جائیں اور اس طرح عیسائیوں اور ان کے حامیوں کے مقاصد ان کی دلی خواہشات اور آرزوئیں اور ان کے باطن میں پوشیدہ شرارتیں پایہ تکمیل کو پہنچیں۔“ ۶۶

اس پس منظر میں دہلی کے باغیوں نے ریں طرف سے بہادر شاہ کی جاری کردہ پیل حق خیر تھی۔ اعلان میں تاجروں سے مدد کے لیے یوں التجا کی گئی:

”ظاہر ہے کہ کافر اور دغا باز برطانوی حکومت نے تمام نفیس اور قیمتی تجارتی اشیا پر اجارہ داری حاصل کرنی سے شائبہ نہیں کپڑا اور دوسری سمندر پار درآمد ہونے والی چیزیں۔ لوگوں کے ہاتھ میں صرف معمولی چیزوں کا بیوپار رہ گیا ہے اور اس میں بھی انھیں منافع کے ایک حصے سے محروم کھا گیا ہے جو وہ محصول اور اسٹاپ کی فیسوں وغیرہ کی شکل میں وصول کر لیتے ہیں۔ غرضیکہ لوگوں کی تجارت محض نام کی ہے۔ اس کے علاوہ تاجروں کے منافع پر محصول، ڈاک، جہاز و سونے

میں لکھا:

”تجارت کی نوعیت یکسر بدل گئی ہے ۱۸۱۳ء تک ہندوستان زیادہ تر مال برآمد کرنے والا ملک تھا لیکن اب درآمد کرنے والا ملک بن گیا ہے اور یہ تبدیلی اتنی تیزی سے واقع ہوئی ہے کہ روپیہ کی شرح زر مبادلہ جو عام طور پر ۲/۴ فی روپیہ ہوتی تھی ۱۸۲۳ء ہی میں گر کر ۲/۲ فی روپیہ ہو گئی۔ ہندوستان جو قدیم زمانے سے دنیا کے لیے سوئی کپڑے کی صنعت کا مرکز تھا اب انگریزی دھاگوں اور موٹے سوئی کپڑوں سے ہٹ دیا گیا۔ ایک طرف ہندوستان کی پیداوار کو انگلستان جانے نہ دیا جاتا اور اگر ملانے بھی دیا جاتا تو نہایت کڑی شرطوں پر۔ دوسری طرف برطانوی مصنوعات برائے نام محصول پر بکثرت درآمد ہونے لگیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی سوئی ملل جو کبھی دنیا بھر میں مشہور تھی اس کی صنعت ناپید ہو گئی۔“ ۶۳

ایسٹ انڈیا کمپنی کی پالیسی نے آزاد تاجر طبقے کو بھی تباہ کیا اور صنعت کاروں اور دستکاروں کو بھی۔ پروفیسر رام کرشن کرمجی نے اس عمل کو یوں بیان کیا ہے:

”اس مادی دنیا سے ہندوستانی کاری گروں کے اخراج کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے تاجر طبقے کی تباہی کا بھی عمل شروع ہوا۔ ہندوستان کی پیداوار کی اجارہ داری انگریزوں کے ہاتھوں میں جانے کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستانی تاجروں کا زندہ رہنا محال ہو گیا۔ صرف وہی لوگ اس پیشے کو جاری رکھ سکتے تھے جو کمپنی کی کٹھ پتلی بننے پر رضامند تھے یا اس کے ملازموں کی جو ہندوستان میں اندونی نجی تجارت کرتے تھے یا ان پرائیویٹ انگریز تاجروں کی جو اس غرض سے ہندوستان میں رہتے تھے ورنہ انھیں کوئی نیا ذریعہ معاش تلاش کرنا پڑتا۔ جن ایشیا کے انگریز اجارہ دار تھے ان کی براہ راست خریداری ہندوستانی تاجروں کے لیے نہ صرف ممنوع تھی بلکہ کمپنی کے کارندے اور ملازم ایسا مال ہندوستانی تاجروں پر بازار سے زیادہ قیمت پر ٹھونس دیتے تھے“ ۶۴

آزاد تاجر طبقہ ایک حد تک صنعت کار طبقے کا بھی کام دیتا تھا لیکن اجارہ دار ایسٹ انڈیا کمپنی نے اسے نیست و نابود کر کے ہندوستانی معیشت کے ایک بہت اہم طبقے کو تباہ کر دیا جو اس کا حریف ہو سکتا تھا۔

اس واقعے کے ایک اور پہلو کا نکتہ ایم۔ پانیکر نے یوں تجزیہ کیا ہے: ”ہندوستان کے بڑے بڑے ساحلی علاقوں میں یورپی تجارتی مراکز کے قیام کے ساتھ ایک طاقتور ہندوستانی سرمایہ دار طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس کا غیر ملکی تاجروں کے ساتھ قریبی رابطہ تھا اور جو ان کے ساتھ تجارت کر کے بھاری منافع

یہ نہیں ہے۔ ۱۸۵۷ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا خاتمہ ہوا تو اس نے ہندوستان کے نام سات کروڑ روپے کے قرضے کی بھاری رقم نکال دی۔ اس اثنا میں انھوں نے ہندوستان سے سود کے علاوہ ہندو کروڑ روپے سے زیادہ خراج وصول کر لیا تھا جو مالی نقطہ نظر سے ایک ناجائز خراج تھا۔ انھوں نے جنگ افغانستان، جنگ چین اور ہندوستان سے باہر دوسری جنگوں کے اخراجات ہندوستان پر ڈال دیے اس لیے انصاف کی رو سے ہندوستان پر کوئی قرضہ نہیں تھا جب کمپنی کی حکومت ختم ہوئی۔ اس کا سرکاری قرضہ ایک فرضی قرضہ تھا۔ جو رقیب ہندوستان سے وصول کی گئیں ان میں سے دس کروڑ روپے کی کافی بڑی رقم اس کے حق میں نکلتی تھی۔ ۱۸۵۷ء

منٹگری مارٹن نام کا ایک انگریز ہندوستانی لوگوں کے ساتھ ہمدردی رکھتا تھا۔ اس نے ۱۸۳۵ء میں لکھا تھا: ”برطانوی ہندوستان پر تیس لاکھ پونڈ کا یہ سالانہ بوجھ تیس سالوں میں بارہ فی صدی سود مرکب کی شرح سے (عام ہندوستانی شرح سود) بہتر کروڑ اٹالیس لاکھ ستانوے ہزار نو سو سترہ پونڈ کی کثیر رقم بن گئی یا کم شرح پر تیس لاکھ پونڈ پچاس سالوں میں آٹھ ارب چالیس کروڑ پونڈ بنتا ہے۔ ایسے مستقل اور روز افزوں بارے تو انگلستان بھی جلد کنگال ہو جائے۔ ہندوستان پر اس کا کتنا ناگوار اثر پڑا ہو گا جہاں ایک مزدور کی روزانہ اجرت دو تین پنس ہو۔“ ۱۸۵۷ء

اس نے مزید کہا: ”پچاس سال تک متواتر ہم ہندوستان سے بیس۔ تیس لاکھ اور بعض اوقات چالیس لاکھ پونڈ ہر سال نکالتے رہے ہیں۔ یہ کثیر رقم برطانیہ عظمیٰ کو اس لیے بھیجی گئی ہے کہ تجارتی مٹبازی کے خساروں کو پورا کیا جائے، قرضوں کے سود ادا کیے جائیں۔ محکمہ داخلہ کے عمل کو قائم رکھا جائے اور جن انگریزوں نے ہندوستان میں زندگی بسر کی ہے۔“ کی جمع کی ہوئی دولت کو انگلستان میں لگایا جائے۔ میرے خیال میں ان سب سچے بوجھ کے لیے یہ ناممکن ہے کہ ہندوستان جیسے دور دراز ملک کو تیس چالیس لاکھ پونڈ کے مستقل سہارے۔ سارے بڑے اثرات سے کلیتا بچا سکے جب کہ یہ رقم کسی بھی شکل میں اسے واپس نہیں دی جاتی۔ ۱۸۵۷ء

پروفیسر رام کرشن مکرجی نے اور زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ بات کہی: ”اس خراج کی مکمل تصویر اس سے کہیں زیادہ رقم کو ظاہر کرتی ہے جس کا ذکر مارٹن نے ۱۸۳۵ء میں کیا۔ اگرچہ ۱۸۵۵ء اور ۱۸۵۶ء تین برسوں میں چونتیس لاکھ چھتیس ہزار تین سو پینتالیس پونڈ کی فاضل درآمد ظاہر ہوتی ہے (اس لیے نہیں کہ غیر ملکی حکمرانوں نے اپنی پالیسی بدل لی تھی بلکہ اس لیے کہ ہندوستان میں کچھ برطانوی سرمایہ ریلوے بنانے اور ملک کو تیار کرنے میں لگایا گیا تاکہ برطانوی صنعتی سرمایہ اس

وغیرہ کے لیے چندوں کا بار پڑتا ہے۔ ان تمام رعایات خصوصی کے باوجود کسی شہدے کے اشارے یا شکایت پر تاجر قید کر لیے جاتے ہیں اور رسوائی کے سزاوار ٹھہرتے ہیں۔

”جب بادشاہی حکومت قائم ہو جائے گی تو تمام مذکورہ بالا عیارانہ دستور ختم کر دیے جائیں گے اور بلا استثناء ہر چیز کی تجارت، بری ہو یا بخری، ہندوستان کے ملکی تاجروں پر کھول دی جائے گی اور وہ سرکاری و خانی کشتیوں اور گاڑیوں سے اپنا مال مفت لے جاسکیں گے۔ جن تاجروں کے پاس اپنا سرمایہ نہیں ہے ان کی مدد سرکاری خزانے سے کی جائے گی۔ اس لیے ہر تاجر کا فرض ہے کہ وہ جنگ میں حصہ لے اور آدمیوں اور روپے کے ساتھ بادشاہی سرکار کی کھلم کھلا یا خفیہ مدد کرے جیسا کہ اس کی حالت اور مفاد کا تقاضہ ہو اور برطانوی حکومت کے تین وفاداری ترک کرنے کی قسم کھائے۔“

اعلان میں اہل حرنے سے ان الفاظ میں اپیل کی گئی:

”یہ ظاہر ہے کہ فرنگیوں نے ہندوستان میں انگریزی چیزوں کو رواج دے کر جولابوں، روٹی دھننے والوں، بڑھتیوں، لوہاروں اور سوچیوں وغیرہ کو بیکار کر دیا ہے اور ان کے تمام پیشوں پر قبضہ کر لیا ہے یہاں تک کہ ہر قسم کا دستکار، بھکاری بن کر رہ گیا ہے لیکن بادشاہی حکومت کے ہمد میں صرف ملکی دستکار ہی بادشاہوں، راجاؤں اور امیروں کی ملازمت میں لیے جائیں گے۔ یہ یقیناً ان کی خوش حالی کی ضمانت ہوگی۔ اس لیے ان دستکاروں کو انگریزوں کی ملازمت ترک کر دینا چاہیے اور جنگ میں مصروف مجاہدین کی مدد کرنی چاہیے تاکہ وہ دنیاوی اور ابدی سعادت کے حصول میں نہ ہوں۔“

ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کے معاشی اور سیاسی عمل دخل نے ہمارے ملک کی ساری دولت چھوڑ لی۔ اسے ہندوستان کے معاشی مورخین نے اقتصادی نکاس کا نام دیا ہے۔ اب ہم ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے عین پہلے کی حالت کا مشاہدہ کریں گے۔

ایک نام نہاد ”ہندوستانی قرضہ تھا جسے کمپنی نے ہندوستان میں اپنی حیثیت کو مستحکم کرنے، مہموں اور جنگوں کے ذریعے اپنے اثر و رسوخ کو اور بڑھانے، انگلستان میں حصہ داروں کو بھاری منافع دینے، ۱۸۵۷ء سے برطانوی سرکار کو خراج ادا کرنے اور انگلستان کے مقتدر اشخاص کو رشوتیں دینے پر صرف کیا تھا۔“ یہ ہندوستانی قرضہ کیوں اور کیسے وجود میں آیا اس سلسلے میں آر۔سی۔ دت نے یہ خیال ظاہر کیا ہے: ”اس ملک (انگلستان ۱۸۵۷ء) میں یہ ایک عام غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ تمام ہندوستانی قرضے سے مراد وہ برطانوی سرمایہ ہے جو ہندوستان کی ترقی میں لگایا گیا ہے۔ اس کتاب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ہندوستان کے سرکاری قرضے کی بابت

۳۔ مذہبی پہلو

۱۸۵۷ء کی بغاوت میں مذہب کو بڑا دخل تھا۔ برطانوی سیاستدانوں اور وقائع نگاروں نے اس پہلو کو بڑھا چڑھا کر اور غلط رنگ میں پیش کیا تاکہ وہ اپنے اس نظریے کو ثابت کر سکیں کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت رجعت پسندانہ، احیائے روایت کی حالی اور ان ترقی پسندانہ اصلاحات کے خلاف تھی جو وہ ہندوستانی سماج میں نافذ کر رہے تھے۔ انگریزی تعلیم پانے والے روشن خیال ہندوستانیوں کی پہلی پشت نے اس شہنشاہیت پرستانہ نظریے کو بلا چون و چرا قبول کر لیا کیوں کہ انھوں نے قدیم رجعت پسندانہ مذہبی اثرات کے باعث نقصان اٹھایا تھا۔ ایک صحیح تاریخی نظریے کا تقاضا ہے کہ ہم نہ اس تاریخی مرحلے کو بھولیں جس پر ہندوستانی سماج ۱۸۵۷ء سے عین پہلے پہنچ چکا تھا، نہ ان نظریاتی قدروں کو جو اس سماج کا معمول ہیں اور نہ ان نظریاتی صورتوں کو جو ہندوستانی لوگ اپنی آرزوؤں کو دے سکتے تھے۔ ہندوستانی جاگیردارانہ سماج کا شیرازہ انیسویں صدی کے وسط میں تیزی سے کبھر ہاتھ اٹھانے لگا۔ غیر ملکی فاتح ہماری کمزوریوں کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنا اتو سیدھا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ ہمارے ملک پر ایک پر جوش اور منظم معاشی، سیاسی اور نظریاتی حملہ کر رہے تھے۔ سب سے بڑا مسئلہ جس سے ہندوستان کے تمام طبقے دوچار تھے، یہ تھا کہ ہندوستان کو ہندوستانیوں کے لیے محفوظ کیا جائے اور اسے فرنگیوں کے چورفہ حملوں سے بچایا جائے۔ اس وقت کی تاریخی صورت حال میں روایتی، مذہبی و تمدنی تصورات لازمی طور پر غیر ملکی حکومت کے خلاف ہندوستان کی نظریاتی جدوجہد کا اہم جز تھے۔ تاریخ کے اپنے مطالعے اور اپنی قسمت کو از سر نو بنانے کی خاطر لوگوں کی پشت پائشت کی جدوجہد کی بنا پر مارکس اس نتیجہ پر پہنچا تھا:

”لوگ اپنی تاریخ بناتے ہیں لیکن اس طرح نہیں جس طرح وہ چاہتے ہیں۔ وہ اسے ایسے حالات کے تحت نہیں بناتے جن کا انھوں نے خود انتخاب کیا ہو یا جو ماضی کی دین ہوں۔ تمام مردہ پشتوں کی روایت زندہ لوگوں کے دماغ پر بوجھ بن کر سوار رہتی ہے اور عین اس وقت جب وہ اپنے اندر گرد و پیش کی چیزوں میں انقلاب لانے یا کوئی ایسی چیز پیدا کرنے میں مصروف ہوتے دکھائی دیتے ہیں جس کا پہلے کوئی وجود نہ تھا تو انقلابی بحران کے عین اس دور میں وہ ماضی کی روحوں کو بے تابانی کے ساتھ ملاتے ہیں اور ان سے نام، جنگ کے نعروں اور ملبوسات مستعار لیتے ہیں تاکہ وہ اس قدیم بیس اور مانگی ہوئی زبان میں تاریخ عالم کے نئے منظر کو پیش کریں“ ۵۷۔

سے استفادہ کر سکے) لیکن کمپنی کی حکومت کے آخری دور کے چوبیس سالوں کے دوران یعنی ۱۸۳۵ء سے ۱۸۵۷ء تک کل خزانہ جو ہندوستان سے مصارف محکمہ داخلہ اور ہندوستان کے فاضل برآمد کی شکل میں وصول کیا گیا پندرہ کروڑ اٹھارہ لاکھ تیس ہزار نو سو نو اسی پونڈ تک پہنچ گیا۔ اس سے تقریباً ۱۸ لاکھ پچیس ہزار آٹھ سو پچھتر پونڈ کی سالانہ اوسط نکلتی ہے جو اس مدت میں جمع کیے گئے سالانہ لگان کارائی کے لگ بھگ نصف کے برابر ہے۔ ۴۳

یہ ایک ایسی بھاریک حقیقت تھی جو ہندوستان کی صدیوں پرانی تاریخ میں کبھی دیکھے میں نہیں آئی۔ بقول مارکس "اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ جو مصیبت انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان پر نازل ہوئی ایسی انتہائی اور شدید قسم کی مصیبت ہندوستان نے پہلے کبھی نہ اٹھائی تھی۔" ۴۴

انگریزوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے عہد میں ہندوستان کے معاشی نظام کو سراسر دہیمہ کر دیا۔ انھوں نے قدیم ہندو لبت آفاقی کوٹہ وبالا کر دیا۔ انھوں نے ملک کی صنعت و حرفت کو پاش پاش کر دیا۔ ہندوستان کی معیشت کے ان دو شعبوں کے درمیان رابطے کو منقطع کر دیا۔ ہمارے ملک کی دولت کو باقاعدگی کے ساتھ نکال کر اپنے ملک میں لے گئے اور ہماری معیشت کی پیداوار کے سرچشموں کو خشک کر دیا۔ ہندوستانی سماج کے ہر طبقے نے اس نئے غارت گر کے ہاتھوں سختی جھیلی۔ زمینداروں کو ان کی زمین سے بے دخل کر دیا گیا اور کسان کو نکال ہو گئے۔ تاجروں کے شہری متوسط طبقے کا بحیثیت ایک آزاد جماعت کے نام و نشان مٹ گیا۔ اہل صنعت و حرفت اپنے تخلیقی پیشوں سے محروم ہو گئے۔ ملک کے معاشی نظام اور اس کے ہر طبقے کی بے مثال تباہی کا قدرتی نتیجہ ایک عظیم سماجی انقلاب کی صورت میں رونما ہوا اور یہ ۱۸۵۷ء کی قومی بغاوت تھی۔ برطانیہ کی سراسر تباہ کن پالیسی نے اس کی حکومت کے خلاف ایک وسیع عوامی بغاوت پیدا کی۔

البتہ ہندوستانی سماج کے اندر ان تخلیقی قوتوں اور طبقوں نے ابھی نشوونما نہیں پائی تھی اور حقیقت برطانیہ کی ابتدائی پالیسی نے ان کی پہلی کونپلیس ہی تباہ کر دی تھیں (جو اس انقلاب کی فتح کے موجب ہوئے) ۱۸۵۷ء کی بغاوت اور اس کی ناکامی تاریخی طور پر دونوں ناگزیر واقعات تھے لیکن یہ بھی تاریخ کا ایک تقاضا تھا جس کے بعد نئے حالات رونما ہوئے (ان کا ہم بعد میں تجزیہ کریں گے) جن سے ہندوستانیوں کی جدید قومی تحریک آزادی پیدا ہوئی اور وہ نئی سماجی قوتیں ابھریں جو اس کی فتح کی موجب ہوئیں۔

بولتا تھا۔ اس مسئلے کی کئی برسوں تک پوری پوری چھان بین جاری رہی۔ کے اعتراض کرتا ہے کہ، ”اس میں کوئی شک نہیں کہ کارٹوس کی تیاری میں گائے کی چربی استعمال کی گئی۔“ لارڈ رابرٹس کا بیان ہے: ”حکومت ہند کی دستاویزات میں مسٹر فارسٹ کی تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ کارٹوس کی تیاری میں جو چکنا کرنے والی چیز استعمال کی گئی وہ واقعی قابل اعتراض اجزاء یعنی گائے اور سور کی چربی سے مرکب تھی اور کارٹوس کی ساخت میں فوجیوں کے مذہبی تعصبات سے ایسی لاپرواہی کا اظہار کیا گیا ہے۔ نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔“ ۷۸

بقول مایسن: ”چربیل کارٹوس ایک معمولی واقعہ تھا۔ یہ تو محض ایک دیاسلانی تھی جس سے مرگ پھٹ گئی جو مدت سے تیار ہو رہی تھی۔ اور بھی زیادہ راز فاش کرنے والا چارلس بال ہے: ”دوسرا نیلی نے کارٹوس کی چربی کا معاملہ یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ کسی کو بھی یقین نہیں کہ یہ شورش کا اصلی سبب ہے یہی کارٹوس جن کے بارے میں سپاہیوں نے اعلان کیا تھا کہ ان کے استعمال سے ان کی ذات مٹ جاتی ہے ہمارے خلاف لڑتے ہوئے انھوں نے بے تکلفی کے ساتھ استعمال کرنے میں کوئی تاہل نہ کیا۔“ ۷۹

یہ شک کہ برطانوی سرکار ہندوستانی لوگوں کو عیسائی بنانے پر تلی ہوئی ہے دور دور تک پھیل گیا۔ ہم ایک ہم عصر مسلمان مجتہد کے بیان کا حوالہ دیتے ہیں: ”انھوں نے طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے کام لے کر مختلف مذاہب (سوائے عیسائیت کے) کو نیست و نابود کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا اور انتہائی کوشش کی۔ انھوں نے قصوں اور ٹہروں میں در سے قائم کیے تاکہ بچوں اور ان پر مہ بالوں کو اپنے دین اور اپنی زبان کی کتابیں پڑھائیں۔ انھوں نے علم و ادب کے مراکز اور مدرسے اور پانٹھ شالائیں جو قدیم زمانے میں قائم کی گئی تھیں صفحہ ہستی سے مٹا دیں۔“ ۸۰

ہندوستانیوں کے شکوک کلیتہً جائز تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹرز کے چیرمین مسٹر مینگل نے ۱۸۵۷ء میں پارلیمنٹ کے (House of Commons) میں کہا: ”خدا نے انگلستان کو ہندوستان کی وسیع سلطنت عطا کی ہے تاکہ ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے تک سچی جھنڈا فافانہ انداز میں لہرائے۔ ہر ایک کو ایڑی چوٹی کا زور لگانا چاہیے تاکہ ہندوستان کو عیسائی بنانے کے شاندار کام کو جاری رکھیں کسی بھی وجہ سے لیت و لعل نہ ہو۔“ ۸۱

ان شہادتوں سے ظاہر ہے کہ عیسائی مبلغوں کی سرگرمیوں میں تشویشناک اضافہ ہوا۔ لندن سے مذکورہ بالا ہدایت کے ساتھ برطانوی مشنریوں نے ہندوستان میں جس جوش سے کام کیا اس کو رپورٹرز کینڈی نے صاف صاف بیان کیا ہے: ”خواہ کیسی ہی مصیبتیں ہم پر نازل ہوں جب تک

یہ کہنا بالکل صحیح نہیں کہ جو بری بری اصلاحات نافذ کی گئیں مثلاً سستی کی رسم کا انسداد بیوہ کی دوبارہ شادی وغیرہ ان کے لیے انگریز حکمرانوں نے ضرورت تھی خود ہندوستانی مصلحین شروع کر چکے تھے۔

انیسویں صدی کے آغاز تک برطانوی حکمران اس قدر مغرور اور اقتدار کے نشے سے مدہوش ہو گئے تھے کہ حکومت کے ضابطوں میں جان بوجھ کر ہندوستانی رسوم کو نظر انداز کرتے اور حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیتے۔ ہندوستانی عوام اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ سب کچھ انھیں آہستہ آہستہ عیسائی بنانے کا منصوبہ ہے۔ مثال کے طور پر جیلوں میں مشترک کھانا۔ زیادہ سنگین ایکٹ نمبر ۲۱۵ء تھا جس کی رو سے مذہب بدلنے والے اپنی آبائی جائیداد کے وارث بن سکتے تھے۔ اس رد عمل کو جو اس قانون سے پیدا ہوا اور جس طرح اس قانون نے ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا کام آسان کر دیا اس کو سرسید احمد خاں نے یوں بیان کیا ہے :

"قانون ساز مجلس اس الزام سے بری نہیں ہے کہ اس نے مذہبی معاملات میں مداخلت کی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے قانون نمبر ۳۱ سے دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو یقیناً نقصان پہنچتا ہے۔ عام خیال ہے کہ یہ قانون اس مقصد سے پاس کیا گیا تھا کہ لوگوں کو بہکا کر عیسائی بنایا جائے۔ ہندو مذہب جیسا کہ معلوم ہے، دوسرے مذاہب والوں کو ہندومت قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتا اس لیے اس قانون سے ہندوؤں کو کوئی فائدہ پہنچا۔ اگر کوئی آدمی اسلام قبول کرتا ہے تو وہ اپنے دین کی شرع کی رو سے اس جائیداد کی وراثت سے محروم ہو جاتا ہے جو دوسرے مذاہب والا اس کے لیے چھوڑ مرے۔ اس لیے اس قانون سے کوئی نو مسلم بھی فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ البتہ اس سے ایسے آدمیوں کو بڑے فائدے پہنچتے جو عیسائی بنتے۔ اس لیے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ قانون صرف لوگوں کے مذاہب میں مداخلت کرتا ہے بلکہ تبدیلی مذہب کی زبردست ترغیب دیتا ہے۔" ۷۹

قدیم روایات میں یہ مداخلت فوجیوں پر بھی اثر انداز ہوئی۔ ذات پات کی نشانیوں کے استمال کی ممانعت کر دی گئی۔ انھیں سمندر پار کرنے اور غیر ممالک میں جا کر برطانیہ کی جنگوں میں لڑنے پر مجبور کیا گیا اور سب سے زیادہ خطرناک چربلی دار کار تو سوں کا استعمال تھا۔ برطانوی سپہ سالاروں اور سیاستدانوں نے اس بات سے غصے کے ساتھ انکار کیا کہ گائے یا سور کی چربی استعمال کی گئی ہے جس پر ہندوؤں اور مسلمانوں کو اعتراض ہے۔ بعد میں یہ ثابت ہو گیا کہ انھوں نے جان بوجھ کر جھوٹ

آگیا ہے کہ ملک میں صرف ایک ہی دین ہو اس لیے مناسب ہے کہ ہم سب عیسائی بن جائیں: یہ کہنے میں کوئی بالذمہ نہیں کہ اس گشتی خط کے پہنچنے پر تمام لوگوں کی آنکھوں میں خوف سے اندھیرا چھا گیا اور آخر ایسا نظراً تھا گویا ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ہے۔ وہ چلا کر کہنے لگے کہ وہ گھڑی جس کا مدت سے ڈر تھا آپہنچی۔ سب سے پہلے سرکاری ملازموں کو عیسائی بنانے کا منصوبہ تھا اور اس کے بعد عوام کو۔ کہتے ہیں کہ یہ خط سرکار کے حکم سے لکھا گیا لیکن جلد ہی بنگال کے لیفٹیننٹ گورنر نے اس کے بارے میں سنا تو اس نے ایک اعلان جاری کیا جس سے لوگوں کے دلوں کو تسکین ہوئی اور کچھ وقت کے لیے شکوک دب گئے تاہم یہ عارضی تسکین تھی۔ لوگوں کا اب بھی یہ خیال تھا کہ حکومت نے یہ سارے منصوبے عارضی طور پر ترک کیے ہیں اور جوں ہی حالت سنبھلی ان کو از سر نو شروع کر دے گی۔ ۸۵

انگریزی تعلیم کے اجرا کا سبب بھی ہندوستان میں یورپی سائنس کو رائج کرنے اور روشِ خیال طبعیہ کے نیک خواہش تھی بلکہ اس کا سیدھا تعلق انگریزی تعلیم کے حایوں میں نئے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کے مقصد کے ساتھ تھا۔ مثال کے طور پر ۱۲ اکتوبر ۱۸۲۶ء کو میکالے نے اپنی ماں کے نام ایک خط میں لکھا: ”یہ میرا پختہ یقین ہے کہ اگر ہماری تعلیم کے منصوبے پر عمل کیا جائے تو بنگال میں تیس سال کے بعد ایک بھی بت پرست نہ رہے گا۔“ ۸۶

ڈاکٹر آر۔ سی۔ موزمدار کا بیان ہے: ”تینوں پریذیڈنسیوں کی اعلیٰ ترین عدالتوں نے یہ حکم جاری کیا کہ نوجوان نا تجربہ کار مذہب بدلنے والے ہندوؤں کو بجائے ان کے والدین کے زیر سرپرستی رکھنے کے ان کی مرضی کے خلاف مع بیویوں کے جبراً انھیں مشنریوں کے حوالے کر دیا جائے۔ ایک موقع پر لوگوں نے عدالت کا محاصرہ کر لیا اور اس جج کو ہلاک کر کے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جس نے ایسا فیصلہ صادر کیا اور صورتِ حال پر قابو پانے کے لیے فوج کو بلانا پڑا۔ اس واقعے پر رائے زنی کرتے ہوئے ایک ہندوستانی نے ۳۱ اپریل ۱۸۵۷ء کو ”دی ہندو پریٹ“ (The Hindu Patriot) کے نام اس مضمون کا ایک خط لکھا کہ ایسا واقعہ، نہ کہ ملکی پریس کی پھیلائی ہوئی دس ہزار افواہیں ساری قوم کو اپنے حکمرانوں سے منحرف کرنے کو کافی ہے۔“ ۸۷

اس لیے یہ بخوبی واضح ہے کہ برطانوی حکمران محض شہنشاہیت پسندانہ مقاصد کی خاطر ۱۸۵۷ء سے برسوں پہلے سے عوام کو بڑے پیمانے پر عیسائی بنا کر ہندوستان کے قومی تمدن کو مٹانے پر متلے ہوئے تھے۔ ہندوستانی عوام نے بھی اور ہندو مسلمان فوجیوں نے بھی سر پر منڈلاتے ہوئے اس خطرے کو بلا لحاظ کسی نقطہ نظر کے نبھانپ لیا۔ خواہ یہ سرسید احمد خاں ہوں یا بہادر شاہ، خواہ کلکتے

ہندوستان میں ہماری سلطنت قائم ہے ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہمارا سب سے بڑا کام ملک میں عیسائیت کی اشاعت ہے۔ جب تک کنیا کمار سے ہالیہ تک سارا ہندوستان دین عیسوی قبول نہ کرے اور جب تک ہندومت اور اسلام کو رد نہ کر دے ہماری کوششیں استقلال کے ساتھ جاری رہنا چاہیے۔ ۸۲

اس مخالفانہ روش اور اس کے سبب فریجی مشنریوں کی مخرب اخلاق اور مخرب قومیت سرگرمیوں سے جو ہندوستانی رد عمل پیدا ہوا اس کا رپورٹنگینڈی خود جائزہ لیتا ہے اگرچہ اس نے جو کچھ خود سنا اور لکھا اس کی اہمیت کو نہیں سمجھا: "میرا ایک آشنا مولوی جس کی نظر ہر میرے ساتھ گہری دوستی تھی بستر مرگ پر پڑا تھا۔ اس وقت میں اس کے ساتھ تھا میں نے پوچھا: مرنے سے پہلے تمہاری آخری خواہش کیا ہے؟" اس سوال پر وہ بہت مایوس اور غمگین نظر آیا، بولا: "یقین جانیں، میں کھتا ہوں کہ مجھے انیسویں ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں دو فریگیوں کو بھی قتل نہ کیا۔ ایک اور موقع پر ایک معزز اور عالم ہندو نے دلیری کے ساتھ کہا "ہم چاہتے ہیں کہ تم یہاں سے چلے جاؤ اور ہماری قومی حکومت قائم ہو جائے تاکہ ہم اپنے آباؤ اجداد کی رسوم کو جاری رکھ سکیں۔ ۸۳

کی حمایت بھی حاصل تھی۔ سید احمد کا بیان ہے: "بعض ضلعوں میں مشنریوں کے ساتھ تھانے کے سپاہی شامل ہو جاتے اس صورت میں مشنری صرف اپنی کتابوں کی تعلیمات کی وضاحت پر ہی قناعت نہ کرتے بلکہ دوسرے مذاہب کے پیروؤں اور مقدس مقامات پر دل آزار اور غیر موزوں زبان میں حملے کرتے اور سننے والوں کے جذبات کو اس قدر مشتعل اور مجروح کرتے کہ یہاں نہیں ہو سکتا۔ اس طرح لوگوں کے دلوں کی گہرائی میں بے اطمینانی کے بیج بھی بونے گئے۔ ۸۴

لارڈ کیننگ کی تبلیغی سرگرمیوں کی سرپرستی اور ان کے فنڈ میں کثیر رقموں کے چندے عام طور سے مشہور تھے اور دور دور تک ان کا چرچا تھا۔ سب سے زیادہ بدنام مسٹر ایڈمنڈ کے خط کی مشہور داستان ہے۔ اس کے بارے میں سید احمد خاں کا بیان ہے:

"جب یہ تمام ہیزاریاں انتہا کو پہنچ چکی تھیں ۱۸۵۷ء میں مسٹر ایڈمنڈ کا ایک خطا چانک شایع ہوا جو علی الاعلان کلکتے سے شائع کیا گیا۔ اس کی نقل حکومت کے تمام بڑے بڑے افسروں کو بھیجی گئی۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ 'اب تمام ہندوستان ایک حکومت کے تحت ہے۔ نیل گراف نے ملک کے تمام حصوں کو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ملا دیا ہے گویا ایک ہو گئے ہیں۔ ریلوے نے ان کو ایک دوسرے کے اس قدر قریب کر دیا ہے کہ گویا تمام قصبات ایک ہو گئے ہیں۔ اب وقت

۱۸۵۶ء میں اس کا حسب ذیل تجربہ شائع ہوا:
 اے شہر و شہار کا! (دشمن کو نیست و نابود کرنے والی دیوی کا نام)
 بہتان تراشوں کا منہ بند کر دے
 چغل خوروں کو ہرپ کر جا اور پاپیوں کا ناش کر دے
 اے مات چندری! انگریزوں کو ہلاک کر دے، ان کا ستیاناس کر دے
 دشمنوں کو بچ کر نہ جانے دے، تاہی ان ظالموں کے
 بیوی بچوں کو! اے شہار کا!
 شکر پر کر پا کر۔ اپنے بندوں کی مدد کر!
 دھرم کی پکار سن!
 اوستھا لکا! بھرشٹوں کو کھا جا
 دیر نہ کر

ابھی ان کو بھگل جا

اور جلدی سے

لے گھور متھا لکا!

دہلی کے محاصرے کے دوران انگریز ایجنٹوں نے بازار کو شش کی کہ ہندو مسلم متحدہ جہاد
 کو ہندو مسلم خانہ جنگی میں بدل دیں تاکہ بھائی بھائی کی جان لے لے ۱۸۵۷ء کے ماہ مئی میں انگریز ایجنٹوں
 نے جہاد کے نام پر ہندوؤں کے خلاف مسلمانوں کے کان بھرنے شروع کر دیے اور اس معاملے کو
 بہادر شاہ کے رو برو پیش کیا گیا۔ "بادشاہ نے جواب دیا ایسا جہاد ناممکن ہے اور ایسا خیال انتہائی
 بیہودگی ہے کیوں کہ پورے سپاہیوں میں اکثریت ہندوؤں کی ہے اس کے علاوہ ایسے فصل سے
 خانہ جنگی پیدا ہوگی اور نتیجہ افسوسناک ہوگا۔ مناسب یہ ہے کہ تمام طبقات میں باہمی ہمدردی موجود
 ہو، ہندو افسروں کا ایک وفد شکایت کرنے کے لیے پہنچ گیا کہ ہندوؤں کے خلاف جہاد کی تلقین
 کی جا رہی ہے۔ بادشاہ نے جواب دیا: جہاد انگریزوں کے خلاف ہے، میں نے ہندوؤں کے خلاف
 اس کی ممانعت کر دی ہے۔" 4.

اس طرح ہمارے باغی آباد اجداد نے غیر ملکی غلبہ کے خلاف ایک متحدہ انقلابی جدوجہد کو منظرِ
 اور جاری رکھنے کے لیے مذہب سے کام لیا۔ ۱۸۵۷ء کے تاریخی حالات میں اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ

کاروتن خیال بنگالی یا بھجور کا نانا صاحب۔ چنانچہ اگر ۱۸۵۷ء کی جدوجہد میں مذہبی پہلو کو بڑا دخل تھا تو یہ قوم پرستی کا ایک جز تھا۔ ہندوستانی عوام نے اپنے مذاہب کی حفاظت کے لیے تھیاً اٹھائے اور وہ نہ صرف اپنے مذہب کے تحفظ بلکہ اپنی طرز زندگی اور قومیت کو بچانے کے لیے بھی لڑ رہے تھے۔ البتہ ہندوستانی سماج میں کئی رجعت پسندانہ خصوصیات بھی تھیں لیکن ان کو بدلنے کا صحیح طریقہ صرف یہ تھا کہ ہندوستانی لوگ خود اس کی کوشش کریں۔

صرف اسی پرہیز نہیں۔ ہمارے باغی بزرگوں نے انقلابی جدوجہد کو بڑھانے کے لیے مذہب سے کام لیا۔ مذہب کے سبب انھوں نے اپنے اوسان خطا نہ ہونے دیے بلکہ انھوں نے فرنگیوں کے ساتھ لڑنے کے لیے مذہب سے تقویت حاصل کی۔

پہلی میں شاہی اجازت کے ساتھ ایک اعلان جاری کیا گیا جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو اکسایا گیا کہ وہ اپنے مذہب کے نام پر متحد ہو کر جہاد کریں "اس وقت دہلی اور میرٹھ میں موجود فوجی افسر تمام ہندوؤں اور مسلمانوں، ہندوستان کے شہریوں اور غاموں کو سلام دعا بھیجتے ہیں: سبھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان دنوں تمام انگریزوں نے یہ مذہب منسوب باندھے ہیں کہ پہلے تمام ہندوستانی فوج کے مذہب کو مٹایا جائے اور پھر لوگوں کو جبراً عیسائی بنایا جائے۔ اس لیے ہم اپنے مذہب کی خاطر متحد ہو گئے ہیں اور ہم نے ایک کبھی کا فرزندہ نہیں چھوڑا۔ اسی لیے ہم نے دہلی کے شاہی خاندان کی حکومت کو از سر نو قائم کر دیا ہے۔ ایک بہت بڑا خزانہ اور سیکڑوں ہندو قیدی ہمارے ہاتھ لگی ہیں۔ اس لیے مناسب ہے کہ جو فوجی اور جو لوگ عیسائی بننا پسند نہیں کرتے وہ متحد ہو جائیں اور جرأت سے کام لیتے ہوئے ان کافروں کا خاتمہ کر دیں۔" ۸۸

لکھنؤ کی شکست کے بعد جب اودھ میں جدوجہد ماند پڑ گئی اور باغی مدافعت میں جنگ کر رہے تھے اور اکثر لڑائیوں میں ہار رہے تھے تو انگریز گرفتار شدہ سپاہیوں سے پوچھتے تھے: "تم بغاوت میں کیوں شامل ہوئے؟" ان کا جواب یہ ہوتا تھا: "ہمارے مذہب کا تقاضا ہے کہ انگریزوں کو قتل کیا جائے۔ اس کا انجام انگریزوں اور تمام سپاہیوں کی تباہی ہوگا اور پھر اللہ اعلم!" ۸۹

گوند قبائل کا راجہ انگریزوں کے وظیفہ خوار کی حیثیت سے ناگپور میں رہتا تھا۔ اس نے ایک روایتی سنسکرت ستوترا کو جو دیوی کی پوجا میں گایا جاتا ہے انگریزوں کے خلاف ایک بھجن میں بدل دیا تھا۔ "دی لندن ٹائمز" (The London Times) مورخہ ۱۳ اکتوبر

”سپاہی کا کردار خواہ کتنا ہی ذلیل ہو، یہ انگلستان کے ہندوستان میں اپنے ہی کردار کا گھناؤنا عکس ہے۔ نہ صرف سلطنتِ شرقی کے قیام کے دور میں بلکہ مدت کی مستحکم حکومت کے دوران میں بھی۔“

”چونکہ جیمز کی مانند دہلی آمدنی کے سخت جھونکوں کے سامنے سرنگوں نہیں ہوا اس لیے جان بُل کو انتقام کے نعرے بلند کرنے پڑے تاکہ وہ یہ بھول جائے کہ اس کی اپنی سرکار ہی اس فقر پر لڑائی کے لیے ذمہ دار ہے جس کو اس حد تک بڑھے دیا گیا۔“ ۹۱

اس مقالے کے ابتدائی حصوں میں انگریزوں کے خلاف اس شدید نفرت کا کچھ تصویر پیش کیا گیا ہے جو سو سالہ حکومت کے دوران انگریزوں نے اپنی بد اعمالیوں سے ہندوستانیوں میں پیدا کی۔ وہ نفرت ۱۸۵۷ء کی جدوجہد میں پھوٹ پڑی۔ مسز کوپ لینڈ کی لکھی ہوئی ایک داستان میں اس جذبے کو ہندوستان کے دیہاتی محاورے میں بیان کیا گیا ہے جس نے باغی سپاہیوں میں ایک نئی روح جھونکی۔ ”ایک افسر نے جو قیدیوں کے مقدمات کی سماعت کر رہا تھا ایک سپاہی سے پوچھا: ”تم عورتوں اور بچوں کو کیوں قتل کرتے ہو؟“ اس آدمی نے جواب دیا: ”جب تم کسی سانپ کو ہلاک کرتے ہو تو اس کے بچوں کو بھی مار ڈالتے ہو۔“ ۹۲

باغیوں کے ماہنامہ عورتوں اور بچوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کو پسند نہیں کرتے تھے اور مجموعی طور پر وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے۔

خیر آباد کے علاوہ فضل حق جنگ سے متعلق اپنے ”رسالہ“ میں بیان کرتے ہیں ”باغی سپاہیوں میں ایسے بھی لوگ تھے جنہوں نے شرمناک حرکتیں کیں اور حد سے بڑھ کر زیادتیاں کیں اور مظالم ڈھاتے، بچوں اور عورتوں کو بھی قتل کیا۔ انہوں نے عورتوں کو قتل کر کے ذلت اور رسوائی پائی اور بچوں کو ہلاک کر کے وہ بدنام اور خوار ہوئے۔“ ۹۳

اودھ میں بغاوت سب سے زیادہ پھیلی اور کمال عروج کو پہنچی۔ برطانوی مورخ فارسٹ لوگوں کی انسان دوستی اور ضبطِ نفس کی یوں داد دیتا ہے: ”فوجیوں نے غدر کیا اور لوگوں نے وفاداری ترک کی لیکن انتقام کسی نے نہیں لیا اور نہ ہی ظلم و ستم کیا گیا۔ بہادر اور مضطرب آبادی نے حکمران طبقے کے پناہ گزینوں کے ساتھ (سوائے چند مثالوں کے) بے حد مہربانی کا سلوک کیا۔ اودھ کے جاگیرداروں نے اپنے بد بخت آباء کے ساتھ برتاؤ میں بڑی خوش خلقی اور جوانمردی سے

جدوجہد کی نظریاتی صورت مذہبی رنگ اختیار کرے کسی اور چیز کی توقع رکھنا مصلحت کے منافی اور غیر معقول ہوتا۔

۴۔ شہنشاہیت پرستوں کی دہشت انگیزی

تاریخ ہندوستان پر انگریزوں کی درسی کتابوں میں صرف ”باغیوں کے مظالم“ کی داستان بیان کی گئی ہے عورتوں کی بے حرستی، بچوں کا قتل وغیرہ۔ لیکن حقیقت بالکل اس کے برعکس تھی سادہ کرا اور دوسرے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی ابتدائی پشت نے خود برطانوی ماخذوں سے ہندوستانی لوگوں پر انگریزوں کے بے شال مظالم کی داستان فاش کرنی شروع کر دی۔ ۱۹۲۰-۲۹ء کی تحریک عدم تعاون کے دوران ۱۹۵۰ء کے برطانوی دہشت انگیزی کو جلیانوالہ باغ کے ساتھ مربوط کیا گیا تاکہ لوگ بیدار ہو کر ۱۹۵۰ء کے ہمارے آباؤ اجداد کی نسبت زیادہ بہادری اور اتحاد کے ساتھ جدوجہد کریں۔ اس کے بعد ایڈورڈ تھاچرسن کی تصنیف ”دی اور سائیڈ آف دی میڈل“ (The other side of the medal) شائع ہوئی جس میں یہ نظریہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی کہ مظالم دونوں طرف سے ڈھائے گئے جنہیں بھول جانا ہی بہتر ہے

سب سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ کیا طرفین کو ایک ہی سطح پر رکھا جاسکتا ہے۔ کیا لوگوں کو غلام بنانے والوں کے جرائم کو مجاہدین آزادی کی غلطیوں اور زیادتیوں کے برابر سمجھا جاسکتا ہے؟ دونوں معاملے مختلف ہیں۔

برطانوی اخبارات ہندوستانیوں کی وحشیانہ خباثتوں اور مظالم کی داستانوں سے بھرے پڑے تھے اور یہ اس ہم کا جزو تھیں جو ہندوستان میں زیادہ سے زیادہ برطانوی فوجی بھیجنے، اسباب بغاوت پر سنجیدہ بحث کو روکنے اور ہندوستانی مسئلے کے مناسب حل کو ڈھونڈنے کے لیے شروع کی گئی۔ اس نامعقول فضا میں مارکس نے اس مسئلے کو صحیح تاریخی رنگ میں پیش کیا۔

”انسان کی تاریخ میں مکافات بھی کوئی چیز ہے اور تاریخی مکافات کا یہ قاعدہ ہے کہ اس کا آلہ کار خود جابر کی طرف سے میسر آتا ہے۔ مذکورہ ظلم کی طرف سے پہلی چوٹ جو فرانس کی شاہی حکومت پر پڑی وہ امراکا طرف سے تھی۔ مذکورہ دہشتوں کی طرف سے۔ ہندوستانی بغاوت کا شکار وہ کی طرف سے شروع نہیں ہوئی جنہیں انگریزوں نے شدید اذیت دی اور ننگا کر کے رکھ دیا بلکہ ان سپاہیوں کی طرف سے جن کو لمبوس کیا گیا، کھلایا گیا، بے تحشہ کیا گیا، موتا تازہ کیا گیا اور لاڈ سے بگاڑا گیا۔

جس کی وجہ سے دہلی میں عورتوں اور بچوں کے قاتلوں کی زندہ چمڑی ادھیرٹے، جسم میں میخیں ٹھونک کر ہلاک کرنے اور آگ کی نذر کرنے کا اہتمام ہو۔ ایسے مظالم ڈھانے والوں کو صرف پھانسی دینا دیوانگی ہے۔ کاش! میں دیتا کے اس حصے میں ہوتا اور حسب ضرورت قانون کو اپنے ہاتھ میں لیتا۔ فوجی عدالت کے قوانین اور قواعد و ضوابط کو بھی نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ جب افسر فوجی عدالت کی کارروائی میں شرکت کے لیے جاتے تو وہ سوگند کھاتے کہ وہ قیدیوں کو پھانسی دیں گے خواہ وہ قصور وار ہوں یا بے قصور۔ اگر کوئی شخص اس اندھا دھند انتقام کے خلاف دم مارنے کی جرأت کرتا تو اس کے غضب ناک ساتھی فوراً واویلا مچا کر اسے خاموش کر دیتے۔ جن اشخاص کو سرسری عدالت کے بعد موت کی سزا دی جاتی پھانسی سے پہلے جاہل پرائیوٹ (فوجی) ان کی منسی اڑاتے اور ان کو اذیت دیتے جب کہ تعلیم یافتہ افسر دیکھتے رہتے اور اظہار تحسین کرتے۔ ۹۹

دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں نے جو کچھ کیا ایک مصیبت زدہ باغی راہنہ نے اپنے بیان میں اس کی یوں تصویر کھینچی ہے :

”پھر عیسائیوں نے اعلیٰ عہدیداروں اور عیسوں کو قتل کیا جو گرد و نواح اور بستیوں میں رہتے تھے۔ پھر انھوں نے ان کی آراضی، جائداد، مکانات، محلات، مال و دولت، اسلحہ اور سامان، گھوڑے اور ہاتھی اور اونٹ اور اونٹیاں، سب کچھ ضبط کر لیا۔ تب انھیں مع اہل و عیال و اطفال ہلاک کر دیا۔ اگرچہ وہ ان کی رعایا بن چکے تھے اور خون اور امید کے سبب ان کی اطاعت قبول کر چکے تھے۔ پہلے انھوں نے جتنا بھی سونا چاندی قیدیوں کے قبضے میں تھا لوٹ لیا۔ پھر بے شرک چادریں کپڑے تہبند اور پانچائے بھی چھین لیے۔ اس کے بعد انھیں اپنے افسروں کے پاس بھیج دیا جنھوں نے انھیں پھانسی یا گردن زدنی سے موت کی سزا دی۔ کیا جوان، کیا بیمار، کیا شریف، کیا کمین، کوئی بھی ان ہلاکت خیزیوں سے نہ بچا۔ اس طرح ان لوگوں کی تعداد جن کے سر کاٹے گئے یا پھانسی دی گئی ہزاروں تک پہنچ گئی۔“ ۱۰۰

انگریز کے ہاتھوں دہلی کی غارت گری کے بارے میں لارڈ ایلفنٹن نے سر جان لارنس کو یوں لکھا : ”دہلی کا محاصرہ ختم ہونے کے بعد ہماری فوج نے جو ظلم و ستم ڈھایا وہ حد درجہ مگر خراش ہے دوست اور دشمن کی تمیز کے بغیر ہمہ گیر انتقام لیا جا رہا ہے۔ جہاں تک لوٹ مار کا تعلق ہے ہم نے یقیناً نادر شاہ کو بھی مات کر دیا ہے۔“ ۱۰۱ قیصر التواریخ کا مصنف لکھتا ہے کہ ”دہلی میں پھانسی پانے والوں کی تعداد ساٹھ ہزار تھی۔“ ۱۰۲

جن انگریز عورتوں کو مذہب نے کا پتہ۔ میں مقید رکھا ان کی بے حرمتی کی داستان بہت مشہور ہے۔ ۱۸۵۷ء کے سرکاری مورخین کے اور مایسن نے خود اس کا بھانڈا پھوٹا ہے۔ جو دستم کی نفاسیں ناقابل بیان خباثت جو اس وقت کے بعض رسائل کے مطابق ان کے قتل عام کے ساتھ منسوب کی گئیں وہ کسی مشعل تخیل کی من گھڑت کہانیاں تھیں جن پر بلا کسی تحقیق کے یقین کر لیا گیا اور جن کو بغیر سوچے سمجھے شہر کر دیا گیا۔ نہ تو کسی کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے اور نہ کسی کی بے حرمتی کی گئی یہاں سرکاری افسروں کا بیان ہے جنہوں نے جون اور جولائی کے قتل عام کے حالات کی انتہائی تنہی کے ساتھ چھان بین کی ہے۔ ۹۵

دہلی کے بارے میں بھی جھوٹی خبریں اڑائی گئیں مثلاً یہ کہ انگریز خواتین کو سڑکوں پر برہنہ حالت میں چلنے پر مجبور کیا گیا۔ ان کی کھلم کھلا بے حرمتی کی گئی۔ ان کی چھاتیاں کاٹ دی گئیں بلکہ کمر سن ہو کر ان کو بھی چھوڑا گیا۔ دیوہ دیوہ۔ گورے عیسائی پادری گلا پھاڑ پھاڑ کر ان کہانیوں کا ڈھنڈورا پیٹنے لگے تھے۔ محکمہ جاسوسی کے افسر اعلیٰ سر ولیم میور کی تحریری رپورٹ ہے کہ ”خواہش ہی تم رانی اور خونریزی ہوئی ہو۔ جہاں تک میرے مشاہدات اور تحقیقات کا تعلق ہے عورتوں کی بے حرمتی کی کہانیوں کا کوئی خاطر خواہ ثبوت نہیں ملا۔“ ۹۶

جہاں ہندوستانیوں کی دہشت انگیزی کے قتلے زیادہ تر فرضی تھے وہاں انگریزوں کی درندگی نے لارڈ کیننگ کو بھی پریشان کر دیا۔ ۲۴ دسمبر ۱۸۵۷ء کو گورنر جنرل کی کونسل کی کارروائی میں مذکورہ ذیل سرکاری یادداشت موجود ہے۔۔۔۔۔ صرف تمام قسم کے مجرموں کو بلا امتیاز پھانسیا دی گئیں بلکہ ان کو بھی جن کے جرائم نہایت مشکوک تھے۔ دیہات کی لوٹ اور آتش زنی کے عام واقعات۔ ونا ہوئے جس کے سبب گناہ گار اور بے گناہ دونوں نے بلا لحاظ عمر و جنس اندھا دھند سزا پائی اور بعض حالتوں میں جان بھی گنوائی۔ اس سے وہ بڑے بڑے فرقتے بھی بگڑ گئے جو پہلے حکومت کے مخالف تھے۔ کھیتی باڑی موقوف ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قحط کا خطرہ سر پر منڈلانے لگا۔ آخر کار سرکاری افسروں کی کارروائیاں اس افواہ کا موجب ہوئیں کہ حکومت ہندوؤں اور مسلمانوں کے قتل عام کا منصوبہ باندھ رہی ہے۔ ۹۷

۱۸۵۷ء کے دوران نازیلوں کی سی جو ذہنیت برطانوی حلقوں میں پھیلی ہوئی تھی اُسے ”فدر کے سورا۔“ جنرل نکلسن کے الفاظ میں نہایت خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اپنے ایک دوست یڈورڈس کو جس نے اس دور میں شہرت حاصل کی اس نے لکھا: ایک ایسا قانون تجویز ہونا چاہیے

کیا ہے۔ آم کے درخت سولی کا کام دیتے تھے اور ابھی تختہ دار کا۔ اس جنگل کے انصاف کے شکار ہندسہ 8 کی شکل میں پھانسی کی رسی سے لٹکتے رہ جاتے گویا دل لگی کا سامان ہیں : ۱۶۔

انگریزوں کے مظالم اس حد تک پہنچ گئے کہ برطانیہ کی قومی زندگی میں حریت پسند عناصر کو خود برطانیہ کے خاص شہری حقوق کی فکر پڑ گئی۔ سر چارلس ڈکن نے "گریٹر برٹین" (Greater Britain) میں لکھا: "جو لوگ اس حقیقت پر شک کرتے ہیں کہ ہندوستانی فوجی ملازمت فوجیوں کو انسانی زندگیوں سے لاپرواہ، جائداد کے حقوق سے غافل اور انسانی شان کو خاک میں ملانے والے بنادیتی ہے، ان کو شاید وہ خطوط یاد نہیں جو انھیں ۱۸۵۷ء میں پہنچے۔ ایسے ایک خط میں ایک اعلیٰ فوجی افسر نے کانپور پر چڑھائی کے دوران یہ اطلاع بھیجی: "آج خوب شکار ہاتھ آیا۔ باغیوں کی صفائی کر دی" اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ جن نام نہاد باغیوں کو پھانسی دی گئی یا توپوں سے اڑا لیا انھوں نے ہتھیار نہیں اٹھائے تھے بلکہ دیہاتیوں کو شک میں پکڑ لیا گیا تھا۔ اس فوج کشی کے دوران دیہات کو نذرِ آتش اور بیگناہوں کا قتل عام کرتے وقت ایسے مظالم ڈھائے گئے جن پر خود محمد متعلق بھی شرمسار ہوتا۔ یہ کہنا کہ ایسے شرمناک اعمال کا سلسلہ ہماری گھریلو آزادیوں کے حق میں زیرِ قائل ثابت نہ ہوگا، تاریخ کو جھٹلانا ہے ۱۷۔

پنڈت نہرو نے نسلی برتری کے خطہ کے مسئلے کو صحیح رنگ میں پیش کیا ہے۔ کیوں کہ ہمارے باغی آباد اجداد کو کبھی اس سے سابقہ پڑا اور بعد میں ہم بھی اپنی آزادی کی جدوجہد کے تمام عرصے میں اس سے دوچار رہے: "ہم ہندوستانی برطانوی حکومت کے آغاز سے ہی نسلی امتیاز کی تمام صورتوں سے آشنا ہیں۔ اس حکومت کا تمام تر نظریہ بیرن واک اور آقائی نسل کا تصور تھا اور اسی پر حکومت کی بنیاد تھی۔ درحقیقت آقائی نسل کا تصور شہنشاہیت پرستی کی جلالت میں پایا جاتا ہے۔ اس پر مکرو فریب کا کوئی پردہ نہیں تھا بلکہ حکمرانوں نے اس کا واضح زبان میں اعلان کیا۔ زبان کی نسبت ان کے عمل میں اس کا شدید تر اظہار تھا۔ نسل پرست اور سال بہ سال ہندوستان کے ساتھ بحیثیت ایک قوم کے اور ہندوستانیوں کے ساتھ بطور افراد کے توہین، تذلیل اور حقارت کا سلوک روا رکھا گیا۔ ۱۸۔

ہندوستان میں بعض بلند رتبہ سیاست دان اور مورخ ایسے بھی ہیں جو ماضی کو بھول جانے کی تلقین کرتے ہیں اور یہ تاکید بھی کہ صد سالہ یادگار کے دوران ہمیں ان مظالم کا ذکر نہیں چھیڑنا چاہیے۔ اس کا مطلب نہ صرف تاریخ سے آنکھیں موڑنا ہے بلکہ خود اپنی تاریخ اور تجربے سے

جو کچھ دہلی میں ہوا اس کو ایک درہم عصا انگریزوں نے بیان کیا ہے: "میں نے دہلی کی گلیوں میں چلنا پھرنا ترک کر دیا ہے کیوں کہ کبھی جب ایک افسر اور میں خود بیس جوانوں کے ایک دستہ کو گشت کے لیے باہر لے گئے تو ہم نے چودہ مردہ عورتوں کو دیکھا۔ ان کے شوہروں نے ان کے گلے کاٹ دیے تھے اور انھیں شالوں میں لپیٹ کر لٹا دیا تھا۔ ہم نے وہاں ایک آدمی کو پکڑا جس نے ہمیں بتایا کہ ان عورتوں کو اس در سے قتل کیا گیا ہے کہ کہیں یہ انگریزوں کے جنگیں میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ پھر اس نے ان کے خاوندوں کی ششیں ہمیں دکھائیں جنھوں نے نیک ترین کام کیا اور بعد میں خودکشی کر لی۔" ۱۴

دہلی ہسٹری آف دی سیج آف دہلی (The History of the Siege of Delhi) میں جو ایک افسر کی تصنیف ہے جس نے محاذ جنگ پر خدمت انجام دی تھی، تفصیل کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ انگریز افسروں نے انبالہ سے دہلی آتے ہوئے راستے میں کیا کچھ کیا: "قلیل مدت میں سیکڑوں ہندوستانیوں کو فوجی عدالت کے روبرو پھانسی کی سزا دی گئی۔ جب ان کے لیے پھانسی کی چنائیں نصب کی جا رہی تھیں تو انھیں انتہائی وحشیانہ اور ظالمانہ طریقوں سے اذیت دی گئی۔ ان کے سروں سے بالوں کے گتھے گتھے نوچے گئے۔ ان کے جسموں کو سنگینوں سے چمیدا گیا۔ پھر ان کو ایسا کام کرنے پر مجبور کیا گیا جس سے بچنے کے لیے وہ موت یا اذیت کی کوئی وقعت نہ سمجھتے تھے۔ غریب اور مسکین ہندو دیہاتیوں کے منہ میں برچھیلوں اور سنگینوں کے ساتھ گائے کا گوشت ٹھونس دیا گیا۔" ۱۵

لکھنؤ پر قبضہ کرنے کے بعد انگریز فاتحین نے کس طرح فوجی اور غیر فوجی قصور وار اور بے قصور کو یکساں ذبح کیا ان میں سے ایک نے اسے یوں بیان کیا ہے: "لکھنؤ پر قبضہ کرنے کے وقت — اندھا دھند قتل عام کا سماں — کسی قسم کی تمیز و رعا نہ رکھی گئی۔ جو بد بخت ہماری فوج کے ہاتھ لگ جاتا اس کا کام تمام کر دیا جاتا۔ کوئی سپاہی ہو یا اودھ کا دیہاتی اس میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔ اس سے کوئی سوال پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔ اگر اس کی چوڑی کالی ہوتی تو پھر کسی ثبوت کی ضرورت نہیں تھی۔ رتی کا ایک ٹکڑا اور درخت کی شاخ یا دماغ میں سے گزرتی ہوئی بندوق کی ایک گولی بد بخت خبیث کی زندگی کو جلد ختم کر دیتی۔" ۱۵

جو واقعات دیہات میں بنارس، الہ آباد اور کانپور کے درمیان اس علاقے پر جنرل نیل کی چڑھائی کے دوران رونما ہوئے انھیں کے اور مایسن نے مذکورہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے: "رضا کار جلا دوں کے گردہ ضلعوں میں گھومنے لگے اور اس موقع پر شوقیہ جلا دوں کی کمی نہ تھی۔ ایک بھلا مانس ڈینگ مار رہا تھا کہ اس نے ماہر فن کے انداز میں کتے ہی افراد کا کام تمام

۱۸۵۷ء کے دوران ہندوستانی جاگیرداروں کے ایک حصے کے طبقائی مفاد انگریزی حکومت کے خلاف قومی بغاوت کے ساتھ مطابقت رکھتے تھے اور انھوں نے قومی بغاوت میں سرگرم حصہ لیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان میں حقیقی معذوریات اور سخت کوتاہیاں نہیں تھیں جن کے سبب قومی بغاوت نے بڑی زک اٹھائی لیکن جو اصلی پارٹ ایک طبقے نے فوجی بغاوت میں ادا کیا اس پر نکتہ چینی کو اس پارٹ کی قدر و قیمت کے اندازے کے ساتھ غلط ملط نہیں کرنا چاہیے

یہ کہنا صحیح نہیں کہ جاگیرداروں نے کبھی بھی تاریخ میں مطلق وطن پرست کا پارٹ ادا نہیں کیا۔ ہم روسی سیاستدانوں اور مورخوں کی مصلحت پسندی کو سراہتے ہیں جب وہ ان روسی جاگیردار جرنیلوں اور رہنماؤں کے حب وطن پر فخر کرتے ہیں جنھوں نے انیسویں صدی کے آغاز میں نیپولین کے مقابلہ کیا۔ ہم پولینڈ کے لوگوں کی وطن کی آزادی کے حق میں اور اس کی تقسیم کے خلاف اس جدوجہد کی تعریف کرتے ہیں جس کی رہنمائی پولینڈ کے جاگیرداروں نے کی۔ ہم ان کے لوگوں کی اپنی مادر وطن کی آزادی اور اس کے اتحاد کے لیے بہادرانہ اور مستقل جدوجہد کی بھی تعریف کرتے ہیں جس کی رہنمائی نہ صرف میزنی اور گیری بالڈی جیسے انقلابی جمہوریت پسندوں نے کی بلکہ جس میں کونٹ کوہو اور بادشاہ پیڈمونٹ نے بھی اپنا پارٹ ادا کیا۔ ہم دوسرے ملکوں کے جاگیرداروں کی وطن پرستی کے توفائل میں لیکن اپنے ملک کے جاگیرداروں کی وطن دوستی کو تسلیم نہیں کرتے۔

صرف اس صورت میں کہ جب ہم باطنی جاگیردار رہنماؤں کے قطعی وطن پرستانہ پارٹ کا اعتراف کریں تب ہی ہم ان کی قوت و عمل اور شدید کمزوری کا تنقیدی جائزہ لے سکتے ہیں جو انھوں نے بغاوت کے اہتمام اور اس کی رہنمائی میں داخل کی۔ صرف ایسے حقیقت پسندانہ نقطہ نظر سے ہی ہم ۱۸۵۷ء کی بغاوت اور بعد کی قومی ترقی کے دوران جاگیردار محبت وطن کے پارٹ کو باقاعدہ طور پر سمجھنے کے قابل ہوں گے۔

اب ہم ایک بار پھر مثال کے طور پر اودھ کی اس تصویر کا جائزہ دیتے ہیں جو زیادہ تر ہم عصر برطانوی وقائع نگار چھوڑ گئے ہیں۔

رسل کے مندرجہ ذیل بیان سے یکم اودھ، قہقہاروں، سنہ دیہاتی مجاہدوں اور باغی سپاہیوں کے کارناموں اور ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے دوسرے دور کے اس کے باہمی تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ”خیال یہ ہے کہ فوجی سپاہیوں کی اکثریت کابھنوں کے اندر ہی ہے لیکن وہ اس خوبی کے ساتھ جنگ نہیں کریں گے جیسا کہ اودھ کے لوہے دار مزدق چلانے والے جو اپنے نوجوان بادشاہ

کچھ سیکھنے سے انکار کرنا ہے۔

۱۸۵۷ء میں ہمارے آباؤ اجداد نے سختیاں جمیلیں اور اپنا خون بہایا۔ بعد کی پشتوں نے جدوجہد کو جاری رکھا اور ضروری قربانی کرتے رہے۔ آزادی کے بعد اگر ہم اپنے ماضی کے تجربات کو بھول جائیں اور برطانوی شہنشاہیت پرستی کو بجائے اپنے قدیم دشمن کے ایک نیا دوست سمجھنے لگیں تو ہم نہ تو ہندوستان کی آزادی کے تحفظ کے قابل ہوں گے اور نہ جدوجہد میں مصروف ایشیا اور افریقہ کی نوآبادیاتی قوموں کے تئیں ہندوستان کا فرض ادا کر سکیں گے۔

۵۔ ناکامی کیوں؟

۱۸۵۷ء کی بغاوت کی ناکامی کے اسباب نے برطانوی اور ہندوستانی مورخین کو پریشان کر رکھا ہے۔ اولین برطانوی مورخین نے اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ بغاوت اس لیے ناکام ہوئی کہ باغی نہ تو اچھی طرح منظم تھے اور نہ ہی متحد۔ وہ کام کے فوجی راہنما پیدا نہ کر سکے۔ ہندوستانی مورخوں نے اس مسئلے پر زیادہ گہری نظر ڈالی ہے اور بغاوت کی ناکامی کو ہندوستانی باغی لیڈروں کی سیرت کے ساتھ وابستہ کیا ہے کیوں کہ وہ قدامت پرست اور جاگیردار تھے۔ اس وقت کے ہندوستانی راہنماؤں کی جائز شکایت تھی کہ بنا برائے بعض ہندوستانی مورخ بغاوت کی قومی خصوصیت سے ہی انکار کرنے پر مائل ہیں بلکہ نظریاتی اور غیر تاریخی زبان میں باغی راہنماؤں پر تنقید کرتے ہیں۔

ڈاکٹر مسین جنھوں نے حکومت ہند کے لیے ۱۸۵۷ء کی تازہ ترین سرکاری تاریخ لکھی ہے اور ڈاکٹر آر۔ سی۔ موزمدار جنھیں یہی کام پہلے تفویض کیا گیا تھا لیکن بعد میں انھوں نے خود اپنی کتاب تصنیف کی، دونوں کم و بیش تاکید کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ باغی راہنماؤں میں کوئی بھی حب وطن کے خالص جذبے سے متاثر نہ تھا بلکہ خود غرضی غالب تھی۔

ہم پہلے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کے آغاز میں برطانوی حکمران جن سیاسی اور معاشی پالیسیوں پر عمل کر رہے تھے وہ ایسی تھیں کہ چوٹی کے ہندوستانی حکمران سے مفلس ترین کسان اور دستکار تک ہندوستانیوں کا ہر فرقہ ان کی حکومت کا مخالف ہو گیا۔ ایسے حالات میں اگر ہندوستانی جاگیرداروں کا ایک طبقہ عوامی مسلح بغاوت میں شریک ہو گیا پس کا ہر لحاظ سے مسلمہ مقصد انگریزوں کو وطن سے نکلان تھا تو واقعی انھوں نے ایک بے غرض حب وطن کا کام کیا۔ اس سے انکار کرنا تاریخی واقعیت پسندی کو ترک کرنا ہوگا اور خالص ذاتیت کے نقطہ نظر کو اختیار کرنا ہوگا۔

کی تمام جائیداد کا واحد مالک بنا دیا لیکن شروع سے ہی اس نے ہمارے ساتھ انتہائی ندرت کا اظہار کیا ہے۔ اس قسم کی دوسری مثالوں سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ زمینداروں اور راجاؤں کی بغاوت کا سبب ہماری حکومت اور ان کا ذاتی نقصان نہیں تھا۔ ۱۱۰

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے وہ داستان کا روشن پہلو ہے۔ دربارِ اودھ میں حکومت کے معاملات کی انجام دہی اور کہانی کے تاریک پہلو کو ایک فاضل وطن دوست اور عینی شاہد، جاگیردار عالم علامہ فضل حق نے بیان کیا ہے۔ ان کا بیان بغاوت کے آخری مرحلے کی داستان ہے جب باغی ہار رہے تھے اور انگریز جیت رہے تھے۔

”نواب کی سرکار کے تمام افسر اور ریاست کے دذیر نکلتے، ڈرپوک، بزدل، امسحق اور بے ایمان تھے۔ وہ نہ تو دانشمند تھے اور نہ ہی قابلِ اعتبار۔ ان میں اُن پڑھ، آرام طلب، بدتمیز، غل غبار کرنے والے، کابل اور کمزور لوگ شامل تھے۔ ان کے علاوہ ان میں خوشامدی، فطیلی اور چالپوس بھی تھے۔ وہ اپنے عہد و پیمان توڑ دیتے اور ایمان کے عوض کفر قبول کرتے۔ وہ بگٹھے بگٹھوں کا کام کرتے۔ عیسائیوں کی پاسداری شروع کر دی، ان کے ساتھ مل گئے اور ان کی فسطح حاصل کرنے میں مدد کی۔“

مذکورہ بالا اقتباس میں صاف اور ناٹائستہ زبان میں اس اخلاقی کمزوری کا بیان ہے جو ایک جاگیردار دربار اور راہنماؤں پر غالب تھی۔ بغاوت کے دوران اودھ کے جاگیردار راہنماؤں کی کارگزاری کا جائزہ لیتے ہوئے جو تصویر سامنے آتی ہے، حسب ذیل ہے: بغاوت کے پہلے مرحلے کے دوران تعلقدار اور زمیندار چند ایک کے سوا، بغاوت میں شریک ہوئے لیکن انہوں نے مجموعی طور پر زیادہ سرگرم حصہ نہ لیا۔ وہ انتظار کر رہے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ کون سا فریق فتح پاتا ہے۔ بغاوت کا دوسرا مرحلہ لارڈ کیننگ کے مارچ ۱۸۵۷ء کے اعلان کے ساتھ شروع ہوتا ہے جس کی رو سے سوائے چھ مخصوص تعلقداروں کے سب کی زمینیں ضبط کر لی گئیں۔ زمیندار متحد ہو کر بدل و جان عوامی بغاوت میں کود پڑے۔ لکھنؤ کی شکست کے بعد بغاوت کے تیسرے مرحلے کے دوران جوں جوں زیادہ واضح ہوتا گیا کہ انگریز جیت رہے ہیں یہ جاگیردار راہنما تو فی دشمن کے ساتھ صلح جونی کرنے لگے اور یکے بعد دیگرے برطانوی حکمرانوں کی اطاعت قبول کرنے لگے بلکہ بادشاہِ عظیم نے بھی جس نے اکثر محبِ وطن کا پارٹ ادا کیا تھا ۱۰ اپنا وکیل برٹش ہائی کمانڈ کی خدمت میں بھیجا جب کہ خود اپنے باقی فوجیوں اور مددگاروں کے ساتھ نیپال کی طرف پس پانگوئی۔ جاگیرداروں کی وطن پرستی کا کارنامہ تھی۔

برجیس قدر کے ساتھ میں اور جنہیں بجا طور پر اپنے ملک اور بادشاہ کے وطن پرست مجاہدین جنگ کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ ریڈیٹنسی کے محاصرے کے دوران سپاہی کبھی بھی ایسی دلیری کے ساتھ آگے نہ بڑھے جیسے زمیں دار رنگروٹ اور نرجیب بیگم بڑی ہمت اور قابلیت کا مظاہرہ کرتی ہے۔ اس نے تمام اہل اودھ کو مشتعل کر دیا ہے تاکہ وہ اس کے بیٹے کے مفادات کی حمایت کریں اور امرائے اس کے ساتھ وفاداری کی سوگند کھائی ہے۔ بظاہر ہم اس کے حلالی ہونے پر باور نہیں کرتے لیکن زمیندار جو اصلیت سے بہتر واقف ہیں برجیس قدر کو بلاتامل قبول کرتے ہیں۔ کیا سرکاران لوگوں کو باغی قرار دے گی یا معزز دشمن؟ بیگم ہمارے خلاف دائمی جنگ کا اعلان کرتی ہے۔ ان رانیوں اور بیگموں کی بلند سچی سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے حرم میں حد درجہ دماغی استعداد واقعی حاصل کرتی ہیں۔ بہر حال وہ سازشوں میں ضرور ماہر ہیں۔ مردوں کے دلوں پر غلبہ کے لیے ان کی جدوجہد انہیں ذہین بنا دیتی ہے۔ ۱۰۹۔ لارڈ کینگ نے بھی اس مسئلے پر بحث کی کہ آیا زمیندار اور حلقہ صرف اپنے محدود طبقہ کے مفاد سے متاثر تھے یا اس معاملے نے بڑھ کر قومی درد کا رنگ اختیار کیا اور قومی بغاوت کا سبب ہوا۔ سر جیمز اوٹرام کے جواب میں اس نے لکھا: ”معلوم ہوتا ہے تم یہ خیال کرتے ہو کہ اودھ کے راجہ اور زمیندار اس لیے باغی ہوئے ہیں کہ انہیں ہماری لگان آراضی کی تشخیص سے ذاتی طور پر نقصان پہنچ رہا ہے، لیکن گورنر جنرل کی رائے ہے کہ اس پر کافی غور و خوض کی ضرورت ہے۔ شاید ہی کوئی جاگیردار اس قدر کمال نفرت ظاہر کر سکتا تھا جتنی کہ چندا بھنجا اور گونڈا کے راجاؤں نے ظاہر کی۔ ان میں سے پہلے ہم نے ایک بھی گاؤں نہیں لیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کا خراج بھی کم کر دیا گیا تھا۔ دوسرے کے ساتھ بھی ایسا ہی فیاضانہ سلوک روا رکھا گیا۔ تیسرے کے چار سو دیہات میں صرف تین لے لیے گئے تھے اور اس کے عوض اس کے خراج میں دس ہزار روپے کی کمی کر دی گئی تھی۔

”حکمرانوں کی تبدیلی سے کسی کو نوپاؤ کے نوجوان راجہ سے زیادہ فائدہ نہیں پہنچا جو بنی انگریزوں کی عملداری شروع ہوئی ہم نے اُسے دس ہزار گاؤں عطا کیے اور دوسرے تمام دعوی داروں کو نظر انداز کر کے اس کی مال کو اس کا سرپرست مقرر کیا۔ لیکن شروع سے ہی لکھنؤ میں اس کی فوج ہمارے خلاف لڑ رہی ہے۔ راجہ دھرانے بھی ان تبدیلیوں سے بے حد فائدہ اٹھایا لیکن اس کے اپنے آدمیوں نے ہی کپتان ہر سے پر حملہ کیا۔ اس کی بیوی کو گرفتار کر لیا اور اسے لکھنؤ بھیج کر جیل میں قید کر دیا۔

”ہم نے اشن بخش خان تعلقدار کو جو اپنے سابق آقا کے ہاتھوں جو رستم سہتا تھا، فوراً اس

کے ساتھ کوچ کرنے سے روکتی۔ وہ راتیں سو کر اور دن بدستی میں گزار دیتے۔ جب وہ جاگتے اور بوش میں آتے تو حیران و پریشان ہوتے۔ ۱۱۳

برطانوی مورخ افسر اور جاسوس احمد اللہ کے اس حقیقت افروز بیان کی تصدیق کرتے ہیں۔

۱۲ مئی کے دن چونی لال نے اپنے روزنامہ میں یہ قلم بند کیا کہ احسن اللہ کا انگریزوں کے نام ایک خط باغی سپاہیوں کے ہاتھ لگ گیا۔ یہ انگریز شہر کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ اس خط میں سپاہیوں کو ملوں ٹھہرایا گیا اور دہلی پر قبضہ کرنے کے لیے انگریزوں کی مدد کا وعدہ کیا گیا بشہر علیکہ وہ زینت محل کے بطن سے بہادر شاہ کے بیٹے مرزا جواں بخت کو ولیعہد تسلیم کرنا منظور کر لیں۔ سپاہی غضب ناک ہو کر محل کے گرد جمع ہو گئے۔ تند و تیز زبان استعمال کی گئی اور سخت غل غپاڑہ مچایا بارشاہ کی وفاداری کی ضمانت کے طور پر ۱۰ انہوں نے احمد اللہ کے سر اور زینت محل کی حراست کا مطالبہ کیا۔

گریتھ نے جو ایفٹ گورنر شمال مغربی صوبجات کے پولیٹیکل ایجنٹ کی حیثیت میں دہلی فیلڈ فورسز (Delhi Field forces) کے ساتھ وابستہ تھا اپنے ایک خط مورخ ۲۲ اگست میں لکھا:

”بادشاہ کی چہیتی بیگم، زینت محل، بن کی ایک اہم سیاسی اہمیت تھی، کی طرف سے ایک قاصد آیا۔ اس نے بادشاہ پر اپنا اثر ڈالنے کی بیگم کی پیشکش کی تاکہ مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے۔ ۱۹ اگست کو پھر گریٹھ نے لکھا: ”شہزادوں سے مجھے خطوط ملنے شروع ہو گئے ہیں۔ وہ اعلان کرتے ہیں کہ ہمیں تمہارے ساتھ ہمیشہ دل بستگی رہتی ہے اور ہم صرف یہ جانتا چاہتے ہیں کہ تم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں۔“ ۱۱۳ مورخ ۶ اگست کے اپنے ایک خط میں گریٹھ نے سر ڈیوڈ مور کو اطلاع دی کہ ”مکات کو بادشاہ کی طرف سے ایک خط ملا ہے جس میں اس نے اس کی مزاج پر ہی کی ہے۔ یہ راہ و رسم پیدا کرنے کا جاگیردارانہ شائستہ طریقہ ہے۔ وغیرہ وغیرہ“

تمام شہادت فراہم کرنے کے بعد ڈاکٹر سین دربار کے اندر کی غدار منڈلی کی پیش کش کے بارے میں اس نتیجہ پر پہنچتا ہے: ”تدبیر سادہ تھی۔ اگر برطانوی حکام بادشاہ کی سابقہ پیشکش اور حقوق خصوصی کی ذمہ داری قبول کر لیں اور جنگ سے پہلے کی حالت بحال کر دیں تو اس کے طرف دار لکڑی کے ٹیل کو تباہ کرنے، سالہ کو اپنے ساتھ ملنے، ان کی مدد سے پیادہ فوج کو منسوب

جب انقلاب کی لہر عروج پر تھی تو وہ بڑھتے ہوئے عوامی دباؤ سے متاثر ہوئے اور غیر ملکی حکومت سے عام قومی منافرت میں شریک ہو کر انہوں نے قطعی وطن پرستانہ پارٹ ادا کیا۔ لیکن جب وہی لہر اترنے لگی اور عوام کی انقلابی قوتوں میں انتشار پیدا ہونے لگا تو جاگیردار طبقے کی اصلی اخلاقی کمزوری ظاہر ہو گئی۔ انہوں نے بزدلوں یا فداؤں کا کام کیا۔ طبقے کی حیثیت سے جاگیرداروں نے ڈبرا پارٹ ادا کیا جو نہ تو فاضل وطن پرستی کا تھا اور نہ کیس خود غرضی اور فدا داری کا۔

جس طرح رانی جھانسی، کنور سنگھ، تانیا ٹوبے اور مولوی احمد اللہ جاگیردار محبوبان وطن شجاعت، دلاوری اور وفاداری کے پتے تھے اسی طرح زوں پذیر جاگیردارانہ نظام کی تمام کمزوریاں مثلاً خود غرضی، بزدلی اور فدا داری دہلی کے جاگیردار راہنماؤں میں نمایاں تھیں۔

یہ علامہ فضل حق کے بیان سے بخوبی ظاہر ہے جس کا شہنشاہ اہد اس کے دربار سے گہرا تعلق تھا۔ اس کی قدرے تفصیل قابل ذکر ہے۔

”اس (بہادر شاہ) کا ایک اپنا وزیر (حکیم احسن اللہ) تھا اور عملہ بھی۔ وہ کافی بوڑھا اور ناتجربہ کار تھا لیکن اپنی بیگم (زینت محل) اور وزیر کے اشاروں پر چلتا تھا۔ وزیر مذکورہ حاکم (علی) تھا اور درحقیقت عیسائیوں کا دوست تھا اور ان سے بے حد محبت رکھتا تھا اور ان کے مخالفوں کا سخت دشمن تھا۔ شہنشاہ کے خاندان کے بعض افراد کا بھی یہی حال تھا کچھ تو اس کے مقرب تھے اور اس کے تحت کے نزدیک اور اس کے معتمد تھے۔

”وہ خود اپنی رائے سے کوئی احکام جاری نہ کرتا اور بھلائی اور بُرائی میں تمیز نہ کر سکتا۔ وہ بظاہر یا خفیہ طور پر کسی چیز کا فیصلہ نہ کر سکتا اور نہ ہی کسی کے ساتھ برائی یا بھلائی کرنے کے قابل تھا۔“

”بہادر شاہ نے اپنے بعض بیٹوں اور پوتوں کو فوج کے افسر مقرر کیا لیکن وہ احمق، بے ایمان اور بزدل تھے۔ وہ دیانتدار اور دانشمند اشخاص سے نفرت کرتے۔ انہوں نے کبھی معرکہ آرائی نہ دیکھی تھی اور نہ ہی انھیں تلواروں اور نیزوں کی ضرب کا کوئی تجربہ تھا۔ وہ اپنی صحبت اور صلاح مشورے کے لیے پتے ٹہہے آدمیوں کا انتخاب کرتے۔ یہ ناتجربہ کار لوگ عیش و عشرت میں محو اور حرام کاری کے سیلاب میں غرق تھے۔ وہ افلاس زدہ تھے جو اچانک دولت مند ہو گئے تھے۔ جب امیر ہو گئے تو عیاشی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ فوج کو رسد بہم پہنچانے کے بہانے سے انہوں نے بڑی بڑی زمینیں لوگوں سے اینٹھ لیں۔ جو کچھ لوگوں سے حاصل کیا وہ خود ہڑپ کر گئے۔ مشہور رنڈیاں ان کو باغی فوجوں کی راہنمائی سے فائدہ دیتی تھیں اور داشتائوں کے ساتھ ان کی صحبت ان کو رات کے وقت فوج

حکمران تھا۔ سر تھامس منرون نے گورنر جنرل کے نام ایک خط میں اس نظام کو ان افغانوں میں بیان کیا ہے: اس کا مقصد نتیجہ یہ ہے کہ یہ ریاست کی سرکار کو کمزور اور سخت گیر بناتا ہے، سماج کے اعلیٰ طبقات میں جذبہ غیرت کو مٹاتا ہے اور تمام قوم کو خوار اور کمزور کر دیتا ہے۔ ہندوستان میں ناقص حکومت کا عام علاج محل کے اندر خاموش انقلاب یا خونریز بغاوت یا غیر ملکی فتح ہے لیکن انگریزی فوج کی موجودگی علاج کے ہر امکان کو ختم کر دیتی ہے کیوں کہ یہ فوج دلی ریاست کی گدی کو بربروں اور لندروں دشمن سے محفوظ رکھتی ہے۔ اب ہم کسی قدر ٹھوس طریقے سے اور خود برطانوی مصنفین کے بیانات سے اس بات کی تحقیق کرتے ہیں کہ دلیاں ریاست نے کس طرح ۱۸۵۷ء کی قومی بغاوت کے دوران انگریزوں کو بچایا۔

حیدر آباد جنوبی ہند کا دروازہ تھا لیکن نظام علی طور سے انگریز غاصبوں کے ساتھ تھا۔ نارٹن نے تسلیم کیا، "اگر حیدر آباد باغی ہو جاتا تو ہم لگ بھگ سارے دکن اور جنوبی ہندوستان میں بغاوت سے بچ سکتے تھے۔" ۱۲۰

دلیاں راجستھان نے جو خاندانی نجابت اور شاندار فوجی روایات کا دعویٰ کرتے تھے، قومی بغاوت کو دبانے کے لیے اپنے فوجی دستے انگریزوں کے حوالے کر دیے۔ انھوں نے اپنی رعایا کی امیدوں پر بھی پانی پھیر دیا اور باقی ہندوستان کی امیدوں پر بھی کہ وہ انگریزوں کے خلاف جہاد میں شامل ہوں گے۔ بالین کا بیان ہے کہ "اگر راجپوت باغی ہو جاتا تو یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اگر وہ کس طرح مقابلے پر ڈماتا رہا اور دہلی کے محاذ پر کس طرح ہماری فوج کے پاؤں جمے رہتے۔" ۱۲۱

وسطی ہندوستان میں گوالیار کو نہایت اہم مقام حاصل تھا۔ راجہ سندھیا پر عوام کا بڑا دباؤ پڑا لیکن اس نے اس کی مزاحمت کی "ریڈ پمفلٹ" (Red Pamphlet) کا گنگام مصنف لکھتا ہے: "اگر سندھیا اپنے بے تاب فوجیوں کی قیادت کرتا اور اپنے قابل اقتدار مرہٹوں کو ساتھ لے کر میدان کا رزار کی طرح کوچ کر دیتا تو ہمارے لیے نہایت تباہ کن نتائج پیدا ہوتے۔ وہ کم از کم بیس ہزار فوجی ہمارے محاذ کے غیر محفوظ مقامات پر لے آتا۔ اگر وہ لکھنؤ فوراً ہاتھ سے نکل جاتے تو لاگ آباد میں گھر کر رہ جاتا۔ یا تو وہ قلعہ محصور ہو جاتا یا باغی اس سے کنارہ کشی کر کے بنارس کے راستے سے کلکتہ کی طرف کوچ کرتے۔ وہاں ان کو روکنے کے لیے کوئی فوجی دستہ نہ تھے اور نہ ہی کوئی قلعہ بندیاں تھیں۔" ۱۲۲ انس کا بیان ہے کہ "سندھیا کی وفاداری نے ہندوستان کو بچانے کے لیے بچالیا۔" ۱۲۳

کرنے اور انگریزوں کو شہر کے اندر داخل کرنے کی تدبیر کریں گے لیکن انگریزوں کی فوجی حالت بہت بہتر ہو گئی تھی اس لیے انھوں نے ان تجاویز پر توجہ دینے سے انکار کر دیا ۱۱۵۱

اعلیٰ حلقوں کی ان ہمگیر غدارانہ سرگرمیوں کا اثر باقی آبادی پر یہ پڑا کہ ان میں اخراج فری ہڈ ہو گئی اور پست ہمتی پھیلنے لگی۔ اس سے باغی سپاہیوں کی بلند حوصلگی کو سخت دھکا لگا۔ انگریز افلاس صورت حال سے باخبر تھے۔ "باغی سپاہیوں کا اپنے راہنماؤں پر اعتماد جاتا رہا اور باغی سپاہی پریشانی اور ہچکچاہٹ کے ساتھ ہم سے دوچار ہوتے... ۱۱۶۰"

اوپر ہم نے ہندوستانی جاگیرداروں کے ایک طبقے کی کارگزاری کی وضاحت کی ہے یعنی وراثت سے محروم اور بے دخل کیے گئے طبقے کی۔ جاگیرداروں کا ایک اور طبقہ تھا جو کم اہم نہیں تھا یہ ہندوستان کے **والیان ریاست** تھے۔ انگریز دشمنی کا جذبہ اس قدر پھیلا ہوا تھا کہ تمام ہندوستانی درباروں میں بھی **سراپت کوٹھی** تھا۔ برہمدار میں ایک منظم منڈلی تھی جو قومی بغاوت کو عملی امداد دینے کی حالت تھی۔ بقول سادو گریشتر والیان ریاست نے "مشکوک پارٹ ادا کیا۔ ۱۱۶۱" اس سے "عدم مزاحمت" کا نام دیتا ہے یعنی انھوں نے انگریزوں کے تئیں رسمی وفاداری کا وطیرہ اختیار کیے رکھا اور جب انگریزوں نے ان کی ریاست سے روپہ اور سطح فوج کی امداد حاصل کی تو وہ خاموش رہے گویا رضامند ہیں لیکن درحقیقت یہ موقع محل کا جائزہ لینے میں مصروف تھے۔ والیان ریاست کے ایک اہم طبقے نے البتہ شروع سے ہی عملی طور پر دل و جان سے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ جو ہی انقلاب کا پانسہ پٹا سبھی نے انگریزوں کے تئیں وفاداری کے اظہار میں جلدی کی۔

بغاوت پھوٹنے کے بعد برطانوی سرکار کو والیان ریاست کی وفاداری کا یقین نہ تھا اس لیے انھوں نے ان پر نگرانی کی بجگاہ کئی۔ ریزیدنٹوں نے ان کی عملی امداد حاصل کرنے یا کم سے کم ان کو بے حرکت رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ باغی بے آبی کے ساتھ منتظر تھے کہ والیان ریاست صحت اپنی رمایا کے ان کے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔ تدبیر جنگ میں ان کا اہم مقام تھا اور اس جدوجہد کے حشر کا فیصلہ کرنے میں ان کا پارٹ قطعی اہمیت رکھتا تھا۔

کون سی چیز تھی جس نے والیان ریاست کو قوم کا ساتھ دینے سے عاری کر کے رکھ دیا اور ملک کی زندگی میں اس نازک گھڑی کے موقع پر انھیں برطانوی اقتدار سے چٹائے رکھا؟ اس کا جواب ان مضر معاہدات معاونت میں ہے جس کے شکار وہ پہلے ہی ہو چکے تھے۔ ان معاہدات کی رو سے ہر ریاست میں کہیں کے فوجی دستے تعینات تھے اور برطانوی ریزیدنٹ یا ایجنٹ ہی اصلی

البتہ دیسی ریاستوں کے عوام ابھی جاگیرداروں کے سیاسی اثر و رسوخ کے تحت تھے اور والی ریاست کی رانہائی کے منتظر تھے۔ اس طرح والیان ریاست اپنے ماتحت لوگوں کی بیزاری کو دبا سکتے تھے اگرچہ یہ کبھی کبھی مقامی شورشوں کی صورت میں پھوٹ پڑتی تھی جنہیں آسانی کے ساتھ دبا دیا جاتا۔ اس طرح ۱۸۵۷ء کی قومی بغاوت کے دوران ہندوستان کے والیان ریاست نے برطانوی راج کو بچالیا۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے موزین کے ایک طبقے نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ یہ کوئی قومی بغاوت نہیں کیوں کہ سالہا ہندوستان اس میں شریک نہیں ہوا تھا اور ایک خاص علاقے کے اندر یہ محدود تھی۔ اب ہم مسلم حقائق کو ملاحظہ کرتے ہیں:

شمالی ہندوستان کا بیشتر حصہ اس وسیع علاقے میں شامل تھا جہاں بغاوت رونما ہوئی یعنی دہلی، اودھ، روہیلکھنڈ، بندھیکھنڈ، آگرہ پرشتمل شمال مغربی صوبجات اور بہار کا بہت سا حصہ۔ فوجت کا بیان ہے: ”یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بغاوت زدہ اضلاع فرانس، آسٹریا اور پرشیا کے مجموعی رقبے کے برابر تھے اور آبادی میں ان سے بھی زیادہ۔“

بغاوت کی وسعت اور کمال عروج کا کچھ اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اس وقت بنگالی فوج کے علم میں باقاعدہ شامل رسالے کی ہر رجمنٹ بے قاعدہ رسالے کی اٹھارہ میں سے دس رجمنٹیں اور فوج پیادہ کی چوبتر میں سے تریسٹھ رجمنٹیں فرو ملازمین سے قطعاً اور کلیتہً غائب ہو گئیں۔ ۱۸۷۸ء بغاوت کے اس خطے سے باہر وسیع علاقے میں یعنی پنجاب، راجپوتانہ، بہار، اشر، حیدرآباد، بہار کے قبائلی علاقوں اور بنگال میں سپاہیوں کے غدر، مقامی بغاوتیں اور انگریزوں کے خلاف سرگرم سازشیں پیا ہوئیں۔

برطانوی غلبے کے خلاف ہندوستانی جدوجہد کے تاریخی تصور میں جس بات پر زور دینے کی ضرورت ہے وہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی حد بندی اور تنگی نہیں ہے بلکہ اس کی تندہی و تیزی، وسعت اور گہرائی ہے۔ سرزمین ہند پر انگریزوں کے خلاف لڑی گئی تمام سابقہ جنگوں سے ۱۸۵۷ء کی بغاوت نمایاں طور پر الگ حیثیت رکھتی ہے۔

پہلی خصوصیت اس علاقے کی وسعت ہے جس میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت پھیلی اور اس سے وسیع تر وہ ہمدردی اور اتحاد عمل ہے جو اسے حاصل ہوا۔ تمام برطانوی اور ہندوستانی تواریخ اور واقع نگار یکساں طور پر اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت ہندوستان

پٹیالہ ادھینند کے راجاؤں اور کرنال کے نواب نے اپنے تمام وسائل انگریزوں کے حوالے کر دیے اور اپنے رنگروٹوں کے ساتھ انگریزوں کے بڑے اڈے انبالہ سے دہلی تک سڑک کو کھلا رکھنے کا کام سنبھال لیا۔ اس طرح پنجاب سے باغی پایہ تخت کے انگریز محاصرین کو کمک پہنچنا ممکن ہو گیا۔

اخباری اطلاعات پڑھنے کے بعد مارکس نے اپنے روزنامہ میں قلمبند کیا: ”سندھیا انگریز کتوں کا وفادار ہے! لیکن اس کے فوجی نہیں۔ راجہ پٹیالہ پر ٹلٹ! وہ فوجیوں کے بڑے بڑے دوستے انگریزوں کو کمک کے طور پر بھیج رہا ہے! ۱۲۴۰“

البتہ نئی انقلابی ذہنیت دیسی ریاستوں میں سرایت کر چکی تھی۔ بالخصوص ان کے فوجیوں میں جنہوں نے عملی طور پر باقی ہندوستان کے سپاہی بھائیوں کی مثال کی پیروی کی۔ ہمارا جہاد اور کے فوجیوں نے بغاوت کر دی اور انگریزوں کو ریاست سے نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ انتہائی ڈرامائی واقعہ اس وقت رونما ہوا جب رانی جھانسی اور تانتیا ٹوپے گوالیار پہنچے۔ سندھیا کے فوجی ان سے مل گئے اور سندھیا اپنے منشی بھرو فادار پیروں کے ساتھ بیچ کھڑا کر کے برطانوی قلعے کی جانب بھاگ گیا۔ ہمارا اڈہ پور کے فوجی جو آگرہ کی حفاظت کے لیے بلوائے گئے تھے، معلوم ہوا کہ وہ ”ساز باز کا شکار ہوئے ہیں۔ ۱۲۵۰“ پور کے فوجیوں کو ”متھرا اور گورگاؤں میں امن وامان بحال کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ انھوں نے فرنگی پناہ گیزوں کی حفاظت کرنے پر تورضامندی کا اعلان کیا لیکن جارحانہ جنگ کرنے سے انکار کر دیا۔ ۱۲۶۰“ رسالہ سمہو نے اسی قصے کو دہرایا۔ ”کوٹاہ کنشنٹ نے جے آگرے کی حفاظت کے لیے بلایا گیا تھا بغاوت کر دی۔ بھرت پور و سارنار ہو گیا اور کرولی کے جوان نمک حرام ثابت ہوئے۔“

جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس سے مابین اس نتیجہ پر پہنچا: ”یہ صاف طور پر ثابت ہو گیا ہے کہ جب اہل مشرق کا مذہبی جنون ابھرتا ہے تو پھر ان کا راجہ بھی جسے وہ باپ کا درجہ دیتے ہیں اور بعض اُسے خدا کہہ کر خوش ہوتے ہیں، وہ بھی انھیں اپنے اعتقادات سے منحرف نہیں کر سکتا۔ ۱۲۷۰“ افسے انگریز شہنشاہیت پرست مودن مذہبی کٹر بن قرار دیتا ہے۔ وہ ایک نئے شعور کا آغاز، انگریزوں کی کا توئی جذبہ اور روایتی جاگیردارانہ وفاداریوں کا خاتمہ تھا۔ ان کا راجہ اب ان کا باپ ”نرہا اور ذان کا خدا تھا۔ ۱۲۸۰“ کے دوران جب وایان ریاست انگریزوں کے تئیں وفاداری کا وعدہ کر رہے تھے ان کے فوجی ان سے منہ موڑ لیتے اور اپنے ملک سے اپنی وفاداری کا ثبوت دیتے۔

کرنے میں انگریز کا میاب ہو گئے۔ مرہٹوں میں پیشواؤں کے وارث نے بغاوت کی لیکن مرہٹے راجہ جنوب میں نظام کے ساتھ اور شمال میں مغلوں کے ساتھ ذاتی رقابتیں اور دیرینہ غلطیاں رکھتے تھے۔ راجپوتانہ کے راجاؤں کے دلوں میں پہلے مغلوں کے اور بعد میں مرہٹوں کے غلبہ کی گزشتہ تبلیغ یادیں تھیں۔ اس کے علاوہ اب وہ انگریزوں کے جنگیں میں تھے۔

ہمارے جاگیرداروں کے نفاق سے متعلق ماضی کی تاریخی یادوں نے ملک کے بیشتر حصوں کے لوگوں کو پست کر دیا اور ہندوستانی والیان ریاست نے جاگیردارانہ ذاتی مناد کے زیر اثر انگریز غاصبین کی مدد کی نہرو نے بحث کے حاصل کو اختصار کے ساتھ یوں بیان کیا ہے۔ ”بغاوت نے انگریزوں کی حکومت کے انجمنہ خیر ڈھیلے کر دیے اور بالآخر اسے ہندوستانیوں کی مدد سے دبا لیا۔“ ۱۳۰۰

جس طرح یہ ایک حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت برطانوی حکومت کے خلاف سب سے بڑی قومی شورش تھی اسی طرح یہی صحیح ہے کہ انگریز ہندوستانیوں کو ہندوستانیوں کے خلاف بڑا کر اسے دبانے کے قابل ہوئے۔ ”پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو“ انگریزوں کی روایتی پالیسی تھی اور انھوں نے ۱۸۵۷ء کے دوران اس سے تباہ کن اثر کے ساتھ کام لیا۔ فوج بگلیں بجاتے ہوئے دعویٰ کرتا ہے ”یہ ساری داستان برطانوی قوم کی شہنشاہی ذکاوت کا کیا خوب مظاہرہ ہے۔ بقول ہاؤس“ جو خود اس شاندار ڈرامے میں نہایت متاثر ہوا تھا۔ ”وہ قوم جس نے پنجاب جیسے بڑے ملک کو ہندوستانی (پوریا) فوج کے ساتھ فتح کیا! پھر مفتوح سکھوں کی قوت کو اسی فوج کو مغلوب کرنے میں استعمال کیا جس نے انھیں رام کیا تھا۔ جس نے پشاور پر برسوں لڑ کر قبضہ جمائے رکھا حالانکہ افغان قبیلوں نے سخت مزاحمت کی تھی۔ پھر جب وہ ان رجمنٹوں سے اچانک محروم ہو گئے جنھوں نے یہ کارنامہ انجام دیا تھا اور انھوں نے بغاوت کر دی تو انھیں بے ہتھیار کرنے اور دبانے میں بلا تامل انھیں قبیلوں سے کام لیا۔ وہ قوم جو اتنا کچھ کر سکتی ہے بے شک اس کی قیمت میں دنیا پر حکومت کرنا لگتا ہے۔“

انس اس حقیقت کو زیادہ مدبرانہ زبان میں پیش کرتا ہے اور اس حکمت عملی کو بیان کرتا ہے جس کے ساتھ برطانوی سیاست دانوں نے ۱۸۵۷ء کے دوران ہندوستانی زندگی کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا۔ صرف ہماری موجودگی ہی قدیم ہلاکت خیز جنگوں اور ان کے ساتھ وابستہ ہونے کیوں سے تحفظ کی ضمانت تھی۔ ان ہونہ کیوں کی روایتیں اور یادیں ابھی تازہ نہیں۔ ۱۳۲

اس سوال کو پیش کرنا ضروری ہے کہ انگریز ہندوستانیوں کے نفاق سے کیوں گرفتار ہوا تھا۔ اس کا جواب ہندوستان میں بحیثیت مجموعی اور مختلف سماجی طبقات کے سیاسی

میں انگریزوں کے خلاف مسلح جدوجہد میں عظیم ترین متحدہ محاذ تھا جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

اس کے علاوہ اس جنگ اور برطانیہ کے خلاف دوسری جنگوں میں مابینتی فرق ہے۔ سابقہ جنگوں میں ایک قلمرو کے لوگ جو اکثر ایک ہی قوم کے ہوتے تھے تنہا لڑتے تھے۔ مثلاً بنگالیوں نے پلاسی کی لڑائی اکیلے ہی لڑی یہی حال کرناٹک، مرہٹہ، سکد اور سندھ کی جنگوں کا تھا۔ وسیع تر متحدہ محاذ کی ابتدائی کوششیں ناکام ہو گئی تھیں لیکن ۱۸۵۷ء کے دوران مختلف ذاتوں، قبیلوں، قوموں اور مذہبوں کے لوگوں نے جو الگ الگ علما دیوں میں رہتے تھے مل کر بغاوت کی تاکہ برطانوی راج کو ختم کیا جائے۔ یہ ہندوستانیوں کا بے نظیر اتحاد تھا۔ اپنے زمانے کے سب سے زیادہ دور اندیش مفکر مارکس نے اس نئی حقیقت پر یوں روشنی ڈالی ہے۔

”اس سے پہلے ہندوستانی فوج میں کئی بار غدر ہوا لیکن یہ بغاوت مخصوص اور ہلکے کھیتوں کے سبب امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ پہلا موقع ہے جب فوجی رجمنٹوں نے اپنے فنگی افسروں کو قتل کیا ہے۔ ہندو اور مسلمان اپنی باہمی کدورتوں کو ترک کر کے اپنے آقاؤں کے خلاف متحد ہوئے ہیں۔ جن ہنگاموں کی ابتدا ہندوؤں سے ہوئی ان کا عمل انجام یہ ہوا کہ ایک مسلمان شہنشاہ کو دہلی کے تخت پر بٹھا دیا گیا۔ بغاوت صرف چند علاقوں تک محدود نہیں رہی۔ ۱۲۹

جس طرح ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے مذکورہ بالا مثبت پہلو پر زور دینا ضروری ہے اسی طرح یکساں طور پر یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے منفی پہلو کو بیان کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ کون کون سے فیصلہ کن علاقے اور ہندوستانیوں کے طبقے تھے جو قومی بغاوت میں شریک نہ ہوئے اور کس طرح بعضوں کو برطانوی فریق کی حمایت پر اکسایا گیا۔ اس میں متعدد اسباب کو دخل تھا لیکن ہم صرف سب سے بڑے یعنی قومی پہلو کا مطالعہ کریں گے۔

گورکھوں اور سکھوں نے انگریزوں کے طرفدار ہو کر فیصلہ کن پارٹ ادا کیا۔ انگریزوں نے نیپال کی جنگ ہندوستانی فوج کی مدد سے لڑی تھی۔ رانا جنگ بہادر نیپال کو رانا شاہی کے مرکزی نظام حکومت کے تحت لارہا تھا۔ انگریزوں نے اُسے ایک مستقل امدادی رقم اور ترائی کے وسیع علاقے دینے کا وعدہ کیا۔ وہ انتقام کی آڑ میں اودھ کو فتح کرنے کے لیے گورکھ کوچیلا کو نیچے لے آیا۔

مغلوں سے متعلق سکھوں کی تلخ تاریخی یادیں ابھی تازہ تھیں۔ تھوڑے سے ابتدائی تال کے بعد خالص فوج کے بیکار فوجیوں اور سکھ راجاؤں اور سرداروں کے نوکروں چاکروں کو بھرتی

۲۔ جاگیر داری کی بحالی

باغیوں کا مقصد کیا تھا؟ وہ کس قسم کا سیاسی اور سماجی نظام ہندوستان میں قائم کرنا چاہتے تھے؟ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے صحیح جائزے کا مدار مذکورہ بالا سوال کے صحیح جواب پر ہے۔ اس سے یہ فیصلہ کرنے میں مدد ملے گی کہ آیا یہ بغاوت رجعت پسند ارتقعی یا ترقی پسندانہ؟

یہ حیرت کا مقام ہے کہ اس سوال پر نہ صرف برطانوی اور بعض بلند رتبہ ہندوستانی بورجوازی میں اتفاق رائے ہے بلکہ کچھ صوبہ اول کے ہندوستانی سیاسی رہنماؤں میں بھی۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی رائے اس طرح پیش کی ہے: "اہل میں یہ جاگیر داروں کی شورش تھی۔ جاگیر دار سرداروں نے اور ان کے پیروؤں نے اس کی قیادت کی۔ دور دور تک پھیلے ہوئے انگریز دشمنی کے جذبے نے اس کی مدد کی.... ہاری ہوئی بازی یعنی نظام جاگیر داری کے لیے میدانِ جہد کرنے سے آزادی حاصل نہ ہوگی۔ ۱۳۳۰ء

ڈاکٹر موزملدار اس نتیجے پر پہنچتا ہے: "۱۸۵۷ء کی خونریزی اور مصائب ہندوستان کی تحریک آزادی کا پیش خیمہ نہیں تھے بلکہ زمانہ وسطی کے فرسودہ طبقہ امرا اور مرکز گریز نظام جاگیر داری کے نزاع کا درد و کرب تھا۔ ۱۳۵۰ء

سرکاری موڑ ڈاکٹر حسین وزیر اعظم کے لفظ نظر کی اصلاح اور مزید وضاحت پیش کرتا ہے: "برطانوی حکومت نے نادیدہ طور پر ایک سماجی انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ انھوں نے عورتوں کی بعض مجبوریات رفع کر دی تھیں۔ انھوں نے قانون کی نگاہ میں انسانوں کی مساوات قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے کسان اور نیم غلام مزدوروں کی حالت سنوائے کی کوشش کی تھی۔ بغاوت کے رہنما اگر جیتے تو رجعت پسندانہ اقدام کر کے وہ نئی اصلاحات پر پانی پھیر دیتے۔ نئے نظام کو ختم کر دیتے اور پچھلے دنوں کی یاد تازہ کرتے جب ایک عام آدمی امیر کے مقابلے میں یکساں انصاف کی توقع نہ کر سکتا تھا۔ جب اسامی تعلقدار کے رحم و کرم پر تھا اور جب چوری کی سزا میں ہاتھ پاؤں کاٹ دیے جاتے تھے۔ غرضیکہ وہ انقلاب کے پیسے کو الٹ چلانا چاہتے تھے۔ ۱۳۶۰ء

اس کا مطلب یہ ہے کہ برطانوی حکومت اگرچہ غیر ملکی تھی ایک سماجی انقلاب پیدا کر رہی تھی اور ۱۸۵۷ء کے رہنما اگرچہ وہ آزادی کے لیے مسلح جہاد کر رہے تھے درحقیقت

شعور پر منحصر ہے۔

کسان انگریز کا مخالف تھا لیکن اس کی نظر گاؤں تک محدود تھی۔ اس کی سیاسی واقفیت اس ریاست کے معاملات سے آگے نہ بڑھتی جس میں وہ روایتی راجہ کے تحت رہتا تھا۔ ملک کی سیاسی اور نظریاتی راہنمائی ابھی جاگیردار حکمران طبقات کے ہاتھ میں تھی۔ انگریز دشمنی کے عام جذبے میں وہ دوسروں کے ساتھ شریک تھے لیکن وہ اپنے جاگیردار حریفوں سے زیادہ ڈرتے تھے۔ وہ ایک زوال پذیر طبقہ تھا۔ ان کی تاریخی یادیں ماضی کی جاگیردارانہ پھوٹ اور خانہ جنگیوں تک محدود تھیں۔ انھیں ایک متحد اور آزاد ہندوستان کا تصور نہ سوجھ سکتا تھا۔

ان دنوں حب وطن سے مراد اپنے علاقے کی محبت تھی جس پر اس کا روایتی حکمران راج کرتا تھا۔ ہندوستان کا تصور بطور ایک مشترک وطن کے ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس کی راہ میں نہ صرف جاگیردارانہ تاریخی یادیں حائل تھیں بلکہ اس کی مادی بنیادیں ابھی نہیں پڑی تھیں یعنی ریلوے، ٹیلیگراف، جدید تعلیم کا یکساں طریقہ وغیرہ۔

ہندوستان کا تصور ایک مادر وطن کی حیثیت سے بعد میں پیدا ہوا اور ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے قابل قدر تجربے نے اس کی ترقی میں مدد دی۔ ”دی لندن ٹائمز“ (The London Times) نے اس نئے نظریے کا ٹھیک ذکر کیا ہے ”۱۸۵۷ء کی بغاوت کا ایک بڑا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کے ہر حصے کے باشندے ایک دوسرے سے آشنا ہو گئے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ جنگ کا سیلاب نیپال سے امنڈتا ہوا گجرات کی حدود تک اور راجپوتانہ کی صحراؤں سے نظام کے علاقوں کی سرحدوں تک جا پہنچا ہے۔ ایک ہی طرح کے لوگ سارے ہندوستان کی سرزمین کو تاخت و تاراج کر رہے ہیں اور اپنی تحریک کو قومی رنگ دے رہے ہیں۔ الگ تھلگ ریاستوں کے حقیر مفادات، جہالت جس کے زیر اثر ایک چھوٹی سی ریاست کے باشندے دوسری ریاست کے آداب و رسوم سے بے خبر رہتے، یہ سب کچھ ختم ہو گیا ہے اور اس کی جگہ سارے ہندوستان میں یکساں معاملات کی زیادہ یکساں سوجھ بوجھ نے لی ہے۔ اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں کوئی قومی جذبہ بیدار نہیں ہوا تھا تو بھی ہم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ بغاوت کو دبانے کے لیے ہماری کوششوں نے ایک نئے پودے کے پتے بویے ہیں اور اس طرح آنے والے برسوں میں لوگوں کی طرف سے زیادہ سرگرم جدوجہد کی بنیاد پڑ چکی ہے۔“ ۱۸۳۳

گوشت پوست کا ایسا جُز بن چکی تھی کہ جب شورش کے اولین آثار مئی ۱۸۵۷ء میں نمودار ہوئے تو لارڈ کیننگ نے فوراً یہ سوچنا شروع کیا کہ آیا اس کی پشت پر ہندو ہیں یا مسلمان۔ کے اس نئی صورتحال کی الجھن اور اہمیت کو بیان کرتا ہے جس سے برطانوی حکمران دوچار تھے۔ "لیکن ماہ اپریل کے خاتمے سے پہلے لارڈ کیننگ پر یہ ظاہر ہو گیا ہو گا کہ جن ایشیائی نسلوں کو ہمارے تحفظ اور قوت کا بڑا وسیلہ سمجھا گیا تھا اب ان کی مخالفت کے سبب کسی چیرکی توقع نہیں رہی۔ مسلمان اور ہندو کھلم کھلا ہمارے خلاف متحد تھے۔" ۱۲۸

البتہ برطانوی افسروں نے ہمت نہ ہاری بلکہ ہندو مسلم تفرقات کو براہِ گتیز کرنے کی پالیسی پر ثابتِ قدم رہے۔ مئی ۱۸۵۷ء میں سر ہنری لارنس نے لکھنؤ سے لارڈ کیننگ کو لکھا: "میں دونوں فرقوں کے مابین جذبات کے اختلافات پر نظر رکھوں گا۔ لیکن فرقہ وارانہ منافرت پیدا نہ ہو سکی۔" ایچسن افسوس کے ساتھ تسلیم کرتا ہے: "اس موقع پر ہم مسلمان کو ہندو کے خلاف نہ لڑا سکے۔" ۱۲۹

باغی راہنما پوری طرح انگریزوں کی اس تفرقہ انگیز چال سے آگاہ تھے۔ اچانک اسلام کے حامی علامہ فضل حق نے لکھا: "انگریزوں نے ایریڑی چوٹی کا زور لگایا کہ اپنے حیلوں اور دھوکے کی چابوں سے انقلابی قوتوں میں انتشار پیدا کیا جائے، مجاہدوں کی طاقت کو بے اثر کیا جائے اور ان کی بیخ کنی کی جائے اور ان میں پھوٹ ڈال کر انھیں تتر بتر کر دیا جائے۔ اس باب میں انھوں نے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔" ۱۳۰

جدوجہد کی کامیابی کے لیے باغی راہنماؤں نے دیدہ و دانستہ ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا۔ بہادر شاہ، فوجی لیڈروں، فاضل علما اور شاہسریوں نے اعلان اور فتوے جاری کیے جن میں یہ تاکید کی گئی کہ ہندو مسلم اتحاد وقت کا تقاضا ہے اور سب کا فرض۔ جو علاقے برطانوی حکومت سے آزاد ہو گئے ان میں باغی راہنماؤں نے جو کام سب سے پہلے کیا وہ گاؤ کشی کی ممانعت کا حکم اور اس کا نفاذ تھا۔ باغی راہنماؤں کی اعلیٰ ترین سیاسی اور فوجی تنظیم میں ہندو اور مسلمان نمائندوں کی تعداد برابر تھی۔ "جب بہادر شاہ نے سمجھا کہ وہ حکومت کے معاملات کا انتظام نہیں کر سکتا تو اس نے جے پور، جو دھپور، بیکانیر اور الود کے راجاؤں کو لکھا کہ "اگر آپ انگریزوں کو نیست و نابود کرنے کے مقصد سے متحد ہو جائیں تو میں برضا و رغبت شہنشاہی اقتدار آپ کے ہاتھوں میں سونپ دوں گا۔" ۱۳۱ دہلی میں ایک باغی لکھنؤ رجمنٹ نے ایک مسلمان سپہ سالار کے تحت فوجی خدمت انجام دی ۱۳۲ ایسی متحدہ مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

ایک جوابی انقلاب لار ہے تھے۔ پھر میں حیرت ہوتی ہے کہ ہندوستانیوں نے برطانوی حکمرانوں کو ہندوستان چھوڑ جانے پر کیوں مجبور کیا؟ ان سے یہ تقاضا کیوں کیا کہ وہ مزید سو سال یہاں ٹھہریں تاکہ سماجی انقلاب کو پایہ تکمیل تک پہنچائیں اور سماجی مساوات کا نظام ہمارے لیے تعمیر کریں! یہ نظریہ کہ برطانوی سرکار کے ترقی پسندانہ اقدام کے مقابلے میں باغیوں کا رویہ رجعت پسندانہ تھا نہ نیا ہے اور نہ طبع زاد بلکہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا لارڈ کینگ اور ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے پہلے مسلم انبوت برطانوی مورخ کے بقول: "لارڈ کینگ نے بلاشبہ دیکھا کہ شورش سے پہلے چند سالوں کے دوران انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے یقین محکم سے متاثر ہو کر کسی قدر شدید جوش کے ساتھ کوشش کی تھی کہ وہ ہر چیز کو اپنے خیال کے سانچے میں ڈھالیں۔ قدامت پرست اس جدت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور متواتر جدت طرازیوں پر غضبناک ہو گئے" ۱۸۷۰ء

برطانوی سیاستدانوں اور مورخوں کا نظریہ تو ہماری سمجھ میں آ سکتا ہے جب وہ قدیم وضع اور جدید وضع کے مقابلے کا نظریہ پیش کرتے ہیں اور وہ اپنے طرز عمل کو ترقی پسندانہ اور باغیوں کے مقصد کو رجعت پرستانہ قرار دیتے ہیں لیکن جب ہندوستانی راہنما اور مورخ اسی نظریہ کا بار بار ذکر کرتے ہیں تو ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ وہ ظاہر کو حقیقت سمجھ رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی راہنمائی ہندوستانی جاگیرداروں نے کی (لیکن صرف انھوں نے ہی نہیں) لیکن وہ کوئی کارنامے انجام دینے والے نہ تھے نہ ہی ہندوستان کے مقدر کے مختار کل۔ اس جدوجہد کے دوران عوام کی سماجی قوتیں بھی بروئے کار تھیں جن کے ساتھ نئے خیالات اور عوامل بھی آئے۔ حیف کا مقام ہے کہ ڈاکٹر موزملار، ڈاکٹر سین اور پنڈت نہرو نے ان پر نہ تو توجہ کی اور نہ انھیں کوئی وقعت دی۔ اگر ہم غور اور تنقید کے ساتھ ان کا مطالعہ کریں تو یہ نتیجہ ناکریر ہے کہ ۱۸۵۷ء کی قومی بغاوت کے دوران عوامی قوتیں بہت سرگرم تھیں، ان کی آرزوئیں معقول تھیں اور ہندوستان میں رجعت پسندانہ جاگیرداری کی بحالی کو روکنے کے خیالات ان کے دماغ میں روشن تھے۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کا ایک قطعی عظیم کارنامہ جس کا ہندوستانی قومی تحریک بجا فخر کے ساتھ دعویٰ کر سکتی ہے وہ انگریزوں کے حیلوں چالوں کے خلاف جدوجہد کو کامیابی کے ساتھ جاری رکھنے اور ہندو مسلم اتحاد پیدا کرنے کی نیک کوشش اور اس کو قائم رکھنے کی متواتر سعی ہے۔

ہندو مسلم تفرقے سے فائدہ اٹھانے کی پالیسی ہندوستان میں برطانوی نمائندوں کے

اور سیاسی اثر و رسوخ کمزور تر ہوتا۔ جاگیر دارانہ قوتیں جس قدر سرسبز بنتے تھیں۔ ان کا ایک عالم دعویٰ کے امکانات کم تر رہ جاتے۔ ہر قسم کی عوامی اور قومی جدوجہد کی یہی منطق ہے۔ لوگ پوری طرح کے آخری دور میں جاگیر دارانہ قوتیں کلیتہً عریاں اور کمزور ہو کر رہ گئیں۔ عوامی قوتیں جو پہلے نے بغاوت پیدا اور منظم نہ تھیں کہ ان پر غالب آئیں اور جدوجہد جاری رکھیں۔ اصل میں جو پہلے نے بغاوت فتح تھی ذکر جاگیر دارانہ نظام کی بحالی۔ جب اگلی پشت میں جدید قومی تحریک شروع ہوئی تو ۱۸۵۷ء جدوجہد سے ہندو مسلم اتحاد کی شاندار میراث حاصل کی گئی اور اگلی دو پشتوں نے برطانوی غلبہ کے خلاف ہندو مسلم متحدہ محاذ کے تصور کو زیادہ جمہوری پروگرام کا رنگ دیا۔

برطانوی فریق نے بھی اس تاریخی واقعے سے عبرت حاصل کی۔ فارست "انٹروڈکشن ٹو اسٹیٹ پیپرز ۱۸۵۷-۵۸ء" (Introduction to State Papers) میں لکھتا ہے:

"ان بہت سے اسباق میں جو متحدہ کو ہندوستان کے غدر سے ملتے ہیں کوئی بھی سبق اس تنبیہ سے زیادہ اہم نہیں کہ ہم ایک ایسے انقلاب سے دوچار ہو سکتے ہیں جس میں برہمن اور شعور ہندو اور مسلمان ہمارے خلاف متحد ہو سکتے ہیں اور یہ فرض کر لینا قرین مصلحت نہیں کہ ہمارے مقبوضات میں امن اور استحکام کا اس بات پر انحصار ہے کہ براعظم میں مختلف مذاہب کے فرقے آباد ہیں۔ غدر میں یاد دلانا ہے کہ ہمارے عسکری ایک ایسی پتلی پرت پر قائم ہے جسے سماجی تغیرات اور مذہبی انقلابات کی زبردست قوتیں کسی بھی وقت پارہ پارہ کر سکتی ہیں۔" ۱۸۸۷ء

۷۔ باغی سپاہی فوج

ایسٹ انڈیا کمپنی کی باغی سپاہی فوج نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو شروع کیا بلکہ اس کی تنظیم اور قیادت میں اہم اور قطعی پارٹ ادا کیا۔

اس وقت کے حالات میں اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ یہ قومی بغاوت ہندوستانی سپاہیوں کی طرف سے شروع کی جاتی۔ مارکس نے جو اس وقت واقعات کو قلم بند کر رہا تھا اس کی اہمیت کو فوراً سمجھنا پڑا۔ "یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کی اطاعت کا مدرسیسی فوج کی وفاداری پر ہے۔ اس فوج کی بھرتی کے ساتھ برطانوی حکومت نے مزاحمت کا پہلا عام محاذ منظم کر دیا جو ماضی میں کبھی ہندوستانیوں کو حاصل نہ ہوا تھا۔" ۱۸۹۰ء

ہندوستانی سپاہی فوج کی اپنی شکایات تھیں جو اس وجہ سے پیدا ہوئیں کہ یہ ایک غیر ملکی حکومت

البتہ ان دنوں لوگوں پر مذہبی نظریے کا غلبہ تھا۔ روایتی ہندو مسلم تفرقہ موجود تھا۔ ہندو اور مسلمانوں میں احیائے مذہب کے نظریات بھی پائے جاتے تھے۔ وہابیوں کا سب سے زیادہ اثر و رسوخ تھا۔ باغیوں کے ڈیرے میں برطانوی جاسوسی منڈلی یعنی ففٹھ کالم نے ہندو مسلم اتحاد میں رخ نہ ڈالنے کے لیے نعرہٴ جہاد بلند کیا۔ "بادشاہ کے حضور میں عرضداشتیں پیش کی گئیں کہ کل ۲۲ مئی رمضان کا آخری دن ہے اس لیے بادشاہ سلامت ہندوؤں کے خلافت جہاد کے احکام صادر فرمائیں۔ بادشاہ نے ڈنکے کی چوٹ پر یہ اعلان جاری کیا کہ ہندو مسلمان آپس میں کوئی جھگڑا نہ کریں۔ تمام ہندوؤں نے جان کے خوف سے اپنے مکانات بند کر دیے۔ ۲۰ مئی کو ہندو افسرں کا ایک وفد پہنچا اور شکایت کی کہ ہندوؤں کے خلافت جہاد کی تلقین کی جا رہی ہے۔ بادشاہ نے جواب دیا: "جہاد انگریزوں کے خلافت ہے۔ میں نے ہندوؤں کے خلافت اس کی ممانعت کر دی ہے۔" ۱۲۵۰

جب عید کا تیوہار آیا تو بادشاہ نے احکام جاری کیے کہ کوئی گائے ذبح نہ کی جائے۔ اگر کوئی مسلمان ایسا کرے گا تو قیپ سے اڑا دیا جائے گا۔ انگریزوں کے دوست "حکیم احسن اللہ خاں نے اس حکم پر اعتراض کیا اور کہا کہ میں مولویوں سے مشورہ کروں گا۔ یہ سُن کر بادشاہ بہت غضبناک ہوا۔ دربار کو موقوف کر دیا اور اپنے دیوان خاص میں چلا گیا۔ جنرل بخت خاں نے شاہی احکام کے مطابق ہندوؤں کو پھانسی کا شہر میں گاؤں کشی منع ہے۔ ۱۲۶۵

ڈاکٹر موزمدار کا یہ بیان درست نہیں کہ "فرقہ وارانہ تعصب کی جڑیں اتنی گہری تھیں کہ صرف اعلان میں مذکور نیک خواہشات کی برکت سے اس کی بیج گنی کرنا ممکن تھا۔" ۱۲۶۵ فرقہ وارانہ فساد کے جو کچھ اکاؤنٹات واقعات رونما ہوئے ڈاکٹر موزمداران کی اہمیت میں جالغ کرتا ہے۔ اصلی اہمیت تو اس حقیقت کی ہے کہ برطانوی ایجنٹ بہت کم فرقہ وارانہ فساد براہیچھتہ کر سکے اور باغی راہنما بحیثیت مجموعی جدوجہد کے دوران ہندو مسلم متحدہ محاذ کو کھامیاں کے ساتھ قائم رکھنے کے قابل تھے۔

اس مسئلے کا ایک اور بہت اہم پہلو ہے۔ اس ہنگامے کے نتیجہ کا فیصلہ کرنے میں ہندو مسلم اتحاد کو بڑا دخل تھا۔ برطانوی فریق اس سے باخبر تھا اور انھوں نے اس اتحاد میں رخ نہ ڈالنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور انتہائی کوشش کی۔ ہندوستانی بھی اس سے آگاہ تھے اور انھوں نے اس کی وقعت کو قائم رکھنے اور سمجھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ لیکن بذات خود یہ مسئلہ کاغذ پر محسوس بیان ہو گا۔ باغیوں کے لشکر میں جس قدر زیادہ ہندو مسلم اتحاد ہوتا اسی قدر جدوجہد زیادہ طویل ہوتی۔ اسی قدر عوامی قوتوں کو پیش پیش رہنے کے زیادہ مواقع ملتے اور جاگیر دارانہ قوتوں کا نظریاتی

کی فتوحات انگریزوں کو حاصل ہوئی تھیں وہ سراسر ہماری جوانمردی کا نتیجہ تھیں۔ ان کا ایک عام دعویٰ تھا کہ ہماری مدد سے ہی انگریزوں نے ہندوستان کو برائے کابل تک فتح کیا ہے۔ لوگ پوری طرح جانتے تھے کہ سرکار کا انحصار ہندوستانی فوج پر ہے۔ اس لیے جب انھیں معلوم ہوا کہ فوج نے بغاوت کر دی ہے تو لوگوں نے فسادات پھاڑ دیے۔ اب ان پر سرکار کا کوئی رعب نہ تھا۔ ۱۵۲

ایسی ہندوستانی فوج جو ہندوستانی کسانوں سے طبقہ عام سے بھرتی کی گئی تھی اپنے تجربہ کی بنا پر اس نتیجے پر پہنچی کہ اگر پہلے اس نے ہندوستان کو فتح کرنے میں انگریزوں کی مدد کی تھی تو اب اسے ہندوستان کو انگریزوں کے جوئے سے آزاد کرانے کے لیے لوگوں کی قیادت کرنا چاہیے۔ ایسی فوج ہندوستانی جاگیردار رانہاؤں کی حاشیہ بردار نہیں ہو سکتی تھی بلکہ اس نے انقلابی جدوجہد کی رفتار اور رتنی پر اپنا نقش ثبت کیا۔

جنرل بخت خاں فوج میں نئی اسپرٹ کا ترجمان تھا۔ وہ بریلی برج میں توپخانے کا معمولی رسالدار تھا۔ بریلی کو آزاد کرانے اور وہاں باغی حکومت قائم کرنے کے بعد اس نے یورپ بریگیڈ کے ساتھ دہلی کی طرف کوچ کیا۔ دارالخلافہ میں حقیقی جاگیردارانہ بد نظمی اور انتہائی اتری پھیل گئی۔ باغی سپاہیوں نے اس میں مداخلت کا فیصلہ کیا اور بخت خاں کو اپنا نمائندہ بنا کر بہادر شاہ کے حضور میں بھیجا۔ جیون لال ۲ جولائی کو اپنے روزنامے میں قلمبند کرتا ہے:

”انضباط عامہ نافذ کرنے کے لیے محمد بخت خاں نے افواج کے سپہ سالار اعظم کی حیثیت میں اپنی خدمات پیش کیں۔ بادشاہ نے دوستی کا ہاتھ تھام لیا۔ فوجوں میں واپس آکر بخت خاں نے صوبیداروں کو آگاہ کیا کہ بادشاہ نے میری خدمات، وفاداری اور اطاعت کو قبول کر لیا ہے۔ محمد بخت خاں کو ایک ڈھال، ایک تلوار اور جنرل کے لقب سے سرفراز کیا گیا۔ اسے تمام افواج کا سپہ سالار اعظم مقرر کیا گیا۔ ایک اعلان جاری کیا گیا جس میں تمام کان افسروں کو حاضر ہونے کا حکم صادر کیا گیا تاکہ وہ محمد بخت خاں سے ہدایات حاصل کریں۔ محمد بخت خاں نے بادشاہ کو آگاہ کیا کہ اگر کسی شہزادے نے شہر کو لوٹنے کی کوشش کی تو اس کے کان اور ناک کاٹ دیے جائیں گے۔ بادشاہ نے جواب دیا: ”نہیں کئی اختیارات حاصل ہیں، جو تم ٹھیک سمجھو کہ وہ ۱۵۲

ہندوستان کی قومی تاریخ میں یہ ایک الٹا اور بے مثال واقعہ تھا۔ یہ باغی ہندوستانی فوج تھی جو اس نخل بادشاہ کو شرائط پیش کر رہی تھی۔ جسے اس نے کچھ ذریعہ پہلے شہنشاہ ہندوستان بنا کر اس کے سر پر تاج رکھا تھا۔ یقیناً یہ ایسی فوج نہیں تھی جیسی کہ اکبر یا اورنگ زیب کی تھی

کی بھاڑے کی فوج تھی۔ ان کی شکایات نہ صرف مذہبی رسم و رواج میں مداخلت سے متعلق تھیں بلکہ تنخواہ، بھتے وغیرہ سے متعلق معاشی شکایتیں بھی تھیں۔ سب سے بڑھ کر ان کے نسلی امتیاز کی شکایت تھی جس کی وجہ سے انھیں بلا لحاظ قابلیت اور تجربے ہر اہم معاملے میں انگریزوں کی نسبت ادنیٰ سمجھا جاتا تھا۔

صرف یہی نہیں کہ ہندوستانی فوج کی اپنی شکایات تھیں اور وہ ہندوستانی لوگوں کی سب سے زیادہ منظم قوت تھی بلکہ آخر وہ تھے تو ہندوستانیوں کی اولاد اور اس حیثیت سے وہ برطانوی راج کے اسی طرح شکار تھے جیسے دوسرے ہندوستانی۔

بحیثیت ایک طبقے کے ہندوستانی سپاہی کسان تھے اور بنگالی فوج کی اکثریت "اودھ کے دیہات سے تعلق رکھتی تھی۔ اسی لیے وہ ہندوستان کے دیہاتی گھرانوں کے مصائب سے اچھی طرح واقف تھے۔ الحاق اودھ کے بعد اپنے وطن کی آزادی کھونے سے باقی ہندوستانی فوج کی نسبت بنگالی فوج میں قومی ذلت کے سوال کا زیادہ سخت اور تیز رد عمل ہوا۔

سپاہیوں کا ہندوستان کے لوگوں کے ساتھ وہی تعلق تھا جو پیٹ کے بچے کا اپنی ماں کے رحم کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان کے دلوں سے برطانوی آقاؤں کی عزت جاتی رہی۔ وہ جنگ کے اعتبار سے اپنی وقعت اور قوت سے آگاہ ہو رہے تھے۔ سکھ اور افغان جنگوں کے دوران سپاہی نے نہ صرف خود غرضی سے بھی واقف ہو گیا تھا اور جانتا تھا کہ جب یہ ناکامیوں سے دوچار ہوتے ہیں تو یہ ایک جارحانہ اور غاصبانہ فوج بن جاتے ہیں۔ اس پس منظر میں ہندوستانی سپاہیوں کو اس فوج میں جس نے ہندوستان کو انگریزوں کے لیے مطیع کر رکھا تھا انگریزی عملہ کی نسبت اپنی کثرت تعداد کا زعم ہونے لگا۔

۱۸۵۷ء کے دوران چیف کسٹرن پنجاب جان لارنس نے بجا طور پر یہ لکھا: "اس بات کی توقع کرنی چاہیے تھی کہ دیسی فوج جو ہمارے قلعوں، اسلحہ خانوں، بارود خانوں اور خزانوں کی ذمہ داری تھی وہ فرنگیوں کی نگرانی کے بغیر اپنی اہمیت کے زعم میں مبتلا ہو جائے گی۔" ۱۵۱

اس وقت ہندوستانی فوجیوں میں جو جذبات غالب تھے ان کا مفصل اندازہ ہمیں سر سید احمد خاں کے بیان سے ہو سکتا ہے:

"وہ فوج میں انگریزوں کو آنے میں نمک کے برابر سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جو بہت

انگریزوں کے خلاف جہاد کے نام پر شہزادے دولت مندوں سے روپیہ وصول کر رہے تھے لیکن وہ اسے اپنے تصرف میں لے لیتے جب کہ شاہی خزانہ خالی تھا اور سپاہی فاقے کر رہے تھے۔ سب سے زیادہ سنگین مسئلہ جس سے مجلس دوچار تھی فوج کو رسد پہنچانے اور باغی حکومت کو چلانے کے لیے کافی روپیہ فراہم کرنا تھا۔ اس معاملے پر اس نے سخت رویہ اختیار کیا۔ ۶ جولائی کو بادشاہ نے مرزا عبداللہ اور دوسرے شہزادوں کے بڑے لچھنوں کی بر ملا مذمت کی اور انہیں وہ تمام روپیہ لکھنے کا حکم دیا جو انہوں نے ساہوکاروں سے جبراً اینٹھنا تھا ورنہ ان کا وظیفہ بند کر دیا جائے گا۔ ۱۸ اگست کو بخت خاں نے پھر شہزادوں کے خلاف بادشاہ سے شکایت کی تو اس نے احکام صادر کیے کہ کتب روپیہ کی فراہمی کا حکم جاری کیا جائے تو اس کی ادائیگی اہل شہر کے رو برو جزل بخت خاں کو کی جائے۔ ۱۸ اگست کو ساہوکاروں کے نام احکام صادر کیے گئے کہ وہ براہ راست جزل بخت خاں سے باجیت کریں۔ ۱۵ اگست کو اراکین مجلس نے "ساہوکاروں کو بلایا اور ان سے روپوں کا مطالبہ کیا۔ ساہوکاروں نے جواب دیا: شہزادوں نے پہلے ہی ہم سے تین لاکھ ستر ہزار روپیہ وصول کر لیا ہے اور ہم مزید کچھ بھی نہیں دے سکتے؛ مجلس اس جواب پر غضبناک ہو گئی اور اعلان جاری کیا کہ شہزادوں کو آئندہ کوئی روپیہ ہرگز نہ دیا جائے۔ ۱۵۸ اب مجلس بادشاہ کی وساطت سے نہیں بلکہ بلا واسطہ لوگوں سے اپیل کر رہی تھی۔

۹ ستمبر کو بادشاہ نے ان شہزادوں کی گرفتاری کا حکم دیا جنہوں نے سپاہیوں کی تنخواہ کے لیے وصول کیا ہوا روپیہ خورد برد کر دیا تھا۔ ۱۵۹ اب موقع ہاتھ سے جا چکا تھا۔ ہینہ ختم ہونے سے پہلے ہی دہلی فتح ہو گئی۔ سپاہی دہلی سے باہر کے رہنے والے تھے اور چوں کہ دہلی کے سانحہ میں شہزادوں کو ایک مقام حاصل تھا، ان کی گرفتاری عمل میں لانے سے دشمن کے خلاف محاذ میں رخنہ پیدا ہونے کا احتمال تھا اس لیے انہیں گرفتار نہ کیا گیا۔

ہومز لکھتا ہے: "ایک موقع پر چند سو بھوکے سپاہی ہال میں گھس آئے اور بادشاہ کے گرد کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے بیٹوں کو قید کرے جنہوں نے ان کی تنخواہ میں منہ کیا تھا۔ پھر قسم کھائی کہ اگر انہیں تنخواہ ادا نہ کی گئی تو وہ اس کو اور اس کے خاندان کو قتل کر دیں گے۔" ۱۹ مجلس نے جو اقتصادی اقدامات نافذ کیے ان سے صاف ظاہر ہے کہ اس کی فوجی تنظیم کی بنیاد کسانوں کے طبقے پر تھی۔ انگریزوں کے خلاف جنگ کا اہتمام اور حکومت کی روزمرہ کی ضروریات کے لیے عظیم مالی وسائل درکار تھے۔ امیروں پر بھاری ٹیکس لگائے گئے جو انہیں نجوبی برداشت

یہ ایک انقلاب پسند فوج تھی جو جاگیردار عکرن طبقے کے ساتھ لوگوں کی راہنائی میں شریک تھی لیکن ان پر قابو پانے اور ان کی روک تھام کے لیے اپنی شرائط نافذ کر رہی تھی۔ یہ ایک نئی قسم کی فوج تھی جس کا جاگیردارانہ بھارت کی فوج کے ساتھ دور کا کبھی واسطہ نہ تھا۔

اس فوج نے بادشاہ سے نہ صرف اپنے راہنما، بخت خاں اور اس کے پورے اختیارات کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا بلکہ انقلاب بعد و جہد کے لیے باغیوں کی جماعت یعنی باغیوں کی مجلس قائم کی، جس کا ذکر تلمیذ خلدون کے اس بیش قیمت مقالے میں تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے جو اس کتاب میں شائع ہوا ہے۔ اس مجلس کا آئین مجموعی طور پر جمہوری تھا۔ اس کا کام باغی قوتوں کی ہر گز فوجی قیادت اور ملک اور پایہ تخت کا انتظام حکومت تھلا س کے راہنما بخت خاں کو نہ صرف جرنیل بلکہ صوبہ دار کا درجہ دیا گیا۔

مغل بادشاہ کے ساتھ مجلس کا تعلق اہم ہے۔ مجلس کو کثرت رائے کے ساتھ انگریزوں کے خلاف نہ صرف فوجی اقدامات سے متعلق تمام فیصلے کرنے کا حق تھا بلکہ ملک کے دیوانے کے لیے احکام اور قوانین بھی صادر کر سکتی تھی۔ اس کے احکام اور اعلانات بادشاہ کے پاس دستخط کے لیے بھیجے جاتے۔ مقدمہ کی سماعت کے دوران اپنے بیان میں بہادر شاہ نے کہا کہ جو بھی دستاویزات اس کے سامنے پیش کی جاتیں ان پر، بلکہ کبھی کبھی گورے کاغذوں پر بھی اُسے دستخط کرنے پڑتے۔ مجلس ہی اعلیٰ اختیارات کا مرکز تھی اور مجموعی طور پر یہ ایک ایسا نظام تھا جو آئینی مطلق العنان حکومت سے ملتا جلتا تھا۔

لال قلعہ میں جو رازہ، وسطی کی قدیم جاگیر دارانہ روایات اور رسوم و آداب میں مستغرق تھا سپاہیوں نے حقیقی جمہوری فضا پیدا کی۔ سپاہی فوجی بوٹ پہنے مارچ کرتے ہوئے دیوان خاص میں داخل ہو جاتے۔ اہل رسالہ اپنے گھوڑوں کو اس کے احاطے میں باندھ دیتے جس پر مغل بادشاہ اور اس کے درباری نوکر چاکر حیرت و حیران میں مبتلا ہو جاتے۔

یہ امر محل غور ہے کہ باغی راہنماؤں اور مجلس نے کس طرح مغل شہزادوں کو قابو میں رکھا جو فضول خرچی اور خود رانی کے عادی، حرس و ہوس کے بندے، بزدل اور ذلیل تھے جس کا لازمی نتیجہ ان کی نفاق انگیزی اور بد اخلاقی تھی۔ انگریزوں کے وفادار نامہ نگار جیون لال نے تمام ماجرا احتیاط کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ ۲۰ رج لال کو ایک حکم جاری کیا گیا جس کی رو سے شہزادوں کو فوج سے متعلق تمام خرافات سے آئندہ کے لیے سبکدوش کر دیا گیا۔ ۱۵۴

لی تھی۔ بادشاہ نے اس ارادے کے پیش نظر مکر جانے کا بہانہ کیا۔ یہ حالت سارے ملک میں پیدا ہو گئی جہاں کہیں باغی فوجیں سرگرم عمل تھیں ہندوستانی جاگیرداروں کی جائے پناہ یا زیارت گاہ نزدیک ترین برطانوی چھاؤنی تھی۔

جو سرکش سپاہی باغیانہ قوتوں میں سب سے زیادہ سرگرم اور بارسوز تھے انھوں نے رطانیہ کے خلاف مشترکہ جدوجہد کی غرض سے ہندوستانی جاگیرداروں کے ایک طبقے کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا۔ لیکن جدوجہد کو جاری رکھنے کے لیے انھوں نے باغیوں کی مجلس کی صورت میں ایک اعلیٰ اور مقتدر جماعت بھی قائم کی۔ یہ مجلس اس وقت کے حالات میں آئینی شخصی حکومت کے ڈھانچے کے اندر فوجیوں اور کسانوں کی ایک ملی جلی جمہوری سرکار کا نمونہ تھی۔

اس بات کو دیکھ کر بہادر شاہ نے برطانوی عدالت کے روبرو تسلیم کیا بلکہ دوسرے بیانات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ باغی راہنما اور مجلس بادشاہ سے خطوط لکھواتے اور اعلانات جاری کرواتے جو ان کی رائے میں جدوجہد کے مفاد میں ضروری تھے۔ جب بہادر شاہ انگریزوں کے ساتھ رابطہ قائم کر رہا تھا تو اسے اس بات پر مجبور کیا گیا کہ وہ جے پور، بیکانیر اور الور کے حکمرانوں کو یہ لکھے کہ ”میں اس نازک گھڑی میں سلطنت کے اہم معاملات کے اہتمام اور انجام دہی کے لیے تمھاری مدد اور تعاون چاہتا ہوں اور ریاستوں کی ایک گروہ بندی قائم کرنے کا خواہاں ہوں۔ اگر یہ ریاستیں جن کو میں نے خطوط لکھے ہیں متحد ہو جائیں تو میں شاہی اقتدار انھیں سونپ دوں گا۔“ ۱۷۴۱ء ہندو مسلم اتحاد کو مضبوط کرنے کی کوشش میں اس اقدام کا ہم پہلے ہی ذکر کر چکے ہیں۔ انگریزی اقتدار کے خلاف کامیاب جدوجہد کے نتیجے کے طور پر آزاد ہندوستان کی صورت میں ہندوستانی ریاستوں کے وفان کا تصور ایک نیا اور معنی خیز خیال ہے جو بغاوت کی پیداوار ہے۔

اس ضمن میں جنگ کالپی کے موقع پر اور جھانسی کی شکست کے بعد اس باجماعت حلف کے الفاظ بہت پر معنی ہیں جو رانی لکشمی بائی نے اپنے باغی سپاہیوں کو دلائی: ”جب تک ہم میں دم ہے ہم کالپی سے دست بردار نہ ہوں گے۔ ہم اپنے ہاتھوں سے آزاد شاہی کو دفن نہ کریں گے۔“ ۱۷۵ء ایک رانی سپاہیوں کو لڑتے لڑتے مر جانے یا فتح پانے پر آمادہ کرنے کے لیے مغل شاہی یا مرہٹہ شاہی کے بجائے آزاد شاہی کے نئے تصور سے کام لیتی ہے اور یہ بھی اس وقت جب ناٹا صاحب کاٹمانیدہ، اس کا پٹا بھائی موقع پر موجود تھا اور وہ خود ہمارا شہر کی رہنے والی تھی! جھانسی کے شہری ونداون لال درما جنھوں نے رانی سے متعلق ہندی میں ایک مشہور تاریخی ناول لکھا ہے۔ مجھے بتایا ہے کہ انھوں نے راجہ

کرنے کے قابل تھے اور غریب لوگوں کو اس بوجھ سے آزاد رکھا گیا۔ زمین کے مسئلے پر ایک پرواز جاری کیا گیا جس میں انگریزوں کے بندوبست آراضی کو تبدیل کرنے کا وعدہ کیا گیا اور "کاشت کار کو زمین مہیا کرنے کا یقین دلایا گیا۔" ۱۶۱

اشیائے خورد و نوش کے تحوکی بیوپاریوں نے ذخیرہ اندوزی شروع کر دی تھی اور پھر وہ منڈی
سے بھاری قیمتیں اٹھنے کے لیے جنگ کی حالت سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے تھے۔ عوام کو بڑی مصیبت
کا سامنا تھا۔ ۵ ستمبر کو "پولیس" کے نام احکام جاری کیے گئے کہ دو اشیاؤں خوردنی کی قیمتیں مقرر
کرنے کے لیے ہر روز ایک پنچ کا مقرر عمل میں لائیں۔ پنچ سے مراد پانچ تا جروں کی ایک منڈی ہے
شہر کا کوتوال تختانیلوں کے نام قیمتوں کی فہرست سرکاری نمبر میں جاری کرتا تھا۔
معلوم نہیں کہ مذکورہ فیصلہ کب تک نافذ رہا۔

ایک اور اہم کام جو سپاہی انجام دیتے تھے وہ انگریزوں کے "منفقتہ کالم" (جاسوسی ٹولی) کے خلاف انقلابیوں کی جو کسی تھی۔ وہ کسی بھی شخص کا لحاظ نہ کرتے خواہ وہ کوئی بڑے درجہ کا جاگیردار ہی کیوں نہ ہو۔ جیون لال کا روزنامہ پھر ذیل کی قسم کے واقعات سے بھرا پڑا ہے:

کو قتل کرنے کی دھمکی دی۔ زینت محل بیگم صاحب کو بے جا نے کی دھمکی بھی دی تاکہ وہ اسے بادشاہ کی وفاداری کی خاطر بطور ضمانت رکھ سکیں۔ ۱۶۲۰

مغل خاندان کے وارث کو کبھی بھی یہ گمان نہ ہو سکتا تھا کہ وہ بھی اپنے موروثی تخت پر بیٹھنے کے بعد کہ وہ ایسی صورت حال سے دوچار ہوگا کہ پانی سر سے گزر جائے گا۔ نئے خیالات اور حالات کے تھپیڑوں سے گھبرا کر اس نے زیارت مکہ و فطر کی خواہش کا اعلان کیا۔

ہندوستان میں جاگیردارانہ نظام اور اس کے لوازمات کو بحال کرنے کا موجب ہوتی۔ اس کے
اس کی جیتی بیگم اور شہزادوں کی کثیر تعداد بھی شامل تھی جنہوں نے انگریزوں کے ساتھ صلح کی تھان

اپنے پایہ تخت کی آخری مدافعت کے لیے پہنچ گئے۔ چارلس بال کے الفاظ میں "سارے ملک کے مسلح
آوارہ گردوں کے ہجوم لکھنؤ کی طرف اندر رہے تھے تاکہ سبھی ایک ساتھ کیمز کردار کو پہنچ کر فرنگیوں کے ساتھ
آخری شاندار جنگ میں کام آئیں۔" ۱۴۰۰

بریلی اور لکھنؤ کی شکستوں کے بعد بھی باغی لڑتے رہے اور انھوں نے گوریلا جنگ کے ڈھنگ
پنایا۔ اس کا نمونہ خان بہادر خان کے فرمان عام میں بیان کیا گیا ہے: "کافروں کے ساتھ باقاعدہ فوجی
دشمنوں کے ساتھ مقابلے کی کوشش نہ کرو کیوں کہ وہ بندوبست کے اعتبار سے تم پر فوقیت رکھتے ہیں
اور ان کے پاس بڑی بڑی توپیں ہیں۔ البتہ ان کی حرکات و سکنات پر نگاہ رکھو، دریا کے تمام گھاٹیوں کی
نگہبانی کرو۔ ان کے سلسلہ رسل و رسائل میں رخنہ ڈالو۔ ان کی رسد رسانی میں خلل اندازی کرو۔ ان
کی ڈاک کا سلسلہ منقطع کرو اور ان (فرنگیوں) کے آس پاس متواتر پکڑ کاٹتے رہو تاکہ وہ دم نہ سکیں۔"
مذکورہ بالا حالات پر رائے دیتے ہوئے رسل نے اپنے روزنامے میں لکھا: "اس فرمان عام
سے دانش مندی ظاہر ہوتی ہے اور یہ اس خوفناک جنگ کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کا ہمیں سامنا کرنا ہوگا۔"
انگریزوں کے خلاف جنگ کو طویل کرنے کی غرض سے مذکورہ بالا طریقہ کار کو عمل میں لانے اور متفرق
باغی قوتوں کی امداد کرنے کی ذمہ داری کا بار دیہاتی عوام پر پڑا۔ روسیوں، بندھیکھنڈ، اودھ اور بہار
میں اس جنگ کی داستان کے تمام جمہور برطانوی بیانات میں اس بات کی متعدد کہانیاں موجود
ہیں کہ کس طرح ہندوستان کے دیہاتیوں نے وفاداری اور صدق دلی کے ساتھ باغی ہائی کی ان
کے احکام کی تعمیل کی۔ ہم صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں: "جب باغی اپنے مقصد میں ناکام ہوتے ہوئے
رکھائی دے رہے تھے تب بھی انھوں نے ہمارے ساتھ خیر سگالی کا کوئی ثبوت نہ دیا بلکہ جو اطلاع ہم
چاہتے تھے وہ بھی دینے سے دریغ کرتے اور اکثر ہمیں گمراہ کرتے۔" ۱۴۰۱

ناکام قومی بغاوت میں کسی طبقے کے حصے اور امداد کا بہترین اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے
کہ اس نے اس میں کس قدر قربانی کی۔ اگر اس معیار کے مطابق اندازہ لگایا جائے تو ۱۸۵۷ء کی بغاوت
کا اعزاز اسی مراتب میں کسانوں کا طبقہ سب پر سبقت لے جائے گا۔ ہونر لکھتا ہے: "ان مسلح جوانوں کی
تعداد جنھوں نے اودھ میں جان دی لگ بھگ ایک لاکھ پچاس ہزار تھی جن میں سے کم سے کم پینتیس ہزار
سپاہی تھے۔" ۱۴۰۲

یہ دیکھنے کے بعد کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں کسانوں نے اپنے گاؤں سے باہر کیا کارنامے انجام
دیے اس جدوجہد کی بابت اور وسعت کا جائزہ بھی ضروری ہے جو اس نے گاؤں کے اندر جاری

مروان سنگھ کے نام رانی کا ایک خط پڑھا ہے جس میں وہ جدید لفظ "سوراج" استعمال کرتی ہے۔
 لکھنؤ میں آدھ کا کسن بادشاہ محض ایک کٹھ پتلی تھا اور اقتدار سپاہیوں کے ہاتھ میں تھا جو
 اپنے افسروں کا انتخاب کرتے اور جب چاہتے انھیں معزول کر دیتے۔ ۱۳۶ لکھنؤ میں بھی اسی طرح کی
 ایک مجلس تھی جیسی دہلی میں تھی۔ ۱۳۷

غرضیکہ نئی ہوائیں صرف دہلی تک محدود نہ تھیں بلکہ سارے ملک میں چل رہی تھیں جہاں بغاوت
 زور پرتھی اور یہ ہرگز نظام جاگیر داری کی بحالی کا پیش خیر نہ تھیں۔
 اس وقت ہندوستان کے اندر جاگیر داری کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا اور جمہوری خیال اور عمل کی
 نئی لہر چلا اٹھ رہی تھیں۔ لیکن یہ اتنی طاقتور نہ تھیں کہ قدیم جاگیر داری کے نظریاتی بندھنوں کو توڑ سکیں
 اور برطانوی حکام پر غلبہ پائیں۔ البتہ اس درجہ خفاناک ضرور تھیں کہ اصلی ہندوستانی جاگیردار اس بات پر
 مجبور تھے کہ انگریزوں سے بغاوت میں شرکت کی معافی مانگ کر ان سے زندگی کا نیا پڑا بطور ہدیہ
 حاصل کریں۔

ہندوستان میں قدیم بندوبست آراضی کی تباہی اور انتقال آراضی کے قانون نے سارے دیہاتی
 علاقے کو سرکار کے خلاف شورش پر آمادہ کر دیا۔ حکومت کی پالیسیوں کی وجہ سے قدیم دیہاتی طبقات
 تاجروں، مسافروں اور کپنی کے افسروں کی نئی جماعت کے ہاتھوں اپنی زمینیں کھو بیٹھے۔ اس
 طرح سرکار نے ان کی زندگی کو تباہ کر دیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں بڑے پیمانے پر کسب و کار کی شرکت
 نے اسے ایک ٹھوس جمہوری بنیاد اور عوامی بغاوت کا رنگ دیا۔ ۱۸۵۷ء کے دوران ہندوستانی کسانوں
 نے وطن پرستانہ فرض ادا کیا۔

کسان باغی قوتوں کے ساتھ بطور مجاہدین شامل ہوئے۔ اگرچہ انھوں نے کوئی فوجی تربیت
 حاصل نہ کی تھی لیکن وہ اس قدر شجاعت اور خوبی کے ساتھ لڑے کہ خود انگریزوں نے انھیں خسراج
 تحسین ادا کیا۔ ان میں سے بعض کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔

لکھنؤ اور کانپور کے درمیان سیانچ کی لڑائی میں انگریزوں کو آٹھ ہزار ہندوستانی باغی فوج
 کا مقابلہ کرنا پڑا جن میں سپاہیوں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ تھی۔ ۱۳۶ سلطانپور میں باغیوں نے ایک
 اور جنگ لڑی۔ اس میں ۲۵۰۰۰ فوجی ۱۱۰۰۰ سالہ اور ۲۵ توپیں تھیں۔ ان میں صحت پانچ ہزار
 باغی سپاہی شامل تھے۔ ۱۳۷ دہلی کی شکست کے بعد انگریزوں نے لکھنؤ پر تمام تر توجہ مرکوز کی جب
 انگریزوں نے اپنی تمام طاقت لکھنؤ کے محاذ پر جمع کر دی تو آدھ کے دیہات سے مسلح کسان مجاہدین

اسن عامۃ کے قیام میں میری امداد کر سکے۔ اس کے برعکس جو لوگ واقعی دیہاتی آبادی کی کثیر تعداد پر قابو پاسکتے تھے وہ برہمنی اور برہمنی کی حالت پیدا کرنا چاہتے تھے۔“
 فارست نے بغاوت کے دوران دیہات میں طبقاتی صفت بندی کا صاف صاف نقشہ کھینچا ہے،
 ”سرمایہ دار طبقات کو بے دخل کرنے میں پُرانے زمینداروں کی ان کے

ساتھ ہزار عین نے مدد کی۔“

قومی بغاوت کے دوران اصلی طبقاتی صفت بندی کو ملاحظہ کرنے کے بعد آئیے دیکھیں کہ جو دستہ پانچ چھ روٹا ہوئے ان میں دیہات کے باغی عوام نے کیا طرز عمل اختیار کیا۔

مختلف اضلاع کی اطلاعات موجود ہیں جو ضلع بھڑیلوں یا ڈوڈیہل کشتروں نے فران عام نمبر ۲۱۲ مورخہ ۲۰ اپریل ۱۸۵۸ء سے متعلق مرتب کیں۔ اب ہم جنگ ۱۸۵۷ء کے کورکشیتر یعنی اتر پردیش کے مختلف خطوں کے چیدہ ضلعوں پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ ان اطلاعات کے نقطہ نظر میں شہنشاہیت پرستی کی خوب ہے اور حقیقت کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے جیسا کہ ان کی زبان سے ظاہر ہے لیکن ذلت خاکی کی ہوتی ہے، الفاظ کی نہیں۔ اور شہنشاہانہ تقاضی میں ملبوس مفہوم کو نہایت آسانی کے ساتھ اخذ کیا جاسکتا ہے۔ میرٹھ کا ذکر یوں کیا گیا ہے: ”گو جیروں (کاشتکاروں کی مویشی پالنے والی ذات) اور رہائی یافتہ مجرموں نے فوراً بڑنی اور لوٹ مار شروع کر دی۔ سڑکوں کو بند کر دیا گیا۔ ڈاک کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اور راجہ کی کوڑیوں (ایک اور کاشتکار ذات) اور راجپوتوں نے تحصیل سرودھانہ پر حملہ کر دیا۔ قلندر خاں نام کے ایک حوالدار نے فوراً اپنے حکمران ہونے کا اعلان کر دیا۔“

شاہ لہ، باغیت کا جٹ باغی رہا تھا اس کے بارے میں یہ رپورٹ تھی کہ ”اس نے باغیت پر حملہ کیا اور اسے لوٹا اور دریائے جہنا پر کشتیوں کے پل کو تباہ کر دیا جو میرٹھ اور برطانوی فوج کے بیڈ کوارٹر کے پیمپ کے بیچ ریل و رسائل کا واحد وسیعہ ذریعہ تھا۔ ۹ جولائی کو باغیوں کا ایک بہت بڑا گروہ بلیک آباد کو لوٹنے کے بعد سیکری میں جمع ہو گیا اور برطانوی فوجی دستوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ دھولان کے باشندوں نے دہلی کے کچھ باغیوں کی امداد سے پولیس افسروں کو نکال دیا اور سرکاری کاغذات اور عمارات کو تباہ کر دیا۔ پرگنہ بڑوت کے لوگ باقاعدہ طور پر رسد فراہم کرتے اور شاہ محل کے توسط سے دہلی کے باغیوں کو بھیج دیتے۔ ۱۶ جولائی کو برطانوی فوجی دستوں کو موضع بسودھ کے باشندوں کی سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان لوگوں نے شاہ محل کی اس قسم کی مدد کی تھی اور دہلی کے باغیوں کے لیے انداج کے بھاری ذخیرے فراہم کر رکھے تھے۔ اس انداج کی مقدار اتنی زیادہ تھی کہ محکمہ رسد کی تمام گاڑیوں میں

رکھی۔ اس سے اس بحث کا فیصلہ ہو جائے گا جو انتہا پسند جلقوں میں چھڑی ہوئی ہے کہ آیا یہ ایک قوی جنگ تھی یا طبقاتی اور اس وقت طبقاتی قوتوں کی صفت بندی کس طور تھی۔ اب ہم برطانوی عینی شاہدوں اور افسروں کے بیانات کا حوالہ پیش کرتے ہیں جنہیں آنکھوں دیکھا حال معلوم تھا اور جو براہ راست جدوجہد کے ساتھ وابستہ تھے۔

تھارن ہل اس کے آغاز کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

”جب یہ خبر پھیلی کہ دہلی کے بادشاہ کو دوبارہ اپنے تخت پر بٹھا دیا گیا ہے تو دیہاتیوں نے خیال کیا کہ ہماری حکومت ختم ہو گئی ہے۔ جب قانون کی دہشت جاتی رہی تو ہر شخص جس میں کچھ دم تھا وہی کچھ کرنے لگا جو اس کی نگاہ میں درست تھا۔ ہر جگہ پہلا کام بیوں سے انتقام لینا تھا۔ ان کے مکانات کو لوٹا گیا، ان کے بھئی کھاتے جلا دیے گئے، خود ان کے ساتھ اور ان کے عیال و اطفال کے ساتھ برا سلوک کیا گیا۔ باہر کے زمینداروں کو ہر جگہ زمینوں سے بے دخل کر دیا گیا۔ اگر وہ گاؤں کے رہنے والے ہوتے تو انہیں اپنی حیثیت برقرار رکھنے کے لیے قدیم مالکان آراضی کے ساتھ جدوجہد کرنا پڑتی کیوں کہ وہ تہیابوں کے زور سے اپنی کھوئی ہوئی میراث کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔“

ولیم ایڈمز جو ضلع بدایوں کا حاکم تھا مذکورہ بالا بیان کی تصدیق کرتا ہے:

”بلندرتبہ اور بارہوٹ خاندانوں کی کثیر التعداد جائیدادوں کو نئے آدھوں نے غنا بازیوں اور قانونی جھگڑوں سے خرید لیا جن میں زیادہ تر تاجروں اور سرکاری ملازم تھے اور جن کا کوئی چلن یا اپنے مزارعین پر کوئی اثر نہ تھا۔ ان لوگوں کی اکثریت (زمینوں سے) غائب ہائوں کی تھی جو اپنی خریدی ہوئی زمینوں پر رہنا پسند کرتے تھے یا ڈرتے تھے کیوں کہ وہاں انہیں زبردستی دخل دینے والے اور ناخاندان بہانہ سمجھا جاتا تھا۔ متقل شدہ جائیدادوں کے قدیم مالکوں سے انہیں زمینوں پر مزارعین کی حیثیت سے کام لیا جاتا تھا جو کبھی ان کی اپنی تھیں۔ وہ کسی بھی طرح اپنی حیثیت کی تبدیلی پر قانع نہ تھے بلکہ کاشت کاروں کے طبقے کی ہمدلیوں پر انہیں زبردست موروثی اختیار حاصل تھا۔ یہ کاشت کار اپنے جاگیردار آقاؤں کی اس کوشش میں شریک ہونے پر رضامند اور تیار تھے کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی عزت اور جاگیروں کا قبضہ دوبارہ حاصل کریں۔ نئے آدمیوں میں سے کوئی بھی جوان کے بعد زمینوں کے مالک بنے تھے، اس قدر اثر و رسوخ نہ رکھتا تھا کہ وہ

”اس کے برعکس نیلام میں زمین کا خریدار عام طور پر شہر کا باشندہ تھا اور کبھی اپنے گاؤں میں نہ تھا سوائے اس موقع کے جب وہ پڑ کی رقم وصول کرنے یا ڈگری کے عہدہ آمد کے قبیضہ مقصد کے ساتھ آتا۔ اس لیے لوگوں نے قدرتی طور پر ان زمینداروں کا ساتھ دیا جنہیں ہنگاموں میں اپنی کھوئی ہوئی حیثیت کو بحال کرنے کا شاندار موقع نظر آیا۔ پہلے وہ فرنگیوں کی ہرجیرہ کو تباہ کرنے اور لوٹنے پر مصروف ہوئے اور ان کی تمام جائیدادوں پر جبراً قبضہ کر لیا۔ البتہ نیلام میں زمین کے خریدار ہمارے غیر خواہ تھے اور انھوں نے امن و امان کی بحالی میں حتی المقدور ہماری مدد کی۔ ۱۸۳۱ء

جو پور کے مشرقی اضلاع میں ”کوئی نام کا بھی حاکم نہ رہا۔ جو لوگ ہماری حکومت کے تحت اپنی جائیدادوں سے محروم ہو گئے تھے انھوں نے ان کھوئی ہوئی جائیدادوں کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے موقع کو غنیمت جانا۔ جن لوگوں نے ایسا خیال نہ کیا وہ اپنے کمزور ہمسایوں کو لوٹ کر معمولی فائدہ اٹھا سکے جو کسی قدر زیادہ منجملہ تھے انھوں نے اودھ کی باغی قوتوں سے راہ و رسم پیدا کر کے زیادہ مجاہدانہ فوائد حاصل کرنے کی ٹھان لی۔ یہ بد نظمی کی حالت جاری رہی حتیٰ کہ ۸ ستمبر کو گورکھوں نے بیچن کر بھٹانوی حکومت کی صورت دوبارہ پیدا کر دی۔ ۱۸۳۱ء

گورکھپور کے مشرقی علاقے میں بھی ”راجہ نگر سے شہر پکر اور بعض اوقات اس کی بجلی کان کے تحت کوٹہا چوت ہر جگہ باغی ہو گئے اور موجودہ مالکوں کو ان تمام زمینوں سے بے دخل کر دیا جو روایتاً ان کی نسل کی ملکیت تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ معلوم ہوا کہ نر ہر پور، نگر اور ستاسی کے راج اور پانڈ پور کے راجہ اور کئی دوسرے لوگوں نے باہم ملاقاتیں کی ہیں جن میں اودھ سے امداد حاصل کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ”اختیارات منجھانے کے بعد محمد حسین کا پہلا کام یہ تھا کہ اس نے تمام سرکاری ملازموں کو سزا کی دیکھ کر اس کے ساتھ حکم دیا کہ وہ اس کی ملازمت قبول کریں۔ اس نے موجودہ ہیضہ مال اور ضابطہ فوجداری کو برقرار رکھا اس پر اس کے بہت سے زمیندار حامی بیزار ہو گئے۔ انھوں نے اعتراض کیا کہ ”نوابی کے تحت ہمارا اب ضلع بن گیا ہے، تھانیداروں کا وجود نہیں ہوتا تھا۔ عدالت دیوانی کی ڈگریوں کی تعمیل عدالتی فیصلہ کی نصف رقم پر بھی کی جاتی تھی۔

”ضلع میں جو لوگ دیوانی عدالتوں کے ذریعہ سے اپنی جائیدادیں کھو بیٹھے تھے اب انھوں نے زمینداروں کو بے دخل کر دیا اور خود دوبارہ تباہ ہو گئے۔ دستاویزوں اور ڈگریوں کو بڑی دوزخ سے بھڑکایا۔ ۱۸۵۰ء

نوابی اہم پور میں ”بقاوت کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ ضلع میں ہر جگہ تمام ساہوکار بیٹوں

ذخیرے کے صرف ایک قلیل حصے کو ڈھونڈنے کے لیے کافی ثابت ہوئیں۔ ۱۷۸

سہارنپور میں ”پہلے ساہوکاروں کو لوٹا گیا یا انھیں لوٹ سے بچنے کے لیے رقم ادا کرنی پڑی سود خوروں اور تاجروں کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے بھی کھاتے اور قرضوں کی رسیدیں دے دیں۔ گڑے رنے اکھڑے گئے۔ اولین شورشیں دیرینہ عداوتیں نکالنے، پرانے حساب چمکانے یا لوٹ مار کے لیے تھیں۔“ رنگھروں کے باسے میں یہ بیان کیا گیا: ”ان کی پر جوش دیری کی داد دینے سے دریغ کرنا ناممکن تھا۔ پناہ مانگنا کسر شان سمجھتے تھے اور اپنے تعاقب کرنے والوں پر فوراً مڑ کر ٹوٹ پڑتے خواہ وہ گنڈاسے یا ایسے ہی کسی بھدے سے ہتھیارے لیں ہوتے۔“ ۱۷۹

منظر نگار میں ”سارے ضلع میں ہر روز بلکہ ہر گھنٹہ میں ہر قسم کے قتل و غارت کے جرائم چھپ کر یارات کو نہیں بلکہ کھلم کھلا اور دن دھاڑے سرزد ہوتے۔ اکثر حالتوں میں بیٹے اور بہا جن ہی ان کے تشدد کا شکار تھے اور ان میں سے کئی ایک کو اپنے گزشتہ حرص اور طمع کا خوف ناک فیاض بھگتنا پڑا۔“ ۱۸۰

علی گڑھ میں ”ماہ جون کے وسط سے پہلے پرگنہ کے چوہانوں (راجپوت زمیندار) نے جو انتقام پر تلے ہوئے تھے جاٹوں (ایک اور زمینداروں کی ذات) کو مدد کے لیے بلایا۔ غیر ہر حملہ کیا اور لگ بھگ ساری سرکاری عمارتوں کو بھی لوٹا اور تباہ کیا اور بیٹوں اور بہا جنوں کو بھی گھروں کو بھی صدر، کچہری اور تحصیلوں کے سرکاری کاغذات کو برباد کر دیا گیا۔ بہت سے لوگوں نے جنھیں ہماری حکومت کا تختہ الٹنے سے بڑا فائدہ پہنچا اپنی کھوئی جائیدادیں حاصل کر لیں اور ان پر قناعت کر کے شورش کے نتیجے کا انتظار کرنے لگے۔“ ۱۸۱

مقررہ میں ”ہنگاموں میں زیادہ تر بیٹوں پر حملے ہوئے اور پرانے زمینداروں کے ہاتھوں نئے زمیندار زمینوں سے بے دخل ہو گئے۔“ اگرہ کو جانے والی سڑک کے ساتھ ساتھ تمام دیہات کے زمیندار باغی سپاہیوں کے ساتھ شامل ہو گئے اور ان کی امداد کی۔ محکمہ مال اور پولیس کے علی کو ہر جگہ نکال دیا گیا اور اگر رہنے دیا گیا تو وہ باغیوں کے رحم و کرم پر تھے۔“ ۱۸۲

الہ آباد میں ”کاشتکار اور غریب طبقات ابھی تک پرانے بے دخل زمینداروں کو ان زمینوں کے خریداروں کی نسبت زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے خواہ نئے زمیندار کتنی ہی مدت سے زمینوں پر قابض رہ چکے ہوتے۔ سابق زمیندار اور اس کے خاندان کے لوگ اب بھی گاؤں کے سب سے زیادہ باد سونہا باشندے تھے۔“

تلمیذ خلدون کا یہ نظریہ کہ اس بغاوت کے دوران "ہندوستانی کسان غیر ملکوں اور ہندوستانی جاگیرداروں کی غلامی سے نجات پانے کے لیے جان بھری پرکھ کر لڑ رہے تھے اور یہ بغاوت ملکی زمینداری نظام اور غیر ملکی شہنشاہیت کے خلاف کسانوں کی جنگ بن کر ختم ہو گئی" محض مبالغہ ہے۔ اس بات کی مطلق کوئی شہادت نہیں کہ ہندوستانی کسانوں نے جاگیردار بندھنوں کو سیاسی یا اقتصادی طور پر توڑ ڈالا کہ وسیع قومی بغاوت کو کسانوں کی جنگ میں بدل دیں بلکہ اس کے برعکس تمام شہادت جو معلوم ہے اس نظریے کے خلاف ہے۔

ضلعوں سے متعلق مذکورہ بالا اقتباسات کے متعلق کسانوں کی جدوجہد برطانیہ کے پیدا کردہ نئے زمینداروں کے خلاف ہے نہ کہ تمام نئے اور پرانے زمینداروں کے طبقے کے خلاف۔ دوسرے اضلاع سے متعلق "دی نیرینو آف ایونٹس" (The narrative of events) میں جو معاصرین کے نہایت مفصل دستیاب بیانات ہیں مجھے کوئی شہادت نہیں ملی سوائے اس کے جو اس طبقا کی صف بندی کی تصدیق کرتی ہے جس کا میں پہلے ہی ذکر کر چکا ہوں۔ ان برطانوی ماخذوں سے کہ خلدون نے حوالہ دیا ہے ظاہر ہے کہ زمیندار اعلیٰ طبقات کے خلاف ادنیٰ طبقات کی بغاوت سے خوفزدہ تھے اور انھوں نے جدوجہد کو حسب مصلحت حدود کے اندر رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ کسی ایسی شہادت کا حوالہ نہیں دیتا جس سے ثابت ہو کہ کاشتکاروں کی جدوجہد نئے زمینداروں یعنی نیلام میں خرید کرنے والوں کی زمینوں کی ضبطی اور قبضے سے آگے بڑھی اور تمام زمینداروں کے طبقے کی زمینوں پر قبضہ کر لیا گیا تاکہ "زمین برائے کاشت کار" کے نعرے پر عمل کرنے کے لیے زمینوں کو از سر نو تقسیم کیا جائے زمینداروں کا طبقا خوف ایک تاریخی حقیقت تھی جس نے زمینداروں کو زیادہ آسانی اور رضامندی کے ساتھ اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ انگریزوں کے سامنے ال دیں لیکن یہ ثابت کرنے کے لیے کوئی تاریخی حقائق موجود نہیں ہیں کہ ۱۸۵۷ء کے دوران کسانوں کی جدوجہد نئے زمینداروں کے خلاف جدوجہد سے آگے بڑھ کر تمام زمیندار طبقے کے خلاف جدوجہد کے مرحلے تک پہنچی یعنی اس نے ایک کسانوں کی جنگ کی صورت اختیار کی۔

پھر کچھ ایسے نظریاتی اور سیاسی اسباب تھے جن کی بنا پر زرعی شورش کو زمینداروں کے صورت اس ایک طبقے کے خلاف محدود اور محصور رکھا گیا جس نے دیہاتی کاشتکاروں اور قدیم روایتی زمینداروں کی اکثریت کو یکساں زمینوں سے بے دخل کیا تھا۔ مشترکہ شکایات کی بنا پر یہ تمام دیہاتی طبقات کی غیر دیہاتی، غیر کاشتکار، سرمایہ دار اور سود خور طبقات، برطانوی حکومت کے پیدا کردہ

مارڈاڑیوں وغیرہ کو تمام جائیداد آرمی سے محروم کر دیا گیا خواہ وہ کسی بھی طریقے سے انہوں نے حاصل کی تھیں یعنی بنیادی ہسپتالوں سے یا کسی اور طریقے سے نیز بڑے بڑے فرقوں نے اس بد نظمی کے دورے بے حد فائدہ اٹھایا اور پڑانے حساب خون سے چکائے گئے۔ ۱۸۶۱ء

پاس ہی بنائے ہیں "سرکاری کاغذات پھاڑ کر ان کی دھجیاں اڑا دی گئیں تاکہ ان کے قول کے مطابق نئی حکومت کے ہاتھ میں ان کے قرض کا کوئی ثبوت باقی نہ رہے۔ ہر طرف گاؤں کے گاؤں باغی ہو گئے بنیادی میں جائیداد کے خریداروں اور عدالتی ڈگری رکھنے والوں کو بے دخل کر دیا گیا۔ مسافروں اور تاجروں کو لوٹا گیا۔ سرکاری ملازموں کو جان بچانے کے لیے بھاگنے پر مجبور کر دیا گیا اور ہر حالت میں ہر قسم کی سرکاری جائیداد اور عمارت کو لوٹ کر تباہ کر دیا گیا۔

"بندھیلکھنڈ میں تلواروں اور توڑے دار بند و قوں کی کمی تھی لیکن لوگوں نے برہمنوں اور انہوں نے اپنی لائیں اور چھوٹی کے سب پر چھری لگا کر عارضی ساخت کی کلہاڑیوں سے مسلح ہو کر اپنے آپ کو سپاہی تصور کر لیا۔ اپنے بادشاہوں کا انتخاب کیا اور تمام نوواردوں کو لٹاکر ان کا مقابلہ کیا۔ بغاوت کبھی بھی اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ نہ پھیلی تھی اور نہ ہی اس سے زیادہ مکمل تھی۔" ۱۸۶۱ء

مذکورہ بالا اقتباسات کی بے شمار مثالیں باغی صوبوں کے تمام اضلاع سے ہمیش کی جاسکتی ہیں۔ ان بیانات سے ۱۸۵۷ء کی قومی بغاوت کے دوران دیہات میں جدوجہد کی مابیت صاف صاف ظاہر ہے۔ اول یہ کہ ساری دیہاتی آبادی اس نئے بندوبست آرمی کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی جسے برطانوی حکمرانوں نے ان کے گلے منڈھ دیا تھا۔ دوسرے جدوجہد کا یکساں طریقہ یہ تھا کہ برطانوی حکومت کے تحت جوئے زمیندار پیدا ہوئے تھے ان کو نیست و نابود کر دیا جائے۔ ان کی دستاویزات کو تباہ کر دیا جائے۔ دیہات سے انہیں مار بھگا یا جائے اور ان کی زمینوں پر قبضہ کر لیا جائے۔ برطانوی حکومت کے تمام آثار و خصوص کچھری، تحصیل اور تھانے پر دھاوا بولا جائے۔ دوسرے، جدوجہد کی بنیاد دیہاتی عوام اور غریبوں پر تھی جب کہ قیادت کی باگ ڈور ان زمینداروں کے ہاتھ میں تھی جنہیں برطانوی قانون کے تحت بے دخل کر دیا گیا تھا۔ چوتھے، جدوجہد کا یہ طریقہ ۱۸۵۷ء کی قومی بغاوت کے عام طریقے سے مطابقت رکھتا تھا۔ دیہات میں طبقاتی جدوجہد تمام زمینداروں کی جماعت کے خلاف نہیں تھی بلکہ صرف اس نئے طبقے کے خلاف تھی جو انگریزوں نے نئے قانونوں کے تحت پیدا کیا تھا اور یہ ان کے وفادار سیاسی حامیوں کے طور پر کام کرتے تھے یعنی یہ طبقاتی جدوجہد غیر ملکی غاصب کے خلاف قومی اتحاد کے عام تقاضے کے تحت تھی۔

پروان لے آیا (جس نے دہلی کے بادشاہ سے لقب 'نوبہ' پایا تھا) جس کی رو سے اُسے 'نائب صوبہ دہلی' کی سند عطا کی گئی۔ اس سے یس ہو کر وہ واپس آیا، اپنے القاب کا اعلان کیا اور اقتدار سنبھال لیا۔ فرخ آباد میں سابق نواب کو وہاں کا حاکم اور بادشاہ دہلی کا مقامی نائب بنادیا گیا، جب کہ حکومت کے معاملات پرانے جاگیرداروں اور اکثر سابق برطانوی ملازموں کی مدد سے انجام دیے جاتے تھے۔ سپاہیوں کے نمائندے کئی بار لوگوں کی طرف سے مداخلت کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باغی راہنماؤں کے تحت ضلعوں اور صوبوں میں دہلی کی نسبت نظام حکومت جاگیرداروں کے زیادہ زیر اثر تھا۔ پنجابیوں پر مگر بحال ہو گئیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جدوجہد کے مراکز کے طور پر کام کرتی تھیں تاکہ انگریزوں کے خلاف جنگ کے لیے انسانی اور مادی وسائل کو متحد کر کے حرکت میں لایا جائے۔ شاید یہ پنجابیوں کو سوائے دیہات کے کہیں با اقتدار جماعت کی حیثیت سے کام نہ کرتی تھیں۔ دہلی پر باغی سپاہیوں کا قبضہ تھا۔ انھیں انگریزوں اور شہری مراکز کے ساتھ واسطہ ہا۔ وہ نہ صرف ہندوستان کے مختلف حصوں بلکہ ہمسایہ ممالک کے حالات سے بھی واقف تھے۔ تجربہ اور سوجھ بوجھ کے اعتبار سے وہ باغی عوام میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ طبقہ تھا۔ ان کے دیہات میں رہنے والے لوگ بہت محدود مقامی تجربہ رکھتے تھے اور ان پر روایتی جاگیردارانہ نظریاتی، اور سیاسی اثر کہیں زیادہ غالب تھا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ باغی کسان دیدہ و دانستہ ہندوستان میں قدیم جاگیردارانہ نظام کی بحالی میں شریک ہوتے یا ان پر متعلقہ جاگیردارانہ اثر و رسوخ اس نظام کی بحالی کا موجب ہوتا۔ دہلی کے باغی سپاہی جنھوں نے مجلس انتظامیہ قائم کی اور جمہوری احکام جاری کیے ان کے اپنے ہی بیٹے تھے اور ان کی اپنی آرزو، اسکا اظہار کر رہے تھے جو اگلی صفوں کے ان مرد چوں کو ظاہر کرتے تھے جو ہندوستان کے کسانوں کے فوجی وردیوں میں ملبوس ہو کر پہلے ہی سنبھال رکھے تھے۔

ہندوستان کے کسانوں نے قدامت پسند زمینداروں کے ساتھ مشترکہ جدوجہد کی خاطر مصالحت کر لی لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ یہ عوام کی انقلابی جدوجہد کی حقیقی صورت اختیار کر رہی ہے تو وہ اس اتحاد سے خوفزدہ ہو گئے، گھبنس جے اودھ اور دوسرے مشرقی اضلاع سے متعلق وسیع ذاتی تجربہ حاصل تھا لگتا ہے:

”اس نازک گھڑی میں بے شک ہندوستانی شرفا کی معذوری کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کیوں کہ ان میں اتنی طاقت نہ تھی کہ اس مسلح اور منظم دشمن کی تاب لائیں جس نے اچانک ہمارے خلاف مراٹھا یا۔ دشمن اپنے ان ہم وطنوں کے ساتھ

خمد کاروں اور خود غرض رشوت خور ہندوستانی ملازموں کے خلاف بغاوت تھی جو ان کی زمینوں پر جبراً دخل اور قبضہ جارہے تھے۔ یہ ایسی زمینیں تھیں جن کے یہ دیہاتی طبقے پشتوں گا لگ رہے تھے اور ان پر کاشت کی تھی۔

ایسی صورت حال کے تحت پرانے زمیندار جدوجہد کے راہنما بن کر ظاہر ہوئے کیوں کہ وہ دیہات کے روایتی پیشوا تھے۔ نئی قوتوں کے زیر اثر جو برطانوی حکومت حرکت میں لائی، بحیثیت ایک معاش اور انتظامیہ اکائی کے قدیم دیہاتی برادری کا شیرازہ تیزی سے بکھر رہا تھا لیکن اس کی نفسیاتی اور سماجی میراث محفوظ تھی اور از سر نو تازہ ہو گئی۔ جب یہ موال پیدا ہوا کہ قدیم دیہاتی برادری کے مختلف عناصر مرتبہ جو تمام آراضی کے مالک تھے مل کر زمینوں کے نئے فاصیبن کے خلاف جھڑپوں نے ان کی قدیم زمینوں پر قبضہ چالیا تھا اور اس غیر ملکی فاصبانہ حکومت کے خلاف جدوجہد کریں جس نے اپنے قانونوں، عدالتوں اور حکومت کے ایجنٹوں کے ذریعے یہ سب کچھ ممکن بنایا تھا۔ پس اس طرح گاؤں کے روایتی پیشوا دیہات میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے تاریخی راہنما بن گئے۔

یہ بات نہیں کہ باغی کسانوں کا دانشمند عنصر ان زمینداروں کے ساتھ اپنے طبقاتی تنازعوں سے باخبر نہ تھا لیکن انہوں نے مصلحت اس میں سمجھی کہ اس تنازع کو ابھرنے دیا جائے بلکہ عقل سلیم کا تقاضا یہ تھا کہ پہلے بڑے مشترکہ دشمن سے پٹا جائے۔ ہومز کا بیان ہے: ”دیہاتیوں کے لیے ان تعلقداروں کے ساتھ ہمدردی کی کوئی وجہ نہ تھی جنہوں نے انہیں حقوق آراضی سے محروم کیا تھا“ لیکن یہی تعلقدار ان کے قدیم پیشوا تھے جن کی قیادت قبول کرنا ان کے لیے ضروری تھا اگر وہ غیر ملکی ناخواندہ مہانوں کے ساتھ سنجیدگی سے لڑنا چاہتے تھے۔ ۱۸۸۰ء

دیہات میں طبقاتی جدوجہد کی صورت میں بے شک تبدیلی پیدا ہوئی لیکن یہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد رونما ہوئی اور اس پر ہم بعد میں بحث کریں گے۔

اس بغاوت کے دوران کسانوں اور دوسرے طبقوں پر روایتی زمینداروں کی نظریاتی اور سیاسی گرفت نے بے شک انقلابی قوتوں کو کمزور کیا، پہلے گورکھپور کی رپورٹ کا حوالہ دے چکے ہیں جس میں یہ مذکور ہے کہ علاقے کو آزاد کرانے کے بعد زمیندار رہنماؤں نے زیادہ تر قدیم انتظامیہ ڈھانچے کو برقرار رکھے کی کوشش کی۔ اس سے بے اطمینانی پیدا ہوئی۔ ضلع علی گڑھ کی رپورٹ میں بیان کیا گیا ہے کہ مقامی بغاوت کے بعد با اختیار مقامی تنظیم کے طور پر ایک بڑی پچائیت قائم کی گئی لیکن عالمگیر دار رہنماؤں نے اس کے خلاف سازش کی۔ ان میں سے ایک ”مالا گڑھ کے ولی داد خاں سے

تھے ہم نے زیادہ وقت لیا۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے تجربے کی بنا پر انگریز حکمرانوں نے ہندوستانی جاگیردار طبقات کے قیام پر اپنی پالیسی کو تیزی سے بدلا۔ ان کے مفادات پر ضرب لگانے کی پرانی پالیسی کو ترک کر دیا اور ہندوستان میں اپنی حکومت کی اصلی سماجی بنیاد قائم کرنے کی غرض سے ان کے ساتھ مصالحت کی نئی پالیسی اپنائی۔ ہندوستانیوں نے ہندوستانی جاگیرداروں کے تجربے سے یہ درس حاصل کیا کہ اپنی تحریک کے اگلے دور کے لیے انگریزوں کے خلاف ان کی جدوجہد کی کامیابی کا مدار اس بات پر ہے کہ یہ جدوجہد جاگیرداروں کے خلاف بھی ہو۔ وہ لوگ جنہیں آج تک ہندوستانیوں نے اپنا روایتی راہنما سمجھا اب بجا طور پر انہیں ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے غدار اور برطانوی اقتدار کی ہندوستانی مکھڑیاں تصور کیا گیا۔

جہاں تک وایان ریاست کا تعلق ہے، الحاق کی پالیسی ترک کر دی گئی۔ ملکہ وکٹوریہ نے اپنے اعلان میں ان سے وعدہ کیا: ہندوستانی حکمرانوں کے حقوق، شان اور عزت کا ہم ایسا ہی پاس رکھیں گے جیسا کہ اپنا۔ لارڈ کیننگ نے اپنی سرکاری یادداشت مورخہ ۲۰ اپریل میں بڑی صاف گوئی سے لکھا: ہندوستانی سرداروں کی سرپرستی سے جو ہماری ساتھ اچھی خاصی وابستگی رکھتے ہیں، ہماری حکومت کا تحفظ بڑھتا ہے، کم نہیں ہوتا۔

۱۸۵۷ء کے بعد وایان ریاست کے تین برطانوی پالیسی کو جس طرح ہندوستان کی قومی تحریک نے سمجھا اس کا بہترین اظہار نہرو کی کتاب ”ڈسکوری آف انڈیا“ (Discovery of India) میں کیا گیا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں: ”یہی ریاستوں کو برقرار رکھنا ہندوستان کے اتحاد میں رضہ ڈالنے کے ارادے سے تھا۔“ ہندوستانی وایان ریاست ہندوستان میں برطانیہ کے فتنہ کالم کا کام کر رہے ہیں۔^{۱۹۱} ملکہ کے اعلان میں یہ وعدہ کیا گیا کہ ہندوستانی باشندے اپنی موروثی آبائی زمینوں کے ساتھ جو باقی رکھتے ہیں اس کا پاس رکھا جائے گا۔“ اور ”قانون کے بنانے اور نافذ کرنے میں ہندوستان کے قدیم حقوق اور رسم و رواج کا مناسب لحاظ رکھا جائے گا۔“ اودھ کے برطانوی اعلیٰ افسر مال، جنس نے یہ دلیل پیش کی: ”ہم ایسے نظام کے مستقل قیام کا تصور نہیں کر سکتے جس سے ہندوستانی باشندوں کے اسلے طبقات ہم سے بیکار نہ رہیں۔“ یہ عمل خود بغاوت کے دوران ہی شروع ہو گیا جب جنس نے اعتراف کیا: ”اس وقت ہم انہیں جاگیریں بطور رشوت لے رہے ہیں۔“^{۱۹۲} ”گذشتہ راجھوتہ آئندہ راجھوتہ کی آڑ میں اودھ کے دو تہائی تعلقداروں کو غداری کے انجام کے طور پر پہلے سے زیادہ موافق شرائط پر اپنی زمینیں واپس مل گئیں۔ اس کے برعکس ہم نے دیکھا ہے کہ باغی کسانوں کے ساتھ کس بے رحمی کا سلوک بھارت کا

ہمیشہ انتہائی سختی کا سلوک کرتے جو انگریزوں کے خیر خواہ سمجھے جاتے تھے۔ ان کی جان محفوظ تھی نہ مال۔ اس لیے یقیناً ایسی باتیں ہندوؤں پر بڑا خوف طاری ہو گیا جس کے سبب بہت سے لوگ ہمارا ساتھ چھوڑ گئے۔ ۱۸۹۱ء

محدود طبقاتی مفاد اور "مسلم و منظم" عوام کے خوف نے جنہیں انگریزوں نے بجا طور پر "دشمن" کا نام دیا۔ بالآخر جاگیردار شرفا کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ انقلابی جدوجہد کو ترک کر کے فیرنگی حاکموں کے ساتھ مصالحت کر لیں۔ یہ صورت حال جاگیرداروں کی غذاری اور قومی بغاوت کے دب جانے کا موجب ہوئی لیکن ہندوستانی کسانوں اور لوگوں کے دلوں اور بعد ازاں ان کی تحریک میں جاگیرداری کی تقویت کا سبب بنی۔

ڈاکٹر آرسی۔ موزمدار خود "سپریم گورنمنٹ نیر بٹو آف انڈیا" (Supreme Government Narrative of Events) کرتے ہیں: "بغاوت کی عمومی خصوصیت اور ہائیوں کی اکثریت کی شناخت ناممکن ہونے کے سبب مجسٹریٹ نے سفارش کی کہ ان تمام دیہاتوں کو سالم طور پر جلا کر تباہ کر دیا جائے جن کے بارے میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ انہوں نے بغاوت میں عملی طور پر حصہ لینے کے لیے آدمی بھیجے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں کسانوں کے پارٹ کا برطانوی جائزہ ہے۔ کیا ہندوستان میں کسانوں کے ایسے طبقے کے کندھے پر بندوق رکھ کر جاگیردارانہ نظام کی بحالی ممکن تھی؟

۸۔ خمیازہ اور صبر

۱۸۵۷ء کی بغاوت ایک عہد آفریں تاریخی واقعہ ہے۔ یہ ایک پورے تاریخی دور کے اختتام اور نئے عہد کے آغاز کی علامت ہے۔ جہاں تک انگریزوں کا تعلق ہے اس نے کپنی کی حکومت کو ختم کر دیا اور برطانوی تاج کے تحت بلا واسطہ حکومت کا موجب ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اجارہ دار وجود کے زور حکومت کا خاتمہ ہوا اور ہندوستان کے معاملات میں برطانیہ کے صنعتی متوسط طبقہ کا غلبہ شروع ہوا۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے بغاوت ناکام ہوئی لیکن ہندوستانیوں کو وہ تجربہ حاصل ہوا جس سے وہ نئے خیالات کے ساتھ نئی بنیادوں پر جدید ہندوستانی قومی تحریک تعمیر کرنے کے قابل ہو گئے اور ۱۸۵۷ء کے اسباق بے بہا ثابت ہوئے۔ فریقین نے ۱۸۵۷ء کے تجربے سے سبق حاصل کیے اور بعد میں ان سے استفادہ کیا۔ انگریز فاتح تھے، انہوں نے جلد اقدامات کیے۔ ہم مفتوح

اور اگلے ہی دن برطانوی وزیر اعظم نے ہندوستان کو ایک وزارت و فہد بھیجے کا اعلان کر دیا اور ہندوستان کی آزادی کے لیے گفت و شنید شروع ہو گئی۔

ہندوستان میں نظام حکومت کو از بر نو مرتب کیا گیا اور دفتری حکومت کا بھاری ڈھانچہ قائم کیا گیا جس میں ہندوستانیوں کو صرف ادنیٰ اسامیوں پر مامور کیا جاتا۔ اصلی طاقت اور ذمہ داری انگریزوں کے ہاتھ میں تھی۔ ملک کے اعلان میں یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ سرکاری ملازمت میں ہندوستانیوں کے خلاف کوئی نسلی امتیاز روا نہ رکھا جائے گا، لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔

۱۸۵۷ء میں برطانوی تاج کے براہ راست حکومت ہند کو منبھانے کے بعد پہلے پچیس برسوں کے دوران شاید ہی کوئی ہندوستانی سول سروس (Civil Service) میں لیا گیا ہو۔ اگرچہ صدی کے اختتام سے کچھ گنتی کے ہندوستانی اس اعلیٰ ملازمت میں ہر سال بھرتی ہوتے رہے لیکن ۱۹۱۹ء تک یہی ہنشاہی اقدار کے عروج کے دوران ان کا تناسب زیادہ نہ تھا۔ شدید نسلی امتیاز تمام ملازمتوں میں برائیت کیے ہوئے تھا اور نسل پرستی انیسویں صدی میں سرزمین مشرق میں برطانوی حکومت کی امتیازی خصوصیت تھی.... اگرچہ ہندوستانی کھلے مقابلے کے امتحان کے ذریعے انڈین سول سروس میں بھرتی ہو سکتے تھے لیکن خاص درجوں سے اوپر کے عہدوں پر انھیں فائز ہونے کا حق حاصل نہ تھا۔ اپنے زمانے کے ممتاز ترین ہندوستانی حاکم آر۔ سی۔ دت کو استعفیٰ پیش کرنا پڑا کیوں کہ نسلی امتیاز کی بنا پر انھیں کشر کے عہدے پر مامور نہ کیا گیا۔

”برطانیہ کے تحت ہندوستان نے ایک طاقتور ملک کی حیثیت حاصل کی اور یہ اس دفتری حکومت کا کارنامہ تھا جسے احتیاط کے ساتھ مرتب اور بڑے اہتمام کے ساتھ منظم کیا گیا اور شان و شوکت کے ساتھ قائم رکھا گیا۔ ہندوستان میں برطانیہ کے دفتری نظام سے ملا صرف سرکاری اہلکاروں کی جماعت ہی نہ تھی بلکہ یہ ایک حکمران ادارہ تھا جو ہندوستان میں چار پانچ اہم ترین عہدوں کے سوا بھی اسامیوں پر قابض تھے سرکاری پالیسیاں وضع کرنے میں ان کو سب سے زیادہ دخل تھا اور ان پالیسیوں کو عمل میں لانے کا کام انھیں کے ذریعے انجام پاتا تھا“ ۱۹۵

۱۸۵۷ء کے بعد سر سید احمد خاں نے بھی سیاسی طور پر یہ مشورہ دیا تھا کہ مجلس قانون ساز میں ہندوستانیوں کو بھی شریک ہونا چاہیے تاکہ لوگوں کے ساتھ سرکار کا رابطہ قائم رہے۔ ۱۸۶۱ء میں انڈین کونسل ایکٹ کی رو سے مجلس قانون ساز میں قانون وضع کرنے کی غرض سے غیر سرکاری اراکین کی شمولیت کا بھی اہتمام کیا گیا ۱۸۶۲ء میں اس طرح تین ہندوستانیوں کو نامزد کیا گیا۔ ان قانون ساز

گیا۔ زمینداروں پر خاص لطف و عنایت اور کسانوں کو ان کے دم و کرم پر چھوڑ دینا ۱۸۵۶ء کے بعد حکومت کی مستند پالیسی بن گئی۔

کسانوں کے طبقے کو اس نئی حقیقت کا اچھی طرح احساس ہوا لیکن کچھ حقوق رعیت داری حاصل کرنے سے پہلے انھیں ملک گیر قحط اور زرعی فسادات کے مصائب کا شکار ہونا پڑا۔ جس طرح برطانوی پالیسی سے قدیم دیہاتی برادری تباہ ہو گئی تھی اسی طرح نئے تلخ تجربے سے روایتی راہنماؤں کی حیثیت سے زمینداروں کے ساتھ گاؤں کے رفاہی اتحاد کا رشتہ بھی ٹوٹ گیا۔ طبقاتی جدوجہد دیہات میں بھی پھیل گئی۔ جب جدید قومی تحریک نے کسانوں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی تو ہندوستانی کسانوں کا طبقہ زمینداروں سے لڑنے کے لیے قومی تحریک کی حمایت پر آمادہ ہو گیا کیوں کہ زمینداران کی کمانی ہڑت کرنے والے ۱۸۵۶ء کے غدار اور دیہات میں برطانوی حکومت کے ستون تھے۔

سپاہیوں کے غدر کے بعد جس سے سارے ملک میں شورش کی آگ بھڑک اٹھی تھی، فوج کو افسر نو منظم کیا گیا۔ برطانوی فوجیوں کا تناسب بڑھایا گیا۔ انھیں خاص طور پر قبضہ رکھنے والی فوج کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا تاکہ اندرونی امن و امان کو قائم رکھا جاسکے۔ ہندوستانی فوجیوں کو غیر مالک میں فوجی خدمت انجام دینے کے لیے منظم کر کے تربیت دی گئی تاکہ برطانوی سلطنت کے لیے ایشیائی اور افریقی علاقوں کو فتح کیا جائے۔ توپخانہ ہندوستانیوں سے واپس لے لیا گیا۔ تمام اعلیٰ عہدے انگریزوں کے لیے مخصوص کر دیے گئے۔ اب ہندوستانی کو کنگس کمیشن (King's Commission) بھی نہ مل سکتا تھا اور نہ ہی فوجی ہیڈ کوارٹرز میں کوئی ملازمت مل سکتی سوائے کلرک کی حیثیت سے جسے صرف غیر فوجی کام سپرد کیا جاتا۔ ہندوستانی رجمنٹوں کو ”پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو“ کے اصول پر ازبیر نو منظم کیا گیا اور فوج کی بھرتی کو صرف نام نہاد جنگجو نسلوں تک محدود کیا گیا۔

لیکن آخر سب کچھ کرنے کے باوجود کوئی چیز انگریزوں کے آڑے نہ آئی۔ ۱۸۵۷ء کے دوران ہندوستانی سپاہیوں کے کارناموں کی یاد نہ صرف ہندوستانی عوام کے دلوں سے کبھی محو نہ ہوئی بلکہ ہندوستانی مسلح افواج کے دلوں سے بھی۔ خواہ ہندوستانی فوج کو کتنا ہی دوبارہ منظم کیا گیا جب جدید قومی تحریک نے زور پکڑا تو یہ فوج اس کے اثر سے بچ سکی۔ ۱۹۳۰ء کی قومی تحریک کے دوران گردھوالی فوجوں نے پشاور میں ہندوستانی مظاہرہ کرنے والوں پر گولی چلانے سے انکار کر دیا۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد قومی شورش کے دوران ہندوستانی بڑی اور ہوائی افواج میں یکے بعد دیگرے ”غدر“ ہوئے۔ اس کے بعد ۱۸ فروری ۱۹۴۷ء کو ہندوستانی بحری فوج میں بغاوت ہو گئی

میں دوستی پیدا نہیں کی بلکہ پرامن شہری بھی نہیں بنایا۔ ۱۹۸

حکومت ان جدت پسند تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اس وقت وہ خود ہندو قدامت پسندی کے خلاف جہاد میں بہترین مصروف تھے اور باغیوں کے مقصد پر جو مذہب کا رنگ چڑھایا گیا تھا اس سے انھیں سخت نفرت تھی۔ اپنے تاریخی وجود کی ابتدا اور سیاسی تجربہ کی کمی کے سبب وہ اپنی ترقی کو غلطی سے برطانوی حکومت کی دین سمجھتے تھے۔ مگر وہ ایسے ”وقادار اور نمک حلال“ نہ تھے جیسا کہ ارل گرینول کا خیال تھا۔ وہ برطانوی حکمرانوں کے ہاتھ بندھے غلام نہ تھے۔ ۱۸۵۷-۵۸ء کی بغاوت کے دہنے کے بعد اگلے ہی سال میں یہ بات ثابت ہو گئی جب بنگال کے روشن خیال طبقے نے بغاوت نیل (Indigo Revolt) میں اتحاد عمل کے لیے بہار اور بنگال کے کسانوں سمیت سارے بنگال کو اکٹھا کیا۔ یہ کسان کھیتوں کے برطانوی مالکوں کے لیے تپا س ظلم اور لوٹ کھسوٹ کا شکار تھے۔ یہ سریندر ناتھ بنرجی تھا جس نے انڈین سول سروس کے امتحان کے لیے عمر میں کمی کے خلاف سارے ہندوستان میں تحریک چلانے کی ابتدا کی کیوں کہ یہ کمی بظاہر ہندوستانی امیدواروں کے مفاد کے منافی تھی۔ اس کے بعد انگریز عدالتوں میں نسلی امتیاز اور در نیلگر پریس ایکٹ وغیرہ سے متعلق مہموں کا آغاز ہوا۔ جب روشن خیال طبقے نے برطانوی تاج کے تحت ہندوستان کی حالت کو ابتر ہونے دیکھا تو ملک و کشور کے ۱۸۵۸ء کے اعلان سے متعلق ان کا یہ فریب کہ یہ ہندوستانیوں کا منشور آزادی ہے، آہستہ آہستہ کا فور ہو گیا اور انھوں نے سیاسی اصلاحات کے لیے شورش شروع کر دی۔ ۱۸۸۲ء میں ہندوستانی قوم پرستی کے بابا آدم رادابھائی نورجی نے لکھا،

”ہندو، مسلمان اور پارسی یکساں طبع پر پوچھتے ہیں کہ آیا برطانوی حکومت ایک برکت ہے یا لعنت۔ یہ اب کوئی راز کی بات نہیں ہے اور نہ کوئی ایسی صورتِ حالات ہے جو ہمارے ان حکمرانوں پر آشکار نہیں جو آنکھیں رکھتے ہیں۔“ ۱۹۹

دفعہ رفتہ ہندوستانی روشن خیال طبقے کو تلخ تجربے کی بنا پر معلوم ہو گیا کہ انسانی مساوات اور سیاسی جمہوریت کے برطانوی اصول ہندوستان کے لیے نہیں تھے۔

راشد ناتھ ٹیگور خود ہندوستان کے روشن خیال طبقے کی قدیم اور جدید پشتوں کے بیچ کی کڑی تھے اور ہم عصر اور بعد میں آنے والے روشن خیال طبقات کے نظریاتی مہلات کے عبوری دور کے ترجمان انھوں نے اپنی ۸۰ ویں سالگرہ (مئی ۱۹۴۱ء) کے موقع پر ایک پُر غلوں اور پُر اثر خطبے میں یہ کہا:

مجلس میں حقیقی اختیار صرف انگریز حکام کے ہاتھ میں تھا البتہ ہندوستانی وطن پرست سیاستدانوں نے ہندوستانیوں کے پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کرتے تھے اور برطانوی پارلیمنٹ کی پردہ دری کے لیے قومی تحریک کی ترقی میں مدد دیتے۔ انگریزوں کی "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی ایک اور طریقے سے کامیاب ہوئی۔ مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخابات کا اجراء دو قوموں کے اس زیریے نظر سے کامیاب نظر آیا تھا جو حصول آزادی کے عین موقع پر ملک کی تقسیم کا موجب ہوا۔

برطانوی سرکار جو شروع میں سماجی اصلاح کے اقدامات پر فخر کرتی تھی، شلاختی کی ہم کا انسداد، بیوہ کی شادی وغیرہ، ششہاء کے تجربے اور ہندوستانی جاگیردار رجعت پسندوں کے ساتھ اتحاد کے بعد تمام ترقی پسندانہ سماجی اقدامات کی مخالفت ہو گئی۔ "ہندو قانون زیادہ تر رواجی تھا۔ جوں کو رواج تبدیل ہو جاتے ہیں اس لیے قانون کا اطلاق مختلف طریقوں سے ہونے لگا۔ ہندو قانون میں کوئی ایسی دفعہ نہیں تھی جو رواج سے تبدیلی حاصل کر سکتی تھی۔ انگریزوں نے اس پچھلے رواجی قانون کی جگہ مدائتی فیصلے رائج کر دیے جو پرانے شاستروں پر مبنی تھے۔ یہ فیصلے ایسی قانونی نظریں بن گئے جن کا سختی کے ساتھ پابند ہونا پڑتا تھا۔ تبدیلی صرف قطعی قانون وضع کرنے سے ہو سکتی تھی لیکن برطانوی سرکار جو قانون سازی کی مجاز تھی رجعت پسندانہ طبقات کو اپنا مخالف نہیں بنانا چاہتی تھی کیوں کہ یہ ان کی امداد پر بھروسہ رکھتی تھی بعد میں جب منتخب اسمبلیوں کو قانون سازی کے کچھ اختیارات دیے گئے تو بذریعہ قانون سماجی اصلاح کو فروغ دینے کی ہر کوشش پر حکام میں جھجھکیں ہوتے اور اس کی سخت حوصلہ شکنی کرتے ۱۹۹۰ء اس طرح ششہاء کے بعد ہندوستان میں برطانوی سرکار سماجی رجعت پسندی کی حامی ہو گئی۔

برطانوی فرانزواؤں نے ایک انگریزی پڑھا لکھا ہندوستانی متوسط طبقہ پیدا کر دیا تھا تاکہ مصلحتاً حکومت کی ادنیٰ مگر ضروری کڑیوں کے لیے ایک مستند قابل اور قومیت سے کوڑا ہندوستانی عملہ حاصل ہو جائے۔ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے سپاہیوں کے فہم میں کوئی حصہ نہ لیا۔ اس افراطی کے دور میں انہوں نے برطانوی حکام کے ساتھ وفاداری اور نمک حلائی کا نگہ کیا گو ان پر اس کے برعکس الزامات عائد کیے گئے ۱۹۰۰ء

مذکورہ بالا بیان پورے طور پر درست نہیں ہے۔ ڈاکٹر حسین لکھتا ہے: "میدر وضع کے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی یہ قلیل تعداد بھی حکومت کی حمایت میں متفقہ رائے نہ تھی۔ بنگال کا تعلیم یافتہ ہندو صدی بھر کی بے کم و کاست ستم رانی کا شاک تھا جس میں دل جوئی کے لیے فاضلی کا ایک شتم بھی شامل تھا۔ وہ مزید لکھتا ہے: "ایک دوسرے کے ساتھ سو سال یا اس سے بھی طویل تر میل جول نے ہندوؤں اور

کارخانہ دار طبقہ یہاں نسبتاً کم قیمت پر مال بیچتا چاہتا تھا لیکن اب پانسابلٹ گیا ہے۔ کارخانہ داروں پر یہ حقیقت آشکار ہو گئی ہے کہ ہندوستان کو خام مال پیدا کرنے والے ملک میں تبدیل کرنا ان کے وجود کے لیے مدد جو ضروری ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر سب سے بڑھ کر یہ لازم ہے کہ اسے آبپاشی کے وسائل اور اندرونی ذرائع آمدورفت بہم پہنچائے جائیں۔^{۲۱۵}

ہندوستان میں پیداوار کی قوتیں مفلوج ہو چکی تھیں۔ برطانوی شہنشاہیت پرستوں کو ہندوستان میں بھاپ، ریلوے، آبپاشی وغیرہ کے اہتمام کی صورت میں اقتصادی اقدامات کرنے پڑے تاکہ یہ ان مصنوعات کے عوض خام مال پیدا اور برآمد کر سکے جو برطانوی شہری متوسط طبقہ ہندوستان کی منڈی میں کم قیمت پر بیچنے کے لیے بھیجتا تھا۔

ہندوستان کی قومی تحریک کی ترقی کے ساتھ ہندوستانی ماہرین معاشیات نے محققانہ پزیرش قیمت کتاب میں لکھیں جن سے ثابت ہوتا تھا کہ کس طرح برطانوی پالیسی خود غرضی پر مبنی تھی اور کس طرح ہندوستانی مفادات کو برطانوی مفادات پر قربان کیا جاتا تھا۔ ان تصنیفات نے قومی بیداری کو بڑھانے میں مدد دی لیکن ان میں عیب یہ تھا کہ ان کا انداز فکر غیر محرک اور قیاسی تھا۔ ہندوستان میں برطانیہ کے کردار سے متعلق مارکس کو کوئی مغالطہ نہ تھا۔ اس نے بیان کیا: ”ہندوستان میں برطانوی حکومت سراسر بے غیرتی کی ہے۔^{۲۱۶} لیکن اس نے اپنی محققانہ نگاہ سے انگلستان کو ”تاریخ کا غیر شعوری حربہ قرار دیا۔^{۲۱۷} اس نے پزیرش گوئی کی کہ انگلستان جو کچھ ہندوستان کے وسائل پیداوار کو کام میں لانے کے لیے کرے گا یہ بالآخر اس کی تباہی کی مہر ثابت ہوگا۔

اس نے پہلے سے ہی یہ بھانپ لیا: ”جب ایک بار کسی ایسے ملک کے ذرائع باربرداری میں مشینوں کا استعمال شروع کر دیا جائے جس میں لوہا اور کوئلہ موجود ہو تو اسے اس کی مصنوعات سے محروم رکھنا ممکن نہیں۔ اس لیے ہندوستان میں ریلوے سسٹم جدید صنعت و حرفت کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ اس کا احتمال اور بھی زیادہ ہے کیونکہ برطانوی حکام نے ہندوؤں کو موقع دیا ہے کہ اپنے آپ کو ماسٹری قسم کے کام کے متعلق ڈھالنے کے لیے خاص استعداد پیدا کریں اور مشینوں سے متعلق ضروری علم حاصل کریں۔ جدید صنعت جو ریلوے سسٹم سے وجود میں آئے گی پیشوں کی مورد تقسیم کو ختم کر دے گی جس پر ہندوستانی ذات پات کا مدار ہے۔ یہ ذات پات ہندوستان کی ترقی اور قوت کی راہ میں قطعاً مائل ہے۔“^{۲۱۸}

یہی عمل باوجود انگریزوں کی مخالفت کے ہندوستان کی جدید صنعتوں کی ابتدا اور ترقی کا موجب ہوا۔ ہندوستان کے تہذیبی متوسط طبقے کے عام مختار کاروں سے ہندوستان کا صنعتی متوسط طبقہ پیدا ہوا۔

”جب میں ماضی کے گزشتہ برسوں کی دودراز وسعت پر نظر ڈالتا ہوں اور اپنی ابتدائی نشوونما کی تصویر صاف دیکھتا ہوں تو مجھے اس تبدیلی پر حیرت ہوتی ہے جو میرے اپنے انداز فکر میں اور اپنے ہموطنوں کی نفسیات میں واقع ہوئی ہے۔ ایسی تبدیلی جو انتہائی المناک واقعہ کا سبب ہوگی۔

اس زمانے کے تعلیم یافتہ لوگ انگریزی زبان اور ادب کے شیدائی تھے۔ دن رات برک کی شاندار تقریریں اور میکا کے طویل اور رواں جملوں کی تقلید میں فصاحت و بلاغت کے جوہر دکھائے جاتے تھے شیکسپیر کے ڈرامے، بائرن کی شاعری اور سب سے بڑھ کر انیسویں صدی کی برطانوی سیاسیات کی فاضلانہ حریت پسندی بحث و مباحثہ کے خاص موضوع تھے۔

”اس وقت اگرچہ قومی آزادی حاصل کرنے کے لیے آزمائشی کوششیں جاری تھیں لیکن ہم نے دل سے انگریز قوم کی فیاضی میں اپنا اعتقاد کھویا تھا۔ یہ اعتقاد ہمارے راہنماؤں کے جذبات میں اس مظلومی سے جڑ پکڑ چکا تھا کہ ان میں یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ فاتح خود اپنے رحم و کرم سے مفتوح کی آزادی کا راستہ ہوا کرے گا۔

”یقیناً حکمرانوں کی بخشش پر ذلت آمیز انحصار رکھنے کی ذہنیت فخر کی کوئی بات نہ تھی۔ البتہ قابل ذکبات یہ تھی کہ ہم نے اس وقت بھی انسانی غفلت کو دل۔ جان سے تسلیم کر لیا جب یہ اجنبی میں ظاہر ہوئی۔

”قدرتی طور پر میں انگریزوں کو دل سے چاہتا تھا۔ میری زندگی کا پہلا باب یوں ختم ہوا۔ تب ہمارے راستے الگ ہو گئے۔ ایک دردناک احساس کے ساتھ میری آنکھیں کھل گئیں جب یہ حقیقت برہنہ ہوئی شدت کے ساتھ مجھ پر روشن ہونے لگی کہ جن لوگوں نے تہذیب کے بلند ترین اصولوں کو قبول کیا انھوں نے کتنی بے باکی کے ساتھ انھی اصولوں کو ترک کر دیا کیوں کہ ان کے قومی مفاد کا یہی تقاضا تھا۔^{۱۰} نیگور کی اس منظر کشی سے ظاہر ہے کہ کس طرح ہندوستان میں برطانوی حکومت سے متعلق ہندوستان کے روشن خیال طبقے کے ابتدائی خواہوں کی تعبیر پوری نہ ہوئی کس طرح اسے نئے نفاذات دریافت کرنے پڑے جو ہندوستان کے منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے قومی اقتصاد کی بنیاد بن سکیں۔

اس دور کے اقتصادی میدان میں برطانیہ کی ہندوستان کو لوٹنے کی پالیسی میں اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ مارکس نے مندرجہ ذیل الفاظ میں اس کی خوب تصویر کھینچی ہے:

”برطانیہ عظمیٰ کے حکمران طبقات نے اب تک ہندوستان کی ترقی میں صرف اتفاق، غامضی اور شاد و ناادر دل چسپی لی تھی۔ طبقہ امرا سے فتنہ کرنا چاہتا تھا۔ سرمایہ دار طبقے کا مقصد اسے لوٹنا تھا۔“

بہر حال مستقبل بعید میں ہم یقیناً اس عظیم اور دل چسپ ملک کے لئے جنم کو دیکھنے کی توقع رکھتے ہیں جس کے ادنیٰ ترین طبقات میں بھی شریف النفس باشندے اہل اٹلی سے زیادہ ہنرمند ہیں اور ان کی اطاعت میں بھی خاص نجدہ شرافت کا رنگ ہے۔ باوجود طبعی سستی کے انھوں نے اپنی بہادری سے انگریز انفرس کو محو حیرت کر دیا ہے۔ ان کا ملک ہماری زبانوں اور ہمارے مذاہب کا سرچشمہ رہا ہے۔ ان کے جاٹ قدیم جرنوں کی اور ان کے برہمن قدیم یونانیوں کی شال پیش کرتے ہیں۔

ہندوستان نہ صرف بذات خود برطانیہ کا نہایت قیمتی انعام تھا بلکہ اس لیے بھی بہت اہم تھا کہ اس نے برطانیہ کو دوسرے ملک فتح کرنے اور اپنی سلطنت کو وسعت دینے کے قابل بنایا۔ کے۔ ایم۔ پائیک کا بیان ہے، "بلاشبہ ہندوستان ایک عظیم ایشیائی قوت ہے جس کے بن بوتے پڑی چین کے دروازے پھٹ سے کھول دیے گئے اور باقی ایشیا یورپ کی ایک بستی بن کے رہ گیا۔ اگرچہ ہندوستان کی فوجی فتح صرف ۱۸۵۸ء میں پایہ تکمیل کو پہنچی لیکن ۱۸۱۸ء تک یہاں برطانیہ کے قدم جم چکے تھے۔ برطانیہ میں صنعتی انقلاب آچکا تھا اور وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ نیپولین کے بعد کے دور میں اس نے بحرالکاہل میں اپنا سیاسی اور اقتصادی اقتدار بڑھالیا۔" ۲۰۶

۱۸۵۷ء سے پہلے ہی "ہندوستان سے باہر برطانوی سلطنت کی توسیع کا منصوبہ باندھا گیا تھا اور ہندوستان کی برطانوی سرکار برطانیہ کے فائدے کے لیے مشرق میں فتح اور الحاق کی خطرناک راہ پر گامزن تھی۔ البتہ اس کا خرچ ہندوستانی محصول گزاروں کے سر پر ۱۸۵۷ء اس طرح ملاکا اور سنگاپور پر قبضہ کر لیا گیا۔ برما کو فتح کیا گیا، نیپال اور افغانستان کی جنگیں لڑی گئیں اور جنگ ایران کا بھی اہتمام کیا گیا۔ برطانوی سلطنت کا قیام جس کی بنیاد ہندوستان پر تھی ۱۸۵۷ء کے بعد شروع ہوا۔ درحقیقت اب ہندوستان محض ایک برطانوی مقبوضہ بستی بن کے رہ گیا۔ اس وقت سلطنت ہند ایک براعظم کی حیثیت کو کھیتی تھی اور ایک ایسا سیاسی نظام وجود میں آیا جس کی بنیاد ہندوستان پر تھی۔ مدن سے بانگ کانگ تک اس کا سکہ چلتا تھا۔ ۲۰۸ اس دور میں افغانستان اور ایران حقیقتاً برطانیہ کے زیر سایہ تھے۔ شمال میں منگولیا اور تبت کو نہات اور وفد بھیجے گئے اور جنوب مشرقی ایشیا اور چین میں برطانیہ کو ایک مستحکم مقام حاصل ہو گیا۔

"اس براعظم کے نظام میں ہندوستان کو اپنے درجے کی شرکت حاصل تھی۔ برطانیہ کی بڑھتی ہوئی نوآبادیوں کی صنعت و کاشت کے کارخانوں میں ہندوستانی بطور سپاہیوں، تاجروں، سود خوروں اور قلمیوں کے کام کرتے تھے۔ ہندوستان کے مادی اور انسانی وسائل سے نہ صرف فتح کرنے بلکہ برطانیہ کی

اور کنگال کسانوں سے انقلاب پسند مزدوروں کا طبقہ وجود میں آیا۔ ہندوستانی سماج میں۔ دو جدید طبقات
 ہیں جنہوں نے ہندوستان کی قومی تحریک کو ایک نیا جہوری رنگ دیا اور اسے کامیابی حاصل کرنے میں مدد
 دی۔ یہی طبقات اس نوآبادیاتی پس ماندگی کو ملک کی صنعتی ترقی کے ذریعہ ختم کرنے کا سبب بن گئے جو برطانوی
 مشہنشاہیت چھوڑ گئی ہے۔

انگریزوں نے اپنا اُتو سیدھا کرنے کی غرض سے تعلیم یافتہ ہندوستانی متوسط طبقہ پیدا کیا اور اسے
 باورِ طبقے کا نام دے کر اس کی ہنسی اُڑائی۔ البتہ یہی طبقہ ہندوستان کا انقلابی اور ترقی پسند روشن خیال طبقہ
 بن گیا اور قومی تحریک میں اس نے نمایاں حصہ لیا۔ مگر کس نے پیش گوئی کی کہ: "ایک نیا طبقہ وجود میں آ رہا ہے
 جو حکومت کی ضروریات کو پورا کرنے کے اہل ہے اور یورپی سامنس سے بخوبی آشنا ہے۔"

ہندوستان کے استحصال اور اس پر قابو رکھنے کی غرض سے انگریزوں نے ہندوستان میں سیاسی
 اور معاشی مرکزیت قائم کی۔ یہی سیاسی اتحاد بالآخر سارے ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف قومی بیداری کی
 ترقی اور تحریک آزادی کی ابتدا کا موجب ہوا۔ مگر کس نے ہندوستان کے سیاسی اتحاد کو اس کے کاپالٹ
 کی پہلی شرط قرار دیا۔

بقول مارکس: "بھاپ نے ہندوستان اور یورپ کے درمیان آمدورفت کا ایک باقاعدہ اور تیز
 سلسلہ قائم کر دیا ہے۔ اس کے بڑے بڑے بندر گاہوں کو جنوب مشرقی سمندر کی بندرگاہوں کے ساتھ ملا دیا
 ہے اور اسے الگ تھلگ ہونے کی حالت سے بے بچا لیا ہے جو اس کے جوہر کا اصلی سبب تھا۔"

مارکس نے ہندوستان کے اس دور میں برطانیہ کے پارٹ کا بول ذکر کیا ہے:
 "برطانوی شہری متوسط طبقہ مجبوراً خواہ کچھ بھی کرے اس سے زکوٰۃ کو سماجی جمہوری سے نجات
 ملے گی اور نہ ہی ان کی سماجی حالت میں قابلِ قدر اصلاح ہوگی۔ اس کی قوت کا انحصار نہ صرف پیداوار کی ترقی
 پر ہے بلکہ قوام کے اس پرافتخار حاصل کرنے پر بھی ہے۔ لیکن ایک بات جو وہ ضرور کریں گے وہ یہ ہے کہ
 ان دونوں صورتوں کے لیے وہ ضروری وسائل فراہم کر دیں گے۔ کیا شہری متوسط طبقے نے کبھی اس سے
 زیادہ کیا ہے؟ کیا اس نے کبھی افراد اور قوم کو خون خرابہ اور مصیبت و ذلت میں مبتلا کیے بغیر ترقی کی ہے؟
 مارکس نے اپنے نتائج پیش گوئی کے طور پر یوں بیان کیے ہیں۔

"ہندوستانی اس وقت تک ان نئے بیجوں کا پھل نہیں پائیں گے جو برطانیہ کے شہری متوسط طبقے
 نے ان کے درمیان بکھیرے ہیں جب تک خود برطانیہ غفلت میں صنعتی مزدوروں کا طبقہ نے حکمران طبقے کی
 جگہ نہیں سنبھال لیتا یا جب تک خود ہندو اسے طاقتور نہیں ہو جاتے کہ برطانوی غلامی کا جو ایکسپلاٹیشن

پایسیدوں کی پرزور مخالفت کی اور ناظول پاشا کے تحت مصریوں کی جدوجہد کے ساتھ یکجہتی کا ثبوت دیا۔ ۱۹۳۰ء کے دوران اس نے جاپانی حملہ آوروں کے خلاف چینیوں کی جدوجہد اور تاناشاہی کے خلاف عالمگیر تحریک وغیرہ کے ساتھ عملی یکجہتی کا اظہار کیا۔ اس لیے یہ محض اتفاق نہ تھا کہ حصول آزادی کے بعد ہندوستان دنیا کی ایک بڑی طاقت بن کر نمودار ہوا اور اسن عالم اور تمام محکوم قوموں کی آزادی کا علمبردار بنا۔

ان اسباق کا ہم پہلے ہی تجزیہ کر چکے ہیں جو برطانوی شہنشاہیت پرستوں نے اپنی ہندوستانی سلطنت کی برقراری اور استحکام کے لیے ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے اخذ کیے اور نیز ان اسباق کا ہندوستانیوں نے ایک نئی قومی تحریک آزادی کی تعمیر کے لیے حاصل کیے۔ فریقین نے ۱۸۵۷ء کے تجربے کو اپنے دستور العمل کی بنیاد بنایا۔

جے۔ آر۔ سیلے نے "دی ایکسپینشن آف انگلینڈ" (The Expansion of England) میں ۱۸۵۷ء میں لکھا: "جوں ہی کسی غدر کا خطہ درپیش ہوگا وہ محض غدر نہیں بلکہ غلام کے جذبہ قومیت کا اظہار ہوگا۔ اسی وقت ہمارے سلطنت کے تحفظ کی تمام امیدیں اور آرزوئیں بھی خاک میں مل جائیں گی۔" ۲۱۱ ایسا دن بالآخر آیا اور فرنگیوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے ۱۸۵۷ء کے بعد ہماری قومی تحریک کو پھیلنے، زور پکڑنے اور پرچار چڑھنے میں پورے نوے سال لگے۔

البتہ ان بیچ کے برسوں میں ۱۸۵۷ء کی یاد نے ہندوستانیوں کے جوش کو ابھارا جس نے انگریزوں کو پریشان کیا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی پچاسویں سالگرہ یعنی ۱۹۰۷ء کے دوران کیر بارڈی ہندوستان میں اپنے تجربات کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ برطانوی حکام کس قدر اضطراب میں مبتلا تھے۔ ۲۱۲ ایڈورڈ تھاہپسن نے ۱۹۲۵ء میں لکھا: "بہت سے ہندوستانیوں کے ذہن میں جب وہ کسی انگریز سے بات کرتے ہیں تو غم کا قصور تیزی سے گھونٹنے لگتا ہے گویا ایک بھوت ہے جس کی تسکین نہیں ہوتی اور جو انتقام کے لیے بے قرار ہے۔" ۲۱۳ ہندوستان کو آزاد کر کے ہم نے ۱۸۵۷ء کے اپنے باغی آباؤ اجداد کی روحوں کو مطمئن کر دیا ہے۔ اپنے مستقبل کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں سنبھال لی ہے اور جن قوموں نے آزادی کی جدوجہد میں ہماری امداد کی ان کے احسان کا قرض چکانا شروع کر دیا ہے۔

حواشی

۲۱۱۔ بیجربی۔ ڈی۔ ہاسو۔ "رائز آف دی کریسچین پاور ان انڈیا" (Rise of the Christian Power in India)

نوابا دیا تو سلطنت کے قیام اور اہتمام میں بھی کام لیا گیا۔

البتہ یہ تصویر کا صرف ایک رخ تھا۔ کہتے ہیں کہ ہندوستانی بغاوت کے لیے غیر ملکی حمایت حاصل کرنے کی غرض سے نانا صاحب کے نمائندے عظیم اللہ نے روس اور ترکی کے ساتھ رابطہ قائم کر رکھا تھا یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ستارا کے نمائندے رنگو بابو جی نے عظیم اللہ کے ساتھ مل کر کام کیا تھا۔ بہادر شاہ کا دربار ایران کی حمایت کا دعویٰ کرتا تھا۔ یہ سب کچھ اس قدیم اصول کی بنا پر عمل میں آیا کہ برطانیہ کے دشمن ہمارے دوست ہیں۔ لیکن برطانیہ اس دور کی عظیم ترین طاقت تھا۔ ان ملکوں کے جاگیردار حکمران طبقے کسی بھی ہندوستانی بغاوت کی مدد کرنے میں جلد بازی سے کام نہ لے سکتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ کر سکتے تھے کہ اس سے فائدہ اٹھائیں اور نتیجہ کا انتظار کریں۔

البتہ ان ملکوں اور دوسرے ملکوں میں جمہوریت پسند طبقات کا یہ دلیہ نہ تھا جیسا کہ اس کتاب کے بین الاقوامی باب میں مطبوعہ مقالات سے ظاہر ہے۔ مہذب دنیا کے تمام جمہوریت پرست مملکتوں میں ہندوستانی بغاوت کے لیے بڑی ہمدردی پائی جاتی تھی۔ ہندوستان کی قومی بغاوت کے ساتھ چارلسٹ (Charles) راہنماؤں کی ایک جہتی کی بہت بڑی اور تاریخی اہمیت ہے۔ برطانیہ کے مزدوروں کی جدید تحریک کا آغاز منشوریوں (چارٹرس) کے ساتھ وابستہ ہے۔ ہندوستان کی جدید قومی تحریک کا آغاز ۱۸۵۷ء سے ہوتا ہے۔ اس امر کی یاد سے ایک نئی برادری کا تصور پیدا ہوتا ہے کہ برطانوی مزدوروں کے طبقے اور ہندوستانی عوام نے اپنی اپنی تحریکوں کے آغاز سے ہی ایک دوسرے کا ساتھ دیا ہے۔ شہنشاہیت پرستی کے خلاف چینی اپنی جدید قومی تحریک کی ابتدائی ٹپنگ بغاوت سے تصور کرتے ہیں جیسا کہ ہم ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے۔ چینی مقالہ اس داستان کو جو آج تک معلوم نہ تھی قلمبند کرتا ہے کہ چینیوں نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا تھا اور ہندوستانی سپاہی زار ہو کر تائی ٹپنگ باغیوں کے ساتھ مل گئے اور ان کے کندھے سے کندھا ملا کر مشترکہ دشمن کے خلاف لڑے۔ مارکس نے اس نئی حقیقت کو سمجھ لیا اور کہا: ”اینگلو انڈین فوج میں بغاوت اس عام بے زاری کے ساتھ رونما ہوئی ہے جو ایشیا کی بڑی بڑی قوموں نے اقتدار اعلیٰ کے خلاف ظاہر کی ہے۔ بلاشبہ جنگالی فوج کی بغاوت کا ایران اور چین کی جنگوں کے ساتھ گہرا تعلق تھا“ ۲۱۰

پس ۱۸۵۷ء کی عظیم قومی بغاوت نے اگلے دور کی ہندوستانی جدوجہد کے ساتھ عالمگیر جمہوری یک جہتی کی بنیاد ڈالی اور ہماری نئی قومی تحریک خود صحیح بین الاقوامی روایات پر قائم ہوئی۔ مثال کے طور پر ہندوستانی قومی تحریک نے ۱۹۲۰ء-۱۹۲۹ء کے دوران مشرق وسطیٰ میں شہنشاہیت پرست

- ۱۹- مایسن : "انڈین میوشن" جلد چہارم صفحہ ۳۸۱
- ۲۰- مارکس : مقالہ بے دستخط ۱۲ اگست ۱۸۵۴ء بحوالہ پرچہ
- ۲۱- موزمدار : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۷۸
- ۲۲- مارکس : *The Future Results of British Rule in India* بحوالہ پرچہ ۸ اگست ۱۸۵۳ء
- ۲۳- مارکس : مقالہ بلا دستخط بحوالہ پرچہ ۱۵ جولائی ۱۸۵۳ء
- ۲۴- مارکس : "برٹش رول ان انڈیا" بحوالہ پرچہ ۲۵ جون ۱۸۵۳ء
- ۲۵- مارکس : "دی نیو انٹیشن" بحوالہ پرچہ ۲۵ جولائی ۱۸۵۸ء
- ۲۶- ولیم ہموٹ : *System of Territorial Acquisition* جلد اول صفحہ ۱۲
- ۲۷- گرانٹ ڈن : "ہسٹری آف ریٹہ" مطبوعہ ۱۸۶۳ء جلد اول صفحہ ۲۴۰
- ۲۸- مایسن : "ہسٹری" جلد اول صفحات ۲۴۸-۲۴۹
- ۲۹- ایم۔ آر۔ گینس : *An Account of the Malinies in Oudh* Pages 557-58
- ۳۰- پارلیمنٹری پیپر ۱۸۳۱-۳۲ء جلد ۱۲ پیپر ۲۵-۷۱ صفحہ ۱۲۶
- ۳۱- شودر : Notes 1, 4, 10. Page 116
- ۳۲- منقول از تصنیف موزمدار صفحہ ۲۰
- ۳۳- منقول از تصنیف ایس۔ بی۔ چودھری *Civil Disturbances in India* P. 221
- ۳۴- رسل : بحوالہ تصنیف جلد اول صفحہ ۱۲۶
- ۳۵- منقول از تصنیف نہرو : "ڈسکوری آف انڈیا" صفحہ ۲۷۳
- ۳۶- منقول از تصنیف چودھری صفحہ ۲۱۰
- ۳۷- منقول از تصنیف چودھری صفحات ۲۱۰-۲۱۱
- ۳۸- سر سید احمد خاں : *The Causes of the Indian Revolt* P. 44
- ۳۹- ایس۔ این۔ سین : *Eighteen fifty - seven* P. 32
- ۴۰- منقول از تصنیف چودھری صفحہ ۲۱۵
- ۴۱- ایضاً صفحہ ۲۰۵
- ۴۲- شودر : Notes 1, P 166

(Law in India) مطبوعہ ۱۹۳۱ء صفحہ ۹۵۲

- ۲۔ جان ولیم کے: "۱۷۷۱ء ہسٹری آف دی سپاہی وار" (A History of the Sepoy war) جلد اول صفحات ۱۷-۱۱۶
- ۳۔ کارل مارکس: مقالہ بلا دستخط: "دی انڈین کوانٹین" (The Indian Question) نیویارک: ڈیلی ٹریبون، مورخہ ۱۲ اگست ۱۸۵۷ء (انسٹی ٹیوٹ آف مارکسزم سین ازم پرنس کا ملکی نسخہ)
- ۴۔ منقول از تصنیف دی۔ ڈی۔ سادوکر: "انڈین وار آف انڈیپنڈنس" (Indian war of Independence) صفحہ ۱۲
- ۵۔ چارلس بال: انڈین میوٹی (Indian Mutiny) جلد اول صفحہ ۶۴۲
- ۶۔ ڈبلیو۔ ایچ۔ رسل: "مائی ڈائری ان انڈیا ان ایئر ۱۸۵۸-۵۹" (My Diary in India in the years 1858-59) صفحہ ۱۶۴
- ۷۔ کرنل جی۔ بی۔ مائین: "انڈین میوٹی آف ۱۸۵۷" (Indian Mutiny of 1857) دیباچہ صفحہ ۷۱۱
- ۸۔ منقول از تصنیف سادوکر صفحہ ۲۵۷
- ۹۔ منقول از تصنیف آر۔ سی۔ موزمدار: "The Sepoy Mutiny and Revolt of 1857" صفحہ ۲۲۴
- ۱۰۔ "نیرٹو آف ایونٹس، کانپور ۱۸۵۷-۵۸" نمبر ۶۸
- ۱۱۔ ایضاً: جھانسی ۱۸۵۷-۵۸
- ۱۲۔ ایضاً: میرٹھ نمبر ۴، ۱۸۵۸ء
- ۱۳۔ منقول از تصنیف سادوکر صفحہ ۲۸۱
- ۱۴۔ موزمدار: بکوال تصنیف صفحہ ۲۷۵
- ۱۵۔ مائین: "ہسٹری آف دی انڈین میوٹی" جلد دوم صفحات ۸۶-۲۸۵
- ۱۶۔ ایضاً: جلد چہارم صفحہ ۲۲۷
- ۱۷۔ منقول از تصنیف سادوکر صفحات ۱-۵۰۰
- ۱۸۔ رسل: بکوال تصنیف صفحہ ۴۰۰

۶۲۔ مارکس: "The East India Company: Its History and Results" New York, Daily Tribune, July 11, 1953

۶۳۔ رام کرشن مکرجی: "The Rise and Fall of the East India Company" Page 174

۶۵۔ کے۔ ایم۔ پانیکر: "Asia and Western Dominance P. 99

۶۶۔ علامہ فضل حق خیر آبادی: "دی اسٹوری آف دی داران انڈینڈنس ۱۸۵۴ء" جو "جرنل

آف دی پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی" جلد: پنجم مورخہ یکم جنوری ۱۹۵۴ء صفحہ ۲۹ میں شائع ہوا۔

۶۷۔ "نیشنل میریڈر"۔ اگست ۱۹۵۴ء

۶۸۔ ایضاً

۶۹۔ مکرجی: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۲۳

۷۰۔ آر۔ سی۔ دت: "The Economic History of India in the Victorian Age P. XV

۷۱۔ مننگری مارٹن: "ایسٹرن انڈیا" - دیا چہ، جلد اول

۷۲۔ ایضاً دیا چہ، جلد سوم

۷۳۔ مکرجی: بحوالہ تصنیف صفحات ۲۵-۲۲۲

۷۴۔ مارکس: "دی پریس زول ان انڈیا" مطبوعہ نیویارک ڈیلی ٹریبون مورخہ ۲۵ جون ۱۸۵۲ء

۷۵۔ مارکس۔ اینجیل: "سیکلڈ ورکس" جلد اول صفحہ ۲۲۵

۷۶۔ فائ: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۲۷

۷۷۔ کے: بحوالہ تصنیف جلد اول صفحہ ۳۸۱

۷۸۔ رابرٹس: "فارٹی ایرس ان انڈیا" صفحہ ۴۲۱

۷۹۔ ہال: بحوالہ تصنیف جلد اول صفحہ ۶۲۹

۸۰۔ فضل حق: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۹

۸۱۔ منقول از تصنیف ساورکر صفحہ ۵۵

۸۲۔ ایضاً صفحہ ۵۶

۸۳۔ ایضاً صفحات ۶۲-۶۱

- ۴۳۔ کے: بحوالہ تصنیف جلد اول صفحہ ۸۰
- ۴۴۔ بال: بحوالہ تصنیف جلد اول صفحہ ۶۴۴
- ۴۵۔ سرٹی: شکات: *Two Narrations of the Mutiny at Delhi* P. 18-19
- ۴۶۔ ایضاً صفحات ۱-۲
- ۴۷۔ منقول از تصنیف سادکر صفحہ ۲۶۰
- ۴۸۔ سین: بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۱
- ۴۹۔ مارکس: "دی برٹش رول ان انڈیا" بحوالہ پرچہ ۲۵ جون ۱۸۵۳ء
- ۵۰۔ مارکس: *Capital: A Critique of Political Economy* Vol III P. 392
- ۵۱۔ منقول از تصنیف چودھری صفحہ ۱۰
- ۵۲۔ مارکس: "کیپٹل" جلد سوم صفحہ ۲۹۲ ایف ایف
- ۵۳۔ نرجان اسٹریچ: *India: Its Achievements and Progress 1911*, Page 137
- ۵۴۔ ایضاً: صفحہ ۲۲۷
- ۵۵۔ ایضاً صفحات ۵۸-۵۷
- ۵۶۔ خان: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۷-۲۶
- ۵۷۔ سین: بحوالہ تصنیف صفحات ۲۵-۲۴
- ۵۸۔ لو: *Central India During the Rebellion of 1857-58* P. 326-37
- ۵۹۔ اعلان بہادر شاہ مورخہ ۲۵ اگست ۱۸۵۷ء مطبوعہ "دہلی گزٹ" ۱۸۵۷ء میرام پور سے شایع ہونے والے "فرینڈ آف انڈیا" کے پرچہ مورخہ ۱ اکتوبر ۱۸۵۷ء میں بعنوان "The Delhi Millennium" چھاپا گیا۔ "نیشنل ہیئرلڈ" لکھنؤ مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۵۷ء میں دوبارہ طبع ہوا۔
- ۶۰۔ ڈی۔ آر۔ گینڈمل: *Industrial Evolution of India* طبع چہارم ۱۹۴۴ء صفحہ ۲۸
- ۶۱۔ ایضاً صفحات ۴۵-۴۴
- ۶۲۔ آر۔ پی۔ دت: "انڈیا ٹوڈے" صفحہ ۹۸

- ۸۴- فان : بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۸
- ۸۵- ایضاً : صفحات ۲۲-۲۳۔ مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں موزمدار : بحوالہ تصنیف صفحات ۵۲-۲۸۸ نیز سین : بحوالہ تصنیف صفحات ۲۲-۲۰
- ۸۶- منقول از تصنیف سادکر : صفحہ ۵۵
- ۸۷- موزمدار : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۸۹
- ۸۸- ایضاً : . . . صفحہ ۲۲۹
- ۸۹- بال : بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۲۸۲
- ۹۰- مشکات : بحوالہ تصنیف صفحات ۹۹-۹۸
- ۹۱- مارکس : مقالہ بلا دستخط : "دی انڈین ریلوٹ" مطبوعہ "نیویارک ڈیلی ٹریبیون" مورخہ اگستبر ۱۸۵۷ء
- ۹۲- سز آر-ایم-کوپ لینڈ : *A Lady's Escape from Gwalior and Life in the Fort of Agra During The Mutinies of 1857* P 234
- ۹۳- فضل حق : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۰
- ۹۴- فارست : "اے ہسٹری آف دی انڈین میوٹنی" جلد اول صفحہ ۲۱۷
- ۹۵- کے اینڈ مالین : "ہسٹری آف دی انڈین میوٹنی" جلد دوم صفحہ ۲۸۱
- ۹۶- منقول از تصنیف سادکر صفحہ ۱۲۵
- ۹۷- منقول از تصنیف ایڈورڈ تھامپسن : "دی اور سائڈ آف دی میڈل" صفحات ۷۳-۷۴
- ۹۸- منقول از تصنیف موزمدار صفحہ ۱۱۲
- ۹۹- ٹی-آر-ہومز : "ہسٹری آف دی سپاہی وار" صفحہ ۱۲۴
- ۱۰۰- فضل حق : بحوالہ تصنیف
- ۱۰۱- ایچکینسن : "لائف آف لارنس" جلد دوم صفحہ ۲۶۲
- ۱۰۲- ایضاً : . . . صفحہ ۴۵۴
- ۱۰۳- مارٹن : "دی انڈین ایسپائر" جلد دوم صفحہ ۴۴۹
- ۱۰۴- منقول از تصنیف سادکر صفحہ ۱۳۴

۱۵۲. مکات : بحوالہ تصنیف صفحات ۳۵-۱۳۴
۱۵۳. ایضاً : صفحہ ۱۲۰
۱۵۵. ایضاً : صفحہ ۱۲۰
۱۵۶. ایضاً : صفحہ ۱۹۸
۱۵۷. ایضاً : صفحہ ۱۹۹
۱۵۸. ایضاً : صفحہ ۲۱۵
۱۵۹. ایضاً : صفحہ ۲۲۶
۱۶۰. ہومن : بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۵۲
۱۶۱. ملاحظہ فرمائیں مقالہ "تلمیذ خلدون، اس کتاب میں
۱۶۲. مکات : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۲۲
۱۶۳. مکات : بحوالہ تصنیف صفحات ۹۲-۹۳
۱۶۴. ایضاً : صفحہ ۲۲۰
۱۶۵. ہاشوتیا بھٹا چارہ : "جھانسیزانی" (بنگالی زبان میں) صفحہ ۲۵۲
۱۶۶. مائیکل جانس : "دی آرڈیل اینٹ لکھنؤ" صفحہ ۲۸۴
۱۶۷. ملاحظہ فرمائیں مقالہ "تلمیذ خلدون نیز اشوک ہتہ : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۷
۱۶۸. تیاتخ ۵ اکتوبر ۱۸۵۶ء ملاحظہ فرمائیں ایس : بحوالہ تصنیف جلد سوم صفحہ ۲۸۷
۱۶۹. تیاتخ ۳ فروری ملاحظہ فرمائیں ایضاً جلد دوم صفحہ ۳۳۴
۱۷۰. بال : بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۲۴۱
۱۷۱. منو : از تصنیف اشوک ہتہ صفحات ۵۱-۵۲ نیز سادکر : بحوالہ تصنیف صفحہ ۴۴۴
۱۷۲. رسل : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۷۶
۱۷۳. گبنس : بحوالہ تصنیف صفحہ ۵۳
۱۷۴. ہومن : بحوالہ تصنیف صفحہ ۵۰۶
۱۷۵. تھارن ہل : "انڈین میوٹی" صفحہ ۳۵
۱۷۶. ولیم ایڈورڈس : "پرسنل ایڈو پیگز ان دی انڈین ریپبلین" صفحات ۱۲-۱۳
۱۷۷. منقول از تصنیف اشوک ہتہ صفحہ ۴۶

- "The Future Results of British Rule in India" : مارکس :
New York, Herald Tribune, June 25, 1853.
- ۲۰۱۔ مارکس اینڈ اینجیلس : "سیکلنگ کارس پانڈنس" صفحہ ۷۰
- ۲۰۲۔ مارکس : "دی برٹش رول ان انڈیا" نیویارک میرل ٹریبیون روز ۲۵ جولائی ۱۸۵۳ء
- ۲۰۳۔ مارکس : "The Future Results of British Rule in India" : مارکس :
New York Herald Tribune, August 8, 1853.
- ۲۰۴۔ ایضاً
- ۲۰۵۔ پائیک، بحوالہ تصنیف صفحہ ۹۵
- ۲۰۶۔ ایضاً ، ، صفحہ ۱۰۵
- ۲۰۷۔ ایضاً ، ، صفحات ۱۶۲-۹۲
- ۲۰۸۔ ایضاً ، ، صفحات ۱۶۴-۶۵
- ۲۰۹۔ ایضاً ، ، صفحات ۱۶۴-۶۵
- ۲۱۰۔ مارکس : مقالہ بلا دستخط "نیویارک میرل ٹریبیون" ۱۵ جولائی ۱۸۵۳ء
- ۲۱۱۔ منقول از تصنیف آر پی۔ دت صفحہ ۲۳۵
- ۲۱۲۔ جے کیر ہارڈی ایم پی۔ "انڈیا" صفحات ۵۸-۹۰
- ۲۱۳۔ تماپسن، بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۰

۱۷۸- "نیربھو آن ایٹس" نمبر ۲۰۶، ۱۸۵۵ء مؤلف کشن ایف۔ ولیمز مورخ ۱۵ نومبر ۱۸۵۵ء

۱۷۹- ایضاً

۱۸۰- ایضاً مؤلف آر۔ ایم۔ ایڈورڈس مورخ ۱۶ نومبر ۱۸۵۵ء

۱۸۱- ایضاً مؤلف ڈبلیو۔ جے۔ براہی مورخ ۱۶ نومبر ۱۸۵۵ء

۱۸۲- ایضاً مؤلف تھارن بل مورخ ۱۰ اگست ۱۸۵۵ء

۱۸۳- ایضاً مؤلف ایف تھامس

۱۸۴- ایضاً مؤلف ایف۔ بی۔ گبس مورخ ۶ نومبر ۱۸۵۵ء

۱۸۵- ایضاً مؤلف کشن گورکھ پور مورخ ۸ جولائی ۱۸۵۵ء

۱۸۶- ایضاً مؤلف جی۔ ایچ۔ فریلنگ

۱۸۷- ایضاً مؤلف ایف۔ ڈی۔ مین۔ مورخ ۲۲ ستمبر ۱۸۵۵ء

۱۸۸- ہومن: بحوالہ تصنیف

۱۸۹- گبس: بحوالہ تصنیف صفحہ ۵۸

۱۹۰- موزلار: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۱۷

۱۹۱- نہرو: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۸۷

۱۹۲- ایضاً: صفحہ ۲۶۸

۱۹۳- گبس: بحوالہ تصنیف

۱۹۴- ٹیلیگرم مورخ ۲۹ جون ۱۸۵۵ء: فارسٹ: بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۲۹

۱۹۵- پانیکر: بحوالہ تصنیف صفحات ۱۵۶-۱۷۵

۱۹۶- نہرو: بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۸۵

۱۹۷- ارل گریول ۱۹ فروری ۱۸۵۵ء: بدالالار: بحوالہ الزامات صدر بورڈ آف کنٹرول

۱۹۸- لڈالین براہ پارلیمنٹری ڈبیتس "سلسلہ سوم" CXL VIII ۱۸۵۵ء صفحہ ۲۹-۱۶۲۸

منقول از تصنیف سین صفحہ ۲۹

۱۹۹- دادا بھائی ناروجی: "دی کنڈیشن آف انڈیا" وزیر ہند کے ساتھ خط و کتابت "جری"

آف دی ایٹ انڈیا افیرز

XIV 1882 P.P 171-172

۲۰۰- منقول از تصنیف نہرو صفحات ۷۸-۷۶۶

حصہ دوم

۱۸۵۷ء اور ہندی ادب

۱۸۵۷ء ہندوستان عوام کے حافظے میں ایک یادگار سال ہے جس میں برطانوی حکومت کو ایک حقیقی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا اور اس کے اقتدار کو سخت دھکا لگا۔ بعد میں اس کی یاد نے قومی آزادی کی متعدد تحریکوں میں جوش پیدا کیا۔ خاص طور پر آنے والے برسوں میں مسلح بغاوت کی تمام کوششوں کو ۱۸۵۷ء کی روایت سے قابل قدر اخلاقی تقویت ملی۔ بغاوت کے سرکردہ رہنماؤں کو بالخصوص لالی کشی بانی اور کنور سنگھ کو ہندوستانیوں کے دلوں میں بحیثیت قومی سوراؤں کے عزت کا مقام حاصل ہے بہت سی نظروں، لوگ گیتوں اور دوسری ادبی تخلیقات میں ان کے کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔

ہندی ادب میں بغاوت کے سیدھے حوالے بہت کم ہیں لیکن اقتصادی لوٹ کھسوٹ کی طعن اشاروں کی کثرت ہے۔ ہمیں اپنے شاعروں اور نثر نگاروں کے ادب پاروں سے ذلت اور درد و کرب کے احساس کا پتہ چلتا ہے۔ تمام جدید ہندی ادب میں ردیف شعری طرح اس غم کا بار بار اظہار کیا گیا ہے کہ اغیار نے ذمہ داری اس عظیم ملک کو تباہ و برباد کیا بلکہ اس کی عزت کو سبھی خاک میں ملایا۔

مغلیہ حکومت کے آخری دور میں ہندی شاعری میں عشقیہ مضامین اور رسمی اسالیب شاعری کا غلبہ تھا۔ ملک پر برطانوی قبضہ کے بعد یہ شاعری سماجی شعور حاصل کرنے لگی۔ اس دور کے شاعر پنڈت گیار دت تواریسی اس بات پر اظہارِ تاثر کرتے ہیں کہ ملک عیش و عشرت کا دلدادہ ہے؛

”ہندوستانی عیش و عشرت میں مستغرق ہیں اور انھوں نے اس کے آلام و آفات سے آنکھیں موند رکھی ہیں۔ وکاسیت کی بہادری کہاں ہے؟ راجہ بھوج کا نام و نشان نہیں رہا۔ پایہ تخت کی ساری آبادی عیاشی میں محو ہے۔ قنوج کی آب و تاب کہاں ہے؟“

ایک اور شاعر مکھند پنچن اسی قسم کے جذبات کو ظاہر کرتا ہے:

”ہندوستان غمزدہ ہے، ہزاروں سال اس نے سختی جھیل ہے۔ ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ان

آہ! مصائب نے ہندوستان کو پست کر رکھا ہے ۴۹
اسی طرح پرتاپ نرائن مشرا اس بات پر افسوس کرتا ہے کہ ملک کی تمام دولت کو انگریز لوٹ کر
لے جا رہے ہیں:

”انگریز ہم سے ہر چیز چھین لیتے ہیں
ہم صرف باتیں کرنا جانتے ہیں
عمل کے بغیر باتیں بے سود ہیں
ہم جادو ٹونوں سے نصیبت کو نہیں ٹال سکتے۔ ۵۰
بھارتیندو اس حقیقت کی وضاحت کرتا ہے کہ کس طرح تجارت اور دستکاری کی تباہی
سے ملک کو مفلس کر دیا گیا ہے:

”وہ ہمیں مشینوں کے ذریعے لوٹ رہے ہیں
دولت دن بدن کم ہو رہی ہے جب کہ آلام و مصائب بڑھ رہے ہیں
باریک سوتی کپڑے اور نفیس مٹل کے بغیر ہمارا کام نہیں چلتا
ہم غیر ملکی جولاہوں کے غلام ہیں
ہر چھوٹی موٹی چیز باہر سے درآمد کی جاتی ہے
ہر روز یہاں بھرے ہوئے جہاز آگرمال اتارتے ہیں۔ ۱
اس دور کے ادب میں یکے بعد دیگرے آنے والے قحطوں کا بار بار ذکر کیا گیا ہے جسکی نرائن
چودھری پریم گھمن لکھتا ہے:

”بھاگو لوگو! بھاگو! خوفناک قحط پڑ گیا ہے
ہندوستان پر تباہی کی گھنگھور گستاخیں چھا رہی ہیں
بیوپار اور تجارت کا خاتمہ ہو گیا ہے
صنعت و حرفت کا نام نہیں باقی ہے
نذر اعلیٰ بالکل برباد ہو چکی ہے
چاروں طرف ہنگامی کی آگ بھڑک رہی ہے۔ ۲
۱۸۵۷ء کی بغاوت کا براہ راست حوالہ دیتے ہوئے بھارتیندو اس دہشت گردی کا ذکر کرتا ہے جو
بغاوت کے بعد لوگوں پر طاری ہوئی:

مصائب پر کیسے قابو پائیں۔ وہ لاپرواہ ہیں اور سوچتے ہیں کہ اس پر کیوں وقت ضایع کریں۔ جو ہو، سو ہو۔
ہم رادھا اور کم کے قصور میں محو ہیں۔ ۲۰

مشہور ہندی ناول نگار و دنداون لال ورا کے پاس ہر دیش کی ایک نظم ہے جو جھانسی کی رانی
کشمی بانی کا معصر تھا۔ ہر دیش بھی اخلاقی قدروں کے المناک زوال پر تاسف کا اظہار کرتا ہے،
وہ لکھتا ہے:

”اس کجنگ میں کتنے امیر کبیر خاک میں مل گئے
لیکن او بائش گردن میں موتیوں کے ہار پہنے پھرتے ہیں
بقول ہر دیش علما برن کی کھال اوڑھتے ہیں

لیکن مطرب اور رقاص قیمتی شال زیب تن کرتے ہیں۔ ۲۱

گنگا پر ساد اور چیزیش کی ناتمام نظیں اور شاعر بھیگی داؤ جی شام کی راسو کا ایک مسخ شہر
جھانسی کے مشہور انقلاب پسند ماہنامہ شری بھگوان سنگھ ماہور کے پاس ہے جو بمساول مقدمہ سازش
میں ماخوذ تھے۔ رانی جھانسی سے متعلق بندھیکھنڈ کے مشہور شاعر کیان کی ایک نظم ہے۔ اس کے جو حصے
دستیاب تھے وہ حال ہی میں شائع ہوئے ہیں۔ ان نظموں میں بعض ایسے نادر اشعار ہیں جو زور زبان اور
حسن خیال کے مرتبے ہیں۔ ان سے غیر ملکی حکومت کے خلاف جہاد، شجاعت، جواخردی اور ایثار نفس کی
روایات اور حفاظت کی تکمیل ہوتی ہے۔

متنازعہ اور ادراک کی تصنیفات میں اقتصادی خسارے، مفاسی اور لوٹ کھسوٹ کے شعور کا
متواتر اظہار پایا جاتا ہے

بھارتیہ مترو اپنے مشہور نامک ”بھارت ڈروشا“ میں لکھتا ہے:

”ہندوستان کے مصائب حد درجہ جگر خراش ہیں!
خون سے لوگوں کی آنکھوں تلے اندھیرا ہے وہ مفلس اور کنگال ہیں
برطانوی حکومت کے تحت ہر قسم کی راحت اور نعمت میسر ہے

لیکن ملک کی دولت کو لوٹ کر باہر لے جایا جا رہا ہے
مہنگائی، بیماری اور موت نے ملک میں دم کر رکھا ہے

رنج و الم روز بروز بڑھ رہے ہیں

اس پرنیکس اور بھی غضب ڈھا رہے ہیں

بلند پایہ باغی راہنماؤں کی غفلت اور عزت کے راگ اٹا پے گئے ہیں۔ وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ عوام ملک کی اس بربادی اور اس کے استحصال کو۔ جو ایٹ انڈیا کمپنی کا خاصہ تھا۔ نفرت اور خصومت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان گمنام شاعروں نے بغاوت کے ان راہنماؤں کو دیوتا کا درجہ دے کر عقیدت کے پھول چڑھائے کیوں کہ ان سوراؤں نے حیرت انگیز دلاوری اور بہادری کے ساتھ ایک ایسے دشمن کا مقابلہ کیا جو مسلح قوت اور تنظیم کے اعتبار سے برتر تھا۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کی اس روایت کی لوگوں نے پورے سو سال پرورش کی جو شجاعت ایثار نفس اور ناقابل تسخیر حب وطن کی روایت تھی۔ بعد کی مسلح بغاوتوں کے لیے یہ فیضان کا سرچشمہ رہی۔ مثلاً چٹاگانگ کی بغاوت اور حال کی بحری فوج کی بغاوت جو ہندوستان سے انگریزوں کے جلد زخمت ہونے کا سبب بنی۔ ادیب اور شعرا نے خدمت خلق کے لیے اپنی زندگی کو وقف کرنے اور رفائہ غامہ کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرنے میں اس روایت کو برقرار رکھا۔ یہ روایت بھارتیہ و کے زمانے کے دویدی بنگ کے اور چھایا واد کے شعرا اور ادیبوں کی تصنیفات و تصانیف کے دم سے زندہ ہے۔ یہ روایت منشی پریم چند کی تصنیفات میں بھی محفوظ ہے اور ان ترقی پسندوں اور نئی نسل کے ادیبوں کی تصنیفوں میں بھی جو روز بروز زور پکڑ رہے ہیں۔ ایسی تصنیفات جیسے بھارت بھارتی، ماکس لال چٹوپی، سمجھداکاری چوہان اور نوین کی قومی شاعری میں۔ پرساد، نرالا اور پنیت کے کلام میں، پریم چند، راہس، لیش پال، رائے وائسو، نگرجن اور رینو کے ناولوں میں۔ رانی جھانسی سے متعلق سمجھداکاری چوہان اور ورنندا و لال ورمائی کے معرکہ الہاقتضایف اور زیندر، کیدار، سمن اور آج کے متعدد عوامی شعرا کی شاعری میں ہم کو ۱۸۵۷ء کی گونج سنائی دیتی ہے۔

جدید ہندی ادیب متواتر اپنی تصنیفات میں ہندوستان کی قومی توہین کا ذکر کرتے ہیں۔ اگرچہ تری میتھلی شرن گپت کی بھارت بھارتی کی طرز غیر معمولی طور پر شائستہ نہیں ہے لیکن اس میں ایسے اشعار موجود ہیں جن سے ہر محب وطن کا دل متاثر ہوتا ہے۔ ایام بغاوت کے شعرا کی طرح شری میتھلی شرن گپت بھی ملک میں افلاس اور قحط کے پھیلنے پر درد و کرب کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں

”جہاں دولت تھی، ہر چیز کی افراط تھی۔ زندگی با مقصد تھی
ساری دنیا میں ہندوستان“ سونے کی چڑیا کے نام سے مشہور تھا

اب وہاں مفلسی کا خوفناک شنگنا پچا ہے
اب چاکری کے سو کوئی کام نہیں جس سے روزی کھائی جائے

”فوجی بغاوت کی آگ کو بیدری کے ساتھ فرو کیا گیا

دہشت کے مارے ہندوستان دم نہ مار سکتے تھے۔“

پرتاپ نرائن سشرا اور بدری نرائن چودھری پریم گھن نے بھی اپنی نظموں میں بغاوت کی طرف ناگوار اشارے کیے ہیں۔ ان کا خیال ہے بغاوت غیر مطمئن لوگوں کا کام تھا۔ پرتاپ نرائن مشر لکھتا ہے:

”جب مشعل میں فوج کے ایک حصے نے بغاوت کی

تو لوگوں نے ثابت قدمی کے ساتھ حکمرانوں کا ساتھ دیا۔“

پریم گھن بھی اسی انداز میں لکھتا ہے:

”اہل مشرق خوفزدہ تھے۔ لوگوں پر ہیبت طاری تھی

جن لوگوں نے خیال کیا کہ مذہب اور ذات خطے میں پڑ گئے ہیں

انھوں نے چند جاہل فوجیوں اور شہدوں کو اپنے ساتھ لایا

انھوں نے بڑی تابانی پائی اور اپنی بربادی کے بیج بوئے۔“

انیسویں صدی کے نصف آخر میں بہت سے شاعر جاگیرداروں کے سایہ عاطفت میں رہتے تھے اس لیے وہ ان کے زیر اثر تھے۔ قدرتی طور پر بغاوت کے تئیں ان کا رویہ وہی تھا جو ان کے سرپرستوں کا تھا۔ چنانچہ

سیوک ”واگ دلاس“ میں انگریزوں کے تئیں اپنے مرتبوں کی ان خدمات کے لیے مدح سرائی کرتا ہے جو انھوں نے بغاوت کے دوران انجام دیں:

”تمام اوصاف سے آراستہ، انعام و اکرام عطا کرنے والا،

انگریزوں کا وفادار، حسین اور خوب رو،

اس نے بغاوت کے دوران حکمرانوں کی بے حد مدد کی۔“

ایک اور شاعر ”رس راج“ بھاری سنگھ البتہ کپہنی کی حکومت کے تحت لوگوں پر ڈھائے گئے جو روستم کا ذکر کرتا ہے جس نے بالا خاں کا پیمانہ ”صبر بھریز“ کر دیا اور انھیں بغاوت پر آمادہ کیا:

”ساری دنیا جانتی ہے کہ مشعل کے ہنگامے کے دوران کس قدر

مظالم ڈھائے گئے۔ لوگ دہشت زدہ تھے۔“

جب ہم کم مشہور یا کم نام شعرا کے کلام کو دیکھتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ان باتوں کو

زیادہ نیا ضامن خراج تحسین ادا کیا جنھوں نے غیر ملکی حکومت اور اس سے وابستہ بے غیرت تاخت و تاراج کے خلاف بغاوت کی تھی۔ لوگ گیتوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ جھانسی کی رانی لکشی بائی اور کنور سنگھ جیسے

مصنف لیش پال "بلچنا" اور "وژن کے بیٹے" مصنف ناگارجن اور "میلانچل" مصنف ریو۔ اس نے راجس ساگر تیان، بھگوت شرن پادھیائے اور رانگے راگھو نو علامہ تصنیفات پر آمادہ کیا۔ ہم اس کی صدائے بازگشت ایسی نظموں میں سنتے ہیں جیسے زبندر کی "لال نشان"، "سمن کی" "نئی آگ ہے"، "کدھر کی" "لیک کی گنگا" اور راجو سکسین کی "ناوک و درودہ" بعض افسانوں مثلاً "تین گندے" مصنف کرشن چندر یا اس کے خاکے "صبح ہوتی ہے" کے پڑھنے سے قومی جنگ کی یاد تازہ ہوتی ہے۔

جوں جوں لوگوں کا شعور بلند تر سیاسی سطح پر پہنچے گا گیت اور افسانوں میں اس عظیم قومی واقعہ کی یاد دہانی کے لیے بہت سے شاعر اور ادیب ۱۹۵۷ء کی بغاوت سے متاثر ہوں گے۔ نئے نئے قومی شعور کے زیر اثر ایسی کوششیں پہلے ہی ہو چکی ہیں۔ خواجہ حسن نظامی نے اپنی کتاب "مغلوں کے اتم دن" میں کنگال مغل شہزادوں کی المناک اور رقت انگیز تصویریں کھینچی ہیں۔ بغاوت کے راہنماؤں میں جہانسی کی رانی لکشی بانی کی ذات کے تئیں مدد و رجحمت اور تعظیم کا اظہار کیا گیا ہے۔ ایک نظم میں جو لوک گیت کی عام خصوصیات کی حامل ہے، سمندر اکماری چوہان نے اس والہانہ عقیدت کا اظہار کیا ہے

یہ اس نامور خاتون کے لیے عوام میں پیدا ہوئی۔ نظم کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

"راجاؤں کی نسل نے بغاوت کر دی۔ تخت لرزنے لگے

بوٹھے ہندوستان پر پھر سے جوانی کا جو بن آگیا

لوگوں کو از سر نو کھوئی ہوئی آزادی کی قدر کا احساس ہوا

ہر کوئی فرنگی کو نکالنے پر تلا ہوا تھا

۱۹۵۷ء میں پرانی تلوار پھر چمک اٹھی

یہ کہانی ہم نے بندھیلوں سے سنی ہے

جو بھگوان شوکی پوجا کرتے ہیں

جہانسی کی رانی نے بہادری اور جو انفرادی

کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کیا۔ ۱۶

بندی بولنے والے لوگوں میں اس نظم کی بے حد مقبولیت کا سبب یہ ہے کہ یہ عوام کے جذبات کی ترجمان ہے۔ ان جذبات کو جو بغاوت نے برانگیختہ کیا سمندر اکماری چوہان نے بڑی صراحت کے ساتھ ترجیع بندوں میں بیان کیے ہیں:

"جھوپڑیوں میں بدبختی کا ڈیرہ تھا، محلات میں فرخاک میں مل چکا تھا

میدھر بھی نظر ڈالو منہم چہرے دکھائی دیتے ہیں

ہر طنز مایوسی کی کالی رات چھائی ہوئی ہے

غم کے شعلے اٹھ اٹھ کر نہیں مجلس رہے ہیں

نت نئی مصیبت یہاں نازل ہوئی ہے ۱۳۰

سمتر نندن پنت اپنی شہرہ آفاق نظم "پرپورتن" میں اسی قسم کے جذبے کا اظہار کرتے ہیں:

"آج بہار غمناک آجیں بھرتی ہے

گو باسردی کا موسم ہے

موسم بہار میں پھولیوں سے لدی ہوئی

ٹہنی جھکی ہوئی تھی

آج یہ بیچارگی کے عالم میں چلا کر کہتی ہے

"جوانی ایک خونخاک وہاں ہے ۱۳۱"

پنت اپنی نظم "بھارت ماتا" میں افلاس زدہ ہندوستان کی ایک جگر خراش تصویر کھینچے ہیں:

"بھارت ماتا کا لڑاس دیہات میں ہے

اس کا میلہ کھیلہ دوپڑ کیتوں میں پچھا ہے

گنگا جمناک نہریں اس کے آنسو ہیں

یہ ایک چکنی مٹی کا بت ہے

افلاس اور غمناک ۱۵۰

بغاوت کی دردناک یاد ہندوستانوں کے دلوں میں گہر کیے ہوئے ہے۔ اس سے غیر ملکی حکومت کے لیے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے اور حب وطن کا جذبہ بھڑکتا ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے ہتھیار اٹھائے جیسے بھگت سنگھ، چندر شیکھر آزاد اور سدیہ سین، اور وہ لوگ جو غیر ملکیوں کو وطن سے نکالنے کے لیے مزاحمت ماتہ میں اعتقاد رکھتے تھے ان کے دلوں میں یکساں طور پر ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے سہاراؤں کے تئیں محبت اور تحسین کے جذبات موجزن تھے۔ غیر ملکی حکومت کی مخالفت اور مزاحمت کی یہ روایت ہندی ادب میں ہمیش بہاؤ کر رہی ہے۔ زیریں رو کی طرح یہ روایت تمام چھایا داد شاعری میں سراپت کیے ہوئے ہے۔ پریم چند کی انتہا پسند تصنیفات میں یہ نمایاں طہ پر ظاہر ہے۔ یہ ایسے ناولوں کی تصنیف کا موجب ہوئی جیسے "دادا کارٹیڈ" اور "دیش بدھ"۔

بیان ہے جو لوگ اس کے تئیں رکھتے تھے۔ اس نے جھانسی کی عورتوں کو نجات دلائی اور انھیں مردوں کے ساتھ شانہ بہ شانہ لڑنے پر آمادہ کیا۔ ناول میں اُسے ناما صاحب سے یوں خطاب کرتے نظر کیا گیا ہے :

”عوام ہی اصل قوت کا ماخذ ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ قوت بے انتہا ہے۔ جعفر پتی نے امراء کی قوت کے سہارے نہیں بلکہ عوام کے ہی بل بوتے پر دہلی کے طاقتور شہنشاہ کو لٹکارا۔ بالے اور کنہی کسان تھے اور اب بھی ہیں۔ ان کے بل ان کی آزادی اور خود مختاری کی مجسم تمنا ہیں۔ میں یہاں کے لوگوں کو بھی ویسا ہی سمجھتی ہوں“ ۱۸۵

شری ورنداون لال ورنہ رانی کی سیرت کا جائزہ مندرجہ ذیل الفاظ میں مختصراً پیش کرتا ہے

”رانی سوراج کے لیے لڑی، سوراج کے لیے جان قربان کی اور سوراج کا سنگ بنیاد

ثابت ہوئی“ ۱۹۵

یہ محض ایسے جذبات نہیں ہیں جو آج بھولی بھری یادوں پر ٹھونس دیے گئے ہیں۔ خود ۱۸۵۷ء میں لوگ برطانوی حکومت کو شدید نفرت اور ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ بغاوت کے ایک روزنامے میں جسے سر جان مٹکات نے مرتب کیا، نواب معین الدین حسن خاں کہتا ہے۔

”میں بغاوت کی ابتدا کا حال اس بیان کے ساتھ شروع کرتا ہوں کہ انگریز خود حسب مرض اپنے بارے میں خواہ کچھ ہی رائے رکھتے ہوں، ہندوستانی انھیں ظالم سمجھتے تھے اور برطانوی سلطنت میں اودھ کے الحاق سے یہ جذبہ اور بھی زیادہ بھڑک اٹھا۔ اس واقعہ سے سب سے پہلے فوجوں میں بے اطمینانی پھیلی جن کی اکثریت اس علاقے کی رہنے والی تھی۔ پھر بغاوت سے متعلق مختلف واقعات رونما ہوئے۔ کسان خوفناک مصائب کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ بہت سی ریاستیں تباہ ہو گئیں یا فتح کر لی گئیں۔ بہت سے خاندان اور بڑے بڑے شہر خاک میں مل گئے۔ بہت سے بیگناہوں کو پھانسی دی گئی۔ ہر گیر تباہی کے بادل سارے ملک پر چھا گئے“ ۲۰۵

غیر ملکی حکومت کے خلاف نفرت کی اس روایت کا لوک گیتوں میں متواتر اظہار ہوتا رہا۔ ایک بھوچوری گیت میں مذکور ہے کہ غیر ملکی کی کمزور کشتی اب غضب ناک لہروں میں ڈگر گار رہی ہے۔

”بدیسیوں کی کشتی اب ڈگر گار رہی ہے

ملک مغلسی کے بھنور میں پھنسا ہوا ہے

اس کی کشتی منبہار میں ڈالوا ڈول ہے

بہادر سپاہیوں کے دلوں میں گزشتہ شان کا غرور ابھرا
 نانا جنگ کے لیے تمام سامان فراہم کر رہا تھا
 اس کی بہن لکشی بائی بر ملا جنگ کی دیوی کو مدد کے لیے پکار رہی تھی
 گیکہ کی گنی جلائی گئی
 انیس از سر نو گزشتہ کو حاصل کرنا تھا
 یہی کہانی ہے جو ہم نے بندھیلوں سے سُنی ہے
 جو بھگوان شوکی پوجا کرتے ہیں

محل سے چنگاری نمودار ہوئی، جھوپڑیوں میں آگ بھڑک اٹھی
 یہ آزادی کا شعلہ تھا جو تمام دلوں میں چھپا ہوا تھا
 یہ آگ جھانسی دہلی اور لکھنؤ تک پھیل گئی
 میرٹھ، کانپور اور پٹنہ سب میں آگ لگی ہوئی تھی۔

پرنسپل منور بنجن پر سادے اسی قسم کی ایک نظم بابو کنور سنگھ پر "یوگ" ۱۹۲۹ء میں لکھی
 جب یہ پٹنہ سے شری بینی پور کی کے نزدِ برادرت شایع ہو رہا تھا۔ برطانوی سرکار نے فوراً اس کی اشاعت
 ممنوع قرار دے دی۔ یہ نظم اور رانی جھانسی پر دوسری نظم جو منور بنجن بابو نے لکھیں اپنی قوتِ تاثیر
 اور جوش کی وجہ سے مقبول عام ہیں کنور سنگھ سے متعلق نظم یوں شروع ہوتی ہے

"ترانہ مسرت بلند ہوا، یہ ترانہ آزادی تھا
 ملک کے ہر گوشے میں یہی ایک ترانہ سنا گیا
 ایک سرے پر لکشی بائی اور پیشوا نانا تھے

دوسرے سرے پر بہار کا بہادر کنور سنگھ تھا
 اس اتنی سال بڑھے کی بڑیوں میں سلگتی آگ بھڑک اٹھی
 ہر ایک کی زبان پر ہے: "کنور سنگھ بڑا سورا تھا"

ہندی کے ممتاز ناول نگار شری ورنداون لال درمانے ایک ناول بعنوان "جھانسی کی رانی
 لکشی بائی" لکھا ہے۔ اس ناول کے دیباچے میں وہ بیان کرتا ہے کہ رانی جھانسی نے بانپور کے راجہ
 مردان سنگھ کے نام ایک خط میں لفظ "سوراج" کا استعمال کیا اور اس سے انگریزوں کے ظلم
 جدوجہد میں مدد مانگی۔ ناول مذکور رانی لکشی بائی کی بلند نظری اور اس محبت اور تعظیم کا پُر جوش

میرے گلے میں سی ڈال کر کیوں تامل کرتے ہو؟
 میں غازی بن کر سیدھا بہشت میں جاؤں گا
 اور دھرم راج کے حضور میں اپنے مصائب بیان کروں گا۔
 اس سے بھگت سنگھ کو واپس چین لوں گا ۲۵۱
 ایسے گیت غیر ملکی حکومت کے خلاف ہمارے لوگوں کی گہری نفرت کو زندہ رکھتے ہیں اور ہمارے
 ملک کے عام شعور کے اندازے کے لیے ایک پیمانے کا کام دیتے ہیں۔
 ہندوستان کی قومی جدوجہد کے لیے بغاوت کا ہمیشہ قیامت ترکہ ہندو مسلم اتحاد کی روایت
 تھی جو اس دور میں قائم ہوئی۔ بہادر شاہ کے تحت اور رانی جھانسی کی فوجوں میں ہر جگہ ہندو اور مسلمان
 مشترکہ دشمن کے خلاف متحد ہو کر دوش بدوش صف آرا ہوئے۔ سعین الدین حسن خاں اپنی ”فدر
 ڈائری“ میں اس حقیقت پر زور دیتا ہے :
 ”یہ قرین قیاس ہے کہ یہ ایک مشترکہ اعلان تھا جو ہندو اور مسلمان باغیوں میں اتحاد کا نتیجہ تھا۔ یہ
 ایک قابل قبول تاریخی حقیقت ہے کہ کمپنی کے الحاق اور دھ کے واقعے سے بے اطمینانی بڑھ گئی اور یہی
 وجہ تھی کہ بغاوت کی آگ جلد تر بھڑک اٹھی۔ واقعہ اور دھ کا اثر ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں پر پڑا کیونکہ
 اور دھ میں ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ ہے۔ ۲۶۰۰۰
 قومی اتحاد کی یہ روایت بعد کی تمام بغاوتوں میں برقرار رہی مثلاً بحری علمہ اور آزاد ہند
 فوج کی بغاوتیں۔
 جس چیز کو ”غدر“ کہا جاتا ہے وہ ہندوستانیوں کے لیے غیر ملکی حکومت کے خلاف عوام کی
 بغاوت تھی۔ ہندی ادب میں معلوم اور نامعلوم ادیب اور شعرا کی تصنیفات ہماری قوم کی ان انگلی اور
 جذلوں کی ترجمان ہیں جو سو سال پہلے برطانوی حکومت کے خلاف اس قدر بڑے پیمانے پر بغاوت
 کا سبب ہوئے۔

حواشی

۱۔ ایس۔ ایل۔ ورشمنے : ”آدھونک ہندی بہت“ صفحات ۲۴-۲۲۶
 صفحہ ۲۲۶

۲۔ ایضاً
 ۳۔ ورما : ”رانی لکشی بانی آن جھانسی“ صفحات ۲-۴۱

ملک میں قحط اور بیماری کا زور ہے
 مصیبت کے بادل گرج رہے ہیں
 دریائے غم میں اتھاہ پانی ہے
 ملک میں جبر و ستم کی آندھی زور سے چل رہی ہے
 حاکم نشے میں مہوش ہے
 ہم اس سے التجا کرتے ہیں لیکن اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلتا
 اے بدیلی تیری کشتی غرق ہونے والی ہے
 دریا میں تیرا جناں نکلا ہی چاہتا ہے ۲۱
 قلت اور قحط کے حالات میں جو ہندوستان میں برطانوی حکومت کی دیرینہ خصوصیت ہے
 شاعر شاعری اور عشق کو بھول جاتا ہے:

”قحط کے سبب ہم اپنے تمام نفع بھول چکے ہیں
 برہا، کجری، کبیر

۱ اب حسن کا نظاہر بھی دل کو متاثر نہیں کرتا ۲۲
 ایک مالوی لوگ گیت میں شاعر کہتا ہے:
 ”ملک مصیبت میں مبتلا ہے
 فرنگی ملک پر حکمران ہے

آسمان پر گنگا گھر گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں ۲۳

بھگت سنگھ جو اغیار کے خلاف ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے متاثر ہوا متعدد لوگ گیتوں کا موضوع بنا۔ یہ گیت شہنشاہیت کے خلاف مزاحمت کی روایت کو زندہ رکھتے ہیں جو لوگوں نے مختلف اوقات پر جدوجہد کے ذریعے قائم رکھے۔ بھگت سنگھ کے بارے میں ایک لوگ گیت ذیل کے مصرعے شروع ہوتا ہے:

”وہ پھانسی پر جھول گیا، بہادر بھگت سنگھ، اغیرت مند بھگت سنگھ ۲۴
 ایک اور لوگ گیت ایک محب وطن کی تصویر کھینچتا ہے جو پھانسی پر چڑھنے میں دیر ہو جانے
 کے سبب پیچ و تاب کھاتا ہے:
 ”اب ایک ایک لمحہ میرے لیے باعث عذاب ہے۔

سید احتشام حسین

اردو ادب اور انقلاب ۱۸۵۷ء

یہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اردو ادب دربار، خالقہ اور بازار کی پیداوار ہے۔ بلاشبہ یہ صدیوں کے گزشتہ حقائق، حالات اور خیالات کے اتصال اور انتشار کے دقیق تاریخی عمل کا بہت سادہ سا بیان ہے۔ یہ شلت نظام جاگیر داری، مذہبی و سماجی ماحول اور ادب میں عوام کی آرزوئے اظہار کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ حقیقت پر مبنی ہے کہ شمالی ہندوستان میں اردو شاعری کا آغاز اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں جاگیر دارانہ نظام کے زوال کے ساتھ ہوا۔ اس نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ دور اپنی ساری طاقت کھو چکا تھا اور ایک ختم ہوتے عہد کی قدروں کو بھی بیان کرنے کے قابل نہیں تھا۔ بہم طور سے یہ ایک نئی بیداری کا بھی دور تھا اس نئے شعور کی ابتدا کا جو بدلتے ہوئے تاریخی، سماجی اور سماجی حالات کا تقاضہ تھا۔ اس وقت کی اردو شاعری درد و کرب، افراتفری، مایوسی اور تہذیب کی آئینہ دار تھی جس میں کسی قسم کے خیالات اور نظریات کی جستجو بے سود ہو گئی۔ وہ ماحول جس میں یہ شاعر رہتے تھے، ان کے سرپرستوں کا مذاق جن کی وہ مدح کرتے تھے اور اکثر صورتوں میں عوام اور شوا کے درمیان بے تعلق، یہ ساری باتیں شاعری کے زوال کا موجب ہوئیں اور وہ محض ضلع جگت یا ایہام بن کر رہ گئی۔ ہیئت کے اعتبار سے معیار بہت بلند ہوا لیکن خیالات محدود ہو گئے اور شاعری روایات کی پابند ہو گئی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے قیام کے بعد ہی سے شعرا اور ادیب نئی صورت حال کی نزاکت سے آگاہ ہونے لگے۔ جب سراج الدولہ کو انگریزوں نے ہلاک کر دیا اس کا دوست اور رفیق کار راجہ رام نارائن موزوں درد سے تڑپ اٹھا

آہ وہ صحرانورد دلو انے عاشق کہاں گئے؟
اور وہ ایام عاشقی کہاں معدوم ہو گئے؟

- ۴- "ہندی نو-تن" صفحہ ۵۹۸
- ۵- ورثنے : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۶۲
- ۶- ایضاً " " صفحہ ۲۶۲
- ۷- "کوٹا کوہدی" حصہ دوم صفحات ۲۸-۳۹
- ۸- ورثنے : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۵۶
- ۹- بریدلا- سواگت صفحہ ۱۰
- ۱۰- "ہاروک ہرش درش" مطبوعہ ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۱
- ۱۱- ورثنے : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۵۰
- ۱۲- ایضاً " " صفحہ ۲۵۱
- ۱۳- "بھارت بھارتی" صفحہ ۸۷
- ۱۴- "گرامیہ" صفحہ ۲۸
- ۱۵- "نخل" صفحہ ۲۷
- ۱۶- ایضاً صفحہ ۵۳
- ۱۷- ایضاً تمہیدی اشعار
- ۱۸- ورا : بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۴۱
- ۱۹- ایضاً صفحہ ۵۱۰
- ۲۰- "ڈائری آف دی میوٹی" صفحہ ۵۲
- ۲۱- کرشن دیو پادھیائے "بھوچوری گرام گیت" صفحات ۸۷-۲۸۲
- ۲۲- "کوٹا کوہدی" حصہ سوم صفحہ ۲۷
- ۲۳- "پریتجا" آگست-ستمبر ۱۹۵۶ء صفحہ ۱۵
- ۲۴- دیوندر ستیا رتھی "دھیر بھوگنگا" صفحات ۳۲-۱۳۲
- ۲۵- ایضاً
- ۲۶- معین الدین حسن خاں : "نذر ڈائری آف دہلی" صفحہ ۲۱

تصنیفات میں مندرجہ ذیل اہم ہیں : خطوط غالب ، دستبند غالب کا بغاوت کے ایام میں فارسی زبان میں لکھا ہوا روزنامہ) داستان غدر مصنف ظہیر دہلوی ، تاریخ سرکشی بخجور مصنف سرسید احمد ، رسالہ اسباب بغاوت ہند مصنف سرسید احمد ، تاریخ ہند جلد ہفتم مصنف ذکا باللہ ، روزنامہ غدر (انگریز کی تصنیف) ترجمہ ڈاکٹر نذیر احمد ، آغا ، جتو ، شرف (لکھنؤ کی غارت گری پر ایک طویل نظم) واجد علی شاہ ، تیسرا کواہا بہادر شاہ ظفر اور برقی لکھنوی کی بہت سی نظمیں اور فغان دہلی (پچاس نظموں کا مجموعہ جو سب سے پہلے ۱۸۶۱ء میں شائع ہوا) اور مختلف نظمیں اور مقالے جو بغاوت کے دوران اور اس ہنگامے کے بعد زیادہ تر دہلی کے اخبارات میں شائع ہوئے ۔ اور بھی تصانیف ہیں لیکن ہم انہیں نظر انداز کرتے ہیں کیوں کہ ہر اہم مقصد اس مقالے میں ایسی کتابوں کی فہرست فراہم کرنا نہیں ہے ۔

مذکورہ بالا تصنیفات میں سے بعض کا تجزیہ کرنے سے ہم چند قابل ذکر نتائج پر پہنچتے ہیں مشہور اردو شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب کو اس دور کے تمدن اور روایات کا بہترین ترجمان تسلیم کیا گیا ہے چونکہ وہ اسی قبیل کے تھے جس کے زوال پذیر مغل دربار کے دوسرے لوگ تھے اس لیے انہوں نے انگریزوں کے ساتھ تعلقات پیدا کر لیے تھے اور ان کے بعض اوصاف اور کارناموں کے مطالعے سے یہ پہلے اہم ادیب تھے جنہوں نے سائنس اور سیاسی تنظیم میں انگریزوں کے کارناموں کو کئی اعتبار سے مغل اعظم اکبر کی نسبت زیادہ ترقی پسندانہ پایا ۔ اس کا ذکر انہوں نے اپنی ایک فارسی نظم میں کیا ہے ۔
 نظم ۱۸۵۵ء میں سرسید کی رتب کی ہوئی اہل الفضل کی تصنیف آئین اکبری کے نئے نسخے کے لیے پیش لفظ کے طور پر لکھی گئی تھی ۔ اس میں قدیم نظام پر ایسی جگر خراشیں نکتہ چینی کی گئی تھی کہ سرسید بھی اسے اپنی تالیف میں شامل کرنے پر رضامند نہ ہوئے ۔ غالب جو اس وقت بہادر شاہ کے دربار کے ساتھ وابستہ تھے دہلی کے تمام عائدین کے ساتھ قریبی تعلقات رکھتے تھے ۔ جب بغاوت پھیلی تو وہ بھی ناچار اس میں الجھ گئے جب انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا تو ان کے گمروہ رہنما جہاںگیر کی پیشاکریوں کا بہرا بھادیا گیا دیکھ کر یہ اُس کے ایک موزوں دوست کا مکان تھا) اس طرح غیاب انگریزوں کی غارت گری اور آتش زنی سے بچ گئے ۔ دوسری ادبی سرگرمیوں کے علاوہ غالب اس وقت فارسی زبان میں ایک روزنامہ لکھنے میں مصروف تھے ۔ اگرچہ یہ روزنامہ ایک اچھا ادبی شاہکار تھا لیکن تاریخی اعتبار سے اس کی زیادہ وقعت دہلی ۔ ان بیسیوں خطوط سے جو انہوں نے تمام ہندوستان میں رہنے والے اس طرح کے لوگوں کو لکھے دہلی کے حالات سے متعلق اچھی فہمی واقفیت حاصل ہوتی ہے ۔ وہ کالوں اور گوروں کی دہشت انگیزی ، انگریزوں اور ہندوستانی دوستوں اور مریدوں کی موت ، دہلی کے فوجی چھاؤنی میں بدل جانے (جہاں کوئی گریز نہ

اور مصحفی نے لکھا:

”کافر فرنگیوں نے ہندوستان کی تمام دولت اور شان و شوکت
دبا بازی سے چھین لی۔“

پھر بغاوت رونما ہوئی۔ مہم، غیر متین، غیر منظم لیکن شدید قومی جذبے کی سلگتی ہوئی آگ
بھوک اٹھی۔ چھوٹے بڑے بہت سے دہار جو شاعروں کے سر پرست تھے برباد ہو چکے تھے۔ اودھ کو،
جو فن تہذیب کا بڑا مرکز تھا، ۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ دہلی میں نخل حکومت
صرف نام کی رہ گئی تھی۔ ایک نئی سلطنت وجود میں آگئی جس کی جڑیں سرزمین ہند میں تھیں اور جو ہندوستانی
تمدن سے بیگانہ تھی۔ بغاوت یا اس کے نتائج سے متعلق اعلیٰ معیار کے ادب کا زاموں کی جستجو زیادہ
سودمند رہو گی اگرچہ ایسا ادب بھی موجود ہے۔ یہ زیادہ فائدہ مند ہو گا کہ ادب کو بھی ان خاص تاریخی
اور معاشی قوتوں کی پیداوار سمجھا جائے جو خود بغاوت کا موجب ہوئیں۔ اس کے بعد کے ادب کے بیشتر
حصے سے ایک مختلف رنگ نمایاں ہے۔ اس کے بعد کے شاعروں اور ادیبوں کو نئے انداز فکر کے لہنا
قرار دیا جاسکتا ہے جنہوں نے ادب کو قوم کے ارتقا میں ایک تعمیری عمل تصور کیا۔ ان کے خیال میں ادب
کا کام لوگوں میں نیا شعور پیدا کرنا ہے۔ ان میں اہم ترین شخصیتوں کے نام یہ ہیں: سرستید احمد خاں،
خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا محمد حسین آزاد، ڈاکٹر تھیرا احمد، مولانا شبلی، مولانا ذکار اللہ، چشتی
مصن الملک اور وقار الملک۔ ان سب کا عقیدہ یہ تھا کہ ادب زندگی کے مطابق بھی ہو اور اس کے لیے
فائدہ مند بھی۔ پہلے یہ شعوری طور پر ممکن نہ تھا۔

جب ہم اردو ادب پر بغاوت کے اثر کا ذکر کریں تو ہمیں اس حقیقت کو بھولنا چاہیے کہ
اُس وقت اس بغاوت کی مابیت کو واضح طور سے نہیں سمجھا گیا تھا۔ بیشتر حالتوں میں اسے قہر الہی،
فریب تقدیر، آسمان کی چشم بد، انقلاب زمانہ اور اعمال بد کی سزا تصور کیا گیا۔ اس اہم تاریخی واقعہ
کی انفرادی تعبیروں سے وہ غلط راہوں پر پڑ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بغاوت کی وسعت اور اصلیت
کو سمجھنے کی کوئی کوشش نہ کی گئی صرف یہی نہیں، بعض حلقوں میں جو بظاہر انگریزوں کے دیر اثر تھے
اس کا یہ مطلب لیا گیا کہ یہ موجودہ حکومت کے خلاف بغاوت ہے۔ یہ خیال اس قدر غالب ہوا کہ بغاوت
کو قومی تحریک کے ساتھ وابستہ کرنے میں بہت دیر لگی۔ جوں جوں نیا مواد باقوتہ لگے گا اور مزید حقائق
کا انکشاف ہو گا بغاوت کا بے لاگ جائزہ لینے میں مدد ملے گی۔

پہلے ہم ان تصنیفات کا ذکر کرتے ہیں جو بغاوت کے دوران مرتب ہوئیں۔ ایسی بہت سی

انکشاف ہوا ہے۔

ان کتابوں کا ذکر میں کر چکا ہوں جو مصنفین کے ذاتی تجربات یا بغاوت سے پیدا ہونے والی صورت حال کا نتیجہ تھیں۔ سرسید نے (جو ابھی مرے کے خطاب سے سرفراز نہیں ہوئے تھے) تاریخ سرکشی، بجنور، لکھی۔ اُس وقت تک انھوں نے مسلمانوں کے روشن خیال طبقے کی راہنمائی کی باگ ڈور نہیں سنبھالی تھی۔ ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ان کی کتاب "رسالہ اسباب بغاوت ہند" کی اشاعت کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ کتاب آندو میں لکھی گئی اور بعد میں اس کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ یہ کتاب واقعات کا متعقبات تجزیہ بہم پہنچاتی ہے۔ وہ سارا الزام برطانوی پالیسی پر رکھتے ہیں جس کے سبب انگریز ہندوستانیوں کی خیر خواہی سے محروم ہو گئے۔ ان کا بیان ہے "یہ سرکار کا کام تھا کہ وہ کوشش کرے اور رعایا کی ہمدردی حاصل کرے نہ کہ رعایا کا فرض" کہ وہ حکومت کے لطف و کرم کو حاصل کرنے کی سعی کرے۔ اب برطانوی سرکار کو قائم ہونے سو سال سے بھی اوپر ہو چکے ہیں لیکن اب تک اس نے لوگوں کے دل نہیں جیتے۔ خود سرسید کے کردار کی طرح یہ مقالہ بھی ایک بحث طلب دستاویز ہے لیکن پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ بھاری تاریخ کا کوئی بھی طالب علم اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔

ظہیر دہلوی ایک جوان سال مگر نامور شاعر تھے جو بہادر شاہ کے دیباچے والے تھے۔ چند سال گزرنے کے بعد انھوں نے اپنی آپ بیتی لکھی اور اس کا نام "داستان غدا" رکھا۔ انھوں نے دہلی کے واقعات، اپنے مصائب اور ان لوگوں کے آلام جن پر باغیوں کے ساتھی اور ہمدرد ہونے کا شک تھا تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ ایک اور کتاب ہے جو نظموں کا مجموعہ ہے اور جس کا نام "فغانِ دہلی" ہے یہ ۱۸۷۱ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب اس لیے قابل ذکر ہے کہ اس میں دہلی کی لوٹ مار اور بریادی سے متعلق کوئی چالیس شاعروں کی نظمیں جمع ہیں۔ ان نظموں میں زیادہ تر دہلی کے امرا اور شرفاء کے مصائب کا بیان ہے۔ انھیں ایسی سختیوں کا سامنا کرنا پڑا کہ انھوں نے پہلے کبھی نہ جھیلی تھیں۔ ان میں واقعات کا مبہم ذکر ہے اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان ہی زیادہ تر جو روستم کا شکار ہوئے۔ کئی نظموں سے پتہ چلتا ہے کہ دہلی کا ایک بھی صحیح الجسم نوجوان پھانسی سے نہ بچا۔ بعض نظموں کے اختتام پر اس خوش امید کا اظہار کیا گیا ہے کہ دہلی از سر نو آباد ہوگی اور گزرے ہوئے اچھے دن پھر لوٹ آئیں گے۔

کے بغیر گھوم پھر نہ سکتا تھا) دہلی کے بے گناہ امرا کے مقدموں اور روزمرہ کی زندگی کی مشکلات کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ ان واقعات کو کوئی سیاسی اہمیت نہیں دیتے لیکن وہ جانتے ہیں کہ پچھلا زمانہ لوث کرنا آئے گا۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے جس میں اسی واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

ہ بسکہ فعال مایرید ہے آج

ہر سلسلہ انگلساں کا

گھرے بازار میں نکلے ہوئے

زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا

چوک جس کو کہیں وہ مقل ہے

گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

بغاوت کے دب جانے کے بعد غالب دہلی کے لوگوں کے ساتھ بالعموم اور مسلمانوں کے ساتھ بالخصوص انگریزوں کے سلوک کے شاکی رہے۔ ان کے ایک دوست شیخ امام بخش صہبائی کو جو ایک جید عالم اور شاعر تھے، دو بیٹوں سمیت گولی سے اڑا دیا گیا۔ ممتاز عالم مولانا فضل حق کو انڈیا مان بھیج دیا گیا جہاں انہوں نے بغاوت سے متعلق عربی زبان میں ایک کتاب بعنوان "الثورة الهندی" لکھی۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفہ کو قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ اردو زبان میں پہلے اہم ادبی اخبار کے بانی محمد حسین آزاد کے والد داد بلند پایہ مجتہد مولانا محمد باقر کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ غالب نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان کی غزلیں اس ہنگامہ خیز دور میں پیدا ہونے والے درد و کرب کو مؤثر انداز میں ظاہر کرتی ہیں۔ اس زمانے کے بیشتر واقعات بہت سی تصانیف میں موجود ہیں مثلاً خواجہ حسن نظامی کی "تصفیات" غالب کا روزنامہ "انگریزوں کی پٹا"، "بہادر شاہ کا مقدمہ"، "راشد الخیری کی تصانیف" دہلی کی آخری بہار"، "نوبت پنج روزہ" امیر احمد علی کی کتاب "بہادر شاہ ظفر" اور رئیس احمد جعفری کی تصنیف "بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد"۔

میر شکوہ آبادی دبستان لکھنؤ کے مشہور شاعر تھے جو نواب فرخ آباد کے دربار سے وابستہ تھے۔ انہیں گرفتار کر کے مقدمہ چلایا گیا اور انڈیا مان بھیج دیا گیا۔ انہوں نے مختلف نظلیں لکھی ہیں جن میں انہوں نے اپنے ذاتی مصائب اور قومی تباہی کو بیان کیا۔

محمد حسین آزاد نے انگریزوں پر افواجِ شہ شوق کی فتح کے بارے میں ایک نظم لکھی۔ یہ ۳۱ مئی ۱۸۵۷ء کو ان کے والد کے اخبار "دہلی اردو اخبار" میں شائع ہوئی۔ حال ہی میں اس کا

جب ہم جدید ادب کا مطالعہ کریں تو ہمیں اس کی دو متضاد خصوصیات کی طرف سے آنکھیں نہ بند کرنی چاہئیں یعنی ترقی پسندی اور رجعت پرستی، امید اور یاس، خوف اور دلیری، حکمران طبقہ کے تئیں وفاداری اور اس کے طرد طریقوں کے خلاف احتجاج، قومی شعور کی نشوونما میں ایک اہم مرحلے کے آثار تھے۔ اس تازہ حاصل کیے ہوئے شعور کو نئے ادب اسالیب میں ظاہر کرنے کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد ہم نظم و نثر کی نئی اقسام کا ظہور دیکھتے ہیں۔ ناول، نائٹ، انشا پردازی، سوانح نگاری، تنقید اور طویل تخلیقی نظمیں رونق ہوئیں۔ کئی صورتوں میں قدیم اور جدید اسالیب کا امتزاج عمل میں آیا۔ چھاپہ خانہ کے وجود میں آنے سے نئے اسالیب کی ترقی اور اشاعت میں مدد ملی۔

اگر ان بیانات کی روشنی میں ہم سرسید، آزاد، حالی، نذیر احمد، شبلی اور شرر کی تصانیف کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ وہ لوگوں کی ضروریات سے آگاہ تھے اور ان میں امید کی نئی روح پھونکنا چاہتے تھے۔ حالی ہمیشہ اس مقولے کے قائل رہے: "ہمیں وقت کے ساتھ بدلنا چاہیے"۔ قرآن پاک کی تلاوت بارہ سو سال سے ہو رہی تھی لیکن کسی نے مسلمانوں کو انقلاب کی رفتار تیز کرنے کے لیے آیات کا حوالہ نہیں دیا تھا۔ اب مسلمان قرآن مجید کی مذکورہ ذیل آیت کا حوالہ دے رہے تھے: "ان الله لا یغیر ما بقوم حتی یشعروا ما بالانفسہم" (خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ آپ اپنی حالت نہ بدلیں، ان تمام ادیبوں نے تبدیلی کی ضرورت کو تسلیم کیا اور اس سے متعلق بہت کچھ لکھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے ہیرو نانا میدی کو ترک کر دیں اور ایک نئی زندگی شروع کریں۔ یہ محض حسن اتفاق نہیں کہ سرسید، حالی، آزاد، شبلی اور شرر سبھی نے نثر اور نظم میں امید کو اپنا موضوع بنایا۔ انھوں نے خدمتِ خلق کے لیے ادب کو دنیاوی حقائق کا آئینہ دار بنایا تاکہ علم کی اشاعت ہو۔ لوگ تغیر زمانہ کو قبول کرنے پر آمادہ ہوں اور اس کے مطابق اپنی تقدیر کو ڈھال سکیں۔

اردو ادب میں قومی شعور کے ارتقا کی داستان قدرے طویل ہے۔ ان انشا پردازوں اور ان کی تصنیفات کے ناموں کا ذکر کرنا بھی ممکن نہیں جو بغاوت سے پیدا ہونے والے سیاسی شعور کا نتیجہ تھے۔ ان ادیبوں میں سے بیشتر نے سیاسی جور کے تاریک ترین ایام میں بھی لکھنا ترک نہ کیا۔ انھوں نے برج مہن چکست کا ہنوا ہو کر یہ نغمہ الاپا،

لکھنؤ کے شاعروں کی کئی نظموں کا بھی یہی لب و لہجہ ہے۔ ان میں وہ بادشاہ اور شہر
لکھنؤ کے تئیں اپنی وفاداری کے راگ الاپتے ہیں جو کلیۃً تباہ ہو چکا تھا۔ دراصل یہ نظمیں
قوم کا ماتم نہیں بلکہ معمولی واقعات کا مرثیہ ہیں لیکن ہم ان شاعروں پر نکتہ چینی نہیں کر سکتے
کیوں کہ ان کے حب وطن اور قومی اتحاد کے جذبے پر مقامی وفاداری اور عقیدت کا
رنگ غالب تھا۔

اُردو ادب کی روایت پر بغاوت کے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے ہمیں بغاوت
کے بعد کے واقعات کا تجزیہ کرنا ہوگا اور یہ دیکھنا ہوگا کہ ان سے لوگوں کے دل و دماغ
کس طرح متاثر ہوئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے برطانوی تاج کے حق میں انتقال
اقتدار کے بعد مذہبی آزادی کا اعلان گویا ہندوستانیوں کو ایک بالواسطہ دعوت تھی کہ وہ
مذہبی نقطہ نظر سے سوچنے لگیں۔ اس نے متوسط اور اعلیٰ طبقوں کے ذہن میں یہ بات
بھی ڈال دی کہ وہ صرف اپنے اپنے فرقوں کی بیہوری کا خیال رکھیں۔ دوسرے لفظوں
میں یہ ایک طرح سے احیائے مذہب اور ماضی کی شان پر فخر کرنے کا اشارہ تھا۔ بظاہر
یہ بات عجیب لگتی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جدوجہد کے بعد متحدہ قوم کے
تصور کو اس سے نقصان پہنچا۔ تقریباً تمام ہندوستانی زبانوں کے ادیبوں کو اپنے
آباد اجداد کے کارناموں کی حسرت بھری یاد ستانے لگی۔ بے شک ایک لحاظ سے یہ
بیداری کی علامت تھی لیکن مذہبی تنگ نظری ان کی تصنیفات کے قومی ادب کا جزی بننے کی
راہ میں حائل ہوئی۔ اگر صورت حال اس کے برعکس ہوتی تو بنکم چندر چٹرجی، سرسید، بھارتیندو
اور اس کے رفقا مالی اور شبلی سے کم از کم نفس مضمون کے اعتبار سے زیادہ بلند پایہ تصانیف
حاصل ہوتیں۔ اگر ہم ۱۸۵۷ء کے بعد کے دور کے ادب کا تجزیہ کریں تو ہم صاف طور پر
دیکھ سکتے ہیں کہ مذہبی انداز فکر میں قومیت کا جذبہ پنہاں ہے لیکن اس کے واضح تراظہار کے
لیے ہمیں بیسویں صدی کی تصنیفات دیکھنی ہوں گی۔

پرتاپ نارائن نے ”ہندی، ہندو، ہندوستان“ کا نثر لکایا اور سرسید اور
نذیر احمد مسلمانوں کا ایک علیحدہ قوم کی حیثیت سے ذکر کرنے لگے۔ اگرچہ حالات
سے صاف صاف ظاہر ہے کہ وہ یا تو غیر ملکی خباثت کے زیر اثر تھے یا اپنی سادہ لوحی
کے سبب گمراہ تھے۔

کے۔ ایم۔ اشرف

غالب اور بغاوت ۱۸۵۷ء

پرانے خیال کے موترخ نے غالب (مرزا اسد اللہ خاں) کا نام ایک مشہور اردو شاعر کی حیثیت سے سنا ہوگا لیکن وہ غالب کو ایک موترخ کی حیثیت سے نہ جانتا ہوگا جسے بہادر شاہ نے سرکاری طور پر مغلیہ خاندان کی تاریخ مرتب کرنے کا کام تفویض کیا تھا۔ وہ اس حقیقت سے بھی واقف نہ ہوگا کہ اس جلیل القدر قومی شاعر نے نہ صرف باغیوں کی حکومت کے تحت دہلی میں رہنا پسند کیا بلکہ ایک روزنامہ بعنوان "دستنبو" میں اُس نے اس یادگار دور کے روزمرہ کے واقعات کو فارسی زبان میں قلمبند کیا۔ اُس روزنامہ میں اندراجات کا آغاز ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے یعنی میرٹھ کے رسالے کے پہنچنے کے وقت سے ہوتا ہے اور اندراجات کا سلسلہ ۲۰ ستمبر تک چلتا ہے۔ جب برطانوی فوجی دستے دہلی میں عوامی مزاحمت پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئے بعض اعتبار سے اس روزنامے میں لکھنؤ کی شکست تک (جولائی ۱۸۵۸ء) کے واقعات کا ذکر ہے۔ یہ واضح طور پر معلوم نہیں کہ مصنف نے یہ بے نظیر دستاویز کیوں مرتب کی۔ بہر حال اس کی اشاعت انگریزوں کے دہلی پر مکمل قبضے کے بعد ہوئی۔ یہ قیاس کرنا چنداں غلط نہ ہوگا کہ اس کتابچہ کے اصل متن میں صورت حال کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے مناسب ترمیم کی گئی تھی۔ غالب کے موجودہ روزنامہ میں واقعات کا بیان بہت مختصر ہے لیکن بعض اہم حقائق کا ذکر تک نہیں حالانکہ وہ عوام کے علم میں تھے خصوصاً بہت سے اہم اور پر معنی واقعات پر کم توجہ دی گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو روزنامہ پر افشاء انگیز لکھنے کی فرصت ہی نہ تھی۔ اُس نے اسی پر اتفاق کیا کہ بعض عبارات کو محذوف کر دیا جائے اور بعض کا بعد میں خیال آنے پر اضافہ کیا گیا۔ یہ سب غالباً جان بچانے کے لیے کیا گیا ہوگا۔^۲

استان سرخوشی کے عالم میں شروع ہوتی ہے جب ہر طرف عوامی بغاوت زوروں پر تھی

دل اسیری میں بھی آزاد ہے آزادوں کا

دلوں کے لیے ممکن نہیں زنداں ہونا

اس مختصر مقالے کا مقصد یہ نہیں کہ قومی تحریک کی تاریخ بہم پہنچائی جائے جس کی اردو ادب میں عکاسی کی گئی ہے۔ مصنف کا منشا صرف یہ ہے کہ ان ادیبوں کی دلی اور دماغی کیفیت کی ایک جھلک دکھائی جائے جنہیں پُر آشوب سیاسی زندگی کے کھلے سمندر میں چھوڑ دیا گیا۔ اس بغاوت کے سبب ان کے دلوں میں دبا ہوا غصہ اور جوش بھوٹ پڑا اور انہوں نے ہندوستان کی راہ کی اور ترقی کی خاطر اس سے آج تک کام لیا۔ اردو ادیبوں کی نگاہ میں بغاوت کا یہی مطلب اور اس کی یہی وقعت ہے۔

اپنے آپ کو سختی کے ساتھ الگ تھلگ رکھا ہے بلکہ درحقیقت میں اپنے مکان میں مجبوس رہا ہوا۔ انگریزی فوجی دستوں کے داخل ہونے کے بعد بھی میں نے شہر میں ٹھہرنا پسند کیا حالانکہ بہت سے رئیس اور نیشن خواربھاگ گئے۔ ۹ بغاوت میں اپنی عدم شرکت کے ثبوت میں انھوں نے ہندوستان اور انجلیکنڈ میں اعلیٰ حکام کی خدمت میں اپنا فارسی روزنامہ (دستبنو) پیش کیا۔ اس کی وجوہات معلوم کرنا کچھ دشوار نہیں۔ ایہام گوئی میں استاد ہونے کے سبب یہ طرزیہویں صدی کے مغل دربار کے اہل ادب میں مقبول تھی۔ وہ شعر کے معنی بیان کرتے ہوئے بھی اس کو چھپانے میں بہارت رکھتے تھے۔ اپنے طرز کلام اور مفہوم دونوں میں ایہام کو بڑھانے کے لیے اس موقع پر غالب نے فارسی زبان کی ادبی پاکیزگی کے حق میں اپنے تعصب سے فائدہ اٹھایا۔ غرضیکہ انھوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ ان کے روزنامے کو خود یا ان دوستوں کے خلاف جنھوں نے بغاوت میں نمایاں حصہ لیا ثبوت کے طور پر استعمال نہ کیا جاسکے۔

لیکن اس سے دہلی میں بغاوت سے متعلق بعض واقعات کے لیے معتبر سند اور مافذ کی حیثیت سے دستبنو کی وقعت کم نہیں ہوتی۔ مجھے اس بات پر زور دینے کی ضرورت نہیں کہ مصنف کا شوقِ راست گوئی اور جذبہ انسان دوستی اس کتاب کی ایسی ہی خصوصیات ہیں جیسی اس کی دوسری تصنیفات کی۔ ۱۱ ظاہر اسباب کی بنا پر واقعات کا بیان بے شک مبہم اور عمومی ہے۔ غالب اس جزوی داستان میں بھی قومی مزاحمت کی اس عظیم تحریک کی گرجو شہی سے ہیں آگاہ کرنے اور اس میں الجھنے والی نئی سماجی قوتوں کی جھلک دکھانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ غالب کے فارسی روزنامہ کا موجودہ نسخہ اپنی مجبوریوں اور کمیوں کے باوجود ۱۸۵۷ء کے واقعات کے ہر ایاں دار طالب علم کے لیے ایک بیش قیمت دستاویز ہے۔ ۱۲

اب ہم دستبنو سے کچھ اقتباسات قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں اور اس کی خوبیوں اور خامیوں کا فیصلہ انھی پر چھوڑتے ہیں۔

عوام کی بغاوت

شاعر منظر کے آغاز میں کسی قدر پریشان ہے: "عوام حکمرانوں کے ساتھ برسرِ پیکار ہیں۔ باغی سپاہی برطانوی سپہ سالاروں کا خون بہاتے ہیں اور پھر نتائج سے بے خبر ہو کر بغلیں بجاتے ہیں۔" (کلیات صفحہ ۳۸۰)

اور پہاڑی پر انگریزی فوجی دستوں کا مقابلہ کرنے کے لیے مختلف سمتوں سے ہندوستانی فوجیں دہلی کی جانب بڑھ رہی تھیں لیکن جوں ہی لڑائی شروع ہوئی۔ جو چار ہینے دس دن تک جاری رہی۔ مصنف کی خاموشی بڑھتی گئی اور اُس نے چپ سادھ لی۔ عام کیفیت کے بیان کی چند سطروں کے بعد میں یکایک بتایا جاتا ہے کہ کشمیری دروازے پر انگریزوں کے حملے کے مقابلے میں ہندوستانی فوجوں کے لیے سوائے پسپا ہونے کے کوئی چارہ نہ رہا۔ اب وہ اصل موضوع سے گریز کرتا ہے اور ملک میں تحریک مزاحمت کے چند اتفاقی مگر حقیقت افزہ حوالوں کے سوا وہ زیادہ تر اپنے خانگی مسائل اور سابقہ دور میں انگریزوں کے تئیں اپنے خاندان کی خدمات کے ذکر پر متوجہ ہو جاتا ہے۔

بغاوت کی تفصیلات پر بحث سے متعلق مصنف کی خاموشی اور غیر ملکی فاتحین کے تئیں اُس کی وفاداری کے دعووں کی حقیقت اور وقعت کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں اگر ہم اس وحشیانہ قتل عام کو ملحوظ رکھیں جو اُس وقت بمباری تھا۔ بغاوت میں اُس کی شرکت کے ذرہ بھر گمان پر بھی اُسے یقیناً پھانسی پر چڑھا دیا جاتا۔ اس کے علاوہ غالب معاش کے لیے پنشن پر انحصار رکھتے تھے اور اس سے پیشتر کہ حکام اُس کی بحالی پر آمادہ ہوتے، انھیں اپنے خلوص نیت کا ثبوت ہم بیچانا تھا۔ یہ اُس شخص کے لیے اور بھی زیادہ ضروری تھا جو طبقہ امرا سے تعلق رکھتا تھا اور دہلی کے مغل بادشاہ بہادر شاہ کا اتالیق، درباری اور ندیم رہ چکا تھا۔ اگرچہ وہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے جدید تہذیبی اثرات کو سراہتے تھے لیکن انگریزوں کی جارحانہ پالیسیوں بالخصوص اودھ کے الحاق کو قبول نہ کر سکتے تھے۔ کچھ دیر کے بعد جب مارشل لا کی سختیوں میں ڈھیل ہوئی اور امن امان کی حالت بحال ہوئی تو غالب انگریزوں کے جو رستم کی زیادہ کھل کر مذمت کرنے لگے وہ ماگیر دار شرفا کی اس خام خیالی سے متفق نہ تھے کہ نئے حکمران اُن کو سیاسی اقتدار میں شریک کریں گے، انھوں نے عام طور پر اپنے باغی ساتھیوں اور شکست خوردہ طبقہ امرا کے مصائب کے لیے کھلے بندوں ہمدردی کا اظہار کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ جب ستمبر ۱۸۵۷ء کے وسط میں حالات دگرگوں ہو گئے تو انھوں نے اپنے بہت سے دوستوں کی طرح اپنی سلامتی کو ہر چیز پر ترجیح دی۔ اس لیے اگر انھوں نے حکام کے سامنے اپنی بریت کی پُر زور وکالت کی تو اس کے لیے انھیں قصور وار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ انھوں نے عند پیش کیا کہ میرا خاندان ہمیشہ انگریزوں کا ٹھک حلال رہا ہے اور اسی بنا پر مجھے زندگی بھر کے لیے پنشن عطا ہوئی ہے۔ بغاوت کے ایام میں میں نے شاہ پرستوں اور باغیوں دونوں سے

سپاہی خاص و عام سب پر حکم چلاتا ہے۔ (ایضاً صفحات ۸۵-۲۸۴)

عوامی لشکر کا دہلی میں اجتماع

غالب نے لکھا ہے کہ جو ہی سپاہیوں کے مختلف دستے دہلی میں پہنچے سب سے پہلے انہوں نے اپنے ساتھ لایا ہوا سونا چاندی شاہی خزانے کے حوالے کر دیا۔ پھر وہ لال قلعہ میں گئے مگر بادشاہ کے آستانہ پر سجدہ کریں۔ بعد میں فوجوں کے انداز میں ادھر ادھر پھرنے لگے۔
 ”لو دیکھو! ہر کو نے کھترے سے ایک سپاہی نمودار ہوا۔ ہر راہ سے ایک پلٹن اور ہر جانب سے ایک فوج ظاہر ہوئی۔ سبھی اس سرزمین یعنی دہلی کی طرف بڑھنے لگے۔ عجیب زمانہ ہے، کارکن باہر کے مڑے ہیں۔ اب دہلی کے شہر کے اندر اور باہر کم و بیش پچاس ہزار پیادہ اور سوار فوجی جمع ہو چکے ہیں۔“ (ایضاً صفحہ ۲۸۵)

ہندوستانی والیان ریاست پر عوام کا دباؤ

نامور والیٰ فرخ آباد افضل حسین خاں نے دہلی سے بادشاہ کے حضور میں جہ سالہ کی اور اطاعت کا اظہار کیا۔ بریلی کے خان بہادر خاں نے حضور شاہ میں ایک سو ایک سونے کی ہریں ایک ہاتھی اور ایک گھوڑا چاندی کے ساز کے ساتھ بطور ہدیہ بھیجا۔ رام پور کے نواب یوسف علی خاں بہادر جنہوں نے مدت سے انگریز حکمرانوں کے ساتھ پیان و فاباندہ رکھا تھا، بہادر شاہ سے وفاداری کا یہی پیغام بھیجنے پر مجبور ہو گئے۔ اس طرح انہوں نے اپنے نکتہ چیں ہمسایوں کا منہ بند کر دیا۔ لکھنؤ میں دانشمند وزیر (نظمی معنی ”مسلم فہم“) شرف الدولہ نے واجد علی شاہ کے بیٹوں میں سے ایک دس سال کے لڑکے کو تخت پر بٹھا دیا اور خود اُس کے پیشکار اور مشیر بن گئے۔ اُس نے دہلی میں شاہی دربار کو بیش بہا تحائف کے ساتھ اپنا سفیر بھیجا۔ الغرض بادشاہ کی قسمت کا ستارہ اتنا بلند ہوا کہ فرنگیوں (غوی معنی غانکی و دیہینے والوں ”غاکوں“) کا چہرہ گہنا گیا۔ (ایضاً صفحات ۸۸-۲۸۷)

انگریزوں کے ساتھ جنگ

”دن رات دونوں طرف سے سنگریزوں کی مانند فضا سے گولے برستے ہیں۔ مٹی اور جون کی گرمی آفتاب کی تیز روشنی کے ساتھ روز بروز بڑھ رہی ہے۔ طلوع آفتاب کے بعد شاہی فوج

ہامیان فرنگ کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں

”بچوں کو تیز سیلاب کو خس و خاشاک سے روکنا محال ہے، اس لیے انگریزوں کے مددگاروں میں سے ہر ایک لاچار ہو گیا اور حالات کے بگڑنے پر گھر کی چار دیواری میں سوگوار ہو کر بیٹھ گیا۔ مجھے بھی ان ماتم داروں میں شمار کر لو۔“ (ایضاً صفحہ ۳۸۲)

میرٹھ کے سواروں کا ان کے پہنچنے پر استقبال

”میرٹھ سے کچھ کینہ پرورد سوار شہر میں داخل ہوئے۔ یہ سب شور و غل کرنے والے تھے جو اپنے آقاؤں کو ہلاک کرنے کے لیے بے تاب اور انگریزوں کے خون کے پیاسے تھے۔ شہر کے دروازوں پر متعین دربانوں کو سازش کا پورا پورا علم تھا (لفظی معنی ”ہم سوگند“) انھوں نے ان ناخواندہ (یا شاید خواندہ) ہمالوں کا خیر مقدم کیا۔ بہر حال سواروں نے دربانوں کو ہمالا نواز پایا۔“ (ایضاً)

بغاوت کی توسیع

”رفتہ رفتہ دور دراز شہروں سے خبریں آنے لگیں کہ ہر چھاؤنی میں ہرجمنٹ کے شوریدہ سروں نے اپنے انگریز سپہ سالاروں کو قتل کر دیا ہے۔ جس طرح ساز چھڑتے ہی رقاصہ رقص میں آ جاتی ہے، اسی طرح ہر طول نمک حرام سپاہی اور کارگر اٹھ کھڑے ہوئے اور دل و جان سے بغاوت میں شریک ہو گئے اور دوسرے سے ایک لفظ کہے بغیر اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ باہر جنگ سپاہیوں کے یہ بزدل دستے جھاڑوں کی مانند ایک ہی شیرازے میں بندھے ہوئے ہیں۔ بے ترتیبی سے ان کے کوچ کرنے کا منتظر دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ بلکہ یہ کسی باقاعدہ سپہ سالار کی قیادت کے بغیر لڑتے بھی ہیں۔“ (ایضاً)

جاگیردار طبقہ پس پشت پڑ جاتا ہے

”انھوں نے نامور اور دانشمند ہستیوں کی عزت اور ان کی حویلیوں کو خاک میں ملا دیا۔ بیچ اور کنگال یکایک ممتاز ہو گئے۔ ذرا خیال کرو یہ شہدے، لپچے اب تیس مارخاں بنے ہوئے ہیں۔ یہ بد بختی کے دن ہیں جب جوان مرد خود اپنے سایہ سے ڈر جاتے ہیں اور ایک معمولی

دیہات اور دہلی کے گرد و نواح میں مزاحمت

بالآخر جب ۱۸۵۷ء کو دہلی رسمی طور پر انگریزوں کے قبضے میں آگئی لیکن دیہات میں مزاحمت کسی صورت کم نہ ہوئی، مصنف لکھتا ہے: "اب بھی بریلی، فرخ آباد اور کھنویس کثیر التعداد باغی منظم گروہوں کی صورت میں لڑنے اور زمین کا چپہ چپہ واپس لینے پر تلے ہوئے ہیں (لفظی معنی ایک ایک فرسنگ) دہلی کے قرب و جوار میں سوہنہ اور نؤہ (ضلع گوردھاراؤں) کے دیہاتیوں نے ایسا اودھم مچا رکھا ہے جیسے سودائی زنجیریں توڑ کر آزاد ہو گئے ہوں۔ تیلارام اب بھی ریلواری میں مغرور ہے اور دیوی نام کے میوکی خوجوں میں شامل ہو گیا ہے اور اُس کے حکم کے تحت کام کرتا ہے۔ ان پیارے اور جنگلی علاقوں میں یہ گروہ برطانوی حکمرانوں کے ساتھ لڑنے کا اپنا جداگانہ منصوبہ رکھتا ہے۔ الغرض یہ کہنا بجا ہوگا کہ ہندوستان کا ذرہ ذرہ بیجان میں مبتلا ہے۔" (ایضاً صفحہ ۲۹۷)

ایک خانگی نظارہ: بارش کے پانی کا ذخیرہ کرنا

۵ اکتوبر کے بعد غلے کی تمام دکانیں بند ہو گئیں اور بہتر، دھول، حجام اور پھری والے شہر چھوڑ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو دن اور دو رات کھانے پینے کو کچھ نہ ملا۔ قدرتی طور پر غالب بدحواسی کے عالم میں تھے جب "اچانک آسمان ابر آلود ہو گیا اور بارش ہونے لگی۔ ہم نے گھر میں کپڑے کی ایک چادر پھیلائی، اس کے نیچے ایک بڑا منکار رکھا اور اس طرح بارش کا پانی جمع کیا۔ کہتے ہیں کہ بادل سمندر سے پانی ماحصل کرتے ہیں اور زمین پر برساتے ہیں لیکن اس سونہر پریش ہوا بادل ہمارے لیے چشمہ زندگی سے پانی لائے ہیں۔ بہر حال جس آبِ حیات کو سکندر اپنا بادشاہی کے دوران دھونڈنے میں ناکام رہا وہ اس کھاری پانی پینے والے عاجز شہزاد نے مصیبت کی اس گھڑی میں دریافت کر لیا۔" ۱۵

غارت گری اور قتل عام

شہر پر برطانوی قبضے کے ساتھ بقول مصنف "ہمارے نئے آقاؤں کی آتش انتقام" کا نیا دور شروع ہوا۔ "فاتحین کشمیری دروازے کے سامنے کے راستے سے آگے بڑھے جو بازار کو جاتا ہے اور جو کوئی بھی سڑک پر ملا اُسے قتل کر ڈالا۔ ہر شریف اور ہوشمند نے اپنے گھر کا دروازہ بند کر دیا۔"

کے جنگجو روزانہ شہر کے گوشے گوشے سے جمع ہوتے ہیں۔ شیروں کی مانند رٹنے جاتے ہیں اور غروب آفتاب سے مین پہلے واپس آ جاتے ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۲۸۶)

حویلی حکیم احسن اللہ خاں آگ کی نذر

ہاتھوں نے انگریزوں کے مددگار حکیم احسن اللہ خاں کی حویلی کو لوٹ لیا جو بنگارخانہ چین کی مانند نظر آتی تھی اور استقبالیہ ہال سے متصل کمرے کو آگ لگا دی۔ (ایضاً صفحہ ۲۸۷)

برطانوی حملہ اور باغیوں کی پسپائی

۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو انگریزوں کا حملہ ہوا اور اب کشمیری دروازے پر برطانوی حملے کے مقابلے میں ہندوستانی فوجوں (لفظی معنی "کالے سپاہیوں") کے لیے پسپا ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ (ایضاً صفحہ ۲۸۸)

لوگوں کی آخری دم تک مزاحمت

"جب انگریزوں نے غلامی فوج کے ہاتھوں سے شہر چھین لیا تو عام لوگ باغی سپاہیوں کے ساتھ شامل ہو گئے اور گلی گلی میں لڑنے لگے۔ شہر کے بعض شہداء، کہنے شہر پر قابض بہادر انگریز فوجیوں کے ساتھ مقابلہ کرنے لگے۔ دو تین دن تک کشمیری دروازے سے آگے شہر کا گوشہ گوشہ پچ پچ میدان جنگ بنا رہا اور باہر جانے کے تین راستے یعنی اجیری دروازہ، ترکمان دروازہ اور دہلی دروازہ باغی فوجیوں کے ہاتھوں میں رہے۔" (ایضاً صفحہ ۲۸۹)

یہاں خردیہ پر انگریزوں کے قبضے کا نتیجہ ہوا کہ اعلیٰ اور ادنیٰ طبقات کے بہت سے لوگ جن کا شمار ممکن تھا ان تین دروازوں کے ذریعے شہر سے نچ کر نکل گئے (ایضاً)

لوگوں کی بلند حوصلگی

اپنے محلے میں رہنے والے شہریوں کا ذکر کرتے ہوئے نائب لکھتے ہیں: "اگرچہ گلی کا پھانک بند ہے پھر بھی لوگ اس قدر بے خوف ہیں کہ وہ دروازے زبردستی سے کھول کر محلے میدان میں نکل جاتے ہیں اور کھانے پینے کی چیزیں لے آتے ہیں۔" (ایضاً)

کوئی دھواں نہیں نکلتا۔ اس ویرانی اور ناامیدی کے عالم میں شاعر کو فقط یہی نظر آتا تھا کہ مسلمانوں کو قوم کی حیثیت سے مریت اور فاقہ کشی کا سامنا ہے (ایضاً صفحہ ۴۱۰) البتہ جلد ہی کہیں آفت پر ایک دھندلا سا نقش نمودار ہوا اور شاعر نے بالآخر صوفیانہ انداز میں امید کا اظہار کیا۔

چرگر کہ ز زخم بر چنگ زند
پیدا است کہ از بہر چہ آہنگ زند
در پردہ ناخوشی خوشی نہاں است
گازد نہ ز خشم جاہ بر سنگ زند

(مطرب جب باجے کے تار پر مضرب لگاتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا مقصد کیا ہے۔ غم کے پردے میں خوشی پوشیدہ ہے۔ دھواں کسی غصے سے کپڑے کو بھر رہا نہیں پکلتا۔)

کتابیات

- (۱) دستنبو: کلیات غالب (فارسی) میں شامل ہے۔ مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۶۲ء
- (۲) کلیات نثر غالب (لکھنؤ ۱۸۶۱ء)
- (۳) غالب کا روزنامہ (دہلی ۱۹۲۴ء)
- (۴) مکاتیب غالب (راپور ۱۹۴۹ء)
- (۵) نادر خطوط غالب (لکھنؤ، ۱۹۳۹ء)
- (۶) خود ہندی (علی گڑھ ۱۹۲۶ء)
- (۷) اردوئے معلّے (لاہور، ۱۹۲۲ء)

حواشی

- ۱۔ اپنے ایک اردو خط میں غالب لکھتے ہیں کہ جب الہی کو دہلی میں فساد شروع ہوا تو کس طرح انہوں نے گھر کا دروازہ بند کر دیا (جو شہر کے عین وسط میں واقع تھا) اور چل کر "بے شغل زندگی بسر نہیں ہوتی اس نے اپنی مرگدشت جو اوروں سے سنی تھی، لکھنا شروع کر دی۔"

(ایضاً صفحات ۸۹-۸۸) غالب نے یکایک دیکھا کہ "ہر طرف پھانسی کے تختے نصب ہیں اور سرکاریں و ہشت نگ ہیں اب کسی کو باہر نکلنے اندر ہم سے بات کرنے کی جرات نہیں اور نہ ہمیں باہر جانے اور اپنی آنکھوں سے کچھ دیکھنے کی مجال ہے" (ایضاً صفحات ۹۲-۹۱)

جہاں تک شہر کی تاخت و تاراج کا تعلق ہے "فوجی دستوں کے نام پر حکم عام جاری کیا گیا ہے کہ جو شخص فوراً ہتھیار ڈال دے اس کی جان بخشی کر دی جائے لیکن اس کا مال و متاع قبضے میں لے لیا جائے۔ اگر کوئی مقابلہ کرے تو اسے جان سے مار دیا جائے اور اس کے مال پر تصرف کر لیا جائے۔ بہر حال سارے شہر میں اتنی لاشوں کو دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ قتل عام ہوا ہے کیوں کہ ان کے کندھوں پر ان کے سر موجود نہیں ہیں" (ایضاً صفحہ ۲۹۵)

"ہجڑا، بہادر گڑھ، بلب گڑھ، لوبارو، فرننگر، دو جازہ اور پٹودی شہر کے گرد و نواح میں ایسی سات ریاستیں ہیں جن کے حکمران دہلی میں برطانوی ایجنسی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ان میں سے پانچ ولایان ریاست کو سزا کے لیے قلعے میں نظر بند کر دیا گیا ہے اور باقی دو اپنے حشر کا بے تابی کے ساتھ انتظار کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہجڑا، بلب گڑھ اور فرننگر کے حکمرانوں کو الگ الگ پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا۔" (ایضاً صفحات ۱۰۱-۱۰۰)

اس کے بعد دہلی ایک بڑا جیل خانہ نظر آنے لگا۔ بقول مصنف "اس شہر میں جیل خانہ قصبے کی حد و در سے باہر اور حوالات (دارالاعزا) صوبہ شہر کے اندر ہے۔ ان دو مقامات کو لوگوں سے اس قدر کچھ بھر دیا گیا ہے گویا ایک دوسرے میں گھس کر گھری کی صورت بندھے ہوئے ہیں۔ صرف فرشتہ اجل ہی جانتا ہے کہ ان دو قید خانوں میں کتنے قیدی وقتاً فوقتاً تختہ دار پر لٹک کر مرے ہیں۔ شہر میں مسلمان باشندوں کی تعداد اس وقت ایک ہزار سے زیادہ نہیں جو یا تو قیدیوں کے رشتہ دار ہیں یا پیش خوار۔" (ایضاً صفحات ۴-۳-۲۰۳)

لمحات یاس اور تصور مستقبل

غالب نے اس شہر کو جسے اُس نے شہر خوشاں کا نام دیا، دیکھ کر شکستہ دل تھا۔ ایک وقت تھا کہ وہاں ہزاروں اُس کے آشنا تھے۔ ہر گھر میں اس کا کوئی نہ کوئی رفیق اور ہر مکان میں اُس کا کوئی نہ کوئی دوست تھا۔ یہ خیال اُس کے لیے درد و کرب کا موجب تھا کہ وہ شہر مسلمانوں سے خالی ہے رات کی تاریکی میں ان کے گھر بے چراغ ہیں اور دن کو روزن دیو لڑ میں سے کوئی

- اپنے قبضہ قدرت میں رکھا، آدمی کو بدنام کیا ہے۔ (عروج ہندی صفحہ ۹۳)
- ۸۔ وضاحت کے لیے خیر آباد کے مولانا فضل حق کی مثال لیجیے جنہیں بعد میں عرق قیدی مرزا کے کوششیں بھیجا گیا وہیں ان کی وفات ہوئی۔ ۱۸۶۱ء میں جب ان کا ایک دوست کلکتہ آیا تو غالب نے اس سے بڑی فکر مندی کے ساتھ مولانا کا حل دریافت کیا (اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۲) جب مولانا کا انتقال ہوا تو غالب نے اس دوست کی موت پر ماتم کیا جو "فخر ابا دو تکون" (مولانا فضل حق) تھا جبکہ وہ خود مصیبت کی گھر میں گن گن کر زندگی کے دن کاٹ رہا تھا (ایضاً صفحہ ۲۸) امر کے قدیم طبقے کا جو غم اُسے کھلے جا رہا تھا اس کا اس کے مجموعہ خطوط میں بار بار ذکر کیا گیا ہے۔ مثل کے طور پر غالب کا خط مورخہ ۲۸ دسمبر ۱۸۵۸ء لیجیے جس میں وہ یوسف مرزا کو لکھتا ہے: "میرا حال سچائے میر خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرت غم سے سودا ہوا جاتے ہیں، عقل جاتی رہتی ہے، اگر اس بجوم غم میں میری قوت متذکرہ میں فرق آگیا ہو تو کیا عجب ہے بلکہ اس کا بار نہ کرنا غضب ہے میں علی کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں وہ ذخروں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے یہاں اغنیا اور امر کے ازواج و اولاد بھیک اگئے۔ پھوس اودیں دیکھیں (اس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیے) (ایضاً صفحات ۵۵-۲۵۴) یہ دہیوں چاہیے کہ اُس وقت خود مصنف کو تنگ دستی کا سامنا تھا۔ ایک بار اُس کے پاس مرثیہ ایک روپیہ سات آنے باقی رہ گئے تھے اور فاقہ کشی کی نوبت آنے میں تھوڑی ہی گھر باقی تھی۔ (ایضاً صفحات ۵۱-۲۵۰) انگریزوں کے ہاتھوں امر کی حویلیوں کی تباہی پر رائے ذنی کرتے ہوئے غالب نے ایک بار انگریز کو بندر سے مشابہ کیا: "ایک پیلٹن بندر پیدا ہوا ہے۔ مکانات جا بجا ڈھاتا پھرتا ہے۔ فیض اللہ خالدنگش کی حویلی پر جو گلدستے ہیں انہیں سے ہلا کر ایک کی بنیاد ڈھادی ... وہ رے بندر! یہ زیادتی اور پھر شہر کے اندر" (ایضاً صفحہ ۲۸۸)
- ۹۔ کلیات صفحہ ۲۸۹، نیز راجپور کے نواب یوسف علی خاں کے نام ایک خط مورخہ ۱۲ جنوری ۱۸۶۵ء میں۔ (مکتبہ غالب صفحہ ۹)
- ۱۰۔ کلیات صفحہ ۲۹۴، نیز عروج ہندی صفحہ ۱۲، غالب نے اپنے روزنامہ میں عربی زبان کے عام معرلی الفاظ اور اصطلاحات کے ترک کا بھی التزام کیا ہے جو اُس زمانے میں مروج اور متداول تھے۔
- ۱۱۔ یہ ملاحظہ کرنا باعث دل چسپی ہے کہ مصنف نے مولانا فضل حق اور مفتی صدر الدین کے سے بنیاداً اشخاص کے ناموں کا ذکر نہیں کیا جنہوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کی حمایت میں مسلم علماء کا ہتھی

(ہندی صفحہ ۱۱۲) اس قسم کی عبارتوں کے روزنامہ میں بھی موجود ہے (کلیات نثر غالب صفحہ ۱۲۷)

۲- اس کے مقدمہ کے خون کے باب میں ملاحظہ کریں "کلیات"

۳- ایضاً صفحہ ۲۸۸

۴- عام طور پر یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ صرف شہر دہلی میں ۲۷۰۰۰ اشخاص کو پھانسی دی گئی یا گولی سے اڑایا گیا جو لوگ قتل ہوئے ان میں غالب کے دوست اور مشہور شاعر صہبائی کا خاندان بھی شامل تھا۔

۵- مصنف اپنے روزنامہ میں دیدہ و دانستہ بہادر شاہ اور شہزادوں سے متعلق تمام حوالوں کو حذف کر دیتا ہے (کلیات صفحہ ۲۹۸)۔ جب بہادر شاہ کی جلاوطنی کی حالت میں موت کی خبر پہنچتی ہے تو اُسے غم کا احساس بھی ہوتا ہے اور اطمینان بھی۔ شاعر نے لکھا کہ "فرشتہ ازل نے اسے قید رنگ سے بھی آزاد کر دیا ہے اور قید جسم فانی سے بھی" (اردوئے معلّے صفحات ۲۱-۱۲)

۶- ۲۳ فروری ۱۸۵۷ء کے روزِ بغاوت سے چند ہفتے پہلے اودھ میں (غلام حسین بگڑامی نام کے) ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے غالب لکھتا ہے: "ان بڑے دلوں کا خیال کرو جو ہمارے مقدمہ میں لکھے ہیں۔ گو اس سے مجھے براہِ راست کوئی سروکار نہیں لیکن اودھ کی تباہی سے مجھے حد درجہ صدمہ پہنچا ہے۔ درحقیقت بری رائے ہے کہ اگر کسی ہندوستانی کو اودھ سے کوئی ہمدردی نہیں تو وہ انصاف سے بالکل بے بہرہ ہے" (ایضاً صفحہ ۴۰۳) جب اپنے روزنامے کے اختتام پر اُسے لکھنؤ کی شکست کی روئدادِ قلمبند کرنی پڑتی ہے تو غالب بظاہر مغموم ہو جاتا ہے اور اس واقعے سے متعلق اظہارِ رائے میں صرف سعدی کے ایک شعر پر اکتفا کرتا ہے۔

چہ کند بندہ کہ گردن نہ ہند فرماں را

چہ کند گوئے کہ تن در نہد چچکاں را

اس کا مطلب یہ ہے کہ "غلام کیا کہے اگر اپنے آقا کے حکم کے آگے سر تسلیم خم نہ کرے، گیند کیا کہے اگر بٹے کی ضرب بلا چون و چرا نہ سہے۔" (کلیات صفحہ ۴۰۵)

۷- جب مصنف کو اطلاع ملی کہ بہاراجہ اور کے پورے اقتدارات بحال کیے جا رہے ہیں تو غالب نے (جو اس زمانہ کی مسئلہ جبر و قدر کی فلسفیانہ بحث میں تقدیر کی برتری کا معتقد تھا) ایک دوست کے نام خط میں طنزاً یہ کلمات لکھے: "یا لفضل تمام عالم کا ایک سا عالم ہے۔ سنتے ہیں کہ نومبر میں بہاراجہ کو اختیار ملے گا مگر وہ اختیار ایسا ہو گا جیسا خدا نے خلق کو دیا ہے۔ سب کچھ

- ۱۶۔ ایک اردو خط میں یہ زیادہ واضح ہے جہاں اس نے اُسے قتل عام کا نام دیا اور ایضاً صفحہ ۱۲۸) ایک اردو خط میں اُس نے دہلی پر دوسرے حملہ آوروں کے علاوہ انگریزوں کا بھی ذکر کیا، "دوسرا لشکر خاکیں کا" اس میں جان و مال و ناموس و مکان و کمین و آسمان و زمین و آثارِ بہستی مملکت کے "عویدہ ہندی صفحہ ۹۰)۔
- ۱۸۔ ایک اور مقام میں مصنف انگریزوں کا ذکر کرتا ہے جنہوں نے شیعہ کو قتل کر دیا لیکن ساتھ ہی صبح صادق کی بشارت دی جو نورِ آفتاب کا پیش خیمہ تھی۔

صاف کیا اور جو غالب کے یارِ خار اور دوست شمار ہوتے تھے۔ درحقیقت اس کے روزنامہ میں صرف ایک آدمی کا ذکر ہے اور وہ ہے حکیم احسن اللہ جو انگریزوں کی مدد کرنے کی وجہ سے باغیوں کے کیمپ میں بدنام ہو چکا تھا اور غالب نے اس کیفیت کا خاص طور پر مناسب ذکر کیا ہے (کلیات صفحہ ۲۸۷)

۱۲۔ اپنے روزنامہ میں غالب لکھتا ہے: ”درحقیقت ایک آزاد منش کو واجب نہیں کہ وہ راستی پر پردہ ڈالے۔ خاص طور پر میرے جیسے نیم مسلمان کو جو کسی مذہب و ملت کا پابند نہیں اور جو یکتائی سے مطلقاً بی نیاز ہے“ (کلیات صفحہ ۴۷) اس ضمن میں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ گو غالب نے انگریزوں کے خلاف لڑنے میں باغیوں کی بہادری کی داد دی لیکن دہلی میں بیگانہ انگریزوں کا خون بہانے کی وجہ سے انہیں کبھی معاف نہیں کیا۔ ان کی انسان دوستی سے واقف ہونے کے لیے دوسری تصنیفات کے علاوہ اردوئے معلیٰ (صفحہ ۴۲) میں ان کے ارشادات ملاحظہ فرمائیں۔

۱۳۔ غالب کے روزنامے کا اردو زبان میں ایک مفصل نسخہ مولفہ مرزا یعقوب بیگ دہلی سے حسن نظامی نے ۱۹۲۷ء میں پہلی بار بعنوان ”غالب کا روزنامہ“ شائع کیا۔ مجھے ۱۸۵۷ء کی بے شمار سرکاری اور غیر سرکاری تواریخ میں کہیں غالب کے روزنامے کا حوالہ نہیں ملا۔

۱۴۔ ”فرسنگ“ فلسفے کا ایک پہاڑ ہے۔

۱۵۔ یہ سکند اور اس کی آبِ حیات کی تلاش سے متعلق داستان کی طعن اشارہ ہے۔

۱۶۔ انہی دونوں بھصفت نے مارشل لا سے متعلق اپنے مشہور ”آوازِ شاہِ قلم“ کیے:

بے بسک قتال مایہ دید ہے آج
ہر سلسلہ شہر انگلستان کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آبِ انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ قتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا قذہ قذہ خاک
نشہ خوں ہے ہر مسلمان کا

(اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۷۲)

کی پر زور کوشش کی۔ ہندوستان میں تحریک اصلاح مذہب (ابتداء ۱۸۱۵ء) جس کے بانی رام موہن رائے تھے، دیوندر ناتھ ٹیگور (۱۹۰۵-۱۸۱۶ء) کی راہنمائی میں نئے جوش و خروش (۱۸۲۳ء) کے ساتھ چل رہی تھی جب کہ معاشرتی اصلاح کی تحریک نے ایسور چندر وریا ساگر (۱۸۹۱-۱۸۲۰ء) کی قیادت میں نمایاں کامیابی حاصل کی، جب ۱۸۵۶ء میں بیروہ کی شادی کا قانون منظور ہوا۔ اس سے سبھیوں اور قدامت پسند طبقے کی یہ اعتمادی بڑھ گئی۔

سیاسی طور پر انھوں نے مفصلاتی عدالتوں میں فرنگیوں کے غیر منصفانہ امتیازی حقوق (جنہیں ۱۸۴۵ء کے قانون کہتے تھے) کو ختم کرنے کے لیے رام گوپال گمش (۱۸۶۸-۱۸۱۵ء) کی سرکردگی میں تحریک اٹھانا سیکھ لیا تھا۔ انھوں نے سیاسی ادارے قائم کیے (۱۸۴۳ء) اور دی برٹش انڈین ایسوسی ایشن (۱۸۵۱ء) میں اپنی منظم قوت کو متحد کیا تاکہ "حق المقدور ہر جائز طریقے سے ہندوستان میں برطانوی حکومت کی اصلاحات اور اس کے جن انتظام کو بڑھایا جائے"۔

برطانوی حکومت کی اصلاحات اور اس کے بنی اسطلاح کو برہنہ کیا جائے۔
۱۸۵۲ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر کی تجدید ہونے والی تھی، انھوں نے ایک
عرضداشت میں جو ہریش چندر کمر جی (۶۱-۱۸۲۴ء) نے مرتب کی، اسطابق کہ دوسری چیزوں کے
علاوہ ایک ہندوستانی قانون ساز مجلس کا قیام عمل میں لایا جائے جس میں ہندوستانی اراکین کی
اکثریت ہو اور بالآخر سر چارلس وڈ کے ۱۸۳۵ء کے تعلیمی مراسلے اور ۱۸۵۴ء میں کلکتہ، مدراس اور
بمبئی کی تین یونیورسٹیوں کے قیام کے ذریعے انھوں نے اپنے تعلیمی مقاصد کی تکمیل اور ترقی کے
لیے نئی راہیں پائی تھیں۔

یہ نئی راہیں پائی تھیں۔
تاریخ میں ہم بہت سی متضاد صورتوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ بعض لوگ انہیں متناقضات
کا نام دیتے ہیں اور انہیں ہم آسانی کے ساتھ سرسری وضاحت سے رد نہیں کر سکتے۔ ہم میں سے
بہتوں کو یہ بات عجیب دکھائی دے گی کہ فوجی غدر (۱۸۵۷-۵۸ء) کے دوران بنگال کے اس
روشن خیال طبقے نے اُن عظیم ہنگاموں میں کوئی دل چسپی نہ لی حالانکہ اُن ہنگاموں سے کم از کم شمالی
ہندوستان میں برطانوی اقتدار کی بنیادیں ہل گئیں۔ یہ حیرت کا مقام ہے کہ ہندوستان کے لوگوں
کا سب سے زیادہ روشن خیال طبقہ صدیقِ دل سے سپاہیوں کا مخالف تھا حالانکہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت
ختم ہوتے ہی، بلکہ اس سال کی آخری رات ابھی گزرنے بھی نہ پائی تھی کہ وہی بنگالی روشن خیال طبقہ
۱۸۵۸-۵۹ء میں وسطی بنگال کی بغاوتِ نیل میں بلا تامل کود پڑا۔ یہ اُن کا حب وطن کا

گوپال ہلدے

۱۸۵۷ء سے پہلے اور بعد کا

بنگالی ادب

بنگالی ادب ۱۸۵۷ء سے ۱۸۷۱ء تک جس تخلیقی سرگرمی کے درو و کرب میں مبتلا تھا اس کی نظیر اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی۔ یہ تیاری کی منازل طے کر چکا تھا (لگ بھگ ۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک) اس کی تیاری کے چار دور تھے: فورٹ ولیم دور ۱۸۰۱ء سے ۱۸۱۵ء (۱۸۱۵ء تا ۱۸۲۱ء) نو جوان بنگال (ڈرو زین) اور سم واد پر بھار دور (۱۸۲۱-۱۸۳۱ء) احمد آخوندی عیسائی اور تہود مذہبی پر کا دور (۱۸۳۱-۱۸۴۳ء)

البتہ اس پیچیدہ لہجہ کی تحریک کا جسے بنگلہ جاگرن کہا گیا ہے ادبی سرگرمیاں صرف ایک پہلو تھیں کسی تدریس معنی کے اعتبار سے اس تحریک میں بنگالی اکیائے علوم، اصلاح دین (مذہبی اور سماجی سرگرمیاں) اور بالآخر سیاسی بیداری شامل تھیں۔ یہ ان تاثرات کا مرکب تھا جو برطانوی حکمرانوں کے طرز کے شہری متوسط طبقے کے ساتھ بڑھتے ہوئے رابطے سے ہمارے عوام میں پیدا ہوئے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کا آغاز کلکتہ میں ۱۸۱۵ء میں رام موہن رائے ۱۸۲۲-۱۸۴۴ء کی سرگرمیوں کے ساتھ ہوا اور انیسویں صدی کے نصف آخر میں درجہ کمال کو پہنچا۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ "بنگلہ جاگرن" کی ابتدا ۱۸۱۵ء میں ہندو کالج کلکتہ کے قیام کے ساتھ ہوئی۔ ہندو کالج کے قیام سے ایک نئی عکس قوت وجود میں آئی یعنی بنگال کا روشن خیال شہری متوسط طبقہ یا تعلیم یافتہ بھدر لوک۔ بھدر لوک یعنی شرفانے تقریباً سو سال تک بنگال کی زندگی اور اس کے انداز فکر کی تشکیل کی۔ یعنی پہلی عالمگیر جنگ (۱۸-۱۹۱۴ء) تک جن سے قومی اور بین الاقوامی افق پر نئی قوتیں ابھریں۔ چنانچہ کم از کم چالیس سالہ پرانی نوآبادیاتی تحریک اصلاح ۱۸۵۷ء کے روشن خیال طبقے کی پشت پر تھی۔ روشن خیالوں کی دو پشتوں نے شہری متوسط طبقے کے آزادانہ نظریات کے زیر اثر پرورش پائی تھی۔ انھوں نے ہندوستانی جاگیر دارانہ رسم و رواج کے بوجھ کو اتار دیا۔

(۱۸۲۶-۹۹ء) نے گزشتہ دس بارہ سالوں میں بنگالی نثر کی خاص ترقی کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے نین بربر آوردہ شخصیتوں کا ذکر کیا یعنی ایشور چندر و دیاساگر، تبولو دھنی صحافیوں کے اکٹھے کاروت (۱۸۲۰-۸۹ء) اور راجندر لال مترا (۱۸۲۲-۹۱ء) جو ہندیات کے بلند درجہ عالم تھے اور جو ۱۸۵۱ء سے "وودھارتھ سنگھ" کے مدیر تھے۔ یہ ایک باتصویر ماہانہ رسالہ تھا جو آثار قدیمہ، علم حیوانات، صفت و حرفت اور ادب کے لیے وقف تھا۔

راج زائن بوس اپنے آپ کو اور مشہور شاعر نیگور کے والد دیو ندر ناتھ نیگور کو انتہائی حسین تخیلی نثر کے اولین لکھنے والوں میں شمار کر سکتے تھے اور کم از کم ایک اور ادیب پیاری چند (۱۸۱۳-۸۳ء) کو بھی جو "ٹیک چند ٹھاکر" کے نام سے پہلا بنگالی ناول بعنوان "الکیر گھربہ ڈلال" "ماسک پتر کا" کے صفحات میں اشاعت کے لیے لکھ رہا تھا۔ (۱۸۵۲ء) یہ رسالہ رادھانا تھ سکدر (۱۸۱۳-۶۰ء) جو ایورسٹ کی دریافت کے سلسلے میں مشہور ہے اور پیاری چند نے مل کر جاری کیا تھا۔ عبوری دور کی شاعری نے (جیسی کہ استاد وطن پرست شاعر ایشور چندر گپتا یا گپتا کوئی ۱۸۱۲-۵۹ء) کرتے تھے) انگریزی پڑھے لکھے طبقے کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ ان میں رنگ لال بننو اپادھیائے (۱۸۲۶-۸۶ء) بھی شامل تھا جو مقتدر انگریزی شاعر کا مانا ہوا مداح تھا۔ بنگالی شاعری اب اس باکمال مائیکل مدھوسودن دت (۱۸۲۲-۶۳ء) کی آمد کی منتظر تھی جو ۱۸۵۶ء میں مدراس سے کلکتہ واپس آیا۔

بنگالی نانک اور شیخ ۱۷۹۵ء میں روسی گیرام بے ڈنٹ کی بدولت جدید فن سے روشناس ہو چکا تھا اور اُس نے ترقی کی راہ دیکھ لی تھی۔ سنسکرت ہی نہیں شیکسپیر کے نانکوں کو بھی کسی قدر شعور کے ساتھ اپنایا جا رہا تھا۔ سماجی اصلاح اور تفریح طبع کے لیے جدید بنگالی نانک کی ابتدا انگلینڈ میں سر سوسے ہوئی جو رام نارائن ترک رتن (۱۸۲۲-۸۵ء) نے لکھا اور ۱۸۵۲ء میں شائع ہوا یہ نانک پہلی بار مارچ ۱۸۵۴ء میں کلکتہ کے نون بازار کے شیخ پر کھیلایا، اس وقت جب کہ بارک پور میں سپاہی پہلے ہی کرسی پر مائل تھے۔ لیکن بنگالی تھیں ۱۸۵۶ء میں ہی "مہد سرتی" میں وارد ہو چکا تھا جب کالی پرسن سہا (۱۸۲۰-۶۰ء) کا جو اسکو ماؤس شیخ وجود میں آیا۔ پیک پرا باغ شیخ اس کے دو سال بعد (۱۸۵۸ء) قائم ہوا۔

بنگالی نانک اور شیخ نے شہری دولت مندوں، غائب باش زمینداروں اور اعلیٰ طبقوں کی پرستی میں بغاوت ہی کے زمانے میں جنم لیا۔ اضطراب اور فتنہ و فساد کی وجہ سے ان کے

جذبہ تھا، یہ ان کی دلیری تھی۔ یہ اس بات کا ناقابل تردید ثبوت تھا کہ بنگال کا روشن خیال طبقہ (جسے کہہ سکتے ہیں کہ اعلیٰ طبقات کے ساتھ وابستہ تھا) مظلوم کسانوں کی بہبودی کی خاطر اپنے تمام ترجوش اور حین تدبیر کے ساتھ لڑ رہا تھا اور سماج کے تمام طبقوں کے رہنماؤں کی حیثیت سے بنگال کی قومی زندگی میں اپنا پارٹ ادا کر رہا تھا۔

اس لیے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے دوران بنگال کے روشن خیال طبقے کے طرز عمل سے متعلق کسی محدود طبقاتی نظریے سے انیسویں صدی کے بنگال کی زندگی اور ادب کے بہت سے طابعوں کی تسلی نہ ہوگی۔ بغاوت ۱۸۵۷ء کی ماہیت سے متعلق تاریخ کا آخری فیصلہ خواہ کچھ ہی ہو، بنگال کے عوام اور بنگال کے روشن خیال طبقے کا شعور اُس وقت ہندوستانی لوگوں اور عہدہ مابعد کے ہندوستانی روشن خیالوں کے شعور سے مختلف تھا اور اُن حالات میں یہ اختلاف ناگزیر تھا۔ نہ صرف لکھنؤ کے سابق ڈرویزن راجہ دکنشار بنجن مگر جیسے آزادی پسند امر ۱۹ اس بغاوت کے نمایاں تھے بلکہ یوپی کے بنگالی کلرکوں نے بھی نعرہ جہاد پر کان نہ دھرے۔ درگاداس بندوپادھیائے (۱۸۲۲-۱۸۳۵) کے مشاہدات جو بعد میں ”دروہ بنگال“ (ہفتہ وار ”ونگواسی“ کے صفحات اس کے قوم پرست مدیر کی ترغیب پر) میں بیان کیے گئے۔ ظاہر ہے کہ یوپی میں بغاوت (یعنی بریلی) اس کو اپنے آقاؤں کے تئیں وفاداری سے مخوف نہ کر سکی۔

اس بنیادی حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ بنگال کے روشن خیال طبقے کی نگاہ میں بغاوت ۱۸۵۷ء کا مطلب کیا تھا، نیز اس کے اسباب کا بھی بخوبی تجزیہ کرنا ضروری ہے۔ اگرچہ روشن خیال طبقے کی جماعتی خصوصیات کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جس کی خوشحالی کا مدار بڑی حد تک برطانوی حکومت پر تھا۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے روشن خیال طبقہ اپنے عقیدوں میں راسخ تھا۔ وہ فوج بغاوت کو محض ایک اتفاقیہ، بے ساختہ جاگیردارانہ اور رجعت پسندانہ ہم تصور کرتا تھا اور اس کی بے پراپی شہری متوسط طبقے کے آزادانہ نظریات سے مخوف نہ ہو سکتا تھا۔

بنگال ادب اُن جدید خیالات اور اسالیب کو بلا تامل قبول کرنے پر آمادہ تھا جو انگریزی زبان اور ادب کے طفیل تعلیم یافتہ بنگالی پر آشکار ہوئے۔ اب ہم اس جدید بنگالی ادب کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔

۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۹ء کے دوران بنگالی نثر علم و دانش کے وسیلے کی حیثیت سے وجود میں آچکی تھی ۱۸۵۷ء کے ”توبودھنی پتر کا“ میں لکھتے ہوئے ”بابائے قوم پرستی“ راج نرائن بوس

(ہندی و بنگالی) کی اشاعت بغاوت کے دوران بند کردی گئی اور ایک اور اخبار ”ہرکارو“ پر
مقرر چلایا گیا۔ باقی پریس اور ادب پر بغاوت دشمنی کا الزام رکھتے وقت ہمیں اس حقیقت پر مناسب
توجہ دینا ضروری ہے جو ہم بعد میں کریں گے۔ بہر حال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ادبی اور تمدنی سرگرمیوں
کو دبائے میں یہ اقدامات ناکام رہے۔ یہ سرگرمیاں تیزی سے جاری ہیں اور ان پر بغاوت کا کوئی اثر نہ پڑا۔
اب ہم اس وقت کے ادب سے کچھ نمایاں مثالیں پیش کرتے ہیں۔

”اللیر گھیر دلال“ مصنف ”ٹیک چند“ ۱۸۵۸ء میں شائع ہوئی۔ یہ ایک اخلاقی ناول ہے
جس میں تعلیم اور جدید تمدن کی حمایت کی گئی ہے اور معاصر زندگی اور بعض مثالی شخصیتوں کی تصویریں
کھینچی گئی ہیں۔ اور مسائل سے اس کا کوئی سروکار نہ تھا اگرچہ حب وطن کا جذبہ اس وقت (۱۸۵۸ء) کے
بنگالی ادیبوں کی تصانیف کا اکثر موضوع تھا۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، الیشور گیت نہ صرف عبوری دور کا ایک شاعر تھا بلکہ وطن پرست
شاعر بھی۔ وہ اس قدر انتہا پسند تھا کہ اس کی رائے میں ”غیر ملکوں کے دیوتا کے بجائے اپنے وطن کے
کتے کو عزیز رکھنا بہتر ہے۔“

اس کا کلام ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے علاوہ قحط اور اس قسم کی دوسری آفات کے ضمنی حوالوں
سے پڑے ہیں لیکن باغیوں کی بیعت ناک دلیری اور نظام کا زکو شعروں میں ایہام کے ساتھ کیا گیا ہے۔
۱۸۵۹ء میں جب ملک کی براہ راست حکومت شروع ہو چکی تھی، اس نے اپنی موت سے پہلے جو
فہرست گیت (چٹان) نیل کاروں سے متعلق لکھا تھا وہ لب دلچسپی میں بالکل صاف ہے۔ ”ہم بنگالی
محض مولشیوں کا ایک گلا ہیں اے ماما ملکہ کٹیریا! بظاہر شاعر طنزاً اظہار کرتا ہے ”ہم سینگ ماما
بھی نہیں جانتے۔ ہم صرف چارا، گھاس اور بھوسا چاہتے ہیں۔ اپنے گورہاں سمروں کو اس بات کی
اجازت نہ دیں کہ وہ ہمیں اس (چلہ وغیرہ) سے محروم کریں۔“

بنگالی شعرا اور ادیب غم و غصہ میں اپنے ہموطنوں کو ان کی بڑی پرہیزگار طبیعت سے روکتے رہے۔
”ٹیک چند“ (۱۸۵۸ء) تک بنگالی شاعری میں یہ موضوع تکرار کے ساتھ آتا ہے
”ٹیک چند“ کے زمانے (۱۸۵۸ء) تک بنگالی شاعری میں یہ موضوع تکرار کے ساتھ آتا ہے
اور ایک حد تک بنگالی انقلاب پسندوں کی اس بیباکانہ ہمت کا موجب ہے جس کا وہ اظہار
کرتے رہے۔ بہر حال حب وطن ۱۸۵۷ء سے پہلے بھی بنگالی ادب کی بنیادی غذا تھا اور شاید اس کی
تفصیف ”اینل زون راجستان“ (Annals of Rajshahi) نے (جس کا بعد میں ترجمہ کیا گیا)
بنگالیوں کے تخیل کو اس وقت سے متغیر کیا تھا۔

یورپی طرز کے جدید نائیک کے شوق میں کمی نہ آئی۔ یہ ان کے شوق ہی کا نتیجہ تھا کہ نائیک کی دو باکمال ہستیاں سامنے آئیں، مائیکل مہوسودن دت اور دینا بندھو ستر۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت روشن خیالوں کے کسی طبقے نے باغی سپاہیوں اور اُن کے راہنماؤں کی شجاعت و ہمت کی داد نہیں دی پھر بھی یہ بات قابل غور ہے کہ کوئی بھی مصنف، خواہ وہ چھوٹا تھا یا بڑا اور خواہ وہ انگریزی سرکار کے نمک خوار طبقہ، اراستے تعلق رکھتا تھا، اس بات کو نہ بھولا کہ حب وطن ایک اچھا وصف ہے اور بھی نے بھارت مانا کی خستہ حالی اور قیروں کے ہاتھوں اُس کی غلامی کا رونا رویا ہے اور اپنے قارئین کو اتحاد، ہمت اور آزادی حاصل کرنے کی تلقین کی ہے۔

جیسا کہ ہم بعد میں دیکھیں گے، وہ کہتے یہ تھے کہ تاریخ ہند کے برطانیہ سے پہلے کے دور کا کوئی موضوع لے لیتے اور یونوں کی مذمت کی جاتی، تحقیق لغات کی رو سے یون، یونانی تھے لیکن اس ضمن میں بظاہر اُن سے مراد مسلم حملہ آور بھی تھے اور کنایہ کے طور پر برطانوی حکمرانوں کی طرف بھی اشارہ تھا۔ یا پڑاؤں اور قدیم گرتھوں سے کوئی کتھا کہانی لے کر ایسی مثال پیش کی جاتی جس میں فاتح مغتوح اور ظالم مظلوم ہو کے رہ گیا ہو۔

۱۔ یہ بات بھی محل غور ہے کہ اس وقت علی کاوشیں زیادہ تر انگریزی زبان میں ہوتی تھیں، بالخصوص عوامی زندگی کے مسائل پر بحث و مباحثہ زیادہ تر انگریزی ہی میں ہوتا تھا اگرچہ "م واد پر بھاکر" (۱۸۳۱ء) مگر (۱۸۳۹ء سے روزانہ) اور "سوم پرکاش" (۱۸۵۸ء) کے طفیل بنگالی صحافت (آغاز قریب ۱۸۴۰ء) کافی ترقی کر چکی تھی۔

"دی ہندو پریس" (۱۸۵۲ء) کے ہریش چندر کر جی ایک قابل آدمی اور انگریزی زبان کا پرزور انشا پرداز تھا جو بغاوت کے دوران حاکم اور محکوم دونوں (بالخصوص لارڈ کیننگ) کی نگاہ میں یکساں طور پر قابل اعتناء تھا۔ ہریش چندر نے ایک طرف باغی سپاہیوں کو گمراہ اور توہم پرست قرار دیا اور دوسری طرف بغاوت کو فرو کرنے میں اعطال سے کام لے لیا۔ نیل کاروں کی مذمت میں اُس کی تحریروں اور تقریروں سے آگ برستی تھی اور ۱۸۵۷ء میں اپنی قبل از وقت موت سے پہلے متواتر تین سال تک بنگالی کاشتکاروں کے اُس بے غرض علمبردار نے وقت اور روپیہ صرف کرنے میں کوئی ذریعہ نہ کیا اور ایک قومی شخصیت بن گیا اگرچہ نیل کاروں کے ہاتھوں مقدمہ بازی میں تباہ و برباد ہو گیا۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس وقت پریس (انگریزی تھا یا بنگالی) ادب دوستوں کی نئی پود کا گہوارہ تھا۔ دو زبانوں میں شایع ہونے والے اخبارات میں سے ایک، "ساچار سدھارشن"

بیلگیا اسٹیج کے سرپرستوں نے بائیکل مدھوسون دت کی خدمات ڈراما "تناولی وکے" انگریزی ترجمے کے لیے حاصل کیں جسے وہ اسٹیج کر رہے تھے (جولائی ۱۸۵۸ء) اس کے بعد مدھوسون ان کے لیے بنگالی زبان میں طبعاً ڈرامے لکھنے لگا۔ اس طرح مدھوسون نے بنگالی ادب کی طرف رجسٹریا کیا۔ پھر کیا تھا، نانک، سوانک رزمیہ اور عشقیہ نظموں کا تانا باندا بندھ گیا جو پوری رنگینی اور آب و تاب کے ساتھ بیک وقت مہرمت کے ساتھ شایع ہونے لگیں۔ "سرشتو" سب سے پہلے لکھا گیا (جس کی تصنیف) اداسٹیج پراس کی نمائش ہوئی (ستمبر ۱۸۵۹ء) اس وقت جب کہ پہلی آزاد نظم "توم سمجھ کوہ جتہ اول" حیرت زدہ قارئین کی خدمت میں لکھ کر پیش کی جا رہی تھی (جولائی اگست ۱۸۵۹ء) "دودھ ارتھ سنگھ" مصنفہ راجندر لال مترا کے صفحات میں) الیہ "پدماوتی" (۱۸۶۰ء) اس وقت تصنیف ہوا جب میگھادودھ کوہ (۱۸۶۱ء) "برجائنگنا کوہ" (۱۸۶۰-۶۱ء) اور "ویرائنگنا کوہ" (۱۸۶۲ء) نے دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔

شاعر قدیم زمانے کے پر شوکت خیالات کے نشے سے مرشار تھا۔ نشاۃ ثانیہ کی شالی ذہنیت کے ساتھ مدھوسون نے دو معاشرتی مزاج نہانک بھی لکھے۔ ۱۸۶۱ء میں "ایکٹی کی بائے سیٹھتا" دیا یہ تہذیب ہے؟ میں اس نے اپنے ہم خیال انگریزی تعلیم یافتہ بنگالیوں کی بد اخلاقی اور بدستی کی ملامت کی۔ "بروسا لیکر گھرے روم" ۱۸۶۰ء میں بنگال کے قدرت پسند بزرگوں کی اوجاش اور عیاری پر اتنے ہی لگتے ہوئے طنز کیے گئے۔

اس کی کسی تصنیف میں کوئی سیاسی پہلو نکالنا ممکن نہیں۔ عظیم رزمیہ "میگھادودھ کوہ" (۱۸۶۱ء) کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک باغی یا حلقے کے شکار حکمران (راون اور اس کا بہادر بیٹا) کو بہرہ و کا وجہ دیا گیا لیکن اس میں بھی اولاً جاگیر داری کے خلاف مدھوسون کی اپنی بغاوت کا اظہار تھا یعنی ہندومت کے تسلیم شدہ دیوتاؤں اور قوانین کے خلاف۔ اور دوسرے ملٹن کے اثر کا اظہار تھا جس نے "پارڈیس لاسٹ" (Paradise Lost) کو ایک شکست خوردہ کراولین نادانہ طور پر شیطان (بیراڈائز لاسٹ) پر بنا دیا۔

لیکن مدھوسون کی اپنی عقابلی پرواز تھیل عرصے کی تھی (۱۸۵۹-۶۲ء)۔ ۱۸۶۲ء کے بعد اس نے چتر و س پدی کوتالی یعنی سانیٹ (۱۸۶۶ء) کے علاوہ کچھ نہیں لکھا۔ اس سانیٹ میں اس نے بڑے لیکن لمبے میں اپنی ایدوں، نا امیدیاں اور اپنے عقین کا ذکر کیا ہے۔ مدھوسون خود دل تھا اور اُسے فرد درخت محسوس ہوتی ہوگی جب اس نے دیکھا ہوگا کہ پادری

ادب میں اس حیرت و طغیانی کی نئی صورت ۱۸۵۸ء میں طویل رزمیہ نظم "پدنی اپاکیان" میں ظاہر ہوئی۔ شاعر رنگ لال بندو پادھیائے باجرن، تور اور نکات کا پکا مداح تھا۔ اُس رزمیہ میں کوئی شعریت نہیں ہے لیکن اس کے ہیرو ہیمن سنگھ نے جنوز کے کشمیریوں کو جس طرح خطاب کیا اس پر شاعر صدق دل سے چیخ اٹھا۔

"کون ہے جو غلام بن کے رہنے پر رضامند ہے؟ کون اس طرح رہنے پر آمادہ ہے؟
کون بیڑیاں پہنتا چاہتا ہے؟ آہ! بیڑیاں پہنتا!"

ان ناکوں میں جو جورا سا نکو یا بیلگا چیا باغ میں کیلے جا رہے تھے بغاوت ۱۸۵۷ء کے واقعات کا کوئی براہ راست یا بالواسطہ معاصرانہ حوالہ نہیں ہے۔ کالی پرسن سہا کے "وکر م اروشی" (۱۸۵۷ء میں شائع ہوا) "ساوتری ستیہ وان" (۱۸۵۸ء میں شائع ہوا جب "کلین گل سرسو" بھی شائع ہو چکا تھا) اور رام نارائن کے "رتناولی" (بیلگا چیا باغ میں ۲۱ جولائی ۱۸۵۸ء کو شائع ہو چکا تھا) میں اس کا کوئی نشان نہیں ہے۔ یہیں یہ یاد رکھنا ہو گا کہ نثر اور نظم دونوں میں "نیل و دروہ" سے متعلق سیدھے اشاروں کی جھلکیاں موجود تھیں۔ ۱۸۵۹ء کے بعد اس بغاوت نے بحران کی صورت اختیار کر لی۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کو دبا دیا گیا۔ بغاوت کے بعد کے ادب میں جنگالی ادب نے اپنے تخلیقی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے تیزی سے ترقی کی۔ ابھی اُسے اس واقعے پر مرکب نگار ڈالنے کی فرصت نہیں تھی۔

روشن خیال طبقے کے انسان دوستی اور حب وطن کے تمام ترجیحات نے نیل و دروہ میں اظہار کی راہ پائی۔ اس کے علاوہ یہ انقلاب نہ تھا بلکہ ایک بغاوت جس کے لیے وہ تیار نہ تھے۔ ویدیا ساگر کے زمانے کے لوگوں کے لیے انسانیت کوئی بے معنی لفظ نہیں تھا۔ یورپی نیلکاروں نے جن کی پشت پر برطانوی سرکار تھی، ہریش چندر مکرجی کے سے انسانوں کو برباد کیا اور پادری جے۔ لانگت جیسے مبلغ کو قید کروایا (کیوں کہ اس نے "ناٹک نیل درپن" کا انگریزی نسخہ شائع کیا جیسا کہ ہم بعد میں ذکر کریں گے) لیکن بغاوت نیل بھی اس جوش و خروش کو جذب نہ کر سکی جو پیدا ہو چکا تھا۔ اب ہم ۱۸۵۹-۶۲ء کے جنگالی ادب کے متاز شاہکاروں کا ذکر کرتے ہیں جب نو جوان کیشپ چندر سین (۱۸۲۸-۶۶ء) کی زیر سرکردگی اصلاحی تحریک کے ساتھ ساتھ ادبی نشانیہ بار آور ہوئی۔

طبقات میں "خود" کی کامل مذمت بھی ترک ہوتی جا رہی تھی۔ "امرت بازار ہڑکا" اس کی ایک مثال تھی (۱۸۶۵ء)۔ جب بنکم چندر چٹوپادھیائے (۱۸۳۸-۱۸۶۵ء) میں "دھندیش ہندی" (۱۸۶۵ء) کی اشاعت کے ساتھ ادب کے افق پر نمودار ہوئے تو ہمارے ادب میں قوم پرستی کا رنگ غالب آ رہا تھا۔ اگرچہ بھو دیو چندر کھپادھیائے کی طویل داستان "انگوری بنی" کے مؤلف شمار کریں تو وہ "دھندیش ہندی" بنگالی زبان میں پہلا تاریخی رومان تھا۔

اب تخلیقی خود اعتمادی کے اعتبار سے زیادہ اہمیت کا دور شروع ہوا۔ ۱۸۶۲ء (قوی میلہ اور پہلے چمک ایشیج کے قیام کا سال) میں "ونگ ورن" کے سنگ بنیاد رکھے جانے پر بنکم نے بنگالی قوم پرستی کے فلسفہ کی ترتیب کا کام سنبھالا۔ اب (۱۸۶۵ء کے "گگ بھگ") لفظ "قوم" کی قیمت اور وقعت بڑھ گئی تھی۔ اور "بھوپال مڑا جو تحریک جاتیہ میلہ" (۱۸۶۶ء) کی روح رواں تھاب گوپال "قوی" کہلاتا تھا۔ برہم آزاد خیالی اور شرعی کیشپ چندر سین اور اس کے ساتھیوں کی اصلاحی تحریک بظاہر ابھی زردوں پر تھی لیکن تنقیدی قدامت پسندی (بنکم کی راہنمائی میں) قومی افتخار اور قومی تمدن کی بنا پر متظم ہو رہی تھی جس میں مغرب کی عقلیت پرستی اور دانش کی نئی روح پھونکی گئی (اور ان کی نگاہ میں "قوی" کا مطلب "ہندو" تھا جیسا کہ "ہندو میلہ" سے ظاہر تھا) برطانوی حکومت بھی اُس وقت ہندوستان میں اپنے ٹھنڈا پت پرستی کے رنگ میں ظاہر ہو رہی تھی اور اُس کی ترقی پسند اور روش پر یقین روز بروز کم ہوتا جا رہا تھا۔ لارڈ لٹن کی تشدد کی پالیسی (۱۸۵۷-۵۸ء) نے ہندوستان کی آنکھیں کھولنے میں اور بھی مدد دی۔

آزاد خیالوں نے ایک نیا سیاسی ادارہ قائم کیا (جس کا نام انڈین ایسوسی ایشن تھا ۱۸۵۵ء) سریندر ناتھ بھرجی نے سارے شمالی ہندوستان میں یہیں منظم کیں (۱۸۵۵-۵۷ء) ۱۸۶۵ء اور ۱۸۸۵ء کے دوران (۱۸۸۲ء بنکم کے "آئندہ" کی اشاعت اور سیاسی نقطہ نظر سے البرٹ بل شورٹس کا سال تھا) ادب پر اسے شباب پر تھا۔

شراء، ناول نگار اور انشا پرداز سب ہی ترقی کر رہے تھے۔ اپنی بساط کے مطابق انھوں نے مقابلے کی نشان دہی۔ یہ تعداد میں بیسیوں تھے اور تقریباً سبھی نے برطانوی دور سے پہلے کے تاریخی ماخذوں یا ہندو پُرانک گرتھوں سے ایسے موضوع چنے جن میں حملہ اور اس کا مقابلہ کرنے والوں یا ظالم اور مظلوم کا مقابلہ تھا اور پھر ہندوستان پر غیر ملکی غلبے کے

جے۔ لگت کو "نیل درپن" کا انگریزی ترجمہ شایع کرنے کی وجہ سے جہانے اور قید کی سزا دی گئی ہے۔ "نیل درپن" مصوٰطہ سے لکھوایا گیا تھا جو اس کے نام کے بجائے "ایک دیبہ ماسی" کے نام سے شایع ہوا تھا۔

یاد رکھنا ہوگا کہ اس مہم افروہن ڈرائے "نیل درپن" کے اصل کو بھی پہلے ۱۸۶۰ء میں ڈھاکہ سے گمنام شایع کرنا پڑا۔ ڈراما نگار دینا بندھو مترک خود اپنے کو کینچٹ پٹی کین یعنی "راہ گیر" کا نام دیتا پڑا۔ لگت کے مقدمے سے بخوبی ظاہر ہے کہ حریت پسند روشن خیال طبقہ کو بغاوت ۱۸۵۷ء تو درکنار نیل کے جھگڑے کے بارے میں بھی اظہار خیال کی آزادی حاصل نہ تھی اس لیے یہ قرین قیاس ہے کہ اگر کسی محضر مصنف کو باغی سپاہیوں کے ساتھ کوئی ہمدردی تھی تو وہ اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال کر ہی ہمدردی ظاہر کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے اُسے طنزیہ اشاروں سے کام لینا پڑا۔ انیسویں صدی کے اواخر میں یعنی ۱۸۶۶-۶۷ء کے دوران ایسے ایک دو مختاط اشاروں کا سراغ لگایا جاسکتا ہے۔ اس قسم کے بعض اشارے "اثر بازار پتر کا" (جنگالی) کے سیرکار گوش کے ابتدائی تبصروں (۱۸۶۸ء) میں موجود ہیں۔ موصوف نے ۱۸۵۷ء کی لڑائیوں کو اکثر آزادی کی جنگوں کا نام دیا۔ مثلاً ۲۸ مئی ۱۸۶۵ء) ان لڑائیوں کے لیے (۳ مارچ ۱۸۶۰ء کو) "غصہ" کا لفظ استعمال کرنے پر اعتراض کیا اور اس بات کی تائید کی کہ ۱۸۵۷-۵۸ء کی جنگ اتحاد ہونے کی وجہ سے ناکام ہوئی۔ نوآبادیوں میں ملکی صنعت و حرفت کی تباہی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اس کی وجہ سے لوگ مایوس ہو کر جان دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں "سپاہیوں کا غصہ" جسے ہم پسند نہیں کرتے اس کی مثال ہے۔

ایک اور دلچسپ حوالہ "ہم پھر نقش" (۱۸۶۱-۶۲ء) یعنی ٹیم اُن کے خاکے میں ملتا ہے، ٹیم سے مراد وہی نوجوان انتہا پسند کالی پرسن سہا تھا جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اُس نے بغاوت کے خاتمے پر ہلکا دھڑکے سے ٹیس و فاداری کا اعلان کرنے کے لیے گوپال مک کے باغ میں راجہ رادھا کانت دیو کی قیادت میں ہندوستانیوں کے اجتماع کا ذکر کیا۔ ٹیم کے ناقابل تقلید انداز میں ان کے منہ سے یہ کھلایا گیا، "انا! ہم تیری جنگالی بیٹریں ہیں۔ ہم اہل امریکہ کا پارٹ ادا کرنے کی خواہش نہیں رکھتے۔ بعض بغاوت اور آزاد ہونے کی خواہش نہیں رکھتے۔"

البتہ اس میں شبہ ہے کہ جب بغاوت رونما ہوئی تو کوئی جنگالی (اس کا درجہ اور تعلیم کچھ بھی ہو) ۱۸۵۷ء کے باغیوں کے ساتھ خاص ہمدردی رکھتا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ تعلیم یافتہ

کلیہ کے طور پر یہ کہنا ہے جاہلوں کا بیگمالی ادیب اس بعد کے زمانے میں بھی صریحاً بغاوت ۱۸۵۷ء کی حمایت یا مذمت کرتے رہے۔ نوآبادیاتی متوسط طبقات اور ان کے ادبوں اور مفکروں کی ذہنیت میں طبعی تضاد پایا جاتا تھا۔ مثلاً جو لوگ جاگیرداری کے سخت مخالف تھے، وہ شہنشاہیت پرستی کے کسی قدم مخالف تھے اور جو لوگ قطعاً شہنشاہیت پرستی کے مخالف تھے وہ بعض اوقات قوم پرستی کے جذباتیال کے سبب جاگیردارانہ نظریات اور رسوم و آداب کی حمایت کرتے تھے۔ چند آزاد خیال دولوں میں توازن قائم کرنا چاہتے تھے۔ البتہ ہمارے تمام ہندویا برہمادہوں میں جمہوری رنگ پھیکا رہا۔

ایک تیسری حقیقت یہ ہے کہ معاصرین کو ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے ساتھ بعد میں بھی کوئی لگاؤ پیدا نہ ہوا۔ پنڈت شونا تھ شاستری نے رام تالاولاہری اور اس کے مہر کے حالات کے تذکرے ۱۹۱۸ء میں اسے متوازن پیرائے میں بیان کیا ہے۔ لیکن اس نے اپنی آپ بیتی (۱۹۱۸ء) میں اس بحث سے مصلحتاً احتراز کیا ہے۔ راج نارائن بوس نے ۱۸۸۸ء میں اپنی آپ بیتی کا تذکرہ لکھتے ہوئے سپاہیوں سے متعلق بیگانیوں کے خوف اور شک کی تصویر کھینچی ہے جس سے ظاہر ہے کہ وہ بیگانیوں کی بیگانگی سے بیگانے تھے۔ دیوندر ناتھ نیگور نے اپنی آپ بیتی (مرتبہ ۱۸۹۵ء) میں جو ۱۸۹۵ء میں شائع ہوئی، بڑی احتیاط کے ساتھ سیاسیات سے اجتناب کیا۔ اس نے شملہ کی پہاڑیوں میں بغاوت کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا۔ اس نے دیکھا کہ دہشت اور خوف سے فرنگی ہر طرف بدحواس تھے "فرد سے کم از کم یہ حقیقت ثابت ہو گئی کہ تمام فرنگی سودا نہیں تھے جو حکومت کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہوں اور بغاوت کو جس طریقے سے فرو کیا گیا کہ اس سے ظاہر ہو گیا کہ برطانوی حکمران طبقے سے دانش مندی اور انصاف پروری کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ انیسویں صدی کے آخری بیس سالوں میں ادب میں اس احساس کا اظہار برعکس کیا۔

خلافت اپنے خیالات اور جذبات پیش کیے۔ ادب، قوم پرستی اور آزادی کا طرفدار تھا۔ بعض وقتا پر اس کے پیچھے سیر حقیقت جھلکتی تھی جیسا کہ بنکم کے آئندہ ۱۸۵۶ء اور ہم چندر بندو پادھیائے (۱۸۳۸ء) کے نفوذ آزادی "بھارت سنگیت" (۱۸۵۶ء) میں ہوا۔ ہاں چند سین کی "پلاسیر پدھ" (۱۸۵۶ء) میں موہن لال کا بھی ایسا ہی خود لیکن دفتری حکومت کی بنگالو غضب سے پرک گیا۔

۱۸۵۶ء کی بغاوت کو اب رانی لکشمی بائی، کنور سنگھ اور تانتیا ٹوپے وغیرہ جیسے رہنماؤں کی قیادت میں بہادر جواں مردوں کی قوم پرستانہ جدوجہد تصور کیا جاتا تھا۔ البتہ اس بغاوت کو بے سود قرار دیا گیا اور یہ بھی خیال تھا کہ اس میں ہندوستانی والیان ریاست اور برطانوی ملازمت میں بھائی کے آدمیوں نے غلامی کی رجنی کانت گپت کی یادگار تصنیف "سپاہی یدھیر اتھاس" (سپاہیوں کی جنگ کی تاریخ) کی پہلی جلد ۱۸۵۶ء میں شائع ہوئی۔ یہ یقیناً برطانوی ماخوذوں تک محدود تھی اور خیالات کے اظہار میں احتیاط رکھی گئی تھی لیکن "اتھاس" کا مقصد بلاشبہ واضح ہے۔ ہندو قوم پرستی ایک نئی قوت تھی اور اس کی بنگالہ میں ۱۸۵۶ء کے سپاہیوں کا مذہبی خوف اور تعصب مصرت رسال اور ناگوار نہ تھا جیسا کہ ہم مہر ہندو اور برہمنوں اور خیالوں (۱۸۵۶ء) کی نظر میں تھا۔ راجندر ناتھ ٹیگور نے جو اس وقت ستر سال کے نوجوان تھے "بھارتی" کے صفحات میں (۱۸۵۶ء) فوجی غم کے سورماؤں کو کھلم کھلا خارج تمسین ادا کیا اگرچہ ان کی کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ انھوں نے بالخصوص رانی لکشمی، تانتیا ٹوپے اور پیر ضیف کنور سنگھ کو شجاعت اور حب الوطنی کے پتلے اور قومی ہیرو قرار دیا جب کہ برطانوی نوٹین نے انھیں روسیہ اور روسو کرنے کی بڑی کوشش کی۔ البتہ وہ ہندویت پرست نہ تھا۔ ۱۸۹۹ء میں راجندر ناتھ نے اپنے افسانے "درشاہ" میں کمال استاد کے ساتھ ایک باغی سورما کی تصویر پیش کر کے ہندویت پرستی کے دھول کا پول کھولنے کی کوشش کی۔ دیوندر ناتھ کے بیٹے اور راج نارائن کے مداح کے لیے بغاوت اچانک مذہب کے اعتبار سے کسی تقدس کی حامل نہ تھی۔

چنانچہ خیالات (۱۸۵۶ء) کی فضا میں تبدیلی نہیں تسلیم کرنی چاہیے، نیز ہمیں اُن نفسیاتی اور جمالیاتی پیچیدگیوں اور تدبیروں کو سمجھنا چاہیے جو نئی تخلیق کے عمل کے دوران شعوری اور غیر شعوری طور پر سامان کے ڈھانچے میں انقلاب پیدا کرتی ہیں۔ یہ قیاس کرنا جائز ہے کہ ۱۸۵۶ء کی بغاوت نے بنکم چندر کی تصنیف "آئندہ ۱۸۵۶ء" پر اثر ڈالا ہو گا جس کا موضوع بظاہر ۱۸۵۶-۵۹ء کی سیاسی بغاوت تھا۔ "ویربا ہو ودھ کاویہ" (۱۸۶۲ء) اور "وتر سہار کاویہ" (۱۸۵۵-۵۶ء) "بھارت سنگیت" (۱۸۵۶ء) اور ہم چندر کی دوسری نظموں میں۔ تاہم یہ طور سے ظاہر تھا۔

کرنے کے لیے روایتی لوگ گیتوں کا پرچار کیا بلکہ ورام میں انگریزوں کے خلاف نفرت کا جذبہ اس قدر
جوش کے ساتھ ابھر رہا تھا کہ ۱۸۵۷ء سے متعلق لوگ گیتوں کی بھرمار ہو گئی۔ یہ لوگ گیت محنت مگر واقعی
ذہین عوامی شعرا نے ترتیب دیے تھے۔ یہ گیت خاص لوگ گیت ہیں کیوں کہ بے ساختہ کہے گئے ہیں بغاوت
(۱۸۵۷ء) کو بے دردی کے ساتھ دہرایا گیا۔ اس کے بعد ملک بھرگ سوسل تک برطانوی حکومت کا
دبشناک دھڑکا۔ اس دھڑ میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت پر کوئی گیت لکھنا یا گانا اپنانا پکچل غلطی میں ملنا
یا اس سے بھی زیادہ مصیبت میں گرفتار کرنا تھا۔ باوجود اس کے جدید دور کے کسی بھی قومی واقعے کے
مقابلے میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت پر زیادہ لوگ گیت موجود ہیں۔ اس مقالے میں میں بعض گیتوں کا ترجمہ
پیش کر رہا ہوں تاکہ اس زمانے میں رہنے والے لوگوں کے سیاسی نظریے کی وضاحت ہو سکے اور یہ بھی
بتایا جاسکے کہ ان میں سب سے زیادہ حساس یعنی عوامی شعرا بغاوت کے واقعات سے کیسے متاثر ہوئے۔
اس قومی بغاوت کے آغاز کو ان دنوں کے نفسیاتی ماحول کے ساتھ ذکرہ ذیل گیت
میں بیان کیا گیا ہے :

”یہ سن چودہ کا واقعہ ہے۔ میرٹھ میں یکایک اس کا آغاز ہوا
بادل، کاراپٹ کی پرہیزدہ نسیموں اور جنگال کے وسیع علاقوں میں پھیل گئی
لیکن فرنگی لاکھ جو سر پر بند لانے والی آفت سے پریشان تھا ایک ناپاک تدبیر موجد
کیوں کہ بھیاں کالی دیوٹی ولایت کا بیڑا فرق کرنے والی تھی
نے کار تو رسوں میں لگائے اور سندھ کی چربی بھی ہوئی تھی

اور ہندوستانی فوجی رنجیدہ ہو کر نہاد میں کار بائن داغ رہا تھا
دھول دام کہتا ہے : سال چودہ میں انگریز لکھنے سے چپکے سے کسک گیا۔“
اوشاشی لوگ گیت : ۱۔ ابرار ۱۸۵۷ء۔ ۲۔ بادل، بمبئی۔ ۳۔ کاراپٹ : دھاس۔ ۴۔ فرنگی : گوما
یلپی۔ ۵۔ کالی : تباہی کی دیوٹی۔ ۶۔ ولایت : انگلینڈ، سپاہی، ہندوستانی فوجی۔ ۷۔ دھول دام

اس لوگ گیت کا مصنف :

فرنگی کا سابقہ خون جات رہا کیوں کہ وہ سر پر بند لانے والی نئی مصیبت سے پریشان تھا۔ تباہی
کی دیوٹی : کالی نے ولایت کو فرق کرنے کا فیصلہ کر لیا کیوں کہ فرنگی نے ان کا تو رسوں میں جو ہندو
مسلمان فوجیوں کے استعمال کے لیے مخصوص تھے خفیہ طور پر لگائے اور خنزیر کی تباہی چربی استعمال کی
تھی۔ اور یہ جو انگریز کے لکھنے سے چپکے کر نکلنے کی تصویر کشی گئی ہے وہ محض خیال کی پرواز نہیں ہے۔

پی۔ سی۔ جوشی

۱۸۵۷ء سے متعلق لوگ گیت

ہندوستان میں دیہاتی راگ رنگ حرام کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کے روایتی ذرائع تھے۔ اس کی شہادت موجود ہے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو منظم کرنے والوں نے لوگوں کو بیدار کرنے کی غرض سے کمال استاد کے ساتھ اور موثر انداز میں ان سے کام لیا۔ ٹریوٹین کا بیان ہے کہ ”تیوہاروں اور تماشوں میں جن گزلیوں سے نصیر میں کام لیا جانا وہ عجیب زبان میں بولنے لگتیں اور خطرناک ناپر دھکے لگتیں۔ چنانچہ اور لاڈلیاں (لوگ گیت کی طرز جو رقت اور لطیف جذبات پیدا کرتی ہے) تھانوں کے قریب گائی جاتیں۔ آگیا اول (نڈیر گیت جو خون کو جوش میں لاتا ہے) سے بھی کام لیا جاتا۔ کلکتے سے پنجاب تک رات کو خطرناک تماشے دکھائے جاتے۔ خانہ بدوش عورتوں کو بھی کام میں لایا جاتا۔ نفرت پیدا کرنے میں ان کا بلا کا اثر تھا۔ بہشتیوں نے پانی پیتا کرنے سے انکار کر دیا۔ مائیں ملازمت چھوڑ کر چلی گئیں۔ اس کے بھی لکھا ہے ”دو موضوع ایسے تھے جن کو پیش کرنے میں کٹھ پتلی والوں کو انتہائی سترت ہوتی تھی۔ ایک تماشوں کا زوال اور دوسرا تھا انگریزوں پر فرانسیسیوں کی فتوحات۔ ایک کا مقصد تماشوں کے دلوں میں نفرت پیدا کرنا تھا اور دوسرے کا خارت ۲۰

نوٹ مصنف، میں درج ذیل حضرت کا دل سے منون ہوں جنہوں نے اس ستارے میں شامل لوگ گیتوں کے جمع کرنے اور ان کی جانچ پڑتال کرنے میں مجھے مدد دی۔

شری ورنادون لال دسا (جانی)، ڈاکٹر اوسے نارائن تیواری (آباد یونیورسٹی)، ڈاکٹر کے ایس پادھیائی (بنارس)، ستریش چوبے، جہانگیر دگر دگر شکر پرشاد سنگھ وکیل (بھٹرس)، اور شری مکتی ہاشمی بھٹا چارہ (کلکتہ)۔ میں شری شمشیر بہادر سنگھ، اونکار ناتھ کچروا، ڈال، بڑی پوری اور سنیل جنا کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے ان لوگ گیتوں کا ترجمہ کر کے میری اسداد کی۔ پی۔ سی۔ جے۔

صرف اس بغاوت کو منظم کرنے والے اعلیٰ طبقے نے ادنیٰ درجہ کے لوگوں میں انقلاب کا پرچار

دیکھو، آہا، دیکھو۔

میرٹھ اور دہلی کے گرد و نواح کے تمام علاقوں کے کسانوں کی بڑے پیمانے پر بناوت میں شرکت سے بناوت نے عوامی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ علی گڑھ میں امانی سنگھ جیرو تھا جو عام کسانوں کے طبقے سے اٹھا تھا۔ ان چند سطرے سے جو امانی سے متعلق ہیں اُن دنوں کے مقامی باغی راہنماؤں کا دم خم ظاہر ہوتا ہے:

”امانی؟ ہاں، یہی میرا نام ہے
تف، اگر میں گنگا جل نہیں پیتا“

دریائے گنگا کا پانی پینے سے مُراد گنگا کے کنارے کا سارا علاقہ آباد کرنا تھا اس کا پوتر
جل پی کر نتج منانے کا عزم تھا
ہندوستان کے دوسرے حصوں کی طرح اس خطے میں بھی بھابھی اور دیور کا رشتہ
گہری دوستی اور گستاخی کی اجازت کا تانا ہے۔ باغی سپاہیوں سے متعلق ایک قدیم روایتی گیت
ہے جو عورتیں گاتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ کس طرح خواتین موت کو ہلکا کرنے والے جو ان مردوں کو
بہادری پر فخر کرتی تھیں گویا وہ اُن کے اپنے ہی ہیں،

”فوج نے قلعے پر حملہ کر دیا ہے
میرا دیور بھنبھاتی گویوں کا سامنا کر رہا ہے
میرے پیارے نے ایک فرنگی کو ہلاک کر دیا ہے
میرے دید نے دو فرنگیوں کو پکڑ کر کوٹھری میں ڈال دیا
میں نے اس کو ملامت کی اور وہ فقے سے لال پیلا ہو گیا
وہاں دوسری طوت حکم صادر کیا گیا

اور فرنگی فوجیں
تیار ہو گئیں اور قلعے پر دھاوا بول دیا
لیکن دیکھو میرا دیور

اب بھی بے خطر
ان سے لڑ رہا ہے گویا ایک کیل ہے
آہ پیلری سکھی:

کے اور مابین نے بھی فرد کا حال بیان کرنے میں اس دہشت کا ذکر کیا ہے جو کلکتے کے گورے باشندوں پر طاری تھی۔

ذیل کا چھوٹا سا گیت جو حسن بیان کا مرتع ہے اُن دنوں کے انقلابی جوش کا تصویری پیش ہے۔

”دریا میں تلاطم پیدا ہے

انگلستان بہت دور ہے

جلدی کر جلدی ۱۰ اے

دنا باز فرنگی! بھاگ جا“

قومی بغاوت میرٹھ میں شروع ہوئی۔ جب میرٹھ میں بغاوت پھوٹی اور انگریزوں کو خوف پھیل گیا تو اس کی ایک دل آویز تصویر اس گیت میں کھینچی گئی جو میرٹھ سے متعلق تھا؟ اس میں خود اعتمادی کی سپرٹ نمایاں ہے

”آہا! آؤ اور دیکھو

میرٹھ کے بازار میں

فرنگی کو گھیر کر مارا گیا ہے

گودے کو گھیر کر پٹا گیا ہے

میرٹھ کے کھلے بازار میں

دیکھو! آہا۔ دیکھو! (اُسے کس طرح پٹا جا رہا ہے)

اس کی بندوق چھین لی گئی ہے

اس کا گھوڑا مارا پڑا ہے

اس کا ریوالور لوٹ پھوٹ گیا ہے

میرٹھ میں سب بازار

اے گھیر کر پٹا جاتا ہے

دیکھو، آہا، دیکھو

فرنگی کو گھیر کر پٹا جاتا ہے

میرٹھ میں سب بازار

میرٹھ کا دور
سب سے پہلے
۲

کائنات و نہ تھان بہ اطار، شرف اور تامل۔ پھر بھی لوگوں کو اس کے ساتھ جھڑپیں تھیں کیوں کہ
قوی حکومت اس کی ذات کے ساتھ وابستہ تھی۔ اپنی قوم کے حکمران کو بلایا اور استحقاق فرملی حکومت
پر ترجیح دی جاتی ہے۔ دوسرے اوروں کے وطن کو ملک کہا جاتا ہے۔ مگر کہ اور وطن کی حیثیت سے
ہندوستان کا تصور ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ ان کی نگاہ میں ان کا اپنا وطن (اورہ) ہی ان کا اپنا ملک
ہے۔ تیسرے یا یہ حقیقت ظاہر ہے کہ دوسرے ملکوں پر قبضہ جانے کے لیے انگریز صرف اپنی قوت پر
انحصار رکھتے ہیں۔ چوتھے، غیر ملکی عمل کی مزاحمت دکنے اور کسی کے تہیادہ اٹھانے پر شدید دھمک
کا اظہار کیا گیا۔ کھوئی ہوئی آزادی پر قومی لوہین کے شدید احساس نے اورہ کو وطن کی بناوت کا
گڑھ بنادیا۔

مذکورہ ذیل سطروں میں ان واقعات کا بیان ہے جو کھنڈ میں رونما ہوئے۔ یہ سطریں ایک گیت
”کھنڈ کے اندھ سے لی گئی ہیں“

باغ عالم میں گریاں برس رہا ہیں
پتلی بھون میں تو میں گناہگار ہیں
بیل گاڑ میں تلواریں ہل رہا ہیں
تیروں کی بوچھار سے فضا میں تاریکی چھا گئی ہے
اب دیواروں کے باہر فوجی اپنی نعمت کو رہ رہے ہیں
پہانچ کے اس پار کو قتل اپنے مشرور ہو گار ہے
عمل میں جگمگات میں نام پنا ہے
ان کے بال بکھرے ہوئے اور پرانہ ہیں
میگزین میں کوئی توپوں کو سنبھالنے والا نہیں
فیضانِ دہلی کوئی ہاتھیوں کی دیکھ بھال کرنے والا نہیں۔
جنگی اہل تیز محکم گھونٹے شہر میں بلا سانس آواہ ہیں
میرے تمام ساتھی بھی پیچھے کھو گئے ہیں۔“

۱) حاشی گیت۔ ۱۔ باغ عالم: کھنڈ کی ایک بستی جسے بھٹانوی فوجی کمان نے کھنڈ پر حملہ کرنے کے
لیے آفس کے طور پر استعمال کیا۔ ۲۔ پتلی بھون کھنڈ کے اندھ ایک پڑا کتا تھا جسے انگریزوں نے محکم کیا اور لانے
کے لیے اسے اپنا گڑھ بنایا۔ لیکن بناوت کے دوران جب وہ اس پر قبضہ نہ کر سکے تو اسے خالی کرنے پر مجبور ہو گئے۔

میں نے اُسے بہت سمجھایا بھجایا
 (لیکن وہ ایک نہیں سنتا)
 اب گولے بھی ختم ہو چکے ہیں
 (لیکن) وہ کہتا ہے: "میں ہتھیار نہیں ڈالوں گا"
 پس وہ مطلق پروا نہیں کرتا
 آہ! میرا چھوٹا دیور!

۷ فروری ۱۹۵۷ء کو انگریزوں نے اودھ کا الحاق کر لیا تھا اور اُس کے نواب واجد علی شاہ
 کو باقاعدہ جلا وطن کر دیا گیا تھا۔ مذکورہ ذیل گیت اس واقعہ کی تصویر پیش کرتا ہے۔

حضرت! جب سے حضور جلا وطن ہوئے ہیں
 بہلا وطن ہانکل سنسان و ویران نظر آتا ہے
 بادشاہ سلامت شان و شوکت سے محروم ہیں
 بازی باری گئی۔ اب خیال کہاں
 بیگمات سوار کر کے دود جلا وطن کر دی گئیں
 اودھ ہمیشہ کے لیے اپنے وطن کو خیر باد کہہ گئیں
 انگریز تمام تر قوت اودھ کے ساتھ چڑھ آیا
 تاکہ ملک پر قابض ہو جائے
 کسی بشر نے بھی نزاحت نہ کی
 کسی نے اس کے مقابلے پر ہتھیار نہ اٹھائے
 انگریز نے قیصر باغ تباہ و برباد کر دیا
 ہمارا بادشاہ کلکتہ کو روانہ ہو گیا

ہمارے لیے کون سا دلاسا اودھ کون سا سہارا چھوڑ گیا؟

- (حواشی لوگ گیت: ۱۔ حضرت، سکرو احترام، مراد بادشاہ اودھ ۲۔ خیال، ایک مقبول ضرب الادب)۔
 ۲۔ بیگمات، بادشاہ اودھ کے محرم، زنانیاں۔ ۳۔ انگریز، انجمنستان کے لوگ)
 یہ گیت دردناک ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وطن پر انگریزوں کے قبضے کے بعد لوگ کس
 طرح غمزدہ ہوئے۔ کچھ شکات قابلِ توجہ ہیں۔ اولاً واجد علی شاہ ایک زوال پذیر جاگیردارانہ حکومت

نہیں ہے۔ انگریز ریونیو کمشنر گبنس کا اپنا بیان ہے: ”ہم تعلقداروں کو جاگیروں کی رشوت دے رہے ہیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ باغیوں کے محاذ کے اتحاد کو توڑا جائے اور برطانوی حکومت کی بحالی کے لیے بارسوخ حمایت کرنے والے حاصل کیے جائیں۔“

رانی جھانسی اس قوی بناوت میں ایک ہیروئن بن کر سامنے آئی۔ سر ہیوگ روز مشہور برطانوی سپہ سالار تھا جس نے انگریز فوجوں کے ساتھ اس پر چڑھاؤ کی اور بالآخر وسطی ہندوستان کو از سر نو فتح کیا۔ اس ہم کے خاتمے پر جب وہ تھک کر چڑر ہو گیا تو پونہ کی ٹھنڈی ہوا میں آرام کرتے ہوئے اس نے سرکاری رپورٹ میں یہ لکھا: ”اگرچہ وہ ایک عورت تھی لیکن باغیوں کی سب سے زیادہ بہادر اور بہترین فوجی راہنما تھی۔ باغیوں میں ایک مرد تھی۔“ وہی خراج تحسین جو برطانوی جرنیل نے بے دریغ اسے ادا کیا مذکورہ ذیل لوگ گیت میں محبت آمیز لہجے کے ساتھ ادا کیا گیا ہے:

”جو افرادوں کی طرح وہ بہادری کے ساتھ لڑی

رانی جھانسی

ہر منڈیر پر اس نے ایک توپ نصب کر دی

اور دوزخ کی آگ برسنے لگی

خوب لڑی مردانی جھانسی والی رانی

خوب بہادری کے ساتھ!

اس گیت کا مصرع، خوب لڑی مردانی جھانسی والی رانی، ایک بہت ہی مقبول جدید نظم کی بنیاد ہے جس سے شریعتی سجدہ گماری چوہان کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔

رانی کس طرح اپنے ساتھیوں میں جوش پیدا کر سکتی تھی، اس کا اظہار کئی لوگ گیتوں میں کیا گیا ہے غلام فوٹ خاں رانی کے توجہ جانے کا میر تقی میر تھا اور اس کا دوست اور رفیق خداداد خاں قلعہ جھانسی کے بڑے پھانک کا دبان تھا۔ دونوں ۲۲ اپریل ۱۸۵۸ء کو قلعے کی آخری خندق کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ اس گیت میں خداداد کے آخری الفاظ یہ ہیں:

”بھائی! میں ایک دن تو مرنا ہی ہے

میں آج کے دن کا انتخاب کرتا ہوں

اپنی رانی کے لیے میں اپنی جان قربان کر دوں گا

میں اپنی تلوار کے ساتھ فریجی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا

۲۔ جلی گارڈ: برٹش ریزیدنسی کی عمارت کا مشہور نام (بغاوت کے دوران اس کا محاصرہ کیا گیا لیکن انگریزوں نے کامیابی کے ساتھ اس کی حفاظت کی۔

شکست کے بعد یہ گرہ وزارت کی تصویر ہے۔ اس میں ملک کی قسمت اور اس کے مستقبل کے بارے میں کسی اعتماد کا اظہار نہیں ہے۔ یہ بعد میں پیدا ہوا جب عوام نے اس شکست سے مفید سبق حاصل کیا۔

رانا پتی مادھو جاگیر دلوں کی نسل سے تھا۔ دیہاتیوں کو جمع کرنے اور برطانوی حکام کو بہنوں لٹکانے سے ہر دل عزیز و بیرو بن گیا تھا۔ اس جاگیردار محب وطن کے بارے میں یہ گیت بغاوت کے دوران بہت مقبول ہوا اور اس کے بعد بھی اس کی مقبولیت قائم رہی:

ہے رام! اودھ میں رانا بہادر کے سپاہیوں نے

کیا قیامت بہا کر دی!

بار بار صلح جوئی کی پیشکش میں

انگریزی لاٹ نے یوں التجا کی: "اوبھائی رانا! آؤ ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ

اس کے عوض میں لندن سے

تمہارے لیے فوجی اعزازات حاصل کروں گا

اودھ میں ایک صوبہ بنا کر تمہارے اختیار میں دے دیا جائے گا۔"

لیکن رانے نے ایسے تمام پیغامات کے جوابات میں لکھا:

"تم صدد ج چالاکی سے کام لیتے ہو لاٹ صاحب! یہ کوشش مت کرو

مجھ میں جب تک دم ہے تم جان لو کہ میرا واحد عزم یہ ہے

کہ تمہاری جڑیں کھود ڈالوں اور تمہیں باہر نکال پھینکوں

تمام زمیندار متحد ہیں

اور انگریز ان کے سامنے خوف و ہراس سے کانپ رہے ہیں

پھوٹ ان کو ایک دوسرے سے جدا کر دے گی

اور ان کے قلعے کی بنیادیں تباہ کر دے گی۔"

(حواشی گیت: ۴۔ لاٹ: برطانوی گورنر ہ۔ صوبہ: پرانت، ہاؤنس)

اودھ میں انگریزوں کی طرف سے صوبے کی رشوت پیش کرنے کی کوشش محض شاعرانہ تخیل

اور لوگوں کی رگ رگ میں کیا خود اٹھادی سالی ہوگی، اس کا اندازہ اس نوک گیت سے کیا جاسکتا ہے
 "آنکھوں میں اٹھتے آنسوؤں کے ساتھ

منور ہوگ رنڈ بولا:

"میں اپنی پیاس بجھانے کی خاطر

ایک کٹورے پانی کے لیے تھاب سامنے ہاتھ پھیلاتا ہوں

اور پھر مزید کے لیے التجا کرتا ہوں،

وہ مقبول کٹورا حاصل کرنے کے لیے

تو میں ہلے حوالے کر دو

بارود گر ل بھی اور

اپنی تلوار بھی!"

نان کی نیک مثال اور جاں نثاری ہندوستان کے بے شمار بیٹوں اور بیٹیوں کے لیے شعل راہ
 ثابت ہوئی۔ وہ قوی تحریک کی زندہ جاوید ہستیوں میں سے ایک ہے۔ ایسے گیت اس کی دائمی
 یاد کو قائم رکھتے ہیں۔

کنور سنگھ ۱۸۵۷ء کا ایک اور ہر دل عزیز راہنما ہے جس کا لوک گیتوں میں اکثر ذکر آیا
 ہے۔ چار کروڑ بھوجپوری اُسے ہاتھ دے رہے ہیں اور اس کی پرستش کرتے ہیں۔ مقبولیت کے لحاظ
 سے وہ ران جھانسی کا ہم پل ہے۔ کلکتہ اور لکھنؤ کے درمیان طالعے میں اور گنگا کے دونوں طرف
 انگریز اس سے جتنا خوف کھاتے تھے اسی قدر عوام اس سے محبت رکھتے تھے۔

۱۸۵۷ء میں کنور سنگھ پچھتر سال کا بوجھا تھا بھوجپوری وہ مغربی بہار اور مشرقی یوپی کے
 علاقے یعنی اپنے وطن بھوجپور میں نہ صرف جدوجہد میں کود پڑا بلکہ اس کی راہنمائی بھی کی۔ بڑھاپے
 تک بھی اس نے انگریزوں کے خلاف جم کر معرکہ آرائیاں کیں اور طویل گوریلا جدوجہد کی تنظیم کی۔ دینا پور
 کی باغی رجحانیں اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئیں۔ باندہ کا بھورا، لکھنؤ اور اعظم گڑھ کی جانب تمام راستے
 کو بند کیا اور دریائے گنگا کو پار کر کے وطن کو لوٹ آیا اور اپنی جنم بھومی آزاد شدہ جگدیش پور میں
 لڑتے لڑتے جان دی۔

ہائین نے اسے "ان تین ہندوستانیوں میں شمار کیا ہے جنہیں "قدر" نے اہمارا اور جو مدبر
 جنگ ہونے کا دعویٰ کرنے میں حق بجانب تھے۔ باقی دو تانتیا توپے اور مولوی اودھ ہیں"۔ فارسٹ

اے دنیا جے ہمیشہ یاد رکھے گی :-
 ایک بہت ہی موثر گیت ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ اس نے کس طرح اُ
 فوج بھرت کی اور کس طرح تمام انسانوں سے اس نے پہلے جنگجو پیدا کیے اور کس طرح اس نے معمولی
 جہازوں سے انہیں بے بس کیا۔

• خاک و جنگ سے

اس نے فوج بنائی

مغض چھوڑ دیں سے

تلاشیں تیار کیں

اس نے پہاڑ کو گھونٹا بنایا

اس طرح اس نے گواہد کی جانب کو پہنچایا :-

ایک اہر سپہ سالار کی طرح رانے آگ لگانے ہوئے پسپا ہونے کی پالیسی پر عمل کیا۔ ذیل
 کے گیت میں حالانکہ اسی کے مدد میں وہ خون کا ذکر ہے جب جہانسی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔
 • وہ غصوں کو گلا دو

رائی جہانسی نے مکہ دیا

ایسا دھوکہ لڑی ہلے سپاہیوں کو

اُن پر پھانسی دینے کے لیے لٹکانیں

بندوں انگریز چلا کر ذکر کے

اُن کو در غصوں میں پھانسی پر لٹکا دو

اور جھلسی دھوپ میں

اُن کو سایہ نہ ملے :-

الآباد سے کانپور کو نیل کی فوج کے کوچ کے دوران اور دوسری لڑائیوں میں باغی سپاہیوں
 اور کسانوں کو بڑے پیمانے پر پھانسی دی گئی۔ رانی کی کمال دانشمندی یہ تھی کہ برطانوی شہنشاہیت
 پرست کاتھولک بریگڈ ہشت انگریزوں کی چالوں کے خلاف اس نے بڑے پیمانے پر جلانے کی
 پالیسی رتبہ کی

رائی کی زیر قیادت باغی سپاہیوں میں حب وطن اور دلیری کی کیا روح پھونچی گئی ہوگی

اے بچے! وہ اتنی سال کا تھا
 اے بچے! جب وہ چلتا تھا تو اس کا سر ہلتا تھا
 اے بچے! اس کے بال جگمگے کی مانند سفید تھے
 اے بچے! وہ بتیس کے بتیس دانت کھچکا تھا
 اے بچے! اس دن ہمارے بابا نے اپنی تلوار اٹھائی ۴

۲۵ جولائی کو دنیا پور رجمنٹ کی بغاوت کے بعد جب سپاہی اس کے ساتھ شاہ ہو گئے تو کنورنگھ
 نے ضلع کے صدر مقام آمہ کو آزار کیا اور ۲۹ جولائی کو گنگلی کی جنگ میں ڈنبر کے تحت برطانوی فوج
 کو شکست دی۔ پہلی ہی جنگ نے کنورنگھ کی دھاک باندھ دی۔ مگر انگریزوں نے بکسرے آتر کے
 زیرِ کمان ایک اور حملہ کر دیا۔ ۷ اگست کو بی بی گنج کی لڑائی لڑی گئی۔ انگریز بہتر طور سے مسلح اور لیس
 تھے۔ کنورنگھ نے دٹ کر مقابلہ کیا اور دشمن کو پریشان اور کمزور کر دیا۔ بعد میں کال استاد کی
 ساتھ پسا ہوا اور کامیابی کے ساتھ ساری فوج بچا کر لے گیا۔ اس جنگ کو ذیل کے سوہرائیں بیان کیا گیا
 ہے (سوہرائیک لوک گیت کی طرز ہے) جسے عورتیں بڑے جوش و خروش کے ساتھ گاتی ہیں:

”یہ بھادوں کے مہینے کی ایک رات تھی

آسمان پر کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے

بابو کنورنگھ آدھی رات کو

رٹنے کے لیے نکل پڑا

فرنگی خون سے کانپتے تھے

آسمان سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی

میدانِ جنگ میں ہندو قوں

سے گولیاں برس رہی تھیں

بابو کنورنگھ کا گھوڑا کیل کرتا ہوا

آگے بڑھا

وہ گورا فوج کے سپاہیوں کے سر قلم کرتا رہا

دھکی چال چلتے ہوئے گھوڑے کے ہرسم کی ٹاپ کے ساتھ

دھڑام سے سرکٹ کر گر پڑتے

نے ”دی ہسٹری آف میوٹنی“ میں کنورسنگ کے عزم راسخ، جو شس مل اور دلیری کی دلدی مچن کے
 طفیل اُسے اپنے ساتھیوں کی اطاعت اور عقیدت حاصل ہوئی۔
 جس چیز کا کنورسنگہ حالی تھا اور جس کی خاطر وہ لڑا اس کی تصویر ایک پردہ دہوری میں
 کیپٹی گئی ہے

”اے میرے بچے! اس دن ہمارے بابائے تلوار اٹھائے
 اے بچے! ہماری عزت اور ثروت کو بچانے کے لیے
 ہمارے دھرم اور گھوڑی حفاظت کی خاطر
 اے بچے! بھڑاؤں کی صفائی کی زمین کو بچانے کی عرض سے
 مافول اور بہنوں کو بے رحمی سے بچانے کے لیے
 اے بچے! آباؤ اجداد کے ننگ و ناموس کی حفاظت کی خاطر
 اے بچے! جب قہر کی گھڑی ہمارے سر پر تھی
 اس دن ہمارے بابائے اپنی تلوار سوتی!“

لے بچے! جب مرٹھوں نے اپنی جانیں قربان کی تھیں
 اور سنگھوں کے ساتھ مرتے دم تک لڑتے رہے
 لے بچے! پیشواؤں کے بیڑوں نے غلامی قبول کر لی
 لے بچے! شہنشاہِ دہلی بھی کنگال ہو گیا تھا
 انھوں نے بھیک پر بھیک مانگی مگر کوئی خیرات نہ ملی
 لے بچے! اس دن ہمارے بابائے تلوار اٹھائے

لے بچے! ہماری توپوں میں پتھر پلے اور بڑے
 لے بچے! ہماری بندوق کی نالیوں کو زنگ لگ گیا ہے
 لے بچے! ہم نے تلواروں کی فولاد سے دہائیاں بنائیں
 لے بچے! بھوجپوریوں نے اپنی لاشیاں بھی ایک طرف پھینک دی تھیں
 لے بچے! اس دن ہمارے بابائے اپنی تلوار اٹھائے

”اس نے لکھا: ’اے حوالدار میری بات سنو
میں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کی ہے
انگریزوں کے پتھن بڑے ہیں
وہ اس بات کا اتفاق کرتے ہیں کہ ہم
ان کے ساتھ مل کر کھانا کھائیں
وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہم ان کے ساتھ بیٹھ کر پیئیں
(نوٹ ۱۔ انگریزوں کے ساتھ کھانے پینے کا مطلب اپنی ذات برادری سے خارج ہونا تھا)
وہ ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم کار تو سوں کو
اپنے دانتوں سے کاٹیں!“

(نوٹ ۲۔ نئی انفلیڈ رائفلوں کے ساتھ جو کار تو س دیے گئے تھے ان کے ساتھ ایک کاغذ
چپکایا گیا تھا جس میں لکھا ہے: ’اے سوڑکی جبریل! استعمال کی گئی تھی۔ اس کاغذ کو دانتوں سے کاٹنا جاتا تھا
اس لیے ہندوستانی سپاہی ان کار تو سوں کو کاشنا مذہب کے خلاف سمجھتے تھے۔ اس سے ان کے
مذہب میں خلل پڑتا تھا۔)

”حوالدار نے یہ پڑھا
اس نے کیا پیغام بھیجا؟
حوالدار خود چل کر جگدیش پور آیا
(اور اس نے کہا)

’اوپالو! میری سوگند سنو جو میں نے کھائی ہے
کار تو س کو میں کبھی بھی اپنے دانتوں سے نہیں کاٹوں گا
ان کا پانی کبھی بھی نہیں پیوں گا
میں برہمن ہوں یا راجپوت،
شیخ ہوں یا سید ہوں،
میں منحل ہوں یا پٹھان،
ان کے کار تو س کو ہرگز نہیں کاٹوں گا
اوپالو! میری سوگند سنو!“

ایک بار جب وہ گورنر کے نسخے میں آگیا

وہ حیرت انگیز طریقے سے بڑا

اس نے گھوڑے کی باگ کو دانتوں میں دبایا

اور دونوں ہاتھوں سے لڑتا رہا

اس کا گھوڑا جنگ کی چال کے طور پر چکر کاٹ کر دوڑتا رہا

تلوار کے ساتھ تلوار جھنپاتی تھی

بی بی گنج میں ایک خوں ریز جنگ ہوئی

توہین گرجتی تھیں اور سنگینیں جھکتی تھیں

حریف ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے

آکر دہشت زدہ تھا

وہ عالم باؤسی میں اپنی چھاتی کو پٹینا تھا

کہنے لگا "یہ بابو ایک جادوگر ہے

وہ شیر کی مانند تیزی سے جھپٹتا ہے

خوش نصیب ہے وہ ماں جس نے

پہاڑ کی مانند تناور بیٹا جنا!

انگریزی راج تباہی کے کنارے بر ہے

ہاں! اب یہ نہیں بچ سکتا

میں یہاں بے بس ہوں یہاں کنور سنگھ

کے بے سود ما کے ساتھ لڑائی ہے!

شاعر ناتھ "سوہرہ" راگنی الپتا ہے

کنور کا نام زندہ جاوید ہے!

کنور سنگھ اور اس کے چھوٹے بھائی امر سنگھ کی مدح میں مکمل بنوارے بھی میں جنگ دلوں

پر ایک ہنواسے کی چند سطوبہ نیچے پیش کرتا ہوں جن میں اُس زمانے کے ماحول کی عکاسی ہے اور

اُن خیالات اور جذبات کا بیان ہے جو باغیوں کی تحریک کا موجب تھے۔

سپاہی رجمنٹوں کے ساتھ کنور سنگھ کے رابطے کو یوں بیان کیا گیا ہے:

اے ٹھاکر! جب تم غیر سے رحم کی درخواست کرتے ہو،
 تم سنگٹہ یعنی شیر کھلانے کے مستحق نہیں ہو
 صرف وہی اس نام کے حق دار ہیں جن کے
 پنجے ہاتھیوں کو مار گراتے ہیں نہ کہ مسکین
 اپنے آباد اجداد کے اوصاف سے غافل ہو کر تم غیروں کی خوشامد کرتے ہو
 ناز و نعمت اور کاہلی کے پتھروں میں تم زندگی کے بیش بہا دن کھو رہے ہو
 سبحان اللہ! کیا شان ہے ان لوٹی پھوٹی حقیر جھونپڑیوں کی اور
 ان کی سٹی کی دیواروں پر گھاس کی
 ٹفٹ و الیان ریاست کے ان بلند اور فلک بوس راج محل پر!
 محلات کو لوٹنے والوں کے لیے جھونپڑیاں قبر الہی ہیں
 اگر وہ جھونپڑیوں کا رخ کریں گے تاکہ انھیں لوٹا جائے تو مفت میں
 وہ موت کے منہ میں چلے جائیں گے۔

(حواشی گیت ۱۔ سنگھ، راجپوتوں کی عرفیت جس کا مطلب ہے شیر)

۲۔ ٹھاکر: راجپوت سردار یا رئیس۔ لفظی معنی آقا۔ مالک،

۲۔ راج محل: شاہی محل)

مجھے کسی ہم عصر شاعر کا علم نہیں جو اتنی شدید قوم پرستانہ عقیدت رکھتا ہو اور جس نے ایسی
 دنیاوی حقیقت شناسی کا اظہار کیا ہو۔ ہم عصر لوگوں کے دلوں پر ۱۸۵۷ء کی بغاوت کا کتنا گہرا اثر ہوا ہوگا
 جس نے سورج تل جیسے قدامت پسند درباری شاعر کو اپنے جاگیردار سرپرستوں کے ساتھ اپنا تعلق قطع
 کرنے اور ان کی صاف صاف مذمت کرنے پر آمادہ کیا۔

اگر درباری شعرا اس قدر متاثر ہو سکتے تھے تو اس میں شک نہیں کہ عوامی شعرا نے اہ زیادہ کھل
 کر لکھا۔ ہالیان ریاست کے بعد جو دھپور میں سب سے زیادہ بار سوخ آدمی اودا کا ٹھاکر تھا جس نے
 نہ صرف اپنے آقا یعنی مہاراجہ کے خلاف بغاوت کی بلکہ اپنے آقا کے آقا یعنی انگریز کے خلاف بھی۔ اُس
 نے کسانوں اور کچھ وطن دوست جاگیردار سرداروں کو بھی اپنے گرد جمع کیا۔ جس نے جو دھپور کے
 راجہ کی فوجوں کو ناکوں چنے چبوائے۔ برطانوی پولیٹیکل ایجنٹ، مانک مینن کو جنگ میں ہلاک کیا
 اہ راجپوتانہ میں گورنر جنرل کے برطانوی ایجنٹ، لارنس کو ہینوں مقلبے کے لیے لٹکالا۔ اودا کی

بہار کے لوگوں کی نگاہ میں کنور سنگھ کی یاد کا مطلب تھا غیر ملکی غلامی سے نجات پانا۔
 ہر سال ہولی (رنگوں کا تہوار) کے دوران وہ اس کی یاد میں گیت گاتے ہیں اور اس سوگند
 کو دہراتے ہیں!

”او بابو کنور سنگھ!
 ہم اپنے کپڑوں کو کبھی پوتر کبیری رنگ میں
 نہیں رنگیں گے جب تک تمہاری حکومت پھر بحال نہ ہو جائے
 اور اُدھر سے انھیں گھیرنے کے لیے
 فرجی آئے
 اور اُدھر سے

دو لڑیں کنور بھائی نوڈار ہوئے
 طائفین سے توپوں نے اس طرح آگ برساتی
 جس طرح ہولی کا رنگ آزادانہ چھڑکا جاتا ہے
 درمیان میں گھمسان کا رن پڑا
 او بابو کنور سنگھ! اب ہم کبھی اپنے کپڑوں کو
 پوتر کبیری رنگ میں نہیں رنگیں گے جب تک
 تمہاری حکومت بحال نہ ہو جائے۔“

باغی شمالی ہندوستان اور بمبئی کے درمیان راجپوتانہ کی ایک کڑی تھی اور بمبئی میں انگریزوں
 کا پہلا ہندوستان اڈہ تھا۔ نہ صرف راجپوتانہ کے لوگوں کی بلکہ سارے ملک کی نگاہیں راجپوتانہ
 ریاست پر گڑی تھیں کہ وہ بغاوت کریں گے اور انگریزوں کو سمندر میں پھینکے میں مدد دیں گے۔ لیکن یہ
 جاگیردار حکمران برطانوی اقتدار سے چپے رہے اور حب وطن کی فرائض کی پکار کو نہ سنا۔ سورج مل ہندی
 کا مشہور درباری شاعر تھا جس نے والیان ریاست کو قومی بغاوت میں شامل ہونے کے لیے ترغیب دینے
 کی انتہائی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اس نے پُر زور الفاظ میں اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا۔ ذیل میں اس
 کے چند دوہے پیش کیے جاتے ہیں:

”سور سبزہ زار کو برباد کرتے ہیں۔ ہاتھی جیسی کرگاہ لاتے ہیں
 جب کہ شیر خطا سے غافل ہو کر شیریں کی غارت میں غرق ہے۔“

کے تعاقب میں ہے!
 لیکن اودا کے گھوڑے انہیں پھلی ٹانگوں
 کے ساتھ دوڑتی مار رہے ہیں
 وہ جنگ کو جاری رکھے ہوئے ہیں
 جنگ میں ڈٹے رہو
 آخر ہماری فتح ہوگی!
 اودہ لڑتے رہو، جنگ جاری رکھو۔

(حواشی گیت ۱۰۔ بنیا، یو پارسی اور سوذو ۲۔ راجا، بادشاہ، حکمران ۳۔ سنگالی، خاندانی دیوی)
 اس گیت میں خندق کی روح سماں ہوئی ہے اور عظیم خود اعتمادی کے جذبے سے معمور ہے۔ ”راجا“ کا پارٹ کس قدر سادگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے؟ ”وہ گوروں کے ساتھ شامل ہے اور ہم پر چڑھا کر رہا ہے۔“
 یہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے گراں قدر تجربوں کا نتیجہ تھا کہ ہمارے ہوطنوں نے ہندوستانی جاگیرداروں کے پارٹ کی چال کو سمجھ لیا اور ان سے قطع تعلق کر لیا حالانکہ ان کو اب تک روایتی راجا تصور کیا جاتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت نے اس بات کے لیے راستہ ہموار کر دیا کہ شہنشاہیت پرستی کے خلاف ہندوستانی تحریک جاگیرداروں کے خلاف تحریک کی صورت بھی اختیار کرے یعنی مستقبل میں فتح کے لیے صحیح تدبیر جنگ دریافت کی جائے۔
 ۱۸۵۷ء سے متعلق یہ لوگ گیت دھرم فی الواقع ۱۸۵۷ء کے دنوں کی روح کی ترجمانی کرتے ہیں بلکہ یہ ہماری عظیم قومی میراث کا بیش بہا جز ہیں۔ ان میں ہماری اولین بلند درجہ قوم پرستانہ تعلیمیں موجود ہیں اور اس بنا پر ہمارے قومی سیاسی ترکے کا حصہ ہیں۔ انہی میں ۱۸۵۷ء کی قومی بغاوت کے دوران عوام کے نظریوں، جذبات اور ارمانوں کے ثبوت پائے جاتے ہیں چنانچہ یہ پہلی قومی تحریک کی بیش قیمت تاریخی دستاویزات ہیں۔

حواشی

- ۱۔ ٹریولین، ”کانپور شارٹ نیریٹوز“ (Campur Short Narratives)
- ۲۔ کے: ”ہسٹری آف دی سپاہی وار“ جلد اول صفحہ ۲۴۶۔ ایف
- ۳۔ ”ان دی ایر فورٹین“ (In the Year Fourteen) از انڈین اینٹی کوائری (۱۹۱۷ء)
- ۴۔ ملاقہ برج سے توسط کے۔ ایل۔ چنکرک حاصل کیا گیا
- ۵۔ یہ گیت نیزامانی سنگھ سے متعلق گیت سبکوان سنگھ وٹی، ہتھرس کی وساطت سے حاصل کیا گیا۔

جدوجہد کی راگنی لوگ گیتوں میں الاپی گئی ہے۔ ذیل کا گیت مقبول عام ہے جو ہولی کے زمانے میں عام طور پر گایا جاتا ہے:

”ہمارے کالی چڑی والے جوانزد بننے کی چراگاہوں میں ڈیرہ

ڈالے ہوئے ہیں

ہمارا راجہ گوروں کے ساتھ ہے

وہ ہم پر چڑھا کر رہا ہے

گوسے فریگیوں نے کالی ٹوپیاں اوڑھ رکھی ہیں

ہا! کالی ٹوپوں والے گوسے پھیل کر

ہم پر حملہ کر رہے ہیں۔

اجنبی کی توپوں کے گولے خاک پر پڑ رہے ہیں

لیکن آہا! ہماری توپیں ان کے خیموں کو تباہ کر رہی ہیں!

یہ ذی شان اودا ہے!

آہا! کیا خوب شاندار اودا!

اے اودا! تو ایک ستون ہے

جو ملک کی چھت کا سہارا ہے

آہا! جب ہماری توپیں سر ہوتی ہیں

ارادہ کی پہاڑیاں بھی کانپ اٹھتی ہیں!

اودا کا سردار دیوی مسگالی سے ڈکا کر رہا ہے

واہ وا! کیا خوب جنگ ہو رہی ہے!

اودا جنگ جو سپوتوں کا وطن ہے

واہ وا! جنگ جاری ہے!

آہا! راجہ کا رسالہ اپنے ہی کالے ہونٹوں

حصہ سوم

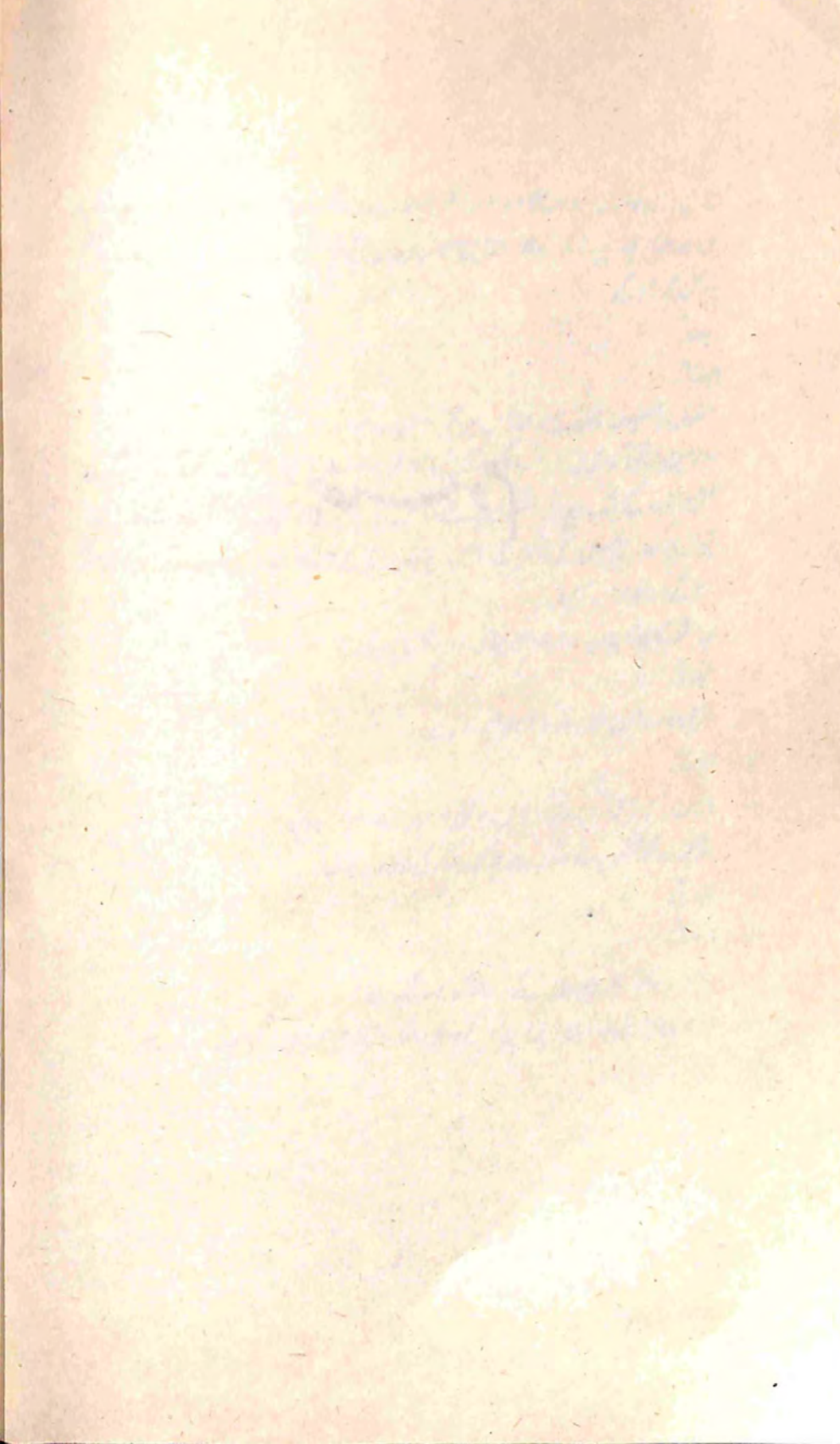
- ۷۔ "انڈین اینٹی کوائری" (دسمبر ۱۹۱۱ء) "سائیکس آف دی کنگ آف اودھ" (Songs about the King of Oudh) انڈین سول سروس کے ولیم کروک نے دیہاتیوں سے راہ و رسم پیدا کر کے جمع کیے۔
- ۷۔ ایضاً۔
- ۸۔ ایضاً۔
- ۹۔ منقول از تصنیف فارست: انڈین میوٹنی "جلد دوم۔
- ۱۰۔ "انڈین اینٹی کوائری"؛ "سائیکس آف دی میوٹنی" مصنف ڈبلیو کروک۔ کروک نے یہ گیت ضلع اٹاو کے ایک دیہاتی اسکول ٹیچر سے حاصل کیا۔ میں نے الہ آباد کے ڈاکٹر اودھے نارائن تیواڑی اور بنارس کے ڈاکٹر کے۔ ایس۔ اپادھیائے کے توسط سے اس گیت کے متن کا بھوجپوری نسخہ کے ساتھ موازنہ کرایا۔
- ۱۱۔ مہاشو تیا بھٹا چاریہ: "جھانسی رانی" (بنگالی) سے۔
- ۱۲۔ ایضاً۔
- ۱۳۔ شری ورنڈاون لال ورما، جھانسی، سے۔
- ۱۴۔ ایضاً۔
- ۱۵۔ مایین: مہسٹری آف دی انڈین میوٹنی "جلد دوم صفحہ ۴۵۳۔
- ۱۶۔ شری درگاشنکر پرساد سنگھ سے جو کنور سنگھ کی اولاد سے تھا۔
- ۱۷۔ ایضاً۔
- ۱۸۔ ایضاً۔
- ۱۹۔ ماہانہ رسالہ "بھوجپوری" کے رسالہ کنور سنگھ سے
- ۲۰۔ راجستھان کے سہ ماہی "پریم پراہ" کے خاص شمارہ شاعری بعنوان "گولامبٹ جا" سے۔
- ۲۱۔ ایضاً۔

جیمز برائن

بغاوت ہند اور برطانوی رائے

۱۸۵۷ء کی بغاوت کی جو تصویر انگریزی طلباء کے سامنے کئی پشتوں سے پیش کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ برطانوی باشندے اُن مظالم پر خوفزدہ ہو کر متحد ہو گئے تھے جو جاہل اور توہم پرست ہندوستانیوں نے انگریز مردوں، عورتوں اور بچوں پر ڈھائے جب کہ وہ دور دراز برصغیر میں برطانوی سلطنت کا بوجھ فرض سمجھ کر اٹھائے ہوئے تھے۔ وسیع علمی وسائل حاصل ہونے کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برطانوی عوام کے اصلی تاثرات جاننے کی غرض سے معاصرانہ وسائل کی کوئی خاص تحقیق نہیں کی گئی۔ (یہ کوتاہی بذات خود تاریخی اہمیت کی حامل ہے) لیکن اب یہ بات ظاہر ہو رہی ہے کہ برطانوی رائے کی جو تصویر آج تک خاص و عام نے قبول کی وہ حقائق کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی۔

یہ مختصر مطالعہ خاص طور سے برطانوی مزدوروں کے طبقے کے تاثرات سے متعلق ہے لیکن اسے برطانیہ کے شہری متوسط طبقے کے مختلف تاثرات کے سیاق و سباق میں دیکھنا ضروری ہے جس میں تین باتوں کے سلسلے میں اختلافات نظر آتے ہیں۔ اختلافی مسئلہ یہ تھا کہ ہندوستان سے متعلق برطانوی پالیسی میں عیسائیت کا کیا پارٹ ہو۔ کیا ہندوستانیوں کو وہ واحد دین برحق "قبول کرنے پر مائل کیا جائے یا انہیں "کافرا" بت پرستی اور توہمات " میں مبتلا رہنے دیا جائے؟ دوسرا اختلاف الیٹ انڈیا کمپنی کے حامیوں اور مخالفوں کے درمیان تھا۔ تیسرے اختلاف میں ایک طرف وہ لوگ تھے جو ہندوستان کو برطانوی قلمرو میں شامل کرنے کی کوشش کو ایک غلط قدم سمجھتے تھے۔ دوسری طرف وہ لوگ جو اس جزاۃً مندرجہ اقدام کو برطانوی تاریخ میں ایک نہری ورق تصور کرتے تھے اور ہندوستان کو برطانیہ کے شہنشاہی تاج کا سب سے زیادہ تاب ناک ہیرا بنانا چاہتے تھے۔



کے تحت لانے کا منصوبہ باندھ رکھا تھا، اپنی دلائل میں عیسائیت کے سوال کو نظر انداز کر دیا۔ آزاد خیال، کابڈن، اور کرسمس سوشلسٹوں کا رد عمل قابل ذکر ہے۔ کابڈن نے نجی طور پر کہا: ”مذہب کے شیدائی جو ہیں یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان کو عیسائی بنانے کے لیے اس پر قبضہ رکھنا ہے میرے خیال میں جو کچھ وہاں ہوا ہے اس کی بنا پر انھیں یقین ہو جانا چاہیے کہ ایک قوم کو عیسائی بنانے کے لیے لال کوٹ بھیجتا تبلیغی کوششوں کے حق میں خدا کی برکت حاصل کرنے کا سوز و گداز ترین یقین نہیں ہے۔“ لیکن اس نے مزید کہا: ”مجھے معلوم ہے کہ اس وقت جب کہ اس ملک کا مزاج بگڑا ہوا ہے اُن عقیدوں کی تلقین کرنا بے سود ہے لیکن اگر مجھے مجبور کیا جائے کہ میں آج کے موضوعات پر عوام کے سامنے اپنی رائے پیش کروں تو میں اس اہم ترین موضوع کو نظر انداز نہ کر سکوں گا۔ اس لیے میں اپنی چاندی کے اندر ہی پاؤں میٹھے رکھنا چاہتا ہوں کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ میرے خیالات کے اظہار کا یہ سوز و گداز قیام نہیں ہے جس سے کسی فائدے کا امکان ہو۔“

بغاوت کی وجہ سے کرسمس سوشلسٹوں کو ایک سخت فلیجمن سے گزرنا پڑا۔ چارلس کنگسٹے نے مارت ڈی۔ مارتس کو لکھا کہ ”میرا ایمان ہندوستان میں قتل عام کی وجہ سے متزلزل ہو چکا ہے۔ اس کے وجود جو اخلاقی مسائل والبتہ ہیں اُن سے میں بدحواس سا ہو گیا ہوں۔ آخر اس کا مطلب کیا ہے؟ حضرت عیسیٰؑ بہر حال بادشاہ ہیں“ مارتس نے اپنے دوست لڈلو کو لکھا: ”ہندوستان کی خبروں سے تمام سوالات کی یا قازدہ ہوتی ہے جن سے ماضی میں بسبن کے زلزلے کے وقت ہم دوچار تھے“ اس بات سے کنگسٹے اور مارتس کو قلق تھا وہ یہ تھی کہ خدا نے کیسے گوارا کیا کہ اس کے ”عیسائی“ بندے ”کافروں کے ہاتھوں قتل ہوں۔ حادثہ لزبن کی طرح اس وقت بھی یہ سوال کیا گیا کہ آیا یہ کافر اس کی سزا تھی یا کفر کے حق میں دلیل؟ کچھ تکلیف دہ غور و فکر کے بعد تینوں دوست اپنے ایمان قائم رہے۔ مارتس کو اس عقیدے میں تسکین ملی کہ ”ہمیں اپنے سوا کسی دوسرے پر الزام نہ دھرنے چاہیے اور اس پشیمانی اور رندامت کا اظہار ہمارے افعال میں ہونا چاہیے۔“ اُس نے ہندوستانی عوام سے متعلق اپنے پانچ واعظ ”میں یہ خیال ظاہر کیا کہ ”ہمیں ہندوستان کی سلطنت کو قائم رکھنے کے لیے جدوجہد کرنا چاہیے۔“ کنگسٹے نے اپنی بدحواسی پر تو قابو پایا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پبلک میں خاموش رہا۔ لڈلو نے جلد ہی یہ لکھنا شروع کیا ”اگر ہندوستان مطمئن اور خوشحال ہو، مغرب میں سکھنی وسائل مضبوط ہوں اور مشرق میں وفادار مسلمانوں اور سکھ (جو مذہب میں جھوٹے جاںکس) ہمارے ساتھ ہوں تو انگلستان بلا خطر دنیا کو دلاکار سکتا ہے“ عیسائی

یہ تین اختلافات جدا گانہ نہ تھے بلکہ ان کے باہمی تعلق ہی کی وجہ سے وہ تذبذب پیدا ہوا جو بغاوت کا مقابلہ کرنے میں حکمران طبقے نے ظاہر کیا۔ اختلاف کا ایک اور نکتہ بھی قابل ذکر ہے یہ اختلاف اُن بینہ مظالم کے بارے میں تھا جو باغیوں سے منسوب کیے جاتے تھے۔ اطلاعات کی صداقت پر کھنے میں شہری متوسط طبقہ بے شک اُن اختلافات سے متاثر ہوا۔ لیکن ان اطلاعات پر بعض لوگوں نے جس طرح شک کا اظہار کیا وہ اُسی قدر قابل ذکر ہے جس قدر اُن لوگوں کا جوش و خروش جنھوں نے انتقام کی حمایت اور تحریف کی۔ برطانیہ کے اسکولوں کے بچے اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔

ہندوستان میں عیسائیت سے متعلق پریوی کونسل کے کلرگریٹرول، کو ہندوستان میں فوجوں کے کمانڈر انچیف اینٹس کی طرف سے ایک خط ملا جو خروش پیا ہونے سے عین پہلے لکھا گیا تھا۔ اینٹس نے "ایسی بلاطینانی کے عجیب احساں کا ذکر کیا جو ہندوستانی فوجیوں میں پھیلی ہوئی تھی اور جس کی بنا مذہبی اسباب بھی تھے اور شک بھی کہ ہم ان پر عیسائیت ٹھونسنے میں زبردست طاقت کا استعمال کرنے والے ہیں۔" گریٹرول نے لکھا: "یہ حقیقت نہیں ہے لیکن ہندوستانیوں کو اُس وقت تک یقین نہ آئے گا جب تک اگر ریٹال اور مشنریوں کو ان علاقوں میں من مانی کرنے کی اجازت ہے۔" بعد میں اس نے "ہندوستان کو عیسائی بنانے کے شاندار منصوبے" کا ذکر کیا "جس کی تعمیل میں کلیسا کے ادنیٰ و اعلیٰ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔" ۲ "نامنر" اُن میں سے تھا جو یہ محسوس کرتے تھے کہ "وہ مقصد جس کے لیے ہیں ہندوستان پر قبضہ رکھنا چاہیے مستقبل میں لوگوں کو عیسائی اور مذہب بنانا ہے۔" ۳ "مارنگ پوسٹ" کی یہ رائے تھی کہ "ہم نے ہر تعصب کو، خواہ وہ ہندو کا تھا یا مسلمان کا، لاڈ پیار سے بگاڑا، اس کی پرورش اور ناز برداری کی خواہ کتنا ہی غیر معقول، کتنا ہی بیہودہ اور کتنا ہی ہمارے احساسات، جذبات اور خیالات کے منافی تھا۔" ۴ لیکن گلید سٹون نے بالکل چپ سا دھ رکھی۔ وہ طلاق بل میں الجھا ہوا تھا۔ ڈسٹرائیٹی نے جو لارڈ پارٹمن کی حکومت کا تختہ الٹنے پر تلا ہوا تھا اور جس نے ہندوستان کو برطانوی تاج (۵) نوٹ متعلقہ گلید سٹون: "کمل نہیں۔ بارے اپنی تصنیف "لائف آف گلید سٹون" میں بناوٹ کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ مئی ۱۹۵۱ء اور بجل کی تصنیف "لائف آف ڈسٹرائیٹی" جلد اول ۱۹۵۰ء میں تنقید ملاحظہ فرمائیں۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۵۰ء کو بگرام جیسٹرس سوسائٹی آف فارن مشنرز کے نام ایک خطبے میں گلید سٹون نے کہا: "میں یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوں کہ میں نے پچھلے پچیس سالوں میں ہندوستان سلطنت سے متعلق پالیسی کی مضرت رساں شالیں دیکھی ہیں، ایسے اقدامات کیے گئے جن میں انصاف کا اثر نہیں۔ تدریج انگلستان کے ماتھے پر یہ کلنگ کا ٹیکہ ہے۔" "پینل پیر" ۶ اکتوبر ۱۹۵۰ء (۶)

لے کر روز بروز مستورات کلکتے میں وارد ہو رہی ہیں جن کے کان اور ناک کٹے ہوئے ہیں اور جن کی آنکھیں نکال دی گئی ہیں۔ معصوم بچوں کو خاص کر مخصوص کیا گیا ہے کہ ماں باپ کی آنکھوں کے سامنے انھیں ایسی ایسی اذیتیں دیں جو سوچی بھی نہیں جاسکتیں۔ ماں باپ کو ان مظالم کا تماشائی بنایا گیا۔ ان کو اپنے بچوں کے اعضا سے کٹے ہوئے گوشت کے ٹکڑے کھلائے گئے اور بعد میں انھیں دھیمی آہنج پر جلا کر ہلاک کیا گیا۔ ۱۸

خاتون جن کے خط کا ذکر ہے وہ گورنر جنرل کی بیٹی لیڈی کینگ تھی۔ بعد میں لارڈ شیفٹسبری نے دباؤ پڑنے پر اپنے بیان کی تصحیح کر دی۔ اس نے تسلیم کیا کہ ”میں نے خود خط کو نہیں دیکھا بلکہ اس کے بارے میں سنا ہے۔“ ۱۹ اس بات کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ ایسا کوئی خط لکھا بھی گیا تھا۔ اس بات کا ثبوت کہ لارڈ شیفٹسبری نے انتقام کے حق میں اپنی رائے برقرار رکھی ایک خط سے ملتا ہے جو اس نے مارٹن پیر کو لکھا۔ یہ بگنم محل میں ایک ہر دل عزیز شاعر تھا۔ اُن نظموں کے علاوہ جس میں اس نے دہلی کی مکمل تباہی اور مجرموں کے بے قطار درقطار ”پھانسی کے تختے“ نصب کرنے کا تقاضا کیا۔ اُس نے یہ بھی تجویز پیش کی کہ ”دکٹوریہ کو ہندوستان کی ملکہ بننا چاہیے۔“ ۲۰ شیفٹسبری نے لکھا: ”میں تمہارے ساتھ اتفاق کرنے پر بہت مائل ہوں کہ اکثر لوگ جب انتقام کو خدا کے ساتھ منسوب کرتے ہیں تو وہ اس لفظ کے مفہوم کو بالکل نہیں جانتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انجیل مقدس میں انتقام انصاف کا کامل ترین اور بلند ترین ارتقا ہے۔ سپاہی اپنے جرائم کے خود گواہ ہیں۔ اُن کے جسم کو ثابت کرنے کے لیے کسی شہادت کی ضرورت نہیں۔ اس معاملے میں انسانی حکومت مختار ہے۔ یہ اس لیے سب سے ضروری ہے کہ آئینی حکومت کو تمام کارروائی کا اختیار ہو نہ کہ نجی قانون سزا کا اس میں دخل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سرکار سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ سزا دینے میں سختی، عزم اور مستعدی سے کام لے۔“ ۲۱

کابڈن نے مظالم کی داستانوں کو تسلیم کیا لیکن جان برائٹ کو اس نے لکھا: ”یہ ظاہر ہے کہ جو سلوک انگریزوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ روا رکھا ہے اس کے پیش نظر اُن سے محبت یا احترام کی توقع نہیں ہو سکتی۔ میں کہتا ہوں کہ ہم ہندوستان میں اپنی رعایا کو (ہندوستانیوں) حبشی کے عام لقب سے نوازتے ہیں۔ یہ بکچہ گویا ہو جاتا (گو کسی قدر مشکل سے) اگر انگریز جن کے ساتھ ہندوستانیوں کا رابطہ تھا اعلیٰ اوصاف اور اعلیٰ داعی صلاحیتوں سے کام لیتے۔ جو غلطیاں ماضی میں انگریزوں سے سرزد ہوئی ہیں اور اس سے زیادہ خونریزیاں جو اس وقت عمل میں آ رہی ہیں اور جو اُن بے گناہ

سوشلزم شہنشاہیت پرستی کے ساتھ مصالحت کر رہی تھی۔

اب ایسٹ انڈیا کمپنی کے چند ہی دوست رہ گئے تھے۔ کابڈن نے لکھا: "ہم سب جانتے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایسا جانے کا کیا مقصد تھا۔ یہ مقصد اجارہ داری تھا۔ یہ اجارہ داری نہ صرف غیر ملکوں کے خلاف بلکہ اپنے باقی ہموطنوں کے خلاف بھی، اس کا خیال تھا کہ کمپنی کو برقرار رکھنے میں کوئی فائدہ نہیں تھا کیوں کہ "کمپنی نے اپنے آپ کو ایسے جرائم کے ارتکاب کا اہل ثابت کیا ہے جو کسی ایسے وحشی قبیلے سے بھی نہ سرزد ہوتے جن کے بارے میں ہم نے ڈاکٹر لونگ اسٹون کی داستان میں پڑھا تھا اور جنہوں نے لونگ اسٹون سے پہلے کسی عیسائی یا فرنگی کی شکل بھی نہ دیکھی تھی" "دی انڈین ریفارم سوسائٹی" مختلف خیالات رکھنے والے لوگوں کے لیے ایک پلیٹ فارم تھی۔ ارنسٹ جونز، منشوری، کے لیے یہ ایک مفید پلیٹ فارم ثابت ہوا۔ یہ سوسائٹی زیادہ تر مابچسٹر کے اُن کارخانہ داروں کی رائے کی عکاسی کرتی تھی جو ہندوستان میں امریکہ کی جگہ ایک متبادل روٹی کی رسد قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس سوسائٹی نے کمپنی کے اختیارات میں کمی، ہندوستانیوں کے ساتھ بہتر سلوک اور اُن پر عائد کیے جانے والے محصول سے متعلق اصلاحات کا مطالبہ کیا: "دی ویکلی ڈسپچ" نے جس کا مقصد اخبار پڑھنے والے مزدور طبقے کی توجہ سماجی اور معاشی نظام کے خلاف بغاوت کی طرف سے ہٹانا تھا، یہ رائے ظاہر کی کہ "اگر ہم ہندوؤں اور مسلمانوں سے اُن کے جرائم کا انتقام لیں اور فرنگی حکام کو چھوڑ دیں جن کی بد اعمالی ان جرائم کا موجب ہوئی تو یہ نامردی اور بے دینی ہوگی" "ارنی طبقوں کی بے چینی کو کمپنی کی مخالفت میں بدل دینا سہل تھا۔" "دی ڈیلی ٹیلیگراف" نے کمپنی کی اس بنا پر مذمت کی کہ حکومت کی باگ ڈور ایک "واحد طبقے" کے ہاتھ میں دے دی گئی ہے۔ "دی سٹینڈرڈ" نے کمپنی کی مذمت کے ساتھ یہ سفارش بھی شامل کر دی کہ وسط ہفتے میں روزے کے دن اور روزِ شفاعت مالک مزدوروں کو پوری اجرت ادا کریں۔ معلوم ہوتا ہے اس تجویز پر عمل نہیں کیا گیا۔ ۱۵ "دی نان کنفارمسٹ" نے بھی کمپنی پر حملہ کیا: "لارڈ پارسٹن جو ہندوستان کے معاملات پر اظہار رائے میں بے ساختہ اور بے لاگ تھا، جھٹ اس نتیجے پر پہنچا کہ کمپنی کو بند کر دینا چاہیے" ۱۶

مظالم کے سوال پر لارڈ شیفسبری سب سے زیادہ صاف گو تھا اُس نے اعلان کیا "ہم نے خود ہندوستان میں مقیم ممتاز ترین خاتون کا لکھا ہوا ایک خط دیکھا ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے

(۱) نوٹ متعلقہ کمپنی: اس نے یہ بھی اعلان کیا تھا کہ "اگر ہم سپاہیوں کو کچل دیں تو خدا اتنا ہی خوش ہوگا جتنا اہل برطانیہ ہوں گے۔" ۱۷ اگست ۱۸۵۷ء

تک لوٹنے کی تجویز کی مخالفت کی۔ اس نے اپنے قارئین کو یاد دلایا کہ "ہمیں یہ کبھی نہیں بھونا چاہیے کہ انھیں آدمیوں (باغیوں) کو جب یہ ہماری ملازمت میں تھے ہم نے دوسروں پر اسی قسم کے مظالم ڈھانے میں آلاکار بنایا۔" ۲۹ "دی نان کنفارسٹ" نے اس بات سے اتفاق ظاہر کیا کہ ہندوستان میں امن بحال کرنے میں اور قانون کی برتری قائم کرنے سے پہلے سختی سے کام لینا پڑے گا۔ لیکن یہ کہہ کر اپنے ضمیر کو مطمئن کر لیا کہ "جو کچھ بھی کرنا ضروری ہے وہ عیسائی سپرٹ کے مطابق کرنا چاہیے۔" ذکر جوش جنوں سے غضب ناک ہو کر "۳۰" "دی ڈیلی ٹیلیگراف" نے اعلان کیا کہ "سخت انتقام اودھرت تک سزا کی ضرورت کی ہر طرف سے حمایت ہو رہی تھی۔" ۳۱ "دی مارنگ پوسٹ" نے اعلان کیا کہ "ہر انگریز نے جو اپنے سینے میں مرد کا دل رکھنا ہے اپنے وطن کے ساتھ یہ بیان باندھا ہے کہ ہندوستان میں برطانوی سلطنت اگر کسی اور وجہ سے نہیں تو کم از کم اس مقصد کے لیے تو ضرور قائم رہے گی کہ اُن مسلمان اور برہمن شیطانوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے جنھوں نے انگریز خواتین اور دوشیزاؤں پر ناقابل بیان مظالم ڈھائے ہیں۔" ۳۲ انتہا پسند "نیوکاسل کرانیکل" نے "جواب مالک، جوزف کوون کے شہنشاہیت پرستی کے بڑھتے ہوئے جوش کی عکاسی کرتا ہے، برطانوی تاج کے تحت اس شاندار نو آبادی کا ذکر کیا اور کیننگ کی حمد لی پر یوں نکتہ چینی کی: "اب رم کھانے کا وقت نہیں ہے، ہمارا انتقام ایسا تیز، خونریز اور اس قسم کا ہونا چاہیے کہ مستقبل میں دہلی کے ذکر پر ہی ہماری ہندوستانی رعایا کا نپ اٹھے۔ اُن کو اس طرح نیست و نابود کرنا چاہیے کہ گویا جنگلی جانور ہیں۔" ۳۳

برطانیہ کے دولت مند طبقے سے متعلق ایک آخری نکتہ قابل ذکر ہے۔ یعنی شہنشاہیت پرستانہ نظریہ جس نے اختلافات پر اپنا رنگ چڑھایا جیسا کہ سابقہ اقتباسات سے ظاہر ہے۔ یہ خیریت گزری کہ بغاوت جنگ کریمیا یا ایران پر فوج کشی کے ساتھ ساتھ رونما نہیں ہوئی "دی ٹائمز" نے لکھا: "اگر بغاوت ہوئی ہی تھی تو اس کا اس سے بہتر موقع نہ ہو سکتا تھا۔" پھر اس نے لکھا: "اب سوال فقط یہ ہے کہ ہندوستانیوں پر کون حکومت کرے گا کیوں کہ وہ اپنے آپ پر حکومت کرنے کے کبھی بھی قابل نہ ہوں گے۔" اس نے بتایا کہ "جنگِ برما کے بعد سے کہیں بھی ہمارے اقتدار کو زک نہیں پہنچی۔ اودھ کا امن کے ساتھ الحاق کر لیا گیا ہے۔ پنجاب ہمارے تحت ایک صوبہ بن گیا ہے بلکہ پیگوہ بھی ایک نفع کا سودا ثابت ہونے لگا ہے۔" ۳۴ لارڈ شیفٹسبری نے بھی یہ رائے ظاہر کی کہ "بغاوت سازگار وقت پر ہوئی۔" اس نے اپنا بیان ان الفاظ کے ساتھ ختم کیا "اس میں خدا تعالیٰ کا ہاتھ تھا۔ ان تمام واقعات سے ثابت ہو گیا ہے کہ خدا نے یہ کام ہمیں بحیثیت قوم سپرد کیا

فروں پر ہماری ابتدائی جارحیت کی وجہ سے آئندہ سرزد ہوں گی، ان سب کا خیاہ وہیں یا ہماری اولاد کو بھگتنا پڑے گا۔ شورش کے شروع میں ہمارے افسروں نے جو خطوط لکھے ان کے پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہر ماتحت کو بھی اختیار حاصل تھا کہ وہ جتنے ہندوستانیوں کو چاہے پھانسی دے یا گولی مار دے۔ وہ اس خونریزی کا ذکر اس حقارت کے ساتھ کرتے تھے گویا جنگلی جانوروں کے شکار کا ذکر کر رہے ہوں۔^{۲۲} لیکن یہ نجی خیالات تھے۔ کاہن اور برائٹ دونوں کو ۱۸۵۷ء کے عام انتخابات میں شکست ہوئی تھی۔ کاہن اس سال کے بیشتر عرصے کے دوران بیمار رہا اور اس نے بغاوت سے متعلق علانیہ کوئی بات نہ کی۔ جان برائٹ نے جو برسنگم میں پارلیمنٹ کا ضمنی انتخاب لڑ رہا تھا اعلان کیا کہ ہندوستانی بغاوت کی کامیابی سے ہندوستان میں افراتفری پیدا ہوگی اور میرا خیال ہے کہ اس بغاوت کو دبانہ ہندوستان پر دم کرنا ہے۔^{۲۳}

ایف۔ ڈی۔ مارٹس نے ایک مجمع کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ایسی درگزر جو جرم سے نفرت نہ ظاہر کرتی ہو، جو اس کے اندر کی کوشش نہ کرتی ہو، جو جرم کی سزا دینے سے کتراتا ہو وہ زبانی نہیں اہلیسا نہ معافی ہے۔^{۲۴} ڈسٹرکٹ کی کوشش تھا (لیکن اس نے اپنے شکوک کو بیڈی لندن ڈیری کے گوش گزار کرنے کے لیے محفوظ رکھا) کہ ان مظالم کی بہت سی تفصیلات جن سے ملک کے جذبات مجروح ہوئے تھے، ہن گزرت کہانیاں ہیں۔^{۲۵} جو ڈکس نے ڈی ٹائمز کے نام ایک طویل خط لکھا جس میں اُس نے اس نظر سے اتفاق ظاہر کیا کہ سراسر ایک ہندو بغاوت تھی اور "بے حتمی اور ایذا رسانی کی بیشتر کہانیاں محض فرضی تھیں۔^{۲۶} لیکن اس رائے کا اظہار انتہائی کارروائیوں کے شروع ہونے کے بعد ہوا اور اس رائے کو ان برعکس اطلاعات کی روشنی میں دیکھنا چاہیے جو اس اخبار میں نمایاں طور پر شایع ہوئیں اور جن میں سے ایک میں تو بے حد تہمت تراشی سے کام لیا گیا، "میرے قبضے میں بہت سے خطوط ہیں جن سے اور بھی شدید تر مظالم کی مثالوں کا پتہ چلتا ہے لیکن مظلوم یا ان کے متعلقین ان کے ناموں اور حالات کے اظہار سے بچنا چاہتے ہیں۔^{۲۷} "دی ٹائمز" ادارہ کے اعتبار سے ان اخبارات میں پیش پیش تھا جنہوں نے "عبرت تک سزا کا مطالبہ کیا، ایسی عبرت جس کا چرچا برطانوی ہندوستان کے دیہات میں آنے والی پشتوں تک رہے۔^{۲۸} انتہا پسند "ارنگ سٹار" نے کج روی اختیار کی جس میں برائٹ کی انتخابی مصروفیتوں اور مانچسٹر کی تجارتی توقعات کی عکاسی تھی۔ اس نے کیننگٹ پر حملہ کیا۔ اس کی "رحمدلی" کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی بغاوت سے پہلے کی پالیسیوں کی بنا پر لیکن اس نے انتہائی کارروائی کی مخالفت کی۔ اُس نے ایک خط شایع کیا جس میں اُس نے دہلی کو تین دن

سے کیا جائے کہ مخالفت کا سوال بھی نہ پیدا ہو سکے۔ ۴۵ ملکہ کے شوہر کی بھی رائے یہی تھی، جس چیز کو سوچ کر روٹ گئے کھڑے ہوتے ہیں وہ اُن لوگوں پر گولی چلانے کا خیال ہے جو ہماری ہی دردی پہنچے ہوئے ہیں۔ بہر حال ممکن ہے نتیجہ اچھا نکلے۔ اب ہم یقیناً ایک معقول فوجی نظام قائم کریں گے۔ ۴۶ بین الاقوامی صورت حال پر بغاوت کا کیا اثر مرتب ہوا اس پر فکر مندی کے ساتھ بحث کی گئی۔ کیا پولین سووم برطانیہ کی پشت میں پھرا بھونکنے کے موقع کو نصیحت جانے گا؟ پارسٹن نے کچھ بے دلی کے ساتھ خوشی کا اظہار کیا جب بلجیم نے بغاوت کو دبانے میں مدد دینے کے لیے ایک فوجی دستہ بھیجنے کی پیش کش کی اور نیویارک سے جہاں بیولاک کی موت پر جھنڈے لٹکوں کر دیے گئے یہ اطلاعات پہنچیں کہ اس مقصد کے لیے پچاس ہزار مجاہد آسانی کے ساتھ بھرتی کیے جاسکتے ہیں۔ ۴۷

غرضیکہ یہ ظاہر ہے کہ برطانوی مزدور طبقہ تو درکنار دولت مند طبقے پر بھی بددلی کی مختلف صورتیں تھیں۔

البتہ ہم یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ یہیں اس سلسلے میں کثیر دستاویزات، دیہاتی گھروں اور پارٹیوں کے مکانات سے اس قسم کے خطوط، سیاسی روزنامے، پارلیمنٹری تقریریں اور فاضلانہ اداریاتی مضامین حاصل ہو سکتے ہیں۔ غالباً ہمیں کبھی بھی یہ معلوم نہ ہوگا کہ ان جگہوں پر کیا گفتگو ہوتی تھی جہاں انگلستان کے مزدور اکٹھے ہوتے اور روزمرہ کے واقعات پر بحث کرتے تھے۔ کوئی دستاویزات دستیاب نہیں رہے۔ شاید ان کا وجود ہی نہیں ہے۔ البتہ ردِ عمل کے آثار پائے جاتے ہیں اور ممکن ہے کہ مزید تحقیق سے نئی باتوں کا انکشاف ہو۔

۱۸۵۷ء میں برطانوی تجارت کی توسیع کے زیر اثر منشوریت کی مجاہدانہ تحریک دھیلی پڑ رہی تھی۔ سوشلزم جس نے برطانوی مزدور طبقے میں جنم لیا تھا، عارضی طور پر کمزور ہو گئی تھی۔ انگلستان نے ۱۸۵۷ء میں لکھا: "۱۸۴۸ء کے فرانسیسی انقلاب نے انگلستان کے متوسط طبقے کو بچا لیا۔ نتیجاً فرانسیسی مزدوروں کے اشتراک اعلانات سے انگلستان کا پچھلا متوسط طبقہ ڈر گیا اور برطانوی مزدور طبقے کی محدود مگر حقیقی تحریک کا شیرازہ بکھر گیا۔ منشوریت کی تحریک ۱۸۴۸ء کو خارجی طور پر ناکام ہونے سے پہلے ہی داخلی طور پر ختم ہو چکی تھی۔ مزدور طبقے کی سرگرمی کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ سرمایہ دار طبقے کی ہر محاذ پر جیت ہوئی۔ ۴۸ اس کے بعد پچیس سال دور شروع ہوا جس میں انگلستان دنیا بھر کا "صنعتی مرکز" بنا رہا اور اس کے اقتدار کو چنوتی دینے والا کوئی نہ تھا۔

ایڈیٹر نیول۔ اندراج ۲ اکتوبر ۱۹۵۷ء: فی الحال ہماری حالت ایک بے وقعت قوم کی سی ہو گئی ہے۔

ہے کہ ہم ان لاکھوں انسانوں کی تہذیب کو ترقی دیں اور خدا کے مولود مسعود (حضرت عیسیٰ) کے دین کی اشاعت کا کام کریں۔ ۲۵ء لارڈ برام نے "سخت سزا" کا مطالبہ کیا۔ لارڈ ڈگرے کی ریفارم کمیٹی کا رکن ہونے کے بعد سر جیمز گراہم نے اب قدامت پسندانہ خیالات اپنا لیے تھے۔ اس نے اعلان کیا کہ سلطنت کھودینے سے ہمارا زوال شروع ہو جائے گا۔ اس کے قائم رہنے سے یہ ثابت ہو گا کہ ہم ابھی تنزل کا شکار نہیں ہوئے ہیں۔ ۲۶ء "دی ڈیلی ٹیلیگراف" نے لکھا: "بزوالہ خیالات اور افسردہ جذبات کسی سلطنت کی مجاہد شوریٰ میں دخل نہیں پاتے جب تک زوال کا دور نہ آجائے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ایسا دور ابھی نہیں آیا۔" ۲۸ء "دی نان کنفڈنسٹ" جو "برطانیہ صغرا" کے نظریہ کی عکاسی کرتا تھا، اس کا یہ خیال تھا کہ شاید یہ بغاوت چین کی معرکہ آرائیوں میں ہماری بے جا مداخلت اور ایک انگریز وزیر کو ایران کے ساتھ جنگ چھیڑنے کی اجازت دینے کی پاداش ہے۔ ۲۹ء "دی نیو کاسل کرائیکل" نے "ریلے اور ڈریکٹ کا ذکر چھیڑا اور امید ظاہر کی کہ "خوش حالی اور عیش و عشرت کی صدیوں نے انگریزوں کو بے باکی اور مردانہ جرأت کی اس سپرٹ سے محروم نہیں کیا جس سے عہد الہیہ کے انگریز مشہور ہوئے۔" ۳۰ء ناول نگار تھیکر نے اپنی خاندانی دولت جو اسے ہندوستان سے حاصل ہوئی تھی، جوئے میں گنوا دی۔ جب وہ پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہونے کے لیے آکسفورڈ کے ووٹروں کی حمایت حاصل کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا، اس وقت اس نے بغاوت کو دبانے کے موضوع کو اپنے پروگرام کا حصہ بنایا۔ ۳۱ء ڈسرایلی نے برطانوی تاج اور ہندوؤں کو ایک دوسرے سے قریب تر لانے کی وکالت میں اپنی تمام فصاحت و بلاغت صرف کر دی۔ اس نے دور اندیشی سے یہ بھانپ لیا کہ ان علاقوں پر صرف جبر کے ساتھ حکومت کرنا ممکن نہیں بلکہ منصب شاہی کی عظمت اور تقدیس بڑھانے کی ضرورت ہے تاکہ ہندوستان کے ساتھ برطانیہ کا رابطہ برقرار رہے۔ ۳۲ء ملکہ وکٹوریہ کو اس بات کا احساس ہوا کہ "مجموعی صورت حال کی مہیا کی نسبت زیادہ تشویش ناک ہے جہاں جنگ شرافت کے ساتھ لڑی گئی اور جہاں عورتیں اور بچے محفوظ تھے۔" ۳۳ء اس نے اس موقع کو غنیمت جان کر مسلح افواج میں اضافہ کی تاکید کی۔ اس نے لکھا: "پچھلے بیس برسوں میں سلطنت کی وسعت تقریباً دو گنی ہو گئی ہے لیکن ملک کی فوجوں کی تعداد اسی قدیم پیمانے پر قائم ہے۔ ۳۴ء کیننگ کے خط سے اس کا ارادہ اور بھی پختہ ہو گیا: "انگلستان کے اقتدار کو سخت دھکا لگا ہے اور اس کے اقتدار میں اعتماد اسی صورت میں بحال ہو سکتا ہے کہ ساری ہندوستانی سلطنت میں قوت کا طویل اور متواتر مظاہرہ ایسی انگریزی فوج کی موجودگی

ہاتھوں میں محفوظ رکھ سکتے ہیں جب تک ہم غارت گری، الحاق اور مظالم کی پالیسی کو نہ بدلیں، مستقبل میں ہندوستانوں کو رحم و انصاف کی ضمانت نہ پیش کریں اور اُن کی موجودہ ناامیدی اور غم و غصہ کو ذریعہ کریں۔ ہندوستان برطانوی تجارت اور صنعت و حرفت کے لیے ایک وسیع میدان ثابت ہو سکتا ہے بشرطیکہ انگلستان اور ہندوستان باہم دے اسے ایسا بندے رکھیں۔ اس لیے انگریزوں کو اس بات کا دھیان رکھنا چاہیے کہ ہم اپنی بد نظمی اور طبقہ امرا کی حماقت کی وجہ سے مشرق کے اس نہری باغ کو اپنے قبضے میں رکھنے کا نہری موقع نہ کھو دیں۔ ۵۲

ارنلڈ جوتز ۵۲ کو مدت سے ہندوستان میں دل چسپی تھی۔ ۱۸۵۲ء میں اس نے اخباری مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ ۱۸۵۱ء میں جب وہ جیل میں تھا، اُس نے ایک طویل نظر بعنوان "ہندوستان یا نئی دنیا کی بغاوت" لکھی تھی۔ جب شورش پیا ہوئی تو یہ نظر دوبارہ شائع ہوئی۔ اس کے دیباچے میں جوتز نے شہنشاہی نعرے میں مشہور ترمیم کی۔ شہنشاہی نسخہ یہ تھا: "برطانوی سلطنت پر آفتاب کبھی نروب نہیں ہوتا۔" اُس نے اس میں تبدیلی کی: "اس کی نوآبادیوں پر آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا لیکن خون بھی کبھی خشک نہیں ہوتا۔"

اب جوتز منشوریوں کی مجاہدانہ روایت کو برقرار رکھنے میں اکیلا رہ گیا۔ ایسا دکھائی دیتا تھا کہ وہ جدوجہد کو ترک کر دے گا اور دولت مند طبقے کے ساتھ مصالحت کرے گا۔ ہندوستانی لوگوں کے حق میں اس کا آخری جہاد اُس کی انقلابی زندگی کا شاندار لفظ، عروج تھا۔

۴ جولائی کو جوتز نے اپنی ہم کا آغاز کیا۔ اس نے اعلان کیا کہ "انصاف اور مصالحت کی پالیسی سے ہندوستان بول کی آخری شورش کافی مدت کے لیے ملتوی ہو سکتی تھی۔" اس نے تنبیہ کی "انگلستان کے مزدوروں! تمہیں ایسی انتہائی غیر منصف اور غاصب سلطنت کے قیام کے لیے خون بہانا پڑے گا اور اس کا بار اٹھانا پڑے گا جس سے زیادہ سیاہ و صیہ انسانی تاریخ کے ماتھے پر دوسرا نہ ملے گا۔ ہموٹوں! تم کو جاننا چاہیے کہ ہندو اس حق کے لیے لڑ رہے ہیں جو تمام نئی نوع انسان کی نگاہ میں مقدس ترین حق ہے۔ پولینڈ، ہنگری، اٹلی اور آئرلینڈ کے لوگوں کا نصب العین اس سے زیادہ مقدس اور منصفانہ نہیں تھا۔ دنیا کی ایک انتہائی عظیم الشان تحریک کو دبانے میں تم سے خون اور خزانہ صرف کرنے کا تقاضہ کیا جائے گا۔ ہموٹوں! تمہیں دوسروں کی آزادی سلب کرنے میں مدد دینے کے بجائے کوئی بہتر کام انجام دینا چاہیے یعنی اپنی آزادی کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے۔"

۱۱ جولائی کو اس نے پُر امید ہو کر حکمران طبقے میں خوف کے آثار کی طرف اشارہ کیا "دی ٹائمز"

چوں کہ ہندوستانی بغاوت اسی پچیس سالہ دور میں رونما ہوئی اس لیے برطانوی مزدور طبقے میں کسی اجتماعی ردِ عمل کی توقع نہ ہو سکتی تھی بلکہ اس کا تھوڑا سا جو ردِ عمل ہوا وہی حیرت کی بات ہے۔

”رینلڈز نیوز پیپر“ مزدور طبقے کے فیر سوشلسٹ نظریے کا ترجمان تھا۔ اس نے فوراً باغیوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا۔ ۵ جولائی ۱۸۵۷ء کو اس نے ”اس ہولناک انتقام کا ذکر کیا جو انگریزوں میں کہیں انصاف باقی ہے، برطانوی حکومت اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے بے مثال جرائم کی پاداش میں نازل ہوگا۔“ اس نے اعلان کیا، ”گویم باغی رجمنٹوں کے مظالم کی مذمت کرتے ہیں لیکن ہماری ہمدردی طاقتور کے مقابلے میں کمزور کے ساتھ، ظالم کے خلاف جدوجہد کرنے والے مظلوموں کے ساتھ، اذیت، غارت، غلامی اور توہین کے شکار ان ہندوستانیوں کے ساتھ ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ جو اپنے ظالم، بے درد، غارت گرد اور قیارت آقا کے آگنی جوئے سے رہا ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہماری ہمدردی باغیوں کے ساتھ ہے، ان سرکش شہیدوں کے ساتھ ہے جنہیں ”دی نائز“ اور اس کے ساتھی گولی مار کر پھانسی دے کر اور سولی پر چڑھا کر عبرت انگیز کرنا چاہتے ہیں۔“ جب مظالم کو بڑھا چڑھا کر منتشر کیا گیا تو اس اخبار نے لکھا: ”ہم یہاں گھر میں بیٹھے تصویر کا صرف ایک رخ دیکھ رہے ہیں۔ انگریزوں کی طرف سے حد درجہ اشتعال انگیزی ہوئی ہے۔“ ۳۹ اُس نے ہندوستان کے واقعات کو برطانیہ میں آزادی کے خاتمے کے ساتھ وابستہ کیا۔ جب روزے کے دن شعبہ کا مظاہرہ ہوا تو اس اخبار نے جنگجو اور مطالبہ پرست چرچا کے رویے پر نکتہ چینی کرتے ہوئے لکھا: ”اکثر اشخاص اپنے خطبات میں آمادہ بہ جنگ اور انتقام جو ثابت ہوئے۔ وہ خون کے پیاسے اور روپیہ کے بھوکے تھے عمرِ رحم سے متعلق انھوں نے چُپ سا دھل“ نان کنفارمسٹ جا دو بیان ”مونٹ بیک سپر جن“ کا خاص طور پر ذکر کیا گیا۔ اس نے کرسٹل پالیس میں اُس ہزار کے مجمع کے سامنے تقریر کی جس نے اس تماشے کے لیے پیسے خرچ کیے تھے۔ سپر جن نے ”خون کے بدلے خون“ کی تلقین کی اور مجمع کے جذبات کو بھڑکانے کے لیے اس نے حقیقت کو مسخ اور تاریخ کو نظر انداز کیا۔ اس نے انھیں بتایا کہ ”سپاہی محبِ وطن نہیں باغی ہیں کیوں کہ انھوں نے برضا و رغبت انگریزوں کی غلامی قبول کی تھی۔ بے شک! وہ اسی طرح اپنی آزادی سے دست بردار ہوئے جس طرح ایک مسافر اپنے بٹے سے دست بردار ہوتا ہے جب ڈاکو اُسے پستول دکھاتا ہے۔“ ۵۱ یہ مذمت قطعی تھی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ رینلڈز کا اخبار اب شبنشاہیت پرستی کا شکار ہونے لگا تھا۔ اُسے صرف یہ فکر تھی کہ برطانوی نظام میں اصلاح کر کے ہندوستان پر قبضہ برقرار رکھا جائے۔ ”ہم اس وقت تک ہندوستان کو چُپ رکھ سکتے ہیں اور اپنے

بھی نہیں کہا۔ اُس نے ہندوستان کی بد نظمی کا تمام تر الزام ایسٹ انڈیا کمپنی پر رکھنے کے منصوبے سے آگاہ کیا۔ کمپنی کو ختم کرنا اور اس کی جگہ ہوم گورنمنٹ (برطانوی حکومت) قائم کرنا گویا ایک ٹھیکہ کو ہٹا کر دوسرا ٹھیکہ تسلط کرنا ہے۔ اس نے پھر اعلان کیا کہ ”ہندو حق بجانب ہے، ہندو کا مقصد نیک ہے۔ خدا ہندو کے مفاد کی حفاظت کرے!“ اس نے وہ تمام انتقامات گنوائے جو ”ٹائمرز“ نے بیان کیے تھے اور یہ رائے پیش کی: ”یہ سیاست اور تہذیب کا نمونہ ہے! اس کے بعد ہندوستانیوں کے مظالم کا ذکر ہم کس منہ سے کرتے ہیں؟“

”ہیلز ہیمپر“ کے اسی پرچے میں بغاوت سے متعلق مزدوروں کے رویے کی بھی دل چسپ حکایت تھی۔ تقریباً دوسو بے کمیشن افسر اور سپاہی چتھم اور راجسٹر کے شہروں میں مارچ کرتے ہوئے دکانیں دیے اور بہت سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا کیوں کہ یہ خوش و طبع جوانوں کا دستہ تھا۔ یہ حال ہی میں ہندوستان سے لوٹے ہیں۔ یہ دس سال کی خدمت کے معاہدے کے تحت بھرتی ہوئے تھے۔ چنانچہ اس مدت کے ختم ہوتے ہی انہوں نے سبکدوشی حاصل کر لی۔ دو پونڈ کے عطیے اور نئی مددی کی ترغیب کے باوجود انہوں نے مزید ملازمت سے انکار کر دیا۔

۲۹ اگست کو جوتوں نے فوجی صورت حال کا ایک اور جائزہ لیا۔ اُسے اب بھی امید تھی کہ بغاوت کا بیاب ہوگی۔ اس نے ”اس سانحہ کی حدود درجہ مصنوعی حالت پر محدود و محدود کا اثرات بیان کیے جس کا مدار ساکھ پر ہے، جب کہ ساکھ کا ملاسن دالان پر ہے۔ دوسری قومیں برطانیہ کی تجارتی برتری کو خطرے میں ڈال دیں گی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مزدور طبقے کو خوراک کی گرانی، قلیل آمدت اور تنگ دستی کا سامنا کرنا پڑے گا۔“

۵ ستمبر کو اس نے پھر اس بیان کو دہرایا کہ، ”بغاوت اتنی انصاف پر مبنی، اتنی برتر اور اتنی ضروری ہے کہ اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں کم ملتی ہے۔ حیرت اس بات کی نہیں کہ سترہ کروڑ لوگوں نے خصلے خٹوڑے خصلوں میں بغاوت کی بلکہ حیرت اس بات کی ہے کہ انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ وہ ہتھیار ڈالتے اگر اُن کے اپنے ہی حکمران اُن سے فدا رہی نہ کرتے۔ وہ یکے بعد دیگرے فیر کے ہاتھوں پک گئے۔ چنانچہ بادشاہ، والیالہ ریاست اور ابراہیمیشہ اسی ملک کے بدخواہ اور اس کے لیے باعث لعنت ثابت ہوئے جس کا انہوں نے ہر دور میں نیک کہا۔ اُس نے اس بات پر زور دیا کہ انگریز مزدور طبقے کو ”ہندو بھائیوں کے ساتھ ہمدردی ہونا چاہیے۔ ان کا مفاد تمہارا مفاد ہے اور ان کی کامیابی ہمارا واسطہ طور پر تمہاری بھی کامیابی ہے۔“

۱۲ ستمبر کو اس نے قلب و وقت کی طرف اشارہ کیا جو ہندوستان میں رونا ہونے والے

کے "سٹی پیج" (Steeple) میں ایک دہشتناک رائے کا اظہار تھا: "انگلستان کے بنک میں سونے چاندی کے ذخیرے میں مسلسل اضافے اور اچھی فصل کی توقع کے باوجود جو سرد بازاری صرافہ میں چھائی ہوئی ہے اس کی مثال نہیں ملے گی۔ ہندوستان سے متعلق تشریحات دوسرے تمام ائمہ پر غالب ہے اور اگر کسی سمجھوتے سے پہلے کل کوئی المناک خبر آجائے تو اس سے غالباً خوف و ہراس پھیل جائے گا۔" اس نے ملک و کنویر کی طرف سے میگم اودھ کے خیر مقدم پر بھی توجہ مبذول کی "اس سے پہلے باریالی کی اجازت کیوں نہیں دی گئی؟ کیا اس لیے کہ میگم اودھ ایسی خفیہ لغزش کی مرتکب ہوئی تھی جس سے بنگلہ دہلی کے اخلاقی سیار کو صدمہ پہنچا تھا۔ اب تخت سے معزول میگم کا استقبال ہو رہا ہے۔ میاں دار اخلاق بالائے طاق رکھ دیے گئے۔ بادشاہی فقیری کے ساتھ بے تکلف ہونے لگی۔ معاطے کی اصلیت یہ ہے: رشوت خوروں نے ایک شاہی خان دان کو اس کی میراث سے محروم کر دیا تھا (مال حرام بود بجائے حرام رفت) اور رشوت خوروں کے ملک کی ملک و معظفر نے ہندوستانی میگم کی طرف سے منہ موڑ دیا۔ اب اس کا بہت احتمال ہے کہ رشوت خوروں کا مال فینٹ چھن جائے۔ اس لیے ملک کو وہ بدر پھرنے والی میگم کی دلجوئی کرنے کی توفیق دی جا رہی ہے کیوں کہ لٹیروں کو امید ہے کہ آئے آلاکار بنایا جاسکتا ہے۔"

میگم اگست کو حوڑنے لکھا: "میں اس کے اپنے قارئین کو مشورہ ہی سے یقین دلا چکے ہیں یہ بغاوت فوجی فدر نہیں بلکہ قومی بغاوت ہے۔" اس نے پھر پرامید انداز میں لکھا کہ "اس سے باقاعدہ تیاری کے آثار ظاہر ہیں۔ کیا یہ محض کسی حکمران کے ساتھ جنگ ہے جو ہم بہت بار لڑ چکے ہیں؟ ہرگز نہیں یہ ایک قوم کے ساتھ جنگ ہے اور اس میں اتنے لوگ شامل ہیں جتنے کہ ہندوستان کے اندر کبھی ہمارے خلاف جنگ میں شامل نہ ہوئے تھے۔" اُس نے ان اشتعال انگیز خیالات میں اس تنبیہ کی آڑ لی کہ "باغیوں میں پھوٹ پڑنے کا امکان ہے اور ان سے غیر توقع امکان حرکت سرزد ہو سکتی ہے۔ ایک بات کا میں یقین ہے خواہ بغاوت دب جائے یا نہ دے یہ ہمارے ہاتھ سے ہندوستان کے نیکلے کامیٹل خیر ہے۔ ہمارا مشورہ یہ ہے، ہندوستانی قوم کی آزادی کو تسلیم کرو۔ سو سال ہوئے دنیا کی پھیری لگانے والے، لیڈن ہال اسٹریٹ کے تاجر لٹیروں کی ایک جماعت حیلے بہانے بنا کر چپکے سے سلطنتوں کے اس عظیم جھگڑے میں وارد ہوئی اور اس کا ہیرا (یعنی آزادی) چڑایا۔ اس سو سالہ عہد حکومت میں جرائم کے ہزاروں سال سنے ہوئے ہیں۔" اس نے تسلیم کیا کہ باغیوں نے بھی مظالم ڈھائے ہوں گے لیکن اس نے انگریزوں کی اشتعال انگیزی کا خاص طور سے ذکر کیا اور جنگ ہزیرہ نما (Peninsular War) کے دوران برطانوی فوج کے قتل عام کی یاد دلانی کہ اس وقت "ناٹھ" نے اس کی مذمت کی؟ نہیں، ایک لفظ

کا دن کیا ہے؟ اس کی وقعت محض ایک عیارانہ مذہبی رسم سے زیادہ نہیں۔ اس کا مقصد غریبوں کی الماریوں کو خالی کرنا اور اُن کے پیٹ پر پتھر باندھنا ہے۔

اُس نے ریلوے کمپنی کے اس اعلان پر تبصرہ کیا کہ "تفریحی گاڑیاں اتوار کے دن کی طرح چلیں گی تاکہ لوگ حسبِ خواہش کرشل پیلیس میں سپر جن کا مجمع دیکھنے یا گرین وچ کی سیر کے لیے جاسکیں۔" اس پرچے میں ایک خط بھی شایع ہوا جس پر دستخط کی جگہ یہ درج تھا "وقت سب کو آتا ہے" معلوم ہوتا ہے یہ خط جو تازے لکھا تھا۔ اس میں بنادت کے برطانوی مظلوموں کی مدد کے لیے امدادی فنڈ کا ذکر تھا۔ میں تنہا کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ اگر کوئی مزدور اس فنڈ کے لیے ایک پیسہ بھی چندہ دے گا تو یہ ایک جرم ہو گا۔ تمہیں غارت گری اور دغا بازی کے اس ابلیماء نظام سے کوئی سروکار نہیں جسے خود غرض احمقوں اور زمین تھبانے والوں کی ایک جماعت نافذ کیے ہو۔ چندہ کی وصولی ان لوگوں تک محدود ہونی چاہیے جن کے ہاتھوں میں ہندوستانی پرچہ دہلی ہندوستانی ہندیاں ہیں۔ ان لوگوں تک جنہوں نے ہندوستان پر فوج کشی اور ڈاکر زنی سے ہاتھ رنگے ہیں۔ جنگ کریمیا کے مصیبت زدگان کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اس کا مقابلہ اُس نے اُس سلوک کے ساتھ کیا جواب ایٹنگلو انڈین لوگوں کے لیے تجویز کیا گیا ہے۔ اُس نے ان بڑی رقوم کا بھی ذکر کیا جو شاہی خاندان اور اس کی شادیوں کے لیے ہتیا کی گئیں۔ "اس شاہانہ اور شاندار دولت و ثروت کا موازنہ اس فاقہ کشی کے ساتھ کرو جو اس ملک کے بدبخت اور خستہ حال تاجروں کی میراث ہے۔ غریب عوام۔ ذرا خیال کرو میاں بیوی کو ایک قلعے میں پھینک دیا جاتا ہے جسے یونین ہاؤس کہتے ہیں۔ جوں ہی وہ داخل ہوتے ہیں ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں۔ نوجوان بچوں کو میلوں دوں بھیج دیا جاتا ہے۔ انھیں جی کا پتلا دیا اور پانی سا شور باکھلایا جاتا ہے جو انسان کے کھانے کے لائق نہیں جیسا کہ پچھلے ہفتے سینٹ پینکراز کے محتاج خانے سے اطلاعات پہنچی ہیں۔" آخر میں اُس نے مزدوروں سے اپیل کی کہ وہ اپنا روپیہ سیاسی سرگرمی کے لیے محفوظ رکھیں۔ "اپنے گھر کی حالت دیکھو، اپنے مفادات پر توجہ دو۔ چندہ اکٹھا کرو اور منظم ہو جاؤ۔"

۱۹ اکتوبر کو اس نے مظالم پر بحث کرتے ہوئے اپنی رائے ظاہر کی کہ ان کے بیان میں "خوفناک مبالغہ" سے کام لیا گیا ہے لیکن "اگر وہ ثابت بھی ہو جائیں تو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ انھیں تصویر کا صرف ایک رخ دکھایا گیا ہے۔ امریکہ کی جنگ آزادی سے تعلق برطانوی دستاویز کو ذرا ذہن میں لائیں۔ ہم نے امریکی ہندوستانیوں کو بھرتی کیا اور فی سرائیک رقم مقرر کی۔ جتنے مرد، عورتوں اور بچوں کے سر وہ برطانوی کیمپ میں لائیں گے اس کے مطابق انھیں رقم ادا کی

واقعات کا نتیجہ تھا اور تجارت کے مستقبل کے بارے میں پائوس کن پیشگوئیاں کیں: "لغات کو دبانے کے اخراجات ٹیکسوں سے پورے کیے جائیں گے یعنی انگریز مزدور طبقے کی جیبوں سے" اس نے سوال کیا: "کیا انگریز مزدوروں کو اس رقم کی ادائیگی میں کوئی دل چسپی ہے؟ کیا ہندوستانی حکومت سے انھیں بھرتی کوڑی کا بھی فائدہ پہنچا ہے؟ انھیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ پھر فائدہ اٹھانے والے کون ہیں؟ امرا اور رؤسا، زمین دار اور سرمایہ دار یعنی طبقہ امرا کی اولاد جنھوں نے وہاں روپیہ اینٹنے، لوٹ مار کی اور جبر و ستم کی تعلیم حاصل کی۔ کیا ہم نے ہندوستان کو کنگال نہیں کر دیا جب سے یہ انجکستان کی ملکیت بنا؟ کیا ہم نے اسے برباد نہیں کیا اور اسے گدا گرنا کے نہیں رکھ دیا؟ ہوپار کی کیا حالت ہوتی اور ہندوستان کی منڈی کی کیا صورت ہوتی اگر ہم نے خود مختار حکومتوں کے ساتھ دوستانہ ملک کی حیثیت سے تجارت کی ہوتی؟"

اس مضمون میں اس نے ظلم و ستم کی داستانوں کے سلسلے میں بھی یہ سوال کیا: "اذیت رساں کون ہیں؟" اس نے ۱۸۵۵ء میں مدراس میں مظالم کے مینہ سبب کی تحقیقات کرنے والے کمیشن کی شہادت کا آرٹیکل کے ایک اخبار سے حوالہ دیا۔ —

۱۹ ستمبر کو اس نے اس بات کا جواب دیا کہ اس کا رویہ غلط فہمی پر مبنی ہو سکتا ہے۔ اس نے کہا: "جمہوریت میں استقامت ضروری ہے۔ خدا بلا شبہ حق اور انصاف کا طرفدار ہے اور انسان کو بے شک حق اور انصاف کا طرفدار ہونا چاہیے۔ کوئی انسان یہ نہیں کہہ سکتا: میں انگریز کے ساتھ ہوں اور ہندوستان کا مخالف ہوں! اگر وہ یہ کہتا ہے تو وہ سراسر جھوٹ بولتا ہے۔ نہ صرف اپنے خلاف بلکہ اصول کے خلاف، سچائی کے خلاف اور عزت کے خلاف۔ اگر ہندوؤں کا ساتھ دینا ایک غیر انگریزی فعل ہے تو ظلم کو ششی، سفاکی اور فوج کشی کی حمایت کرنا اس سے زیادہ غیر انگریزی حرکت ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ انجکستان بدلے بلکہ اپنی آواز انگریز عوام کی آواز ہوگی دوسروں تک پہنچائے اور چیخ کر کہے کہ: حق حق ہے اور سچائی سچائی! حق ہندوؤں کی طرف ہے۔ خدا کرے فتح بھی ان کا ساتھ دے! انگریز قوم اتنی بندہ مت اور طاقت ور ہے کہ وہ اپنی انگلیوں اور اپنے عمل میں انصاف پسند اور یک رنگ ہو سکتی ہے۔"

۲۴ اکتوبر کو جوئرنے آنے والے روزے اور شفاعت کے قومی دن پر طنزاً یہ لکھا: "روزے (بچہ حاشیہ متعلقہ روزہ شفاعت و روزہ: تیر بارش کا سنسان دن تھا۔ مزدور طبقے کے لوگ روزہ رکھتے تھے وہ بھی خوشی سے نہیں بلکہ مجبوراً کیونکہ وہ اس دن اپنی روزی نہیں کھا سکتے تھے وہ منہم و مجبور گلیوں میں پھرتے تھے اور ایسے کلمات نکالتے تھے جو مناجات کے عین برعکس تھا: نیو کاسل کزنیکل، ۱۰ اکتوبر ۱۸۵۷ء)

تھے۔ پھر وہ اپنے زرعی آلات گرو رکھنے پر مجبور ہو گئے۔ اس کے بعد سختی سے وصول کرنے والی برطانوی سرکار کو واجب الادا رقوم ادا کرنے کے لیے انھیں بیجوں کا غلہ فروخت کرنا پڑا جس سے وہ بھکاری بن گئے۔ انھیں یاد ہے کہ جب کاشتکاری ناممکن ہو گئی تو انھوں نے کھیتوں سے دست بردار ہونا چاہا کیوں کہ وہ کھیتی باڑی کے قابل نہیں تھے لیکن دراصل انھیں اس زمین کا ٹیکس بھی ادا کرنے پر مجبور کیا گیا جس میں انھوں نے کبھی بھی کاشت نہ کی تھی۔ انھیں یاد ہے کہ جب وہ اپنے دوستوں سے قرض لینے میں ناکام رہتے تو کس طرح انھیں اذیت دی جاتی۔ کس طرح انھیں دن کی جھلنے والی گرمی میں پاؤں کے تلوں سے لٹکایا جاتا یا ٹانگوں کے ساتھ پتھر باندھ کر انھیں سر کے بالوں سے لٹکایا جاتا۔ کس طرح ان کے ناخنوں کے اندر تیز لکڑی کی پچریں ٹھونکی جاتیں۔ کس طرح باپ بیٹے کو اکٹھا باندھ دیا جاتا اور ایک ساتھ انھیں کوڑے لگائے جاتے تاکہ ایک کی اذیت سے دوسرے کا درد بڑھے۔ کس طرح عورتوں کو چابک سے پیٹا جاتا اور ان کے پستانوں سے پتھو باندھ دیے جاتے۔ کس طرح ان کی آنکھوں میں سرخ مرچیں ٹھونسی جاتیں یہ سب چیزیں انھیں یاد ہیں۔ اور یہ دراصل اس کی عرضداشت، کمشنروں کی سرکاری رپورٹوں اور برطانوی پارلیمنٹ میں ثابت ہو چکی ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں بھولے کہ کس طرح پولیس ان کے پیچھے لگا دی گئی۔ اس کی تنخواہ اس قدر قلیل تھی کہ وہ لوٹ مار سے اپنا گزارہ کرتی۔ ان قانون کے محافظوں کو چھوہ بننے پر مجبور کیا گیا اور پھر برطانوی سرکار اس نظام سے چشم پوشی کرتی۔ ۱۲ جون کو اس نے لکھا: ”ہمدردی کی سنہری کڑی ٹوٹ گئی ہے۔ ایسی خلیج کو خون اور فولاد نہیں پاٹ سکتے جسے حکومت کی بد نظمی، ظلم اور جبر نے پیدا کیا ہے اور جو آتی وسیع ہے جتنا انگلستان اور اس کی سلطنت کے درمیان فاصلہ ہے۔“ ۱۹ جون کو اس نے اپنے اس دعوے کو دہرایا کہ ”ساری قوم ہمارے خلاف ہے۔“

بغاوت کے آخری مرحلے کے دوران ”دی پیپلز پیپر“ کی مالی مشکلات بڑھتی گئیں۔ جون ۱۸۵۸ء میں اس اخبار نے دم توڑ دیا۔ اگرچہ کچھ دنوں کے لیے اس کی بجائے شایع ہونے والے اخبار ”لندن نیوز“ میں جونز کو پاؤں ٹیکنے کی جگہ مل گئی لیکن اس اخبار کو ہمیشہ مشکلات کا سامنا رہا۔ اس کا بچہ کم جنگ جویانہ ہو گیا اور جلد بند ہو گیا۔ البتہ اس میں جونز کے کچھ مضامین ہندوستان کو گول کی حمایت میں شایع ہوتے رہے۔ اس کا آخری مضمون ۱۵ اگست ۱۸۵۸ء کو شایع ہوا جب اس نے انڈیا بل کے تحت ہندوستان کی نئی صورت حال پر بحث کی۔ اس بل کی رو سے انتظام حکومت کی ذمہ داری کینی سے پارلیمنٹ کو منتقل ہو گئی۔ اس نے بتایا کہ پہلے ہندوستان اور رائے عامہ کے مابین

جائے گی۔ ہم اچھی طرح جانتے تھے کہ اُن بد بخت مظلوموں کو کیسی ہولناک اذیت کے ساتھ موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ یہ قرون وسطیٰ کا کام نہ تھا بلکہ موجودہ دور میں کیا گیا جس کی یاد ابھی تازہ ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ”انگریزوں نے ہندوستان میں ہلاکت کا ایسا دہشتناک طریقہ ایجاد کیا ہے جس کے تصور سے ہی انسان کا پنہ لگتا ہے۔ اُن رحمدل عیسائیوں کو ایک مذہب ترکیب ہو چکی ہے۔ وہ زندہ انسانوں کو توپوں کے منہ پر باندھ کر ان کے پرچے اڑا دیتے ہیں۔ خون کی بارش ہوتی ہے، انسانی گوشت اور انٹریوں کے لوتے ہوئے ٹکڑے تماشائیوں پر برستے ہیں۔ اس کام میں تو انھوں نے نیرو کو بھی مات کر دیا ہے۔ یہ اُس انسانی جسم کی تباہی ہے جسے اہل نگر جا کے قول کے مطابق خدا تعالیٰ نے اپنا مشاہیر بنایا۔“

۲۱ اکتوبر کو اُس نے مظالم کے سوال پر پھر بحث کرتے ہوئے کہا: ”باغی غدر کے آغاز سے انجام تک اپنے طرز عمل میں عین اپنے مذہب حکمرانوں کے نقش قدم پر چلے۔“

۱۴ نومبر کو اس نے ”ہندو سپاہ کی بہادری اور جاناہزی کی دوبارہ داد دی۔“ ۲۱ نومبر کو اس نے تنبیہ کی کہ ”خونریزی کا نتیجہ خونریزی اور ظلم کا نتیجہ ظلم ہے۔“ ۵ دسمبر کو اس نے اپنے قارئین کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ ہندوؤں کی کامرانی کی امید ترک کرنے کی کوئی وجہ نہیں لیکن اب برطانوی شہنشاہیت پر کامیاب ضرب کی توقع ماند پڑنے لگی۔ اب بغاوت کا ذکر پہلے کی نسبت کم ہونے لگا۔ ۳۰ اپریل ۱۸۵۸ء کو اس نے ہندوستان قوم پرستی اور برطانوی جارحیت کے درمیان آخری جدوجہد کا ذکر کیا لیکن ۱۰ اپریل کو اس نے جو اشارہ ہندو بھائیوں کی کامیابی کی امید کی طرف کیا اُس کا تعلق فوری امکان سے نہ تھا بلکہ مستقبل کے امکان سے۔ اس نے لکھا: ”وہ وقت زیادہ دور نہیں جب ہندوستان کی عظمت کی ترقی برطانوی حکومت کی غلامی سے اس کی آزادی اور کامل خود مختاری کے عین مطابق ہوگی۔“ یکم مئی کو اس نے اعلان کیا کہ بغاوت کا نتیجہ خواہ کچھ ہو ہندوستان انگلستان کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ ۸ مئی کو اس نے لکھا کہ اگر ہم دوبارہ ہندوستان کو فتح کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس قدر صلح جول سے کام لینا ہوگا جس قدر جنگ جول سے لوگ مافی کو یاد رکھتے ہیں اور جہاں تک ہمارا تعلق ہے وہ مستقبل سے ڈرتے ہیں۔ انھیں یاد ہے کہ ہم نے انھیں زمینوں سے جبراً محروم کیا۔ انھیں یاد ہے کہ زمین کے مالکان مطلق کی جاگیریں ضبط کر لیں اور انھیں وہی زمینیں ہم سے پتہ پر لینے پر مجبور کیا گیا جو زائد قدیم سے معمولی لگان پر ان کی ملکیت تھیں۔ انھیں یہ بھی یاد ہے کہ اُن کی زمینوں پر اس قدر ٹیکس لگائے گئے جو وہ ادا کرنے کے قابل نہ

کو آزادی حاصل کرنے سے پہلے غیر ملکی غلامی کے سوسال گزارنے تھے۔ ہندوؤں کی صد سالہ یادگار کے اس سال اس بات کا اعادہ ضروری ہے کہ اس اذیت اور شکست کی گھڑی میں برطانوی مزدور طبقے کی آواز خاموش نہیں تھی۔

حواشی

- ۱۔ اندراج، یکم مئی ۱۸۵۷ء
- ۲۔ ۲ دسمبر ۱۸۵۷ء
- ۳۔ ۷ اکتوبر ۱۸۵۷ء
- ۴۔ ۸ اکتوبر ۱۸۵۷ء
- ۵۔ جان مارٹے: "لائف آف کابڈن" جلد دوم صفحہ ۲۰۵۔ ایش ورتھ کے نام خط مورخہ ۱۶ اکتوبر ۱۸۵۷ء
- ۶۔ چارلس کنگسٹے: "ہیریٹز اینڈ میاں آف ہز لائف" مرتبہ بیوی، جلد دوم صفحات ۲۴-۲۵
- کنگسٹے سے مارٹس کے نام ۳۰ ستمبر ۱۸۵۷ء
- ۷۔ ۲۱ ستمبر ۱۸۵۷ء
- ۸۔ ایضاً
- ۹۔ این۔ ڈی۔ مارٹس: "دی انڈین کرائس"؛ پانچ و عطا صفحہ ۱۰
- ۱۰۔ جے۔ ایم۔ لڈلو، "اتھائس آن نکاپالیسی آف دی کرائون ٹوودس انڈیا" ۱۸۵۹ء صفحہ viii
- ۱۱۔ مارٹے، بحوالہ تصنیف
- میس بیگنوبان: "انگلش ریڈیکلز" جلد دوم صفحہ ۳۶۶
- ۱۳۔ ۲۳ اگست ۱۸۵۷ء
- ۱۴۔ ۷ اکتوبر ۱۸۵۷ء
- ۱۵۔ ۹ اکتوبر ۱۸۵۷ء
- ۱۶۔ ۱۶ ستمبر ۱۸۵۷ء
- ۱۷۔ "میریٹل ڈائری" مرتبہ فلپ وٹ ویل وکسن جلد دوم صفحہ ۵۶۳
- ۱۸۔ "میریٹل" ۲۰ اکتوبر ۱۸۵۷ء
- ۱۹۔ "دی ٹائمز" ۷ جنوری ۱۸۵۷ء ۲۰ فروری ۱۸۵۷ء

کپنی حائل تھی۔ اب کم از کم مفروضہ طور پر اور علا بھی سب کچھ بدل گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر رائے عامہ کو سوجھ بوجھ اور استعدادی کے ساتھ استعمال کیا جائے تو ہندوستان کے معاملات میں پہلے کی نسبت یہ زیادہ موثر ہو سکتی ہے لیکن کیا ایسا ہو گا؟ کیا یہ عظیم قوم اس ذمہ داری کی وقعت کو سمجھے گی اور اس کی قدر کرے گی جو اس نے قبول کی ہے؟ اب محتاط مطالعے اور مستقل نگرانی کی ضرورت پڑے گی۔ پہلا قدم اس سناکانہ اور اندھا دھند شہتی کو روکنا تھا جو ہندوستانیوں پر روا رکھی جاتی تھی۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اُن انگریز باشندوں کو روکنا چاہیے جو وہاں آباد نہیں ہوتے بلکہ صرف اس لیے جاتے ہیں کہ غریب لوگوں سے جو کچھ ممکن ہو انٹھ لیں۔

جوئرنے: صرف مضامین لکھے بلکہ جلسوں سے بھی خطاب کیا۔ ۱۲ اگست ۱۸۵۷ء کو اس نے "اتنے بھاری جلسے میں تقریر کی کہ شاید ہی کبھی سینٹ جارج ہال، لندن میں منعقد ہوا ہو"۔ ۵۵ دسمبر میں اس نے سینٹ مارٹن ہال میں تقریر کی۔ اس نے کہا: "ایک لمحہ کے لیے بھی آپ یہ سمجھیں کہ میں اس طریق کو تسلیم کرتا ہوں جس سے ہندوستان کی حکومت حاصل کی گئی یا اُن تھکنڈوں کو جن سے اُسے قائم رکھا گیا۔ میں اُسے ایک ہندب ملک کی تاریخ میں شروع سے آخر تک ایک فیج ترین جرم تصور کرتا ہوں"۔ ۵۶ جوری ۱۸۵۷ء میں اس نے لندن میورن میں منعقدہ ایک جلسے میں تقریر کی جہاں لوگوں نے پُرانے چارٹس جان فراسٹ کی تقریر سننے سے انکار کر دیا۔ اس (جوئرنے) نے کہا: "اگر وہ ایسٹ انڈیا کمپنی سے اختیارات چھین کر سرکار برطانیہ کے حوالے کریں گے تو وہ یہ اختیارات بدتر افراد کے ہاتھوں کے سپرد کریں گے"۔ ۵۷ اس نے اپریل ۱۸۵۷ء میں برنگیم میں بھی تقریر کی۔ ۵۸ کوپن ہیگن فیلڈز یعنی مقام موجودہ سمٹھ فیلڈ میٹ مارکیٹ میں کھلے جلسے منعقد ہوئے جن سے متعلق ایک یادداشت میں قلمبند ہے۔ "میں لندن کے ایک دور دراز حصے سے چل کر گیوں میں میلوں کی مسافت طے کرتا ہوا اس کی تقریر سننے وہاں پہنچا۔ یہ ہندوستانی غدر کے دنوں کا واقعہ تھا۔ پُرانا جوش اور پُرانی فضا اب بھی نمایاں تھی۔ لیکن اس کا چہرہ پڑردہ اور کپڑے تار تار تھے جن سے اس کا رنج و الم ظاہر تھا۔ پھٹا پڑا کوٹ گلے تک بٹنوں سے بند اس کی مفاسی کا پردہ دار تھا۔ وہ ایک کھوئے ہوئے مقصد کے ساتھ اپنی وفا دارانہ وابستگی کے سبب اس ناداری کی نوبت کو پہنچا تھا"۔ ۵۹

یہ بازی ہاری ہوئی نہیں تھی، ہمار صرف عارضی تھی۔ برطانوی مزدور طبقے کو اپنے اُن آقاؤں کے ساتھ تعاون کے ایک دور سے گزرنا تھا اور ان کے دسترخوان پر آراستہ لذیذ اور نفیس کھانوں کے گرے ہوئے مکروں کو چھٹا تھا جنہوں نے آدھی دنیا کو لوٹا تھا۔ ہندوستانیوں

- ۴۵۔ لارڈ کیننگ سے بنام ملکہ وکٹوریہ ۳۰ جولائی ۱۸۵۷ء
- ۴۶۔ پرنس البرٹ سے بنام پرنس ولیم آف پرنشیا ۳۰ جولائی ۱۸۵۷ء
- ۴۷۔ "دی ٹائمز" ۱۹ اگست ۱۸۵۷ء
- ۴۸۔ "لنڈن کاسن ویل" یکم مارچ ۱۸۵۷ء
- ۴۹۔ ۲۶ جولائی ۱۸۵۷ء
- ۵۰۔ ۶ دسمبر ۱۸۵۷ء
- ۵۱۔ ۱۱ اکتوبر ۱۸۵۷ء
- ۵۲۔ ایضاً
- ۵۳۔ ملاحظہ فرمائیں "ارنٹ جوتز: چارنٹ" انتخاب تحاریر و تقاریر جوتز مع تعارف و حواشی۔ مرتبہ جان بیول۔
- ۵۴۔ "پبلیش پیپر" ۷، ۱۳، ۲۱، ۲۸ مئی، ۱۱ جون، ۲ جولائی ۱۸۵۷ء
- ۵۵۔ ایضاً ۱۵ اگست ۱۸۵۷ء
- ۵۶۔ ایضاً ۱۹ دسمبر ۱۸۵۷ء
- ۵۷۔ ایضاً ۲۳ جنوری ۱۸۵۷ء
- ۵۸۔ ایضاً ۱۰ اپریل ۱۸۵۷ء
- ۵۹۔ ڈبلیو۔ ای۔ ایڈمز، "مہارز جلد دوم صفحہ ۲۲۰۔ منقول بتصنیف میر"

- ۲۰۔ ڈیرک ہڈسن : "مارٹن پٹر" ہزار ہا ایزد خاں" صفحہ ۱۸۵
- ۲۱۔ ایضاً صفحہ ۱۸۶ شیخ فخری سے پٹر کے نام ۱۰۰ ارنو بر ۱۸۵۶ء
- ۲۲۔ مارٹے : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۰۸
- ۲۳۔ جی۔ ایم بڑیولین : "لائف آف جان برائٹ" صفحہ ۲۶۱
- ۲۴۔ ایٹن۔ ڈی۔ مارٹس : بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۱
- ۲۵۔ "ہاؤس آف کامنز" ۲۷ جولائی ۱۸۵۷ء
- ۲۶۔ ۲۹ جنوری ۱۸۵۶ء
- ۲۷۔ ۴ فروری ۱۸۵۶ء
- ۲۸۔ ۶ اگست ۱۸۵۷ء
- ۲۹۔ ۲۹ ستمبر، ۵ اکتوبر، ۷ اکتوبر ۱۸۵۷ء
- ۳۰۔ ۶ اکتوبر ۱۸۵۷ء
- ۳۱۔ ۸ اکتوبر ۱۸۵۷ء
- ۳۲۔ ۵ ستمبر ۱۸۵۷ء
- ۳۳۔ ۷ جولائی، ۷ اگست، ۲۳ اکتوبر ۱۸۵۷ء
- ۳۴۔ ۲۷ جون، ۳۰ جون، ۲۷ جولائی ۱۸۵۷ء
- ۳۵۔ "ڈی ٹائمز" ۲ نومبر ۱۸۵۷ء
- ۳۶۔ پیتر تھ : ۲۹ اکتوبر ۱۸۵۷ء
- ۳۷۔ "ویکی ڈیپٹیج" ۲۳ اگست ۱۸۵۷ء
- ۳۸۔ ۲۹ جون ۱۸۵۷ء
- ۳۹۔ یکم جولائی ۱۸۵۷ء
- ۴۰۔ ۲۰ نومبر ۱۸۵۷ء
- ۴۱۔ "ویکی ڈیپٹیج" ۲۶ جولائی ۱۸۵۷ء
- ۴۲۔ "ہاؤس آف کامنز" ۲۷ جولائی ۱۸۵۷ء
- ۴۳۔ ملک وکٹوریہ سے بنام کنگ لیپڈ، ۲۰ ستمبر ۱۸۵۷ء
- ۴۴۔ ملک وکٹوریہ سے بنام لارڈ پان یور، ۲۹ جون ۱۸۵۷ء

اخلافات کے باوجود فرانسیسی اخبارات بعض نکات پر متفق رائے تھے مثلاً برطانوی جبر و تشدد کی بے رحمی کی مذمت کے بارے میں۔

”لایسبل“ نے جس پرائگریز کا حامی ہونے کا الزام تھا، ارنو برشرے کو لکھا: ”بد قسمتی سے اس بات کی تصدیق ہو چکی ہے کہ دہلی پر قرضہ کے بعد ہونٹاک کشت و خوں ہوا۔ ہیں ان وحشیانہ اعمال کی مذمت کرنے میں کوئی تامل نہیں جو سپاہیوں کے کسی بھی جرم کی بنا پر حق بجانب نہیں ٹھہرائے جاسکتے۔“ ایک حوامی اخبار ”لیس تائفیت“ نے ۲۹ اگست ۱۹۵۷ء کو غیظ و غضب کے ساتھ اعلان کیا: ”اگر انگریز جبر و ستم کی پالیسی پر متصر رہیں گے تو بڑی طاقتوں بالخصوص فرانس کو مداخلت کرنی پڑے گی کہ ہندوستان کے لوگوں کو مولیشیوں کے ایک حقیر گٹھ کی طرح ذبح نہ کیا جائے۔“

فرانسیسی اخبارات نے اتفاق رائے سے ایٹم انڈیا کمپنی کی بد اعمالیوں اور برطانوی آباد کاروں کے آن طور طریقوں کی بھی مذمت کی جو ان کے خیال میں بغاوت کے ذرہ دار تھے۔ مصلحت اندیش ”ریوودا داکس مانڈے“ نے لکھا ”کمپنی کو غلامی کے جتنے کو ڈھیلا کرنے کی مطلق فکر نہیں۔ بالخصوص پچھلے دس سالوں میں اس نے بہت ہی بڑے پیمانے پر الحاقات، بے دخلیوں اور ضبطیوں کا دور چلیا ہے۔ اُس نے بند و بست آراضی کا طریقہ بدل دیا ہے اور تمام رگی سعادوں کو ناکارہ کر دیا ہے۔“ ”لیس تائفیت“ نے اور بھی زیادہ زور کے ساتھ لکھا: ”کیا ہندوستان قابل نفرت انگریزی غلبہ کے تحت ایک نو آبادی ہے؟ نہیں، انگریزوں نے اُسے ایک بہت بڑا قید خانہ بنا دیا ہے جہاں جا بجا پھانسیاں اور سویوں کے تحت نصب کیے گئے ہیں۔“ ”فائویل خاص طور پر برطانوی مشنریوں کے ہندوستان کو عیسائی بنانے کے جوش کی مذمت کرتا ہے اور کہتا ہے: ”انگلستان میں اب لوگوں پر یہ حقیقت آشکار ہونے لگی ہے کہ مشنریوں کی ناقصیت اندیشی بہت حد تک اشتعال کا سبب ہے۔“

فرانسیسی اخبارات نے عام طور پر اس خیال کو پھیلایا کہ برطانیہ کو بغاوت سے سخت دھکا لگا ہے اور اس سے اُس کو کافی اخلاقی اور مادی نقصان پہنچے گا۔ مثلاً ”لایونین“ کی رائے: ”برطانیہ عظمیٰ نے پچھلے پچاس برسوں میں عالمی معاملات میں جو اعلیٰ پارٹ ادا کیا ہے اس میں لازمی طور پر کمی آئے گی۔“ ”جاگوئی ایسٹائیل“ نے ”ریوودا پاری“ میں اس تصویر کے نقوش کو اور نمایاں کیا: ”مسطحینہ میں برطانوی اثر و سونخ کم ہو رہا ہے۔ سویز میں اس کے سر پر خطرہ منڈلا رہا ہے۔ ایران میں ایک مسلح امن کی کمی صحت ہے جس سے جنگ کا خطرہ درپیش ہے۔ چین میں یہ مطمئن و مطمئن ہے۔ ہندوستان میں یہ دھمکنا رہی ہے اور ترکی بغلیں، بجا رہا ہے۔ تمام مشرق میں انگلستان کا وقار خاک میں مل رہا ہے۔“

چارلس فورمین

ہم عصر فرانسیسی پریس

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بارے میں فرانسیسی عوام کے تاثرات کو قلمبند کرنا کوئی سہل کام نہیں۔ اولاً یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اُس وقت فرانس ایک تحکمانہ شہنشاہی حکومت کے تحت تھا۔ لوگوں کو پبلک جملے منعقد کرنے کا حق حاصل نہ تھا۔ پریس پابندیوں میں جکڑا ہوا تھا جس میں بعض مختلف سیاسی خیالات کے جمہوری رسائل بھی تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی مزدور طبقے کے نظریات کا ترجمان نہ تھا، دوسرے ہندوستان سے بہت کم خبریں آتی تھیں اور جو خبریں آتی بھی تھیں وہ یا تو برطانوی ذرائع سے یا ہندوستان میں مقیم فرانسیسی آبادکاروں سے۔ یہ بھی واقعات کی تازہ خبریں نہ ہوتی تھیں۔ مثال کے طور پر مئی کی بغاوت کی خبریں فرانسیسی اخباروں میں صرف جون کے آخر میں شائع ہوئیں۔ اس پر طرہ یہ کہ ہندوستان سے متعلق فرانسیسیوں کا علم بہت محدود تھا۔ اُس وقت فرانس میں ہندوستان پر چند ایک کے سوا جو مقالات شائع ہوتے تھے، ان میں ہندوستان کی دولت، اس کے دیوتاؤں اور اس کی ایشیائی ذہنیت وغیرہ کے متعلق پرانی روایتی داستانوں کا اعادہ ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرانسیسی علما ہندوستان کو اپنے برطانوی ساتھیوں کا مخصوص دائرہ اختیار سمجھتے تھے۔ کم از کم فینشل لائبریری کے ایشیا سے متعلق شعبے اور "دی ریویو آن ہسٹریک کوائسٹن" (The Review on Historic Questions) کے مضامین کی تحقیق سے ہم اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ ہندوستان سے متعلق کتابوں کی قابل ذکر تعداد صرف بیسویں صدی کے اوائل میں شائع ہونا شروع ہوئی۔

البتہ فرانسیسی پریس نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت پر کافی توجہ دی۔ مثال کے طور پر ایک آزاد خیال رسالہ "لا سیسل" (Le Siecle) نے ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو لکھا: "ہندوستان کی بغاوت اس وقت کا واحد اہم واقعہ ہے۔"

تھے کہ بغاوت کی تہ میں روسی ایجنٹوں کا ہاتھ ہے۔ اس کے برعکس "ریو و دی پارے" یا "لیس تافیت" کے جمہوریت پسندوں نے یہ رائے ظاہر کی؟ اس امر کی تصدیق ہو چکی ہے کہ مذہب کا سوال تو محض ایک بہاد تھا۔ اصلی سبب قوم پرستی کے عام جذبہ کی ازبر توجہ داری ہے۔ (۲ اکتوبر، ۱۸۵۶ء)

"جنرل وادی بیت" کے خلاف بحث کرتے ہوئے اسی جریدہ نے لکھا: "اب سوال یہ نہیں ہے کہ آیا تمام ہندوستانی کم و بیش ہندو یا کم و بیش متحد ہیں یا نہیں، بلکہ سوال یہ ہے کہ آیا گاندھرتہ بغاوت کمیٹی کی زیادتیوں کا رد عمل تھی یا واقعی ایک قومی بغاوت؟"

"لایسٹل" پر نکتہ چینی کرتے ہوئے جس کا یہ دعویٰ تھا کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد ہندوستانی آپس میں لڑنا شروع کر دیں گے "لیس تافیت" نے یہ دنگل شکن جواب دیا: "یہ ہندوستانیوں کا اپنا کام ہے۔ بہر حال یہ حیرت کا مقام ہے کہ ایک جمہوریت پسند جریدہ غیر ملکی حکومت کے گٹن گائے۔" اس کے علاوہ اس شخص اصولی نظریہ کا ملار دوسرے اخبارات کی نسبت ہندوستان کے تاریخی حقائق، بالخصوص برطانوی شہنشاہیت پرستی کے زیادہ سنجیدہ علم پر تھا۔ مثال کے طور پر مذکورہ ذیل سطور ملاحظہ فرمائیں: "انگلستان کو دولت چاہیے۔ برطانیہ نے جس لیے اور جس طرح فتوحات حاصل کیں اس کی یہ وجہ ہے۔ اسی لیے الحاقات جن سے ہندوستان کے دل کو ٹھیس لگی، ایران کے ساتھ انگریزوں کی جنگ کا موجب ہوئے۔ اسی لیے ہندوستان کی پیداوار جہاں بعض صوبوں میں پوست کے کھیت بکثرت موجود ہیں، وہی وجہ ہے کہ اینگلو انڈین سلطنت پر متواتر حملے انگلستان کو روسی سلطنت کے روبرو لاکھڑا کرتے ہیں (اچھ دا جانگوی ابراہانتویل، "ریو و دی پارے" ۱۸۵۶ء "ایفیئر دا انڈی") اسی انداز میں "لیس تافیت" اعتدال پسند جرائد کی اس خام خیالی کی مذمت کرتا ہے کہ سارے یورپ کا مفاد ہندوستان پر برطانوی حکومت کے قائم رہنے میں ہے۔ اگر ہندوستان برطانیہ کے ہاتھ سے نکل جائے تو کیا یہ دولت مند یورپ سے بچ جائے گا؟ اگر ہندوستانی آزادی حاصل کر لیں تو وہ یورپی طاقتوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے میں دیر نہیں کریں گے۔ یہ یورپی ممالک سارے ساحل کے ساتھ ساتھ اپنی ایجنسیاں قائم کریں گے اور آسانی سے اندرون ملک کے ساتھ تجارتی تعلقات پیدا کر لیں گے۔ اس صورت میں اس پر کسی کا غلبہ نہ ہو گا اور ہندوستان جس طرح مناسب سمجھیں گے خود حکومت کریں گے۔"

چنانچہ ۱۸۵۶ء کے جمہوریت پسند برطانوی شہنشاہیت پرستی اور اس کی تباہ کاریوں کے

برطانیہ کے ساتھ معاشی اور نسلی یک جہتی پر زور دینے کے علاوہ فرانسیسی متوسط طبقے کی رائے کو ظاہر کرنے والے اُن تمام مختلف اخبارات کا یہ خیال تھا کہ ہندوستانی حکومت خود اختیاری کے قابل نہیں ہیں اس لیے اُن کی بہبودی اس میں ہے کہ وہ فیصلہ کی سرپرستی میں رہیں۔

یک جہتی کا یہ رویہ بغاوت ہند کے انگریز مظلوموں کے لیے چندہ جمع کرنے کی سرکاری مہم میں ظاہر ہوا۔ یہ مہم ناظم پولیس کی سرپرستی میں مانٹا لامبر کی اس نظم سے شروع ہوئی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی مدح میں لکھی گئی تھی۔ اس کے علاوہ لاپاؤن نے ستمبر ۱۸۵۷ء میں لکھا: "ہندوستان میں برطانوی سلطنت کے خاتمے کا مطلب ہوگا تہذیب پر وحشت کی فتح"۔ ہر اکتوبر کو جنرل وادی بیت نے اس امید کا اظہار کیا کہ "دوسرا تہذیب کے مفاد میں" اس خوفناک بحران میں برطانیہ عظمیٰ کو فتح حاصل ہوگی۔

اُن قدامت پسند اخبارات نے برطانیہ پر جس نکتہ چینی کا اظہار کیا وہ باغی سپاہیوں کے ساتھ ہمدردی کا نتیجہ نہ تھی۔ یہ نکتہ چینی کچھ تو فرانسیسی رائے کی عکاسی تھی جو انگلستان کے ساتھ ہمدردی پر مبنی نہیں تھی۔ ۲ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو "جنرل وادی بیت" نے اس نامعقولیت کا ذکر کیا جو اس وقت بظاہر انگلستان سے منسوب تھی۔ اس کے علاوہ انگلستان کے خلاف کچھ کینز بھی تھا جس کا اظہار دُپتے سے متعلق گفتگو میں ہوتا تھا اور اُس وقت اس کا عام چرچا تھا۔ اور پھر اس حقیقت کے پیش نظر کہ اس وقت فرانس کے قبضے میں صرف ایک بڑی نوآبادی (الجیریا) تھی، فرانسیسی اخباروں کے لیے آباد کاری کی بالعموم مذمت کرتا آسان تر تھا۔

البتہ سرکاری اخبارات عام طور پر انگلستان کے ساتھ اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے بیتاب تھے۔ "پری دوست پیرا دل" نے ہر نومبر ۱۸۵۷ء کو "جنرل وادی بیت" میں لکھا: "انگلستان ہمارا ساتھی ہے۔ اتحاد کے ٹوٹ جانے کا خطرہ مول لے کر ہمیں انگلستان کی مشکلات سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے"۔ حریت پسند اخبارات میں نوآبادیاتی لوگوں کے حق میں سرپرستی ان دوستی کے دعوے موجود تھے۔ ان لوگوں کو ادنیٰ درجے کے بھلا سمجھا جاتا تھا۔ اس بات کے حامی کیسٹوک اخبارات ہندوستانیوں کے لیے کوئی ہمدردی نہ رکھتے تھے لیکن ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو پریڈنسٹنٹ انجیلینڈ پر ایک زبردست چوٹ سمجھتے تھے۔

اعتدال پسند یا رجعت پسند اخبارات کے مقابلے میں فرانسیسی جمہوریت پرست بغاوت سے پہلے ادبا غیوں کی سرکوبی کے دوران انگریزوں کے جرائم کی زیادہ جوہش کے ساتھ مذمت کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اعتدال پسند برائے سنجیدگی کے ساتھ برطانیہ کے اس من گھڑت قصے پر بار کرتے

شایانِ شان مقام اور اکثر گنج بعد آورد بھی حاصل ہوتا ہے۔۔۔“
اسی طرح فقط فرانسیسی جمہوریت پسندی ہندوستان کی تحریک سے متعلق کچھ قابلِ اعتماد واقفیت ہم پہنچاتے ہیں۔

جانکوی ایرآنتویل اس خیال کو اصرار کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں جمہوری قوتیں موجود تھیں۔ وہ دراصل پنچائیتیں تھیں۔ میونسپلٹی جو جاگیردارانہ نظام کے تحت قائم رہی ہے، مغلوں کے عہد کی میراث ہے اور انگریزوں نے اسے برقرار رکھا ہے۔ اس کی رلے کے مطابق یہی قوتیں باغیوں کی فتح کی امید دلاتی ہیں۔

کسی اور جگہ اسی مصنف نے ”لیس تافیت“ کے نام ایک خط میں لکھا:
”نوجوان فرانس اور نوجوان جرمنی کی طرح نوجوان ہندوستان بھی ہے۔ یہ نوجوان ہندوستان شہری اور سیاسی آزادی اور مذہبی رواداری میں اعتقاد رکھتا ہے۔ وہ اصول جن سے یہ نوجوان ہندوستان پیدا ہوا ہے، یورپ کی اٹھارویں اور انیسویں صدی کے اوائل کے اصول ہیں۔ اس زمانے کے ایک مہمصر راجہ رام موہن رائے نے فلسفہ پرست انگلستان اور فلسفہ پرست اور انقلاب پسند فرانس کا سفر کیا۔ وہ وہاں سے ایک ”ایمان“ لے کر لوٹا۔“

فانویل مذکورہ بالا کتاب کے دیباچے میں اس دینِ فطرت میں عقیدے کی خصوصیات پیش کرتا ہے:

”یہ میرا دین ہے، یہ میرے بھائیوں یعنی برہمنوں سماج سوامی کے اراکین کا دین ہے۔

”یہ میرا دین ہے جس کی تعلیم ہمارے محترم گرو اور بانی دین راجہ رام موہن رائے نے دی

”آپ اسے عیسائیت کا نام دیں یا اسلام کا یا دینِ فطرت کا، مجھے نام کی کوئی پروا نہیں۔“

پھر اسی مصنف نے (معلوم ہوتا ہے وہی ایک ہے) ستیاگرہ کے دستور کا ذکر کیا۔ وہ بیان

کرتا ہے کہ کس طرح احتجاج کے طور پر بغاوت سے پہلے تین لاکھ لوگ بنارس کے قریب جمع ہو گئے،

انہوں نے کھانا پینا ترک کر دیا اور انگریزوں کو بددعا میں دیتے تھے۔ بالآخر وہ لکھتا ہے: ”ستیاگرہ

کی اس مثال سے ظاہر ہے کہ ایسی سیرت کے لوگوں کی طرف سے سرگرم مزاحمت کس قسم کی ہوگی۔“

انجام کار فرانس کے جمہوریت پسند اخبارات نے باقی تمام اخبارات کے مقابلے میں نانا صاحب

کی شخصیت کو خوب سراہا۔ ماہ ستمبر ۱۸۵۷ء کے دوران ”لیس تافیت“ نے کئی بار اسے خراج تحسین

ادا کیا: ”بغاوت کے اس راہنما میں تدبیر جنگ میں کمال مہارت کے ساتھ ساتھ جرأت اور بہمت بھی ہے۔

خلافت ایک واضح مگر کسی قدر نادرست رائے کا پہلے ہی اظہار کر چکے تھے۔
 اس ضمن میں فائول اور ایل ریگال کی تصنیف "دی انڈین میوٹنی" خاص اہمیت رکھتی ہے
 اس کے دیباچے سے ایک طویل اقتباس یہاں نقل کیے جانے کے قابل ہے،
 "ہندوستان میں تین مفاد تسلی چاہتے ہیں اور پاتے ہیں۔ کمپنی کا مفاد، عام تجارت کا مفاد،
 اور طبقہ املا کا مفاد۔ سوال یہ ہے کہ اس کے بعد تہذیب کے لیے کیا بچتا ہے۔
 کمپنی اپنی فتوحات کی وسعت سے بھولی نہ سمائی اور اُن پر قبضہ رکھنے کے مصارف سے
 تباہ ہو گئی۔ اس کے بچاؤ کی صرف ایک ہی صورت ہے یعنی ٹیکسوں کی وصولی۔ چوں کہ اس کی نگاہ میں
 تجوریوں کو بھرنے کے لیے دولت اکٹھے کرنے کے تمام طریقے نیک اور جائز ہیں اس لیے انجام کار نفرت
 کا شکار ہو جاتی ہے۔ وہ اس نفرت سے باخبر ہے اس لیے وہ مجبوراً حماقت پر اتر آتی ہے اور اسے
 اپنی حکومت کے تحفظ کی ضمانت سمجھتی ہے۔ اس سے کسی ترقی کی امید نہ ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ اس سے
 ظاہر ہوتا ہے کہ تہذیب ایک بڑی اور لامحالہ چیز ہے۔

"ہندوؤں کے نقطہ نظر سے تجارت بھی بے سود ہے۔ ہندوستان میں نقل پذیری بھی نہیں جس
 سے دوسرے ملکوں کے ادنیٰ ترین کارندے بعض باہمی روابط سے مستفید ہوتے ہیں اور ان روابط اور
 نئے تعلقات کے بڑھنے سے انھیں ایک قسم کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ آقاؤں کی تمام ترقوت ایک
 ایسی چیز کی پیداوار پر مرکوز ہوتی ہے جو ملک کے اندر نہ تو فروخت ہوتی ہے نہ اس کا تبادلہ ہوتا ہے
 اور نہ ہی صرف ہوتی ہے یعنی انیوں جو چین سے برآمد کی گئی اشیاء کی قیمت کو متوازن رکھنے میں بے مثال
 کام انجام دیتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ برطانیہ چین سے بہت زیادہ چائے اور لٹیم خریدتا ہے
 جس کی ادائیگی برنسبت اس لئے سونے اور ادنیٰ مال اور لوہے کے سامان سے نہیں ہو سکتی جو وہاں
 کھپ سکتا ہے۔ برطانیہ بقیہ رقم نقد یا سونے چاندی کے ڈلوں کی صورت میں ادا نہیں کرنا چاہتا۔ اس
 لیے اس فرق کو پورا کرنے کے لیے ہندوستان کا پوست اس کے اٹنے آتا ہے۔ دس کروڑ انسان اپنا
 دماغ مثل کر کے اور اپنی تمام قوت صرف کر کے ایک ایسی چیز پیدا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں جو ایک
 اور دوسرے ملک کے دس کروڑ انسانوں کو مسموم کرتی ہے۔

"یہ ہے ہندوستان میں تہذیب کو سنوارنے والا برطانوی تجارت کا اخلاقی پہلو!
 کمپنی بند ہونے والی ہے۔ اس کے شہری نظام اور فوج کے محکموں میں نادار کنبوں کو بہت
 سے عہدے بھیائے جاتے ہیں۔ بھاری مشاہروں سے اس کے شریف انفس ملازمین کو ان کے

”کون جانتا ہے کہ ہندوستان کے تمام لوگ انگریزوں کا تعاقب کر کے ان کو ملک سے نکالنے کے لیے بغاوت نہیں کریں گے؟ اگر ایسے امکانات تک نوبت آجائے تو فرانس کو دریائے گنگا کے کنارے پر اہم پارٹ ادا کرنا ہوگا اور ہندوستانی اقوام کے وسیع اتحاد کا محافظ بننا ہوگا۔“

یہ جوش اکثر دلکش اور رنگین عبارت میں ظاہر ہوا۔ جانکوی ایرائنویل نے ایک خط میں لکھا: ”تم نہیں جانتے کہ میں کس موقع پر سپاہی بن جائیگا۔ اور ”لیس تانیت“ نے ۱۸ ستمبر ۱۸۵۷ء کو وضاحت کے ساتھ لکھا: ”ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں اور پھر دہراتے ہیں: ہماری ہمدردی ہندوستانیوں کے ساتھ ہے کیوں کہ مادرِ وطن کی محبت اور قومی آزادی ہمارے لیے مقدس چیزیں ہیں۔“

ہندوستانی بغاوت کے لیے فرانسیسی جمہوریت پسندوں کی ہمدردی بالکل واضح ہے البتہ نیپولین کی آمریت کے تحت اخبارات میں اس جذبے کے اظہار پر کافی پابندی تھی، اس وجہ سے ہم زردور طبقے کے تاثرات کے براہِ مامست اظہار کے علم سے محروم ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جمہوریت پسندوں کے علاوہ فرانسیسی عوام کے بڑے حصے کی رائے کم و بیش بغاوت کے حق میں تھی۔ البتہ یہ سوال اٹھتا ہے کہ آیا ان تاثرات سے باغی ہندوستانیوں کے ساتھ حقیقی ہمدردی کی بجائے اس گہری عداوت کا اظہار تو نہیں ہوتا جو بہت سے فرانسیسی انگریزوں کے خلاف رکھتے تھے کیونکہ اخبارات کی ہمدردی کی بظاہر یہی وجہ تھی۔ خواہ کچھ بھی ہو، مفاد کی یکسانیت اور نسلی تعصب کی بنا پر شہری متوسط طبقے کی اکثریت مضبوطی سے انگریزوں کے ساتھ تھی۔

نانا صاحب اپنی قوم کا بدلہ لینے والے کی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔

”باغیوں کا سرفزا نانا صاحب جسے بعض لوگ ایک خونخوار درندہ قرار دیتے ہیں۔“

اسے کامل شریف انسان کا درجہ دیتے ہیں، ہماری ملے میں مذہب اور حب الوطنیت کے دہشت اثر کے تحت کام کر رہا تھا۔ یہ انسانی سرگرمی کے دو بڑے محرک ہیں۔

اس واضح نظریے سے جس کی تائید دوسرے فرانسیسی جرائد کی نسبت زیادہ واقفیت پزینی ہے۔ جمہوریت پسند جرائد نے متناسب رویت اختیار کیا۔

انھوں نے باغیوں پر رکھے گئے مجبوز مظالم کے الزامات رد کر دیے۔ ”سپاہیوں کا طرز عمل خواہ کتنا ہی سفاکانہ ہو یہ فقط انگریزوں کے اس ظلم و ستم کا شدید عکس ہے جو انھوں نے صدی کے بیشتر حصے کے دوران دھایا۔“ (لیس تائیت ۳۱ اگست ۱۸۵۷ء)

”ہم قطعی طور پر مطالبہ کرتے ہیں کہ باغیوں کے دھائے ہوئے مظالم کا مطلق ذکر نہ کرو۔ ان کا جو رستم اس انناک ڈرائے کے انجام کا بلاکت خیر اعلان ہے جس میں انگریز نے آج تک بڑا پارٹ ادا کیا۔“ (ایضاً ۲۰ ستمبر ۱۸۵۷ء)

انھوں نے جبر و تشدد میں انگریزوں کی مدد کے لیے فرانسیسی مداخلت کی اطلاعات پر سخت رویت اختیار کیا۔ بعض انتہا پسند اور رجعت پسند طبقات نے اعلان کیا تھا کہ فرانس کو مداخلت کرنی چاہیے تاکہ صورت حال سے فائدہ اٹھا کر انگلستان سے تلافی یافت اور معاوضے کا مطالبہ کیا جائے۔ ۲۵ اگست ۱۸۵۷ء کو ”لیس تائیت“ نے رجعت پسندوں کے اس وادیلہ کا یوں جواب دیا:

”اگر ہم تلافی یافت اور معاوضے کے امکان کو تسلیم بھی کریں تو پھر بھی ہم یہ نہیں سمجھتے کہ فرانس کس طرح ان ہندوستانیوں کے خلاف انگلستان کی مدد کرے گا جو صرف اپنی قومی آزادی کے اصول کی خاطر باغی ہوئے ہیں۔“

لیکن قارئین کے خطوط میں اس سے کہیں زیادہ مطالبے تھے۔ ایک نے لکھا: ”ہندوستانیوں کے حق میں مداخلت کرو۔ جہازوں کے تمام دستوں کو سمند میں ڈال دو۔ ہماری کوششوں کو روس کی کوششوں کے ساتھ شامل کرو یا لیشیا کے تمام لوگوں سے ہیل کرو، ان کو سنبھلو، ان کو برطانوی ہندوستان کے خلاف جہاد کے لیے بھیجو۔ ظالموں کا تعاقب کر کے انھیں نکال دو۔ مغل اعظم کی سلطنت کو دوبارہ قائم کرو۔ صرف یہی پالیسی ہے جو حقیقت فرانس کی شاندار روایات کے شایان ہے۔“

ایک اور نے لیشیا کی تحریک آزادی کا یوں خیر مقدم کیا:

کی دیہات میں کوئی زمین نہ تھی وہ اس زرے میں شامل نہ تھے)۔

جمہوری پروگرام میں بالخصوص عوامی رنگ پایا جاتا تھا اس لیے جمہوریت پسند اس بات کے مخالف تھے کہ پیڈمانٹ ایک ممتاز ریاست کی حیثیت حاصل کرے جب کہ اعتدال پسند اسے یہ درجہ دیتے تھے۔ جمہوریت پسندوں کی یہ رائے تھی کہ متحدہ جدید اٹلی کی تشکیل عوام کی قومی اور انقلابی شورش کے ذریعے عمل میں آنی چاہیے نہ کہ سیاسی گٹھ جوڑ اور چال بازیوں سے۔

۱۸۵۷ء میں ہی اٹلی کے جمہوریت پسندوں نے اقتدار حاصل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا۔ یہ سپری کی ہم کا سال تھا جب سماجی جمہوریت پسند کارلو پیسکین نے جو سف بیزنی کی شرکت میں ایک انقلابی تحریک شروع کی تاکہ جنوب کے لوگوں کو رجعت پسند بوربان سرکار کے خلاف اُکسایا جائے۔ اور جنوب سے اتحاد کی تحریک کا آغاز کیا جائے۔ اس کوشش کی ناکامی اور اس بحران سے جو اس نے جمہوری تحریک میں پیدا کیا، اعتدال پسندی کے رجحان کو تقویت ملی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیڈمانٹ کی شخصی حکومت نے فرانس کے نپولین سوم کی مدد سے آسٹریا کو شکست دی۔ اس طرح اتحاد کا وہ عمل شروع ہوا جو ۱۸۶۶ء میں جو سف گیری بالڈی کی ”یک ہزاری“ ہم سے پایہ تکمیل کو پہنچا۔ ان حالات میں اعتدال پسندوں نے علاوہ برطانیہ کی حمایت کا رویہ اختیار کیا۔ ان کی نگاہ میں برطانوی پارلیمنٹری سسٹم ایک ایسا نمونہ تھا جس پر اٹلی کے سیاسی اداروں کو تعمیر ہونا تھا۔ آسٹریا کے اثر و رسوخ کا مقابلہ کرنے کے لیے انگریزوں کی امداد بھی ضروری سمجھی گئی۔ برطانیہ کے نوآبادیاتی نظام کی تقویت کو ایک قطعی مصلحت تصور کیا گیا جو اٹلی کی سیاست کے لیے سازگار تھی۔

اس کے برعکس جمہوریت پسندوں میں اگرچہ برطانوی پارلیمنٹری نظام کو قبولیت کی نگاہ سے دیکھا گیا، انگریزوں کی نوآبادیاتی پالیسی کی مخالفت اور نکتہ چین کا عام احساس پایا جاتا تھا۔ اس پالیسی کی بنیاد ظلم اور لوٹ کھسوٹ پر تھی۔ جمہوریت پسندوں کی نگاہ میں جو قومی آزادی کے اصول کو سب سے بڑھ کر عزیز رکھتے تھے، نوآبادیاتی نظام ان عقائد کے سنائی تھا کیوں کہ اس کی بہت سی خصوصیات اٹلی میں آسٹریا کی قومی جبر و ستم کی پالیسی سے متبی جلتی تھیں۔

ان جمہوری حلقوں میں ہندوستان کی قومی تناؤں کے لیے ہمدردی پائی جاتی تھی۔ ”لائبیا اینڈ ایتھوپیا کے ماڈرنا“ (انڈیا، قدیم و جدید) کا مصنف کارلو کینیٹیو اٹلی میں ہم عصر جمہوری انداز فکر کا نہایت مسلم الثبوت نمائندہ تھا۔ اپنے عالمانہ اور پُر جوش مقالے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی لوٹ کھسوٹ اور اس کے اخلاقِ قبیحہ کے پرچار کی مذمت کرنے کے بعد کینیٹیو نے بہادر اور سمجھ دار ہندوستانیوں کی

لیانا ڈل نوگارسے

اٹلی میں ۱۸۵۷ء کی صدائے بازگشت

۱۸۵۷ء کی بغاوت سے متعلق اہل اٹلی کی رائے اور اُن کے تبصروں کو صحیح پس منظر میں پیش کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اٹلی میں اُس وقت کی صورتِ حال کے بارے میں چند باتیں پہلے عرض کر دیں۔

۱۸۵۷ء میں اٹلی ایک متحد اور آزاد قوم کی حیثیت میں نئی بیداری کے انتہائی نازک مرحلے سے گزر رہا تھا۔ یہ ابھی متحد نہیں ہوا تھا اور کئی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ اعتدال پسند جماعت اٹلی کی دو نہرِ آزما تنظیموں میں سے ایک تنظیم تھی۔ یہ اٹلی کی آزادی اور اتحاد کی قومی تناؤں کی ترجمان تھی اور وہاں کے متوسط طبقہ اور دولتمند طبقہ کی نمائندہ تھی۔ البتہ وہ کاریگروں، مزدوروں اور کسانوں کی سماجی آرزوؤں سے خائف تھے۔ اس لیے وہ عوامی جدوجہد میں حصہ لینے سے حتی الامکان اجتناب کرتے تھے۔ چنانچہ اعتدال پسند قومی مقاصد کے لیے کام کر رہے تھے لیکن کسی قومی اور عوامی انقلاب کے ذریعے سے نہیں بلکہ فرانس اور آسٹریا کے درمیان بڑھتے ہوئے تصادم سے فائدہ اٹھانے کی سیاسی چال کے ذریعے سے۔ اعتدال پسند اس امداد کے احتمال پر بھروسہ رکھتے تھے جو پیدمانٹ (شمال مغربی اٹلی) انگلستان سے حاصل کر سکتا تھا۔ انگلستان بحیرہ روم کے وسط میں ایک ایسی ریاست چاہتا تھا جو برطانیہ کی حامی، آسٹریا اور روس کی مخالفت ہو۔ شمالی اٹلی میں آسٹریا کے متنازع پر ایک وسیع تر پیدمانٹ اس منصوبے کے عین مطابق تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ کاؤنٹ کیوڈز جو اعتدال پسند پالیسی کا بانی تھا، انگلستان پر اعتماد رکھتا تھا۔

اس کے برعکس جمہوریت پسند عام طور پر جوسف میزینی کے عقیدوں اور نقطہ نظر کی تقلید کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ قومی نصب العین کو لوگوں کے اشتراکِ عمل کے ذریعہ حاصل کرنا چاہیے۔ (یہ یاد رکھنا چاہیے کہ میزینی کے لیے لفظ "لوگ" سے مراد صرف شہری آبادی کے ادنیٰ طبقات تھے جن کو لوگوں

کی پالیسی کی حمایت اور اس کے ساتھ کھلی مہمردی کا رویہ اختیار کیا: جو سٹیمپری نے جس کا کیو ر کی پالیسی کے ساتھ قریبی تعلق تھا، جولائی ۱۸۵۷ء میں یورن کے "دی ریوژنا کون ٹیمپورینا" (con-temporary Review) میں جو کچھ لکھا اس میں اُس نے ہندوستانی سپاہیوں کی بغاوت کے قوی رنگ سے مطلق نا آشنائی کا ثبوت دیا۔ اس نے لکھا: "بہت سے لوگ مختلف قوموں اور جغرافیہ کو غلط ملط کرتے ہوئے یہ تصور کریں گے کہ ہندوستانی بغاوت آزادی کی ایک کوشش ہے اور ایک ہندوستانی قوم کی تعمیر کی تنہا ہر کرتی ہے۔ لیکن جو لوگ سمجھدار ہیں اور معاملات کی حقیقی صورت حال سے واقف ہیں ایسی فاش غلطی نہیں کریں گے۔ سپاہیوں کی بغاوت محض فوجی سرکشی ہے جس کی آگ برہمنوں کے مذہبی تعصب سے بھرک اٹھی۔ آزادی اور نجات کی آرزو کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں"۔ یہ ذکر کرنا دل چسپی سے خالی نہیں ہے کہ کیتھولک کیمپ میں ہندوستانی بغاوت کو انگلستان کے خلاف بحث و مباحثہ کا موضوع بنایا گیا۔ یسوعیوں کے سرکردہ اخبار "دی ریوٹیا کینولیکا" (Catholic Review) نے برطانوی جبر و تشدد سے اس دلیل کا کام لیا کہ اگر انگریزوں کو اپنے تحت علاقے میں قومی شورش کو جبراً کچلا واجب ہے تو اٹلی کی حکومت کے لیے بھی اپنے تحت لوگوں کو دبانا یکساں طور پر جائز ہے۔

البتہ جمہوریت پسندوں نے شروع سے ہی ہندوستان کی حمایت کا رویہ اختیار کیا۔ جونہی ہندوستانی بغاوت کی وسعت اور مہیت سے متعلق صحیح اطلاع پہنچی جمہوریت پسند اخباروں نے کھلم کھلا ہندوستانی انقلاب پسندوں کے ساتھ مہمردی اور ان کی تحسین کا اظہار کیا۔ اس باب میں اس دور کے اہم ترین جمہوری اخبار "ٹیلیاٹیل پاپولو" جنوا، (Piemonte) کے بیانات پر مبنی ہیں۔ اس اخبار نے مورخہ ۸ جولائی کو لکھا تھا: "بغادت نے انگلستان کو ایسے ناکوں چنے چوائے ہیں کہ اُسے ہندوستان کے سوا کچھ اور سوچنے کی فرصت نہیں۔ اپنے گھر میں آزادی اور غیر ملکیوں کو غلام بنانے کی پالیسی کے سبب برطانیہ نے امریکہ میں اپنے بہترین علاقے گنوا دیے۔ اب دیکھیے ہندوستان میں کیا گل کھلتا ہے۔ وہ غالباً ان بد بخت لوگوں کی آزاد ہونے کی عظیم کوشش کی آگ کو خون سے بچھا کر لوگوں کے جوش کو ٹھنڈا کر دے گا۔ لیکن ضرب نکال جا چکی ہے، آگ روشن ہو چکی ہے اور بہر حال بات یہیں پر ختم نہ ہوگی جیسا کہ ہمارا خیال ہے۔ ہندوستان کے بغیر انگلستان پر کیا گزندے گی؟ اس کا جواب ہے: "مار، کار بھج، اور ویش کے حشر سے بچنے کے لیے انگلستان ایشیا میں ہر ممکن کوشش کرے گا اور یورپ میں ذلیل ترین حرکتوں پر اتر آئے گا۔" ۱۳

آنے والی آزادی کی صاف صاف پیش گوئی کی۔ اس نے لکھا، "واقعات کی اندھا دھند قوت ظالموں کی خواہشات کے غلام خیال اور عمل کا الگ راستہ تیار کر سکتی ہے۔ ہندوستان میں آزادی کے بیج جو پکڑ چکے ہیں تاکہ محکوم برہمن حاکم بن جائے اور اپنے آقا کو غلام کا درجہ دے" ۵

چند سال بعد فلکس آریسنی نے ان لوگوں پر نکتہ چینی کی جو یہ دعویٰ کرتے تھے کہ املی کے قومی نصب العین کے حصول کے لیے انگلستان پر اعتماد کیا جاسکتا تھا۔ وہ ایک مشہور جمہوریت پسند تھا جو نپولین سوم کی زندگی پر قاتلانہ حملے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس نے انقلاب پسند نکولا فابریزی کے نام ایک خط میں لکھا، "لوگ مثال کے طور پر انگلستان کے آزادی اور خود مختاری کے خیالات کا چرچا کرتے ہیں یہ سراسر فریب ہے! جب تک یہ خیالات اس کے اپنے مفاد سے مطابقت رکھتے ہیں، وہ اس کا قائل ہے لیکن جو بھی اس کی کوئی غرض باقی نہیں رہتی۔ ان خیالات میں اس کی دل چسپی زائل ہو جاتی ہے۔ کیا آپ دوسری قوموں کی فیاضی کا ثبوت چاہتے ہیں؟ کارمیکا، مانٹا اور یونانی جزائر میں بغاوت کر کے دیکھیے۔ آپ دیکھیں گے کہ فرانسیسی اور انگریز مطلق کوئی خطہ مول نہیں لیں گے اور فوراً گولی چلا دیں گے۔ وہ وہی کچھ کریں گے جو ہیناؤ نے ہنگری میں کیا۔ وہ لوگوں کو پھانسی دیں گے" ۶

اس قسم کی بہت سی شہادتوں کا حوالہ دیا جاسکتا ہے۔ ہم یہاں ایک اور جمہوریت پسند اینٹونیو مارٹینا کی رائے کا ذکر کرنا کافی سمجھتے ہیں۔ وہ میزنی کا پیرو تھا۔ اس نے اپنے مقالہ "ریپوبلیکاں پر وگرا دی ان پارٹیو نیشنل" (جواب پر وگرا میشل پارٹی) میں لکھا، "کیا ہم یورپ کی سیاسی حکمت عملی کا ذکر کر رہے ہیں؟ مجھے اس سے کافی واسطہ پڑ چکا ہے۔ صاف صاف اور ایمانداری کے ساتھ بات کرو۔ آپ انگلستان کا ذکر کرتے ہیں۔ کیا اس کی پیش کش خلوص اور صدق دلی پر مبنی ہوگی؟ کیا ہمارے حقوق اور اس کے مفادات میں مطابقت ہے؟ اسے کہو کہ یونانی جزائر سے ڈانپنا محافظ بحری بیڑا اور لارڈ ہائی کمنڈر تو ہٹائے۔ مانٹا کے مطالبات تو تسلیم کرے۔ چین سے جو اس نے لاکھوں ایتھے میں واپس ادا تو کرے۔ ذرا ایسٹ اور ویسٹ انڈیز سے تو دست بردار ہو تب ہی ہم اس پر اعتماد کریں گے، تبھی ہم باور کریں گے کہ اس کی نیت صاف ہے اور اس کے مفاد سے ہمارے حقوق کو کوئی خطرہ درپیش نہ ہوگا۔ ہم اس ملک سے کوئی امداد نہیں چاہتے جو آئرلینڈ پر ظلم ڈھاتا ہے اور اسے بھوکوں مارا ہے اور ایک پونڈ روٹی یا ایک کستر چائے کی خاطر بنی نوع انسان کو فائرنگ پر مجبور کرنے کو تیار ہے" ۷

املی کے اعتدال پسند انگریزوں کے حامی تھے اس لیے ان کے اس رویے کے پیش نظر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جب ۱۸۵۷ء کی بغاوت ہندوستان کا سوال سامنے آیا تو انہوں نے انگلستان کی جبر و تشدد

آخر میں ہندوستان کے واقعات کا حوالہ دیا جاتا ہے تاکہ اٹلی میں بھی انقلابی سرگرمی کے جواز کو ثابت کیا جائے۔ ”برطانوی اقتدار کی شان کو زبردست دھکا لگا ہے۔ ہمارے پارٹی نے بہت پہلے الفاظ اور اٹال کے ذریعے پیشین گوئی کی تھی کہ شخصی حکومت اپنی رضا سے دست بردار نہیں ہوتی، ایک قوم کتابوں اور مقالوں کے ذریعے سے نہیں بلکہ محنت و کوشش اور متواتر قربانی سے ہی ترقی کی راہ پر گامزن ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ آزادی کا لباس حاصل کرتی ہے اور جس کے پہننے کی اہل ایک دن بن جاتی ہے۔ لگ بھگ سو سال سے کتابوں اور اخبارات میں بھی اور برطانوی پارلیمنٹ میں بھی غریب ہندوستانیوں کے ساتھ انصاف کا تقاضا کیا جا رہا ہے اور کلائو، ہیسٹنگز اور لاکھو بے رحم لیڈروں کی مذمت کی گئی ہے جو اس بد بخت ملک کا خون بخورتے ہیں اور اس پر جبر و ستم ڈھاتے ہیں۔ تاہم غارت گری اور جبر و ستم اب بھی جاری ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ صرف انگریز ہی قصور وار نہیں ہیں۔ جبر و ستم کا جب کسی قوم کے ساتھ تعلق ہوتا ہے تو یہ ایک خوفناک الجھن بن جاتی ہے جو دو عین مساوی اجزاء سے مرکب ہوتی ہے، ظالموں کی طرف سے تشدد اور نا انصافی اور مظلوم کی طرف سے غلامانہ اطاعت اور بزدلی۔ جب مجھے یہ بتایا جاتا ہے کہ تین کروڑ ساٹھ لاکھ فرانسیسی ڈکٹیٹر کے جوئے تلے کراہ رہے ہیں اور ڈھائی کروڑ اہل اٹلی آسٹریا، بولہائیوں اور پوپ کے ہاتھوں شہید ہو رہے ہیں اور دس کروڑ ہندوستانی تاجروں کی ایک کمپنی کے غلام ہیں تو میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اس قبرِ عظیم کی ذمہ داری ان لاکھوں اطالویوں، ہندوستانیوں اور فرانسیسیوں پر ہے جو اس ذلت کو گوارا کرتے ہیں نہ کہ ان کے آقاؤں پر جن کے پاس سب ملا جلا کر صرف دس لاکھ فوجوں کی قوت ہے جس سے وہ اپنے احکام کی اطاعت کرواتے ہیں۔ یہ تاریخ کی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ غلامی کے تئیں بے حسی اور صبر و تسلیم کا رویہ غلامی کی سختی اور اس کے جاری رہنے کا بڑا سبب ہے۔ حکومت کے غاصبوں سے ایک ذرہ بھی چھیننے کے لیے جبر و تشدد کی ضرورت پڑتی ہے۔ ۱۸۴۸ء کے آئین جن میں پیڈمانٹ کا آئین بھی شامل ہے نہ تو کسی اصول پرستی کا نتیجہ تھے، نہ مؤدبانہ عرضداشتوں کا، نہ بنی نوع انسان کے درد مندوں کے واویلے کا اور نہ ہی عقلیت پسندوں کی منطق کا، بلکہ غضب ناک غلاموں کی بیست ناک شورش کا۔ مشکل مسائل پر غلط استدلال سے کام لینے والے عالم خیال کے مغرور مفکر اور کینے جریہ بھگلا بزدلانہ صبر و تسلیم کی تلقین کے لیے پیڈمانٹ میں اخبارات کی اور خود اس کی آزادی کا استعمال کرتے ہیں حالانکہ یہ آزادی اس انقلاب کے طفیل ہے جسے وہ رد کرتے ہیں یا باغی غلام کی یرتشد سرگرمی کے دم سے ہے جسے وہ نمک حرامی سے کوستے ہیں۔ یہ ثابت کرنے کے لیے

بعد میں ۱۸ اگست کے ادارے میں جس میں ہندوستانی بناوت کے قومی رنگ کی وقعت کو گھٹایا گیا اور تحریک کے مذہبی پہلوؤں میں مبالغہ آمیزی کی گئی اس اخبار نے ہندوستان میں انگلستان کی کارگزاری پر سخت رائے زنی کی۔ "اس کے اپنے سیاستدانوں کی شہادت کے مطابق انگلستان ہندوستان میں جبر و تشدد کے ایسے طریقوں سے کام لیتا ہے جن کے لیے اس نے ریاکاری کے ساتھ یورپ میں فریڈینڈ بوربان کی مذمت کی۔ غذاری، دغا بازی اور تشدد کے ذریعہ اس نے بادشاہ اور وایان ریاست کے علاقوں پر قبضہ کر لیا جو اس کے ملین اور خیر خواہ ہیں۔ معاہدوں کو توڑنے کے لیے وہ قرضے دیتا ہے۔ دوسروں کے علاقے پر ناجائز قبضہ کرنے کے لیے وہ بھائی بھائی میں باپ بیٹے میں اور ماں بیٹے میں ظالمانہ عداوتیں پیدا کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔ الغرض اس نے پنڈہ کروڑ انسانوں کی بد رعائیں اپنے سرلی ہیں جن کی فسیاد اگرچہ وہ وحشی اور کافر ہیں عرش بریں تک پہنچے گی اور انتقام کا تقاضا کرے گی اور ان کا یہ تقاضا پورا ہو گا۔"

اسی اخبار میں ۱۵ ستمبر کو ایک دل چسپ مضمون شائع ہوا جس میں ہندوستانی بناوت کی قومی ماہیت کو زور دے کر بیان کیا گیا۔ اس مضمون میں مصنف اس رائے کی پُر زور تردید کرتا ہے جو اس وقت صحافیوں میں پائی جاتی تھی کہ ہندوستانی شورش محض ایک فوجی تحریک ہے، بناوت میں عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ باغی اپنے افسروں کو ہلاک کرتے ہیں، لوٹتے ہیں اور پھر منتشر ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض اپنے گھروں کو واپس جاتے ہیں اور بعض ڈاکوؤں کے گروہ بنالیتے ہیں لیکن یہاں یہ ہوا کہ ایک سے زیادہ دیسی زمینیں سازش میں شریک ہوتی ہیں ایک مقررہ تاریخ پر بناوت کرتی ہیں اور قدیم پایہ تخت پر قبضہ کر لیتی ہیں۔ فرنگیوں کے خلاف جنگ کا ڈنکا بجاتی ہیں اور قومی آزادی کا اعلان کرتی ہیں۔ پھر شاہی خاندان سے حکمران منتخب کرتی ہیں۔ اس کے بعد منشور صادر کرتی ہیں اور ایک نئے نظام کے لیے کوشش کرتی ہیں۔ انھیں لوگوں کی ہمدردی یا کم از کم غیر جانبداری حاصل ہو جاتی ہے۔ اس سب سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام طبقوں میں یکجہاں تھا اور وہ سب اگر علماء نہیں تو نیت کے اعتبار سے بناوت میں شامل تھے۔ ۱۵ اگست کے چل کر مصنف نے ایشیا کے لیے اس بناوت کی حد درجہ اہمیت کو سمجھنے میں دو اندیشی کا اظہار کیا ہے: "ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی بحالی خواہ تیز ہو خواہ سست، خواہ مکمل ہو خواہ نامکمل؛ یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ دریائے زرد اور دریائے گنگا کے کناروں پر انقلاب کے بھوت کا ظہور ایک عظیم سانحہ ہے اور بہر حال جذبہ آزادی کے نئے اعلان کی علامت ہے۔"

ہندوستانی بغاوت نے اٹلی میں پیدا کی *

حواشی

- ۱۔ اٹلی میں زرعی مسئلے پر میزنی کے پیروؤں کے انتہائی مبہم رویہ کے لیے بالخصوص ملاحظہ فرمائیں اینٹونیو گرامشی کا تجزیہ "ریس آر جی مینٹو" ٹورن (ایٹالینڈی ۱۹۵۲ء)۔
- ۲۔ سپری کی ہمت کے ساتھ ساتھ میزنی کے پیروؤں نے جینوا اور لیگھارن میں ایک باغیہ تحریک منظم کرنے کی کوشش کی مگر یہ تحریکیں ناکام ہو گئیں۔
- ۳۔ دوسری بات کے علاوہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ بہت سے اطالوی سیاست دان جن میں میزنی بھی تھا، نے برطانیہ میں پناہ لی۔
- ۴۔ "انکوار سکریٹ" جلد دوم، میلان (بارونی اے سکائی) ۱۸۳۶ء میں کارلو کینیو کا مضمون ملاحظہ فرمائیں۔
- یہ امر قابل ملاحظہ ہے کہ ۱۸۵۷ء میں بغاوت ہند کے موقع پر میلان کا ایک مالک مطبع پیرڈا کینیو کی تصنیف "انڈیا اینڈ اے ماڈرن کالیک" یا نسخہ شایع کرنا چاہتا تھا اور یہ بھی چاہتا تھا کہ مصنف اس ملک کے عالیہ ہنگاموں سے متعلق چند سطور کا اضافہ کر دے لیکن غالباً اشاعت نامکن تھی۔ ملاحظہ فرمائیں: کینیو: "ایسٹوریلو" جلد سوم، صفحہ ۳۹۔ فلارنس (جی باربرا ۱۹۵۴ء)۔
- ۶۔ فیلس آر سینی "بیسٹرز" روم (ڈولریانو) ۱۹۳۶ء۔
- ۷۔ تاریخی دستاویزات ریاست فلارنس: "آرکیو یو سیگرنو"، پری فپٹورا، ۵۴-۱۹۵۲ء "ٹرانزیکشن" ۱۱۵۴ پوائنٹ ۱، فائل ۸۔
- ۸۔ اس سلسلے میں یہ بات قابل ملاحظہ ہے کہ سرکاری حلقوں کی تحریک پر پیدائش میں ہندوستان

* اہم ترین تصنیفات میں سے مذکورہ ذیل قابل ذکر ہیں: جی۔ بی۔ دی کرائے نیرا: "لا امپرووانڈو۔ ٹینیکو لے لاسا پوٹینزا لی ٹیر" (۱۸۵۷ء) ایرس ناڈیکلائی: "سین ڈیل لان سرژن انڈیا" (۱۸۵۵ء)۔ گائی سب لیریو: "ڈیلا کینیا لے ڈیلا ڈومینیشن انگلیس نیل انڈی نووالا کیدوٹا دی دہلی نیل" (۱۸۵۸ء) اکیرو پوسکیو: "ریٹرن سلا ان سرژن ڈیل انڈیا برٹینیکا" (۱۸۵۵ء)۔ مدیروارن: "لا انڈیا انگلیس پلانٹا اے ڈیہ بولہ ان سرژن ڈیل" (۱۸۵۷ء) (۱۸۵۷ء)۔ فرڈیننڈو ڈی لینا: "لا انڈیا کوئیمپو ریٹا" (۱۸۵۸ء) گیوونی فیلسیا: "کانسٹیٹینو موشی: "لا امپرووانڈو۔ انڈیانو"۔ ڈے شیرژن جوگرافیکا، سٹوریکا، ویو ۱۸۶۲ء۔

کہ برطانوی حکومت وہاں جان اور اس کا جانا قابل برداشت ہے۔ محض عرضداشتوں اور پارلیمنٹری فصاحت سے کام نہیں چلتا بلکہ غلام کی طرف سے ایسے عمل کی ضرورت ہے جس کا اظہار اس عظیم بغاوت میں ہوا۔

میزنی کے پیرو جمہوریت پسندوں کے خیالات کے علاوہ جن کا اخبار "ایٹلیا ڈیل پوپولو" تھا آزاد خیال عقلیت پسندوں کی تحریک کے بانی آسونیو فرانچی کے زیر ادارت اطالوی جریدہ "لارین" نے ہندوستانی واقعات کی جوتاویل پیش کی ہے اس کا ذکر کرنا سودمند ہوگا۔ دی پولیٹیکل ریویو مورخ ۱۸ اگست لکھتا ہے، "مظلوہوں نے مودچہ بنانا اور ظالموں کو جلا کر ناسیکہ لیا ہے۔ ہم اس دن کا مسرت کے ساتھ خیر مقدم کریں گے جب ہندوستان "آزاد ترین" انگلستان کی حکومت کے چنگل سے نجات پائے گا۔" اُن انگریزی جرائد کے جواب میں جنہوں نے محاصرہ دہلی کے دوران برطانوی فوجی دستوں کی شکست سے طیش میں آکر شدید انتقام کا مشورہ دیا تھا "لارین" نے ۵ ستمبر کو لکھا: اس ہونک سبق کے بعد دہلی کو تباہ کرنے کے بجائے اس کا محاصرہ اٹھالینا چاہیے تھا۔ تقریباً تمام انگریزی جرائد غائبی شک بغاوت پر غم و غصہ میں "دی ٹائمز" کی طرح بد بخت مظلم لوگوں کے خلاف انتقام اور ان کی بے رحمی کی ہم کا چرچا کرتے ہیں کیوں کہ وہ لوگ ہمیشہ کے لیے اپنی غلامی کی زنجیروں کو توڑ دینا چاہتے تھے ہم خود غرضوں کی بے رحمی کی نسبت لوگوں کے مقدس حق کو زیادہ عزیز رکھتے ہیں اور دل و جان سے چاہتے ہیں کہ انگریز قوم کو ہمیشہ کے لیے ہندوستان سے نکال دیا جائے۔ ہندوستان میں برطانوی سرکار شاید روئے زمین پر سب سے زیادہ ظالم حکومت ہے اس لیے فرنگیوں کے خلاف ہندوستانیوں کے انتقامی اقدامات پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔ ایٹ انڈیا کمپنی نے اس نہایت دولت مند اور زرخیز ملک کو کوٹ کوٹ کر کنگال کر دیا ہے۔ یہاں ہر سال کروڑوں انسانوں کو قحط کے سبب مرتے ہوئے حکومت بے رحمی کے ساتھ دیکھتی رہتی ہے کیوں کہ انسان دوست انگلستان نے کروڑوں روپے اینٹھنے کے باوجود ہندوستانی صنعتوں کو نیست و نابود کر دیا ہے اور ان کی جگہ ایک بھی رفاہ عام کا کام نہیں کیا۔ ہندوستان پر کبھی مسلمانوں کا تسلط اسلوبی کے ساتھ حکومت کرتے تھے لیکن اب اس پر ایسا یوں کی دہشتناک حکومت ہے۔

جو کچھ اوپر پیش کیا گیا ہے اس سے ہم بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ اطالوی سیاسی حلقوں میں ۱۸۵۷ء کے ہندوستان کے واقعات پر بڑی توجہ مبذول کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ہندوستان سے متعلق متعدد تصنیفات جو اس دور میں شائع ہوئیں اس دل چسپی کا بین ثبوت ہیں جو

پی۔ شاستی کو

۱۸۵۷ء اور روسی پریس

روس میں ہندوستانی بغاوت کی پہلی اطلاع ۲۷ جون ۱۸۵۷ء کو پہنچی جب لندن میں متعین روسی سفیر، خریستو وچ نے میرٹھ میں شورش اور دہلی پر باغیوں کے قبضے کی خبر تار کے ذریعے سینٹ پیٹرز برگ کو بھیجی۔ اُسی دن اُس نے امور خارجہ کے وزیر، پرنس گورچاکوف کے نام ایک یادداشت لکھی اور اس کے ساتھ لندن کے اخبارات سے اقتباسات شامل کیے۔ لندن میں مقیم روسی طبری ایچی کرنل اگناتی یف نے بھی واقعات کی مفصل روداد بھیجی۔

اگناتی یف نے لکھا: ”ہندوستان میں بغاوت کہنی کے خلاف صرف کئی دیسی رجمنٹوں کا اتھاقہ قدر نہیں ہے بلکہ غلامی کے نفرت انگیز غیر ملکی جوئے سے اس سرزمین کی آزادی کی خواہش کا اظہار ہے۔“ اگناتی یف کا خیال تھا کہ ”حکومت کی بدعنوانیاں اور کہنی کی سب کچھ ہڑپ کر جانے کا لاپرواہی بغاوت کے موجب تھے۔“ اگناتی یف کی رائے میں کہنی کی پالیسی سے ہندوستان کے جاگیردار رئیسوں میں بھی یہ خیال پیدا ہو گیا کہ جلد یا بدیر ہر موزوں قطعہ اراضی جو انگریز تاجروں کی دسترس میں تھا اس پر وہ قابض ہو جائیں گے۔“

جب لندن کی سنسنی خیز خبر اخبارات میں شائع ہوئی تو اس نے روسی عوام کی رائے کو بیدار کیا۔ حریت پسند رسالہ ”اتے چست دیسی بیے“ نے اعلان کیا ”آج سیاسی دنیا میں شاید ہی ہندوستان کے سوال سے زیادہ اہم، دلچسپ، یا سنجیدہ کوئی مسئلہ ہو۔ ہندوستان کی خبروں کا انتہائی بے تابی کے ساتھ انتظار کیا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ سنسنی خیز عنوان یہ ہیں: ”ہندوستان“ ”ہندوستان کی ڈاک“ اور ”کلکتہ کے مراسلات!“

”آج سب سے زیادہ جاندار مسئلہ ہندوستان کے معاملات کا ہے۔ پانچ مہینے سے سارے یورپ کی نظریں ہندوستان پر گڑھی ہوئی ہیں۔“ یہ رائے رسالہ ”روسکی ویتنگ“ کی تھی جو اس نے

بناوت کے مظلوموں کے لیے چندہ جمع کرنے کی ایک ہم چلائی گئی۔ اور وکٹریائیٹنول دوم، کیمبر اور
جزیرہ لمرورا نے چندہ دیا۔

۹۔ "ری وزنا کون ٹیمپورینا" ٹیورن، جولائی ۱۸۵۷ء

۱۰۔ بغاوت ہند کے حق میں اعتدال پسندوں کے مختلف دظیروں کے لیے ملاحظہ فرمائیں: "دی گزیٹا

پیڈمانیزہ، ٹیورن، ۱۸۵۷ء، جابجا، اور "گزیٹا دی جینووا"، جینووا، ۱۸۵۷ء، جابجا۔

۱۱۔ "سوسائٹیکو لیکا"، روم، ۲۷ جون ۱۸۵۷ء

۱۲۔ "ایڈیا ذیل پوپلو"، جینووا، ایک اور اہم مائی میزنی روزانہ اخبار "ایڈیا اے پوپلو" (اٹلی

اور اہل اٹلی) کے سلسلے کی ہی ایک کڑی تھی جس نے محکمہ خزانہ کی تعذیب کے نتیجے کے طور پر چندہ
پیشتر اپنی اشاعت بند کر دی تھی۔

۱۳۔ "ایڈیا ذیل پوپلو"، ۸ جولائی ۱۸۵۷ء

۱۴۔ ایضاً ۲۲۔ ۱۷ اگست مضمون بعنوان "لاندیا اے لایورپا"

۱۵۔ ایضاً ۱۵ ستمبر ۱۸۵۷ء؛ "لیٹرپا زبجن ڈیلا سانشا اے ڈیلا انڈی"

۱۶۔ "لاریشن"، ٹیورن، ۱۵ اگست ۱۸۵۷ء

کے فاقحات کی باقاعدہ اور مکمل اطلاعات شایع کرتا تھا۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو اس اخبار نے سرگے برگ کا ایک طویل مضمون بعنوان "ایسٹ انڈیز ایغیرز" شایع کیا۔ مصنف کی ہمدردی امرسراغی ہندوستانیوں کے ساتھ تھی۔ "برطانوی شیراز یا ستوں کے سیاسی اجسام کو نوچنے کا عادی ہے۔ اس بار جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اُسے اپنی خونخواری کی خصلت کو قابو میں رکھنا ہوگا" سرگے برگ کی نظر میں بغاوت کا سبب "ہندوستانیوں کے ساتھ انگریزوں کا وحشیانہ سلوک (خاص طور پر نیکس کی وصولی میں) اور انسانی حقوق سے اُن کی مطلق چشم پوشی تھا۔"

مقبول عام اخبار "پتربرسکی و دومیوتی" زیرِ ادارت اے۔ اے۔ کرائسکی، رکن انجمن سیاسی العوف "اہلِ غرب" بھی اپنے قارئین کو بخوبی مطلع رکھتا۔۔۔ ۳۰ جولائی کو اخبار نے ایک سلسلہ مضامین بعنوان "لیٹرز اباوٹ ایسٹ انڈیز ان ڈکٹیشن" شروع کیا۔ اس میں مصنف نے اپنے قارئین کو مشورہ دیا کہ وہ لندن کے اخبارات پر تنقیدی نگاہ ڈالیں کیوں کہ اس کے قول کے مطابق "انگریز اپنی ناکامیوں کو چھپانے یا ان سے انکار کرنے کا فن جانتے ہیں۔" جس طریقے سے ہندوستان میں برطانوی حکومت قائم ہوئی، اس کی تاریخ سے مصنف نے نتیجہ اخذ کیا کہ "خود انڈو برٹش سلطنت کی تعمیر میں تخریب کا تخم موجود ہے اس نے برطانوی صحافیوں کے اُن دعووں کو مہل قرار دیا کہ بغاوت کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے ہندوؤں کے مذہبی جذبات کو نظر انداز کیا۔"

جہاں تک اُن لوگوں کا تعلق ہے جو یہ دعویٰ کرتے تھے کہ "روشن خیال ہندب یوہپ" پس ماندہ جاہل ایشیا "میں تمدن پھیلانے کا مقصد رکھتا تھا۔" پتربرسکی و دومیوتی نے اس نظریے کو بے باکانہ ریاکاری کا نام دیا۔ اس نے یہ مقول دلیل پیش کی کہ "انگلستان نے ایک وسیع سلطنت حاصل کی لیکن اس میں تہذیب پھیلانے کے لیے نہیں بلکہ اسے ہڑپ کرنے کے لیے۔"

ایشیا میں یورپ کے تہذیب پھیلانے کے پارٹ پر روسی مضمون کے اس قدر توجہ دینے کا سبب یہ تھا کہ نوآبادکاروں کی کھلم کھلا اور ظاہر ابداعمالیوں کو جائز ٹھہرانے کے لیے اس دلیل سے کام لیا جاتا تھا۔ روس میں رجعت پسند حلقوں نے بھی اس ریاکاری کے حربے کو استعمال کرنے کی کوشش کی۔ "روسی ویتنک" نے ان حلقوں کی رائے کی عکاسی کی جب اس نے یہ بیان کیا کہ "ہمیں انگلستان کی خارجہ پالیسی سے کوئی ہمدردی نہیں۔ اس کے ساتھ ہمارے اختلافات کے کئی نکتے ہیں لیکن ہم ہمیشہ فراڈلی اور ایمانداری کے ساتھ تسلیم کریں گے کہ ہمارے کئی مقاصد یکساں ہیں انگلستان اور روس دونوں پر فرض ہے کہ وہ بچھڑے ہوئے ایشیا کی اخلاقی تاریکی میں یوہ پی طرز زندگی کی

اپنے قارئین پر ظاہر کی۔

اخبارات اور رسائل میں بغاوت کی نسبت روسیہ پر شدید بحث چھیڑ گئی۔ بغاوت کے اسباب کیا تھے اور یہ کس طرح پھیل رہی تھی؟ عوام کے لیے اس کا صحیح تصور کرنا مشکل ہو گیا کیوں کہ روسیہ اخبارات اس موضوع پر اپنا بیہشتر مواد انگریزی اخبارات سے اخذ کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مذکورہ مختلف رسائل اور اخبارات کے نقطہ نظر میں اختلاف اور انتشار تھا بلکہ مختلف صحافیوں کے خیالات میں بھی۔

بغاوت سے متعلق سب سے زیادہ واضح اور قطعی رائے بے شک صرف روسی انقلاب پسند جمہوریت پرستوں میں پائی جاتی تھی۔ اُن کے خیالات کا اظہار این۔ اے۔ دو برویو بوت کے ایک مضمون میں کیا گیا جس کا عنوان ”ایسٹ انڈیا کمپنی کی تاریخ اور اس کی معاصرہ صورت حال کا جائزہ تھا اور جو سالہ ”سورے میننگ“ کے پرچم ستمبر میں شائع ہوا۔ ادیب اور فلسفی اور روسی انقلاب پسند جمہوری تحریک کے راہنما این۔ جی۔ جنی شیوسکی کو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ ”مضمون واقعی اچھا نکلا“۔

موضوع سے متعلق نظریے کی پختگی دو برویو بوت کے مقالے کی امتیازی خصوصیت تھی۔ اس کی نگاہ میں بغاوت بے اطمینانی کی ایک اتفاقیہ لہر نہیں تھی بلکہ تاریخی طور پر ایک ناگزیر واقعہ تھا۔ دو برویو بوت نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی لوٹ کھسوٹ کی مشینری کے کل پر زور کی تحقیق کے ساتھ بغاوت کے اسباب کا مطالعہ شروع کیا۔ یہ مشینری ڈاکو کی بے باکی اور حقیرانہ جواز حرص سے مرکب تھی۔

دو برویو بوت نے ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قیام کی تاریخ کی چھان بین کی اور اس امر کی بھی تحقیق کی کہ کس طرح سچلے بیوپاریوں کی ایک چھوٹی سی ٹولی ترقی کر کے تجارتی سالاروں کی حکمران جماعت بن گئی۔ اُس نے اُن مورخوں اور صحافیوں کے دعوے کو قطعاً رد کر دیا جو سادہ لوحی یا بے کاری سے انگریزوں کے تہذیبی مقصد کے قائل تھے۔ دو برویو بوت نے لکھا: ”انگلستان کا آخری مقصد حکومت قائم کرنا اور نجی منافع کانابے ذکر تہذیب پھیلانا۔“

بغاوت کا جائزہ لینے میں دو برویو بوت اُن لوگوں کا طرفدار تھا جو اسے متعصب ہندوؤں کی مذہبی شورش یا بے قابو سپاہیوں کا غدر تصور نہیں کرتے تھے بلکہ اسے آزادی کے لیے لوگوں کی بغاوت سمجھتے تھے جو بغیر کسی ذاتی غرض کے حملہ آوروں کے مقابلے پر آئے۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ لوگوں نے بغاوت کی کیوں کہ انہوں نے بالآخر برطانوی حکومت کے نظام میں خرابی پائی۔ اُس وقت روس کا سرکاری نظریہ ”اخبار“ ”روسک ان ویلڈ“ میں پیش کیا گیا جو ہندوستان

یوشینگ و وچانگ چین کن

چین اور ہندوستان انیسویں صدی کے وسط میں

(۱)

انیسویں صدی کے وسط کا زمانہ مختلف ایشیائی ملکوں میں قومی آزادی کی تحریکوں کے لیے عام شورش کا ایک عظیم عہد تھا۔ انقلابات یکے بعد دیگرے پیا ہوئے۔ چین میں تائی پنگ انقلاب اور دوسری جنگ افیون، ہندوستان میں عوامی بغاوتیں، ایران میں بایوں کی شورش اور اینگلو ایرانی جنگ، تمام اور لبنان میں کسانوں کی سرکشی، بوریو میں نوآبادیاتی نظام کے خلاف لوگوں کی جدوجہد وغیرہ۔ غرضیکہ ایک زبردست سیلاب تھا جو نوآبادیاتی نظام کی بدنامیوں کو بہا لے گیا۔ عوامی انقلابات کی اس امنڈتی ہوئی لہر میں غیر ملکی جارحیت اور جبر و ستم کے خلاف چینی اور ہندوستانی عوام کی جدوجہد سب سے زیادہ وسیع تھی۔ بعد میں آنے والی ایشیائی قوموں کی آزادی کی تحریکوں پر ان کا نہایت گہرا اثر پڑا اور غیر ملکی سرمایہ دار حملہ آوروں اور جاگیردار قوتوں کو بہت سخت دھکا لگا۔ ہندوستان کی جدوجہد اور چین کی شورش ایشیا میں قومی تحریک آزادی کی دو بڑی لہریں تھیں۔

گزشتہ صدی کے وسط میں ایشیا کی قومی آزادی کی تحریکوں کا آغاز دراصل مغربی سرمایہ دار حملہ آوروں کی نوآبادیاتی پالیسی کا براہ راست نتیجہ تھا۔ قوت اور سازش دونوں سے کام لے کر انھوں نے ایشیائی قوموں کو لوٹا اور غلام بنایا۔ انھوں نے ایشیائی ملکوں کے اُس وقت کے اقتصادی ڈھانچے کو توڑ پھوڑ ڈالا اور انھیں نوآبادیوں یا نیم نوآبادیوں کی حیثیت سے دنیا کی سرمایہ دارانہ منڈی میں دھکیل دیا۔ اپنے روایتی حقوق سے محروم اور بڑھتی ہوئی بھوک اور تنگدستی کا شکار ہونے کے بعد ایشیائی قومیں آزادی اور خود مختاری کی جانب صبح اور واحد راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئیں۔ یعنی غیر ملکی حملہ آوروں کے خلاف مصمم ارادے کے ساتھ جدوجہد

روشنی پھیلائیں۔ اس میدان میں ہم حلیف ہیں۔ یہاں ہم میں یکجہتی پائی جاتی ہے۔

البتہ انصاف اس حقیقت کا ملاحظہ کرنے کا تقاضہ کرتا ہے کہ روسی ویتنگ کو روسی عوام کی حمایت حاصل نہ ہوئی۔ اس کو سمجھنا کچھ دشوار نہیں۔ آزادی اور خود مختاری کے لیے جدوجہد میں ہندوستانیوں کے ساتھ ہمدردی رکھنے کے علاوہ روسی عوام خود ابھی اس ضرب سے پیچ و تاب کھا رہے تھے جو ۱۸۵۷ء کی جنگ کریمیا میں برطانوی اور فرانسیسی ہتھیاروں نے ان کے قومی فخر پر لگائی تھی۔ اس لیے ان کی ہمدردی ان لوگوں کے ساتھ تھی جو ہندوستان کو غلامی کے نوآبادیاتی جوئے سے نجات دلانے کی کوشش کرتے تھے۔

ہندوستان کے طوفان کی المناک صدائے بازگشت ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں کے اوپر سے رچھکتی ہوئی روس کے میدانوں کو عبور کر کے سینٹ پترسبرگ تک جا پہنچی۔ روسی عوام کے ترقی پسند طبقے نے اس طوفان میں بہار کے اس پہلے جھونکے کی قوت کو دیکھا جو آزادی کی آنے والی آمدھی کا پیش خیر تھا۔

روسی عالم ۵۹-۱۸۵۷ء کی ہندوستانی بغاوت کی تاریخ کا بڑی دل چسپی کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ دل چسپی تاریخ کو داخلی نظریات کا مجموعہ سمجھنے پر مبنی نہیں ہے بلکہ خارجی قوانین کا منطقی نتیجہ سمجھنے پر۔ ان خارجی قوانین کے مطالعے سے اس رخ کو سمجھنا ممکن ہو جاتا ہے جس میں سماج حرکت کر رہا ہے۔ ماضی میں ہندوستانیوں کی بہادرانہ جدوجہد، حال میں ایک بڑی قوت کی حیثیت سے ہندوستان کے ظہور اور مستقبل میں اس کی ترقی کے امکانات سے تاریخ ہند کا مطالعہ بڑا دل آویز اور خوش ہو جاتا ہے۔ روسی علما کی رائے کے مطابق ہندوستانی بغاوت کوئی الگ نخلگ واقعہ نہیں ہے۔ ہندوستان کی بغاوت، چین میں تائی پنگ شورش، ایران میں بابوں کی تحریک اور انڈونیشیا میں تحریک آزادی کا ظہور۔ یہ سب کچھ ان ملکوں کو نوآبادیوں میں بدلنے کی کوششوں کا عوامی رد عمل تھا۔

ہندوستانی بغاوت برطانوی حکومت کے ذات منظم کی گئی اور سان کارنگرا اور سپاہی اس کی روح رواں تھے۔ اس قوت کے علاوہ جاگیرداروں کی بھی ایک ہمت تھی جس کی قیادت ان روسا نے کی جنہیں انگریزوں نے معزول کر دیا تھا اور جنہوں نے اپنے کھوئے ہوئے حقوق اور اختیارات خصوصی دوبارہ حاصل کرنے کے لیے یو تو کو غنیمت جانا۔ ظاہر ہے کہ بغاوت میں بڑی خاتی تنظیم کی کمی تھی۔

اس کے باوجود کہ بغاوت کو با دیا گیا اس نے ہندوستان میں قومی شعور پیدا کرنے میں نہایت اہم پارٹ ادا کیا اور نوآبادیاتی نظام کی مخالفت قوتوں کی طرف سے بلا لحاظ مذہب، ذات اور زبان متحدہ جدوجہد کے لیے ایک مستحکم بنیاد رکھی۔

اس بات کے کہ اس وقت کے حالات کی وجہ سے دونوں ملکوں میں براہ راست تعلقات قائم کرنے کی راہ میں آج کی نسبت بڑی رکاوٹیں درپیش تھیں۔ درحقیقت ہندوستانی اور چینی عوام مشترکہ دشمن کے خلاف اپنی جنگ میں ایک دوسرے پر اثر انداز تھے اور ایک دوسرے کے معین تھے۔

دوسری جنگ انیون اُس وقت چھڑی جب برطانوی حملہ آوروں نے (جو چوری و چھپے مال لے جانے والوں کے جہازوں کو پناہ دے رہے تھے) کینٹن کے پُر امن باشندوں کی بڑی تعداد کو قصداً قتل کیا۔ بحری ڈاکو یعنی نام نہاد ”ہتھب لوگ“ جن کی پشت پر تو پناہ اور تلوں سے بیس جنگی کشتیاں تھیں، دریائے پرل سے اوپر کی طرف اودھم مچاتے کینٹن تک چڑھ آئے۔ ۲۷ اکتوبر ۱۸۵۷ء سے انھوں نے پُر امن شہر پر متواتر بم برسائے۔ اُن کے بحری فوجی دستے شہر میں گھس گئے اور بے حد مظالم ڈھائے۔ زنا بالجبر، اغوا، قتل، اور ان مکانات اور جائیدادوں کو آگ کی نذر کرنا جن پر وہ ہاتھ ڈال سکے۔ حملہ آوروں کا خیال تھا کہ طاقت کے اس مظاہرے سے چینی عوام ڈر کر اطاعت پر مجبور ہو جائیں گے۔ لیکن یہ ان کی خام خیالی تھی۔ لوگوں نے دشمن کے حملے کا دم کمر مقابلہ کیا۔ برطانوی جنگی جہاز جو دریائے پرل میں گھس آئے تھے، طاقت کا مظاہرہ کرنے میں ناکام ہوئے اور مدافعت کرنے والوں کے زبردست جوابی حملوں سے جلد ہی کینٹن کے گرد و نواح سے تیزی کے ساتھ پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے۔

اس الجھن سے نجات پانے کے لیے اور جنگ کو وسعت دینے کے لیے شکست خوردہ حملہ آوروں نے ہندوستان سے فوجی دستے بھیجے کی تدبیر سوچی۔ ۱۰ جنوری ۱۸۵۷ء کو برطانوی وزیر چین جے باؤرنگ نے ہانگ کانگ سے ہندوستان کے برطانوی گورنر جنرل، کیننگ کے نام ایک سرکاری مراسلہ بھیجا۔ اس میں یہ التجا کی گئی کہ ”اگر ممکن ہو تو حکم معطر کے پانچ ہزار فوجی جوان کسی قدر تو پناہ کے ساتھ بلا تاخیر ہندوستان سے چین لڑنے کے لیے بھیج دیے جائیں۔“ مشرق بعید کے برطانوی بحری بیڑے کے کمانڈر ایم۔ بیٹور نے بھی کیننگ سے یہی درخواست کی۔

لیکن حملہ آوروں کا اندازہ غلط نکلا۔ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان اس قابل نہیں تھا کہ چین کے خلاف برطانیہ کی جارحانہ جنگ کے لیے کوئی کمک بھیج سکے۔ ہندوستان میں برطانیہ کی بے رحمانہ نوآبادیاتی پالیسی نے نفرت کے شعلے بھڑکا دیے تھے۔ اب ہندوستان عوام مزید ظلم اور غلامی کی حالت کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ انگریز دشمنی کے بڑھتے ہوئے جذبات اُن ہندوستانی فوجیوں میں بھی پائے جاتے تھے جنہیں خود انگریزوں نے فوجی تربیت دی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے سویم بہار میں

کرنے اور ان بیڑیوں کو توڑنے پر مجبور ہو گئیں جن میں انھیں جبراً جلا گیا تھا۔

چنانچہ ایشیا میں مغربی سرمایہ داری کی جارحانہ قوتوں کے بڑھنے اور پھیلنے پر نوآبادیاتی نظام کے خلاف جدوجہد ایک روزمرہ کا واقعہ بن گیا اور اس نے لاچار مظلوم اور غلام ایشیائی قوموں کی ایک عظیم مشترکہ ہم کی صورت اختیار کر لی۔ جدوجہد کے یکساں نتائج، مفاد اور نصب العین نے ایشیائی قوموں کو ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا اور ایشیا کی قومی آزادی کی تحریکوں میں نہایت قریبی رابطہ پیدا کر دیا۔ ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت پر بحث کرتے ہوئے مارکس نے بتایا کہ قومی آزادی کی یہ ملک گیر جنگ اُس وقت شروع ہوئی جب ایشیا کی عظیم قومیں انگریزی اقتدار کے خلاف عام نفرت کا اظہار کر رہی تھیں۔ بلاشبہ بنگال کی فوج کی بغاوت کا ایران اور چین کی جنگوں کے ساتھ گہرا تعلق تھا۔^{۱۷}

برطانوی فوجوں کے ایچکھو ایڈانی جنگ میں الجھنے سے ہندوستان کی عظیم بغاوت کے لیے سازگار حالات پیدا ہو گئے۔ برطانوی اور فرانسیسی حملے کے خلاف چینی لوگوں کی دوسری جنگ انہوں نے ہندوستانی بغاوت دونوں کا دراصل یہ اثر ہوا کہ دشمن بڑھنے سے ڈر گیا جس سے دونوں کو فائدہ پہنچا۔ کسی ایشیائی ملک کی قومی آزادی کے لیے جدوجہد کی کامیابی اور ناکامی کا دوسرے ملکوں کی قومی آزادی کی تحریک پر دور رس اثر پڑتا تھا۔ یہ قریبی تعلق موجود تھا اگرچہ اس وقت ایشیا کے لوگوں نے اس کی اہمیت کو نہ سمجھا۔

(۲)

چین کے خلاف برطانیہ اور فرانس کی ۱۸۵۶ء کی دوسری جنگ افیون فارت گری کی جنگ تھی جو چین پر اپنے غلبے کو بڑھانے کے لیے مغربی سرمایہ دار لیٹروں نے شروع کی۔ خارجی حملے کے خلاف چینی عوام کی مزاحمت ایک برحق قومی جنگ میں بدل گئی۔ دراصل کئی پہلوؤں سے یہ پہلی جنگ افیون کا ہی اعادہ اور حصہ تھی جو ۱۸۴۰ء میں شروع ہوئی تھی۔ لیکن اُس وقت کی عالمی صورت حال کے پیش نظر ان دو جنگوں کے فرق کو سمجھنا ضروری ہے۔ پہلی جنگ افیون کے دوران چینی لوگوں کو کوئی بلا واسطہ یا بالواسطہ ارادہ ملی لیکن دوسری جنگ افیون کے دوران ہندوستانی عوام رفیق اور بھائی بن کر ان کی مصیبت کی گھڑی میں آڑے آئے جب کہ وہ خود ۱۸۵۷ء میں برطانوی نوآبادیاتی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے بہادری کے ساتھ جدوجہد کر رہے تھے۔ باوجود

ہے۔ باغیوں کے لیے میدان صاف ہوگا اور ہم خوب جانتے ہیں کہ وہ کس طرح موقعے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بغاوت کا یہ شعلہ جنگل کی آگ کی طرح پھیل جائے گا اور بغیر دے بھرکتا رہے گا جب تک دہلی باغیوں کے قبضے میں رہے گی کسی جگہ نئی بغاوت رونما ہوگی۔ یہ صورت حال خطرناک ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ بعض نہایت اہم چھاؤنیوں میں جن کا میں نے ذکر کیا ہے ایسی زمینیں گڑی ہوئی ہیں اس نازک صورت حال کی اصلاح کے لیے کیننگ نے ایلیگن کو لکھا کہ وہ بنگال میں لوکھڑاتے ہوئے برطانوی نظام کو سہارا دینے کے لیے اپنی فوجیں کلکتے کی جانب بھیج دے۔ ایک سرکاری دستاویز میں یہ قلمبند ہے کہ گوا ایلیگن چین میں اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے بے تاب تھا لیکن اُسے کیننگ کی درخواست کی تعمیل کرنا پڑی۔ اس طرح بہادر ہندوستانیوں نے چین کی جانب بھیجی گئی برطانیہ کی بھائی فوج کو راستے ہی میں روک لیا۔

آزادی اور خود مختاری کے لیے ہندوستانی لوگوں کی مصمم جدوجہد انگریزوں کے حملے کے خلاف چینی جنگ مزاحمت کے لیے پھر سازگار ثابت ہوئی۔ ہمارے پہلے ۱۸۵۷ء کو برطانوی وزیر خارجہ کلیرنڈن کی جاری کی ہوئی ہدایات کے مطابق یہ تجویز تھی کہ ایلیگن چین میں وارد ہوتے ہی اپنی بھائی فوج کے ساتھ شمال کی جانب چڑھائی کرے گا اور منچو سرکار کو سنگینوں کے زور سے نئے غیر منسادی معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے مجبور کرے گا۔ لیکن ہندوستانی شورش کے سبب یہ جارحانہ مقصد ایک سال تک پورا نہ ہو سکا۔

ہندوستانی بغاوت نے چین میں حملہ آور فوجوں کو جانے والی ٹک کور وک لیا۔ یہ تصویر کا ایک رُخ ہے۔ دوسری طرف برطانوی حملے کے خلاف چینی عوام کی جنگ ہندوستانی لوگوں کی جدوجہد کے حق میں جوابی امداد ثابت ہوئی اور اس نے دشمن کو روکنے میں مدد دی۔ ہندوستانی بغاوت کے پھوٹنے کے بعد انگریزوں نے مشرق بعید میں اپنی تمام فوجوں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی تاکہ پہلے ہندوستانیوں کی سرکوبی کی جائے اور پھر چین سے بچا جائے۔ لیکن چینی عوام کی مسلسل جدوجہد نے ان کی یہ تدبیر ناکام کر دی۔ اگرچہ ایلیگن نے چین کو جانے والی برطانوی فوج کا کچھ حصہ ہندوستان کو بھیج دیا پھر بھی چینیوں نے برطانوی بحری اور بری فوجوں کی خاصی تعداد کو الجھائے رکھا۔ اپنی ڈاکہ زنی کے مفاد کے تحفظ کی خاطر حملہ آور چین میں ان فوجوں کو رکھنے پر مجبور تھے۔

جون ۱۸۵۷ء میں ہندوستان بغاوتوں کے شعلے میرٹھ اور دہلی سے گنگا کی وادی میں دوسرے مقامات تک پھیل گئے۔ کلکتے میں بھی شورش کی آگ مسلک رہی تھی۔ برطانوی حکمران خوف

ہندوستانی فوجیوں نے جو بیدار ہو چکے تھے، انگریزوں کے خلاف یکے بعد دیگرے کئی ایک جھوٹی بغاوتیں پیا کیں۔ یہ آنے والے انقلابی طوفان کے آثار تھے۔ اُن حالات کے پیش نظر ہندوستان میں برطانوی حکام کی حالت چین میں حملہ آوروں کی نسبت کسی طور بہتر نہ تھی۔ چین کے خلاف حملے کے لیے ہندوستان سے فوجی دستے بھیجا خام خیالی تھی۔ کیننگ کے نام باورنگت کی اپیل قدیم تاریخی دستاویزات کے انبار میں اس طرح کھو گئی جیسے نکر سندر میں کھو جاتا ہے۔ پس دوسری جنگ افیون کے آغاز سے ہی چینی لوگوں کو ہندوستانی بھائیوں سے عملی طور پر امداد ملنی شروع ہو گئی تھی۔ ممانعت، آزار اور خود مختاری کے لیے اپنی اپنی جدوجہد میں دونوں تھیلوں نے ایک دوسرے کی مدد کرنا اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا شروع کر دیا اور دونوں نے مل کر دشمن کا مقابلہ کیا۔

مارچ ۱۸۵۷ء میں برطانوی سرکار نے مارشلس اور برطانیہ سے ممکن سمجھے کا فیصلہ کیا۔ نوآبادیاتی حکومت کے مسلم البتوت استاد لارڈ ایلگن کو جو بعد میں ہندوستان کا گورنر جنرل بنا اور طویل عرصے تک اس عہدے پر مامور رہا، چین میں سفیر خصوصی مقرر کیا گیا۔ اس کے ذریعہ کام تھا کہ بڑے پیمانے پر مسلح قوت کا مظاہرہ کر کے دشمن کو مدعو کرے۔ لیکن جب ہندوستانی لوگوں نے بڑی حد تک اس نئے جارحانہ منصوبے میں روڑا اٹکا دیا تو نوآبادکاروں کو بڑی ذہنی کوفت ہوئی۔ ۱۰ مئی کو جب برطانوی ہوائی فوجوں نے مشرق کی جانب حرکت کی تو بہادر ہندوستانیوں نے برطانیہ کے خلاف عظیم بغاوت کا جھل بجادیا۔ دہلی پر فی الفور قبضہ کر لیا گیا۔ نوآبادیاتی حکومت کو خطرہ درپیش ہوا کہیں اس کا تختہ الٹ جائے۔ اس سے تھوڑی دیر ہی پہلے باورنگت نے کیننگ سے امداد کے لیے درخواست کی تھی۔ اب کیننگ کی باری تھی کہ ایلگن سے مدد مانگے۔ جب ایلگن سنگاپور کے راستے سے چین کو جا رہا تھا تو ۲۳ جون ۱۸۵۷ء کو لارڈ کیننگ کی طرف سے اُسے ایک مراسلہ ملا اس میں ہندوستان کی دور دور تک پھیلی ہوئی بغاوت کا بیان اور انگریزوں کی نازک حالت کا ذکر تھا۔ کیننگ نے لکھا،

”گنگا کی وادی میں کلکتہ اور آگرہ کے درمیان ۵۰ میل لمبے علاقے میں مشکل سے ایک ہزار فوجی فوج موجود ہے جب کہ کئی اہم شہر اور چھاؤنیاں ایسی ہیں جہاں قلعے، فوجی گودام، خزانے اور فرنگیوں کی بڑی شہری آبادیاں ہیں۔ ان پر صرف ایسی فوجی دستے متعین ہیں۔ آگرہ میں سے کسی مقام پر بغاوت رونما ہوئی تو حکومت ہند کے پاس پانچ اس کو دبانے کے لیے کوئی فوج نہیں

کس طرح ہندوستانی بغاوت پر خوشیاں منائیں۔ "اس وقت ہانگ کانگ کے کچھ لوگوں نے بتایا کہ انگریزوں کو روپے کی اس قدر تنگی کا سامنا ہے کہ نہ صرف فوجوں کو تنخواہیں دیر سے ملتی ہیں بلکہ انھیں اپنے روزمرہ کے اخراجات پورے کرنے میں بھی مشکل پیش آتی ہے۔ انھیں چین کے ساتھ تجارت کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ کچھ اور لوگوں نے یہ بیان کیا کہ ہمیں پتہ چلا ہے کہ برطانوی صوبہ بنگال نے بغاوت کر دی ہے اور انگریز فوجی دستوں کو شکست ہوئی ہے۔ ایک دو ہفتے کے بعد پھر یہ افواہ پھیل کر انگریزی فوجی دستے گھات میں چھپے بیٹھے تھے اور ان کو کلیئر نیٹ وناؤد کر دیا گیا ہے۔ ایک سپہ سالار اور بعض لوگوں کے قول کے مطابق شہنشاہی خاندان کا ایک داماد زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ دوسرے جرنیل اس قدر دہشت زدہ تھے کہ ان کو کچھ نہ بوجھتا تھا کہ کیا کریں۔ یہ خبریں لب لباب یسٹلی تھیں اور ہر کوئی ایک ہی بات کہتا تھا۔ جب گورنر جنرل ایس۔ منگ شٹین سے اصل حالت کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا کہ مجھے بھی مختلف اطراف سے اسی قسم کی اطلاعات ملی ہیں۔ حسن اتفاق سے ہانگ کانگ کے تاجروں سے جو خطوط آتے ان میں بھی یہی داستان ہوتی۔ لوگ خوشی سے پھولے رہتے۔"

اگرچہ ہندوستان کے واقعات کا یہ بیان کلیئر صمیم ثابت نہ ہو (اور اس وقت یہ بات ناگزیر تھی) پھر بھی بغاوت سے متعلق کو انگ کانگ کے لوگوں کی شدید بے تابی اور یہ خواہش ظاہر ہے کہ ان کے ہندوستانی بھائی کامیاب ہوں۔ اس وقت برطانوی حملے کے خلاف کو انگ کانگ جنگ کا سب سے اگلا محاذ تھا۔ یہ نسبتاً ہندوستان کے قریب تھا اور ہانگ کانگ اس کے عین پڑوس میں تھا۔ اس لیے اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ کو انگ کانگ کے لوگ سب سے پہلے ہندوستانی واقعات کی خبریں پاتے اور ان سے متاثر ہوتے۔

نہ صرف چینی عوام ہی ہندوستانی بغاوت کے واقعات میں گہری دل چسپی رکھتے تھے بلکہ ایسے منگ شٹین بھی جو اس وقت کو انگ کانگ اور کو انگیس موبوں کا گورنر جنرل اور صوبہ کو انگ کانگ میں برطانوی حملہ آوروں کے خلاف جنگ کا سپہ سالار تھا، ہندوستانی لوگوں کی جدوجہد پر پوری پوری توجہ دیتا تھا۔ شہنشاہ کے نام عرضداشتوں میں وہ بار بار ہندوستان بغاوت کی کامیابی کا ذکر کرتا اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچتا کہ "غیر ملکیوں کا حشر کسی طور اچھا نہ ہوگا۔ یہی اہم وجہ تھی کہ برطانوی حملہ آور "کک ز بیج" کے "۱۸۵۹ء میں سن کیا ٹنگ کے تاتاری جرنیل، چلائینٹا اور باندین ناہموئی نے سن کیا ٹنگ کے روسی تو فصل کی تجویز پر عمل کرتے ہوئے رسمی طور پر یہ مشورہ دیا کہ برطانیہ کے خلاف معاہدہ کرنے

سے حواس باختہ ہو گئے۔ بار بار کیننگ نے ایلیگن (جو ہانگ کانگ میں پہنچ چکا تھا) سے زیادہ فوجی امداد بھیجنے کا تقاضا کیا۔ اول الذکر کے بار بار مدد کے لیے اپیل کرنے کے باوجود ایلیگن جو خود مشکل میں تھا، یعنی علاقے سے ایک کھن سہا ہی نہ پاسکتا تھا۔ اُسی سال ۲۹ جولائی کو اس نے کلیرنڈن کی مدت میں مذکورہ ذیل رپورٹ بھیجی:

”لارڈ کیننگ کی درخواست کی حتی المقدور تعمیل کی غرض سے ان وسائل کا ملاحظہ کرنے کے بعد جو میرے اختیار میں ہیں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ایک طرف تو ہانگ کانگ میں مامور قلیل قلعہ دار فوج کے کسی حصے کو ہندوستان کی جانب بھیجنے کی کوشش بے سود ہوگی، دوسری طرف بحری فوج میں شھوس کی کرنا کافی خطرے کا موجب ہوگا کیوں کہ مختلف معاہداتی بندرگاہوں میں مقیم ہومنیوں کی حفاظت اور کینٹن کے ساتھ سلسلہ رسل و رسائل کے قیام کے لیے اسی فوج پر ہمارا مدار ہے۔“

آخر کار ایلیگن نے کیننگ کو ”اخلاقی امداد“ دینے کا انوکھا ڈھنگ اختیار کیا، وہ تنہا کلکتے گیا۔ اس نے اپنی آمد کی یہ وضاحت کی کہ اس کی وجہ سے برطانوی فوجیوں کا حوصلہ بڑھے گا کیوں کہ اس کی موجودگی کو چین سے بھاری کمک کا پیش خیر سمجھا جائے گا۔ ”یعنی اور ہندوستان عوام کی مشترکہ ضروریوں سے برطانوی حملہ آوروں کی حالت ڈالوا ڈول اور نازک ہو گئی ہوگی۔“

چینی عوام کو اپنے لڑنے والے ہندوستانی بھائیوں کے ساتھ گہری ہمدردی تھی اور ان کی کامیابیوں سے ان کے حوصلے بلند ہوئے لیکن ہندوستانی نصب العین کے حق میں ہمدردی کا یہ احساس نوثر طور پر ظاہر نہ ہو سکا کیوں کہ اس وقت چین کے اپنے کوئی اخبار نہیں تھے اور جو تحریری دستاویزات اس کے ہاتھ لگیں ان کی تعداد محدود تھی۔ پھر بھی حکمران طبقے کی چھوڑی ہوئی متفرق تحریروں سے یہ پتہ چلانا مشکل نہیں کہ ہندوستانی بغاوت کے تیل چینی لوگوں کا رویہ کیا تھا۔ ایک مضمون بعنوان ”کینٹن میں بے رنگ شین کی انگریزوں کے ہاتھوں گرفتاری کے کوالف“ میں سوئے خو۔ چینگ نے جو سفارت کا ایک ”کن تھا“ لکھا، ”کینٹن کے لوگ انگریزوں سے نفرت رکھتے ہیں۔ یہ افواہیں پھیلی ہوئی ہیں کہ انگریزوں کے تحت ملک ہندوستان نے بغاوت کر دی ہے اور برطانوی فوج کو شکست ہوئی ہے اور وہ کئی کمانڈروں سے ہاتھ دھو چکے ہیں“ اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ صوبہ کو ہانگ کانگ کے عوام کس طرح سرگرمی کے ساتھ ہندوستانی بغاوت کی خبریں حاصل کرتے رہے۔ ہوانگ چے، بمبرٹھ صلیع نہاں، صوبہ کو اننگ اپنی تعینیت ”غیر ملکیوں کے ساتھ راہ و رسم کی دانستان“ میں اپنے ذاتی تجربے کو بیان کرتے ہوئے کسی قدر تفصیل کے ساتھ بتاتا ہے کہ کو اننگ کے عوام نے

نوابا دیات نظام کے خلاف اُن کی جدوجہد کمزور ہو جائے صحیح راستے سے ہٹ جائے اور بالآخر ناکام ہو جائے۔ ۱۷۵۷ء میں ہی جب ہندوستانی بناوت کی آگ تیزی سے بھڑک رہی تھی "ٹائمرز" کے ایک نامہ نگار نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ غیر معتبر ہندوستانی فوجیوں کو چینوں کے ساتھ لڑنے کے لیے بھیج دیا جائے اس نے کہا: "بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستان میں تادیبی اقدامات کو عمل میں لانے اور ساتھ ہی چین کے ساتھ جنگ کو جاری رکھنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے گی۔ بے شک بعض ایسی سپاہی رجمنٹیں ہیں جو بظاہر باغی نہیں ہیں لیکن ان کے ہم مذہبوں کے خلاف کارروائی کرنے میں اُن پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ ان کو چین میں کیوں نہ بھیج دیا جائے؟" کافی الواقعہ دوسری جنگ انہوں کے آخری مراحل میں برطانوی حکام نے کچھ ہندوستانی فوجیوں کو چین بھیجا۔

جب ہندوستانی بغاوت پوری طرح دب گئی تو انگریزوں اور منچو حکمرانوں میں گاڑھی چھٹنے لگی۔ انگریزوں نے ہندوستانی فوجی بھیجے تاکہ وہ توپوں کا نشانہ بن کر چینی انقلاب پسندوں کی سرکوبی میں منچو فرمانرواؤں کی مدد کریں۔

انگریزوں کو ایشیائیوں کے ساتھ ایشیائیوں کو لڑانے کا ناپاک منصوبہ جو جاپان کی واقعات ان کی حسب خواہش رونما ہوئے۔ جب وہ سیکڑوں ہندوستانی فوجیوں کو تائی پنگوں کے خلاف میدان جنگ میں جنونک رہے تھے تو کچھ باشعور ہندوستانی انقلاب پسندوں کے ساتھ شامل ہو گئے اور ان کے دوست بن گئے۔ انہوں نے اپنی توپوں کا سہہ تمام غیر ملکی دخل انداز فوجیوں کی طرف موڑ دیا جن میں برطانوی فوجی دستے بھی شامل تھے۔ چینی ہندی تعلقات کی تاریخ میں یہ ایک سنہرا ورق ہے اور نوابا دیات نظام کے خلاف جنگ میں چینی اور ہندوستانی غلام کے مابین یہ سیدھے تعاون کا آغاز تھا۔

جیلا تک دستیاب مواد سے ہمیں معلوم ہے تائی پنگوں کی صفوں میں ہندوستانیوں کی شمولیت کا ذکر پہلی بار سینگ کو فان کے ایک خط میں کیا گیا جو تائی پنگوں کا جانی دشمن تھا۔ ایک اور جرنیل ہونگ اوں کے خط کے جواب میں اس نے لکھا: "میں نے سنا ہے کہ صدر مقام ضلع یوشان کا محاصرہ کرنے میں باغی وفادار پرنس لی۔ سو۔ چینگ کے سپاہیوں میں کچھ کالی چڑی والے غیر ملکی بھی شامل تھے۔"

جس چیز کا ذکر یہاں سینگ کو رہا ہے وہ ۱۸۵۷ء کے شروع میں نامور مالدار لی۔ سو۔ چینگ کے زیرِ کان تائی پنگ فوجوں کا صوبہ کیا گسی میں صدر مقام ضلع یوشان کا محاصرہ ہے۔ "کالی چڑی والے" غیر ملکی ضرور ہندوستانی ہوں گے کیونکہ منچو حکمران عام طور پر ہندوستانی فوجیوں کو "ٹائمرز" کے کالی چڑی والے فوجی" کہتے تھے۔

کے لیے ایک خاص وفد ہندوستان کو بھیجا جائے۔ یہ ایک ایسی اعلیٰ اہم تھی جو ان کی رائے میں دشمن پر فتح کی موجب ہوگی۔ شہنشاہ کے نام یادداشت میں چلائیٹا اور فافولی نے روسی تو نصل کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا:

”اب برطانیہ اور فرانس دونوں اپنی فوجوں کو منظم کر رہے ہیں۔ وہ جنگی جہازوں کی بھی رقت کر رہے ہیں۔ وہ انتقام کی غرض سے اگلے سال فوری یا مارچ میں اپنی متحدہ افواج کے ساتھ ٹائنسن پر چڑھائی کرنے کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ اس وقت مصلحت کا تقاضہ یہ ہے کہ انھیں کی لاکھی سے اُن کا سر کھلا جائے۔ ہندوستان ایک زرخیز ملک ہے اور برطانوی مقبوضات میں نہایت اہم مقام رکھتا ہے۔ گو وہاں قلعوں میں برطانوی فوجیں متعین ہیں لیکن وہاں عوام کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف شدید نفرت کا جذبہ پایا جاتا ہے اور عرصے سے بغاوت کی آگ مسلک رہی ہے۔ ہمارے لیے یہ موقع غنیمت ہے۔ اگر کوئی قابل شخص خفیہ طور پر وہاں بھیجنا ممکن ہو اور ہندوستانیوں سے تعاون کرنے کا وعدہ لیا جاسکے تو انگریز اُن کے مقابلے پر نہ ٹھہر سکیں گے۔ اس طرح انگریزوں پر اندرونی ہنگامے کا خوف طاری ہو جائے گا اور پھر شاید چین کے ساتھ جنگ کا خطرہ مل جائے گا۔“

ایک اور یادداشت میں چلائیٹا اور فافولی نے پھر اس بات پر زور دیا کہ ”جو کچھ روسی تو نصل نے کہا ہے وہ بالکل درست ہے اور اس کی تجویز قطعیاً قابل عمل ہے۔“ انھوں نے شہنشاہ سے درخواست کی کہ اس تجویز کو قبول کیا جائے۔ اگرچہ اس زمانے کی مجبورلوں کے سبب اس تجویز کی تعمیل ناممکن تھی تاہم یہ بات محلِ غور ہے کہ سو سال پہلے چین میں غیر ملکی حملے کے خلاف مشترکہ مزاحمت کے لیے ہندوستان کے ساتھ معاہدہ کرنے کا خیال موجود تھا۔

(۳)

اگرچہ برطانوی نوآبادکاروں نے ہندوستانی لوگوں کی بغاوت کو بے دردی کے ساتھ دبا دیا اور دوسری جنگِ افیون میں چین نے شکست کھائی پھر بھی ان دونوں ملکوں کی قومی آزادی کے لیے جدوجہد پورے زور کے ساتھ جاری رہی۔ جن دور اندیش اور دلاور ہندوستانیوں نے چینی عوام کے انقلاب میں حصہ لیا ان کے بہادری کے کارناموں کا علم بھی اسی وقت ہوا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ چینی اور ہندوستانی لوگوں کا باہمی رابطہ برطانوی حملہ آوروں کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا کیوں کہ وہ چاہتے تھے کہ یہ دو بڑی ایشیائی قومیں باہم نفرت کریں اور لڑیں۔ پس تاکہ

نے جو سابقہ پانچویں بمبئی میٹروپولیٹن سے تعلق رکھتے تھے تائی پنگوں کے ساتھ لڑتے لڑتے اپنی جان دی۔ ۱۵

اسی سال ۱۹۴۷ اکتوبر کو صوبہ چیکیا ٹنگ میں پینچو اور یو ہانگ کے درمیان بمقام شہلی چانگ چچ ایک لڑائی میں پینچو اور فرانسیسیوں کی متحدہ فوج نے "چند لکھروں کو ہلاک کرنے کا دعویٰ کیا۔ ان میں ایک کالی چمڑی والا اجنبی بھی تھا۔ ۱۶

تائی پنگوں میں کالی چمڑی والے اجنبیوں کی موجودگی کی اور مثالیں بھی مل سکتی ہیں۔ ۱۷ مذکورہ بالا تین مثالوں میں تائی پنگ فوجیں ل سو چیگت کے زیرِ کمان تھیں جو غیر ملکی مداخلت پسندوں کے مقابلے پر انقلاب پسندوں کے کیمپ میں سب سے زیادہ مستقل مزاج اور باہمت سپہ سالار تھا۔ اس لیے اس بات کا پورا احتمال ہے کہ غیر ملکی فوجی دستوں کے خلاف متواتر جنگوں میں کچھ ہندوستانی سپاہی اس کی فوجوں میں چلے آئے۔

جو ہندوستانی سپاہی چین میں برطانوی فوجی حکام کی سخت نگرانی اور دباؤ کے تحت تھے، ان کے لیے تائی پنگوں کی طرف چلے آنا کس طرح ممکن تھا؟ جو تاریخی مواد دستیاب ہے اس کے مطابق اس بات کی تصدیق ہو سکتی ہے کہ جنگ کے فتنہ شدہ ہندوستانیوں نے میدانِ جنگ میں ہتھیار ڈال دیے تھے وہ انہی میں سے تھے جو انقلاب پسندوں کے ساتھ مل گئے تھے۔ چین میں برطانوی وزیر کے نام ایک خط مورخہ ۱۹۴۲ء میں شنگھائی کے برطانوی توفصل نے لکھا: "ایک دو ملین ہوئے سوچو۔ سب بلجیم کا ایک ہم جو آیا تھا۔ اس نے کہا: میں نے شہر میں دو فرنگیوں کو دیکھا جو اسلحہ اور گولہ بارود کے نفع بخش کاروبار کا ذکر کر رہے تھے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ جو چار سپاہی گدہ شہر مئی میں میدانِ توپ پر قبضہ کرنے کے وقت قیدی بنائے گئے تھے ابھی زندہ ہیں اور سوچو میں موجود ہیں۔ ۱۸

نیز اور بھی ہندوستانی فوجی ہوں گے جو ان چار سپاہیوں کی طرح گرفتار ہو کر آہستہ آہستہ عملی زندگی کے مشاہدے اور تجربے سے روشن خیال ہو گئے اور بعد میں انھوں نے رضا کارانہ اپنی خدمات چینی انقلاب پسندوں کو پیش کیں۔

ہندوستانیوں کی کچھ کمتر تعداد مختلف طریقوں سے تائی پنگوں کے ساتھ شامل ہوئے۔ انگریزوں کے نام کے ایک انگریز نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے کہ وہ خود اور ایک "ہندوستانی ساتھی" کس طرح اکتوبر ۱۹۴۷ء میں تائی پنگوں کے ساتھ شامل ہونے کے لیے شنگھائی سے سوچو گئے، ۱۹ بظاہر "ہندوستانی ساتھی" ایک رضا کار تھا جو تائی پنگ تحریک کا حامی تھا۔ یہ کتاب ایک برطانوی

جن حالات میں ہندوستانی لی سوچینگ کے زیر کان خدمت بجالانے کو آئے وہ پردہ تاریکی میں ہیں لیکن ہم یہ بات یقیناً جانتے ہیں کہ اگست ۱۸۶۰ء میں جب آئی نے ٹنگائی پر فوج کشی کی تو برطانوی حاکم نے حکم کلامدخلت کی اور ہندوستانی فوجی دستوں کو تائی پنگوں کے خلاف لڑنے کا حکم دیا۔ ۱۱ جلد بعد آئی کے فوجی دستے کیا لگی میں گھس گئے۔ اس بات کا قوی احتمال ہے کہ جو ہندوستانی ان میں شامل تھے وہ تلو ٹنگائی کی برطانوی فوج سے آئے ہوں گے۔

یہ حقیقت قابل غور ہے کہ جب برطانوی حکام تائی پنگوں کی سرکوبی میں براہ راست حصہ لینے لگے تو اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد ہندوستانیوں نے تائی پنگوں کے ساتھ مل کر لڑائی کی۔ اس سے ظاہر ہے کہ بعض دود اندیش ہندوستانی چین کی قومی آزادی کے نصب العین کے حامی تھے اور برطانوی حملے کے خلاف جدوجہد میں بفرار راست شامل ہو گئے۔ انھوں نے برطانوی مداخلت پسندوں کے برعکس روش اختیار کی۔ انھوں نے نوآبادیاتی نظام کے خلاف چینی اور ہندوستانی عوام کے مابین سیدھے تعاون کی بنیاد رکھی۔ ان کی یہ دین ہمیشہ یادگار رہے گی۔

تھوڑی مدت کے بعد ہی مزید ہندوستان فوجیوں کو تائی پنگ تحریک کے انقلاب پسندوں کے قبل عام کو زیادہ شدت کے ساتھ انجام دینے پر مجبور کیا گیا۔ ۱۲ یہ واقعی افسوس کا مقام تھا۔ البتہ تائی پنگوں اور مداخلت پسندوں کے مابین جدوجہد کے تلخ ترین برسوں (۱۸۶۲-۶۳ء) کے دوران باشعور ہندوستانیوں کی روز افزوں تعداد میدان جنگ میں بھی انقلاب پسندوں کا ساتھ دینے لگی جہاں انتہائی گھسان کی لڑائیاں لڑی گئیں دیکھا لگی اور چیکیا لنگ کے صوبوں کے مختلف علاقوں میں) چند مثالیں حسب ذیل ہیں: ۱۹ فروری ۱۸۶۳ء کو شاؤ ہنگ موہ چیکیا لنگ کی ایک لڑائی میں تائی پنگوں کے ساتھ صف آرا ہندوستانیوں نے ایک فرانسیسی افسر تار دو موادرے کا کام تمام کرنے میں مدد کی۔ یہ افسر منچوؤں کا مددگار تھا۔ منچو سرکار کی دستاویزات کے مطابق منچوؤں اور غیر ملکیوں کی متحدہ فوجوں نے اس دن "سی کو گیٹ کے باہر سے شاؤ ہنگ پر بمباری کی۔ شہر کی سو فیصد سے زیادہ بلند دیوار کو گرا دیا اور بے شمار فزاقوں کو ہلاک کر دیا۔ تار دو آکیلا پل پر کھڑا تھا اور اپنے فوجی دستوں کو شہر کی دیوار پر چڑھنے کی تاکید کر رہا تھا۔ پتھر کلا بند تو توں اور کنکروں کے ساتھ لیس باغی لشکروں کی حفاظت پر مامور تھے۔ پچاس ساٹھ کالی چڑی والے اجنبیوں نے باغیوں کی امداد میں تار دو پر سیدھی بندوق سرکی اس کے سر میں گولی لگی اور جان بحق ہوا۔" ۱۴

اسی سال ۲ مئی کو کیا لنگ موہوہ کے ضلع تائی سانگ میں ایک مٹوہیرو کے دوران نین سپاہیوں

ان کی غیر فانی روح کے وارث ہیں۔ ان میں سے کئی ایک نے چینی عوام کے انقلابی مقصد کے لیے اپنی جانیں قربان کیں۔

البتہ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اُس وقت ہندوستان اور چین کی عظیم قوموں کے درمیان تعاون عام اور مکمل نہ تھا بلکہ ابھی ابتدائی حالت میں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ برطانوی حملہ آوروں نے جو اُس وقت سختی کے ساتھ ہندوستان پر حکومت کرتے تھے ہندوستانیوں کو چین میں جا کر اپنے مفاد کے لیے لڑنے پر مجبور کیا۔ اس سے ہندوستانی اور چینی عوام کے بیچ زیادہ دوستانہ رابطہ اور مفاہمت کے قیام میں رکاوٹ پڑی۔ جن ہندوستانی فوجیوں کو چین میں بھیجا گیا وہ بے شک برطانوی جارحانہ پالیسیوں کا شکار تھے۔ ان کا حشر یہ ہوا کہ وہ برطانوی فوجی حکام کے حکم کے بندے اور غلام بن کے رہ گئے۔ یہ بھی برطانوی نوآبادیاتی نظام کا قصور تھا۔

اب تاریخ نے اپنے فیصلے کا اعلان کر دیا ہے اور صورت حال یکسر بدل چکی ہے۔ جس طرح سو سال پہلے نوآبادیہ حکم چلا سکتے تھے اور حسب مرضی بلڈوک لوگ منصوبے باندھ سکتے تھے آج ممکن نہیں۔ ہندوستان اور چین کے لوگ آزاد اور متحد ہیں اس لیے اب وہ نوآبادیاتی نظام کے مقابلے پر طاقتور حریفوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہماری دو قوموں کے درمیان براہ راست اور وسیع تعاون کی بنیاد رکھ دی گئی ہے اور شہنشاہیت پرستوں کی طرف سے ہمارے عوام میں لفاق ڈالنے کی کوشش ناکام ہو گئی۔ جب ہمیں اُن شہیدوں کا خیال آتا ہے جنہوں نے جبر و ستم کے خلاف جدوجہد میں اپنی جانیں قربان کیں تو ہمارے دل فخر اور شکرگزاری کے جذبات سے معمور ہو جاتے ہیں۔

حواشی

- ۱۔ انڈیا ٹوڈے، "مارکس آن ریولوشن آف ۱۸۵۷ء" جلد دوم، نمبر ۲، صفحہ ۲۳
- ۲۔ "دی سیکرٹ چائنا وار، ۱۸۵۹-۶۰ء" مرتبہ ڈی۔ باز سیمپل وای۔ لمبی۔ صفحہ ۱۶۲
- ۳۔ "بلیو بک" : کارس پانڈنس ریلیٹو ٹو دی ایل آف الیگن، س س پیٹل مشنر ٹو چائنا اینڈ جاپان ۱۸۵۷-۶۰ء، صفحہ ۸
- ۴۔ ایضاً صفحہ ۲۶
- ۵۔ ایضاً صفحہ ۲۶
- ۶۔ ٹوائٹنگ چی (چن کو چو چین)، "این اکاؤنٹ آف کنفیٹ و ونارنز" جلد دوم، از

ایسٹ انڈین باشندے "کابھی ذکر کرتی ہے جس کا ارادہ یہ تھا کہ اسیج - اے برجوان فیکر کے ساتھ
صوبہ فوکلین میں تائی پنگوں کی پارٹی میں شامل ہو جائے۔"

جن ہندوستانیوں نے رضا کارانہ طور پر تائی پنگوں کا ساتھ دیا وہ اُن عوام کے عالی نامندے
تھے جنہوں نے سو سال پہلے غیر ملکی حملے کے خلاف چینی اور ہندوستانی عوام کی مشترکہ مزاحمت کی
مشعل روشن کی۔ ان کے دلوں میں چینی انقلاب پسندوں کے لیے گہری ہمدردی تھی یہ بہرہی ان کے نجی
تجربے کا نتیجہ تھی اور انہوں نے غیر ملکی جابروں کے خلاف چینی انقلاب پسندوں کے ساتھ شامل ہونے
کے پہلے موقع ہی کو غنیمت جانا۔ جہاں تک اُن ہندوستانی فوجیوں کا تعلق ہے جو گرفتار ہونے کے بعد
تائی پنگ تحریک کو سمجھنے اور اس کی حمایت کرنے لگے اُن میں لازماً خیالات کی تبدیلی پیدا ہوئی ہوگی۔
اس کا ایک اہم سراغ لنڈے نے چھوڑا ہے۔ اس نے لکھا: "جو لوگ تائی پنگوں کی امداد کرنے میں مصروف
تھے انہوں نے تمام مصائب اور خطرات کے باوجود اس راستے کو کیوں پسند کیا۔ اس کی حقیقی وجہ یہ
ہے کہ انقلاب پسندوں کے ساتھ ایک ہی ملاقات سے پنچوؤں پر ان کی برتری ظاہر ہو جاتی اور
اس بنا پر وہ اُن کی ہمدردی اور عملی امداد حاصل کر لیتے۔"

لنڈے کی یورپی ہمدردوں کا ذکر کر رہا ہے۔ اگر فرنگیوں کی صورت میں یہ درست تھا تو ہندوستان
کی حالت میں تو یہ ادبھی زیادہ صحیح تھا کیوں کہ وہ روایتاً حق اور حریت کے دلدادہ تھے اور غیر ملکی حملہ آور
اُن کی مادر وطن اور ان کے بھائیوں کو پامال کر رہے تھے۔ جوں ہی انہوں نے برطانوی فوج کی تہد
سے نجات پائی چینی انقلاب پسندوں کی عملی جدوجہد سے اُن کی آنکھیں کھلیں اور اُن کا سیاسی
شعور بڑھا۔ وہ مشترکہ دشمن کے خلاف آزادی کے مجاہدین بن گئے۔ اس لیے چینیوں کی قومی آزادی
کی تحریک کے حق میں اُن کی امداد نہ صرف دونوں قوموں کے مابین دوستانہ تعلقات کی تاریخ کا
ایک روشن باب ہے بلکہ اس سے اُن کی اپنی زندگی میں نئے معنی پیدا ہوئے۔ اس مثال سے اس
حقیقت کی وضاحت ہوتی ہے کہ جب مظلوم لوگ ایک دوسرے کے دست گیر ہوتے ہیں تو سمجھی وہ
اپنی قوم اور خود اپنے لیے نجات کا راستہ پالیتے ہیں۔

تائی پنگوں کے ہندوستانی ساتھی چینی انقلاب پسندوں کے دوش بدوش مڑتے ہوئے
اس نفرت کا اظہار کرتے جو چینی اور ہندوستانی عوام مشترکہ طور پر غیر ملکی جابروں کی نسبت رکھتے
تھے۔ وہ دونوں قوموں کے مشترکہ مفادات کے ترجمان تھے جو قومی آزادی کی خاطر جدوجہد کر رہی
تھیں۔ وہ بجا طور پر ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے سوراووں کے جانشین، اُن کے ناتمام نصب العین اور

"دی ڈیٹا فروم ماڈرن ہسٹری" مرتبہ دی ہسٹریکل انسٹیٹیوٹ آف دی چائینز اکاڈمی آف

سائنسز، نمبر ۲، ۱۹۵۷ء، صفحہ ۱۰۸

۷۔ "اے کمپلیٹ اکاؤنٹ آف دی ٹرانزیکشن آف فارن ایفیزز" بعہد حکومت سین فینکٹ۔

منچو خاندان جلد ۱۵ ویں صفحہ ۶

۸۔ ایضاً جلد ۲۷ ویں صفحہ ۱۷

۹۔ ایضاً جلد ۲۷ ویں صفحہ ۱۸

۱۰۔ جی۔ ڈیوٹنگٹ: "چائنا" صفحہ ۷۳

۱۱۔ "کارس پانڈس آف سینگ کوآونان" صفحہ ۴۴ از "دی کمپلیٹ ورکس آف سینگ کوآونان" جلد سوم، مطبوعہ ورلڈ بک کمپنی۔

۱۲۔ ایل برائن، "دی تائی پنگ ری بلین ان چائنا" صفحات ۵۵۔ ۲۵۴

۱۳۔ شنگھائی کے مرد و نواح میں پانچویں بمبئی این۔ آئی۔ اور بائیسویں پنجاب این۔ آئی کے فوجی اقدامات برطانوی حکام کے زیر ہدایت ۱۸۶۲ء کے بعد عمل میں آئے۔

۱۴۔ "سیموریلز آف لی ہنگ۔ چنگ" جلد سوم، صفحات ۶۔ ۵۔ اس مضمون بھیر میں برطانوی

انفرمانٹس جو منچوؤں کی طرف سے لڑا، ہلکے طور سے زخمی ہو گیا۔ اس کی موت بے

انگریزوں میں اضطراب پیدا ہو گیا۔ ملاحظہ فرمائیں: جلد دوم، صفحات ۸۸۔ ۵۸۷، "تائی

پنگ تین واہ" مصنف پینڈ (تاریخ بغاوت تائی پنگ)۔ کلمات "ڈاکو" اور "باغی" جو

انتہا سات میں استعمال کیے گئے ہیں جو نفرت کے کلمے ہیں جو منچو عدالت نے تائی پنگوں

کو رسوا کرنے کے لیے استعمال کیے۔

۱۵۔ اے۔ ولسن: "دی ایور وکٹوریس آرمی" صفحہ ۱۵۲

۱۶۔ "سیموریلز آف سورنگ ٹانگ" جلد گیارھویں، حصہ اول، صفحہ ۵۔

۱۷۔ "سیاؤ سانگ سنگ چی" (تغیر پذیر مناظر کے کوائف) مصنف یو۔ یاؤ چی رقم طراز ہے

کہ ۸ نومبر ۱۸۶۳ء کو "ایک غیر ملکی انفرنے شہر سے باہر تائی پنگوں کے تین تر جانوں کے

ساتھ دو اجنبیوں کو بھی گرفتار کیا، ایک گورا اور دوسرا کالی چوڑی والا اور انھیں ضلع

لاؤ ہیسن کے حکام کے حوالے کر دیا۔

ملاحظہ فرمائیں "تائی پنگ تین کوآو" جلد ششم، صفحہ ۵۲۶، مرتبہ "چائینز

۱۲: فتح گڑھ میں جوالا پرشاد اور ننگا سنگھ کے زیر کمان نانا صاحب کے فوجی دستوں کو شکست۔

۱۶: کانپور کی لڑائی اور ٹھور کی جانب نانا صاحب کی فوجوں کی پسپائی۔

۲۷: آہ پر کنور سنگھ کا قبضہ۔

ماہ اگست

۳: انگریزوں کی طرف سے آہ کی خلاصی

۱۳: جگدیش پور میں کنور سنگھ کی شکست

۱۶: ٹھور میں تانیا ٹوپے کی شکست

ماہ ستمبر

۱۲: سرکون کیمپ میں فوج کی چیف کمان سنبھالنا۔

۱۲: انگریزوں کا کشمیری دروازہ، دہلی کو توپوں سے اڑانا۔

۱۹: لاہوری گیٹ برج، دہلی پر انگریزوں کا قبضہ۔

۲۰: دہلی پر دوبارہ انگریزوں کا قبضہ

۲۱: مقبرہ ہمایوں میں بہادر شاہ کا انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈالنا۔

۲۲: میجر ہارٹسن کا بہادر شاہ کے بیٹوں کو گرفتار کر کے قتل کرنا۔

ماہ اکتوبر

۲۲: انگریزوں کا سکندر باغ میں سے گھس کر لکھنؤ پر دوبارہ قبضہ کرنا۔

۲۶: پانڈو کے کنائے تانیا ٹوپے کو شکست

۲۷: تانیا ٹوپے کا کانپور سے انگریزوں کے پاؤں اکھیرنا اور اس پر قبضہ کرنا۔

ماہ دسمبر

۶: کیمپ میں کے ہاتھوں کانپور سے تانیا ٹوپے کے پاؤں اکھڑنا اور اس کا لکشی بائی کے

ساتھ جانا۔

۱۶: کاپی کی لڑائی، تانیا ٹوپے کی پسپائی۔

۱۸۵۸ء، ماہ مارچ

۵: بہدی حسین اور گوندہ اور چروہ کے راجاؤں کا چندا میں برطانوی کیمپ پر حملہ۔

جدول تواریخ

۱۸۵۷ء

ماہ مئی

۹۔ میرٹھ کی ایک رجمنٹ۔ کہ ۸۵ سپاہیوں کا کورٹ مارشل جنھوں نے چربیے کا توپوں کو چھونے سے انکار کیا۔ ان سپاہیوں کو دس سال قید یا مشقت کی سزا دی گئی۔
۱۰۔ میرٹھ کی تین رجمنٹوں کی بغاوت، قیدی سپاہیوں کو آزاد کرانے کے بعد ان کا دہلی کی طرف کوچ۔

۱۱۔ دہلی پر سپاہیوں کا قبضہ، بہادر شاہ کے شہنشاہ ہونے کا اعلان
۱۲-۱۳۔ بغاوت کا مذکورہ ذیل مقامات میں پھیلنا:- فیروزپور، مظفرنگر، علی گڑھ، نوشہرہ
اٹاوا، مین پوری، رڈکی، ایٹھ، نصیر آباد، متھرا، لکھنؤ، بریلی اور شاہجہان پور

ماہ جون

۱-۵۔ مراد آباد، بدواؤں، اعظم گڑھ، سیتاپور، نیچ، بنارس، کانپور اور جھانسی میں شورش۔

۶۔ نانا صاحب کانپور کا محاصرہ کرتا ہے۔

۸۔ جھانسی پر قبضہ، رانی لکشمی بائی کا اقتدار بحال، بادی سرائے کی لڑائی اور دہلی کے نزدیک رنج دپھاڑی، پراگریزوں کا قبضہ۔

۹-۱۲۔ دہلی آباد، فتح پور، لوگانگ، گوالیار اور فتح گڑھ میں بغاوتیں۔
۲۶-۲۷۔ نانا صاحب کا کانپور کو فتح کرنا۔

ماہ جولائی

۱۔ بہترس اور اندور میں بغاوت، باغیوں کی طرف سے لکھنؤ ریڈیٹسی کا محاصرہ۔

ماہ اکتوبر

۱۹-۱۶: انگریزوں کا جگدیش پور کا محاصرہ جس کی مدافعت کنور سنگھ کا بھائی اور سنگھ کر رہا تھا۔ اور سنگھ کا بمقام نیاوی شکست کھانا۔

۱۸۵۹ء

ماہ جنوری

۲۱: سیکر کی رٹائی، تانتیا ٹوپے کی شکست

ماہ اپریل

۶: تانتیا ٹوپے کے تیس راجہ مان سنگھ کی غداری، اور تانتیا ٹوپے کی گرفتاری اور اس کا قیدی بن جانا

۱۸: تانتیا ٹوپے کو پھانسی دی گئی۔

ماہ اکتوبر تا ماہ دسمبر

شمالی اودھ اور نیپال میں باغیوں کے غلات آخری فوجی کارروائی اور دسمبر میں نانا صاحب کے چار ہزار پیروؤں کی گرفتاری۔

۲۱: کنوڑ پر انگریزوں کا مکمل اختیار

۲۲: کنوڑ سنگھ کا اعظم گڑھ پر قبضہ

۱۵ اپریل

۱: تانٹیا ٹوپے کا بائیس ہزار جوانوں کے ساتھ لکشمی بائی کی مدد کو پہنچنا اور میٹھا کے کنارے انگریزوں کے ہاتھوں شکست کھانا۔

۵-۳: انگریزوں کا جھانسی پر دھاوا، قلعہ جھانسی کا مفتوح ہونا، لکشمی بائی کا فرار ہونا، اعظم گڑھ میں کنوڑ سنگھ کا انگریزوں کو دوبارہ شکست دینا۔

۲۳: جگدیش پور میں کنوڑ سنگھ کا انگریزوں پر ایک اور فتح حاصل کرنا۔

۲۶: کنوڑ سنگھ کی وفات۔

ماہ مئی

۶: بہادر خاں سے انگریزوں کا بری کو فتح کرنا

۱۱: انگریزوں کی طرف سے شاہجہانپور کا محاصرہ، جس کی مدافعت مولوی احمد اللہ شاہ کر رہا تھا۔

۲۲: کاپی کی دوسری لڑائی، لکشمی بائی، نواب باندہ اور راؤ صاحب (بھتیجا نانا صاحب) باغیوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔

۲۴: کاپی پر انگریزوں کا قبضہ۔

ماہ جون

۱: رانی لکشمی بائی، راؤ صاحب اور نواب باندہ سندھیا گوالیار کو شکست دیتے ہیں گوالیار پر قبضہ کر کے نانا صاحب کے پیشوا ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔

۴: انگریزوں کا محاصرہ گوالیار، گوالیار میں رانی جھانسی کا لڑتے لڑتے مارا جانا، تانٹیا ٹوپے کا فرار۔

۲: انگریزوں کا گوالیار پر دوبارہ قبضہ

ماہ اگست

۲: ایسٹ انڈیا کمپنی کے اختیارات کا برطانوی تاج کے حق میں انتقال

۱۵: کواٹری کی لڑائی (اودھ پور) اور تانٹیا ٹوپے کی شکست۔

ہماری مطبوعات

180/-	پروفیسر سیدہ جعفر	جنت سنگار
45/-	پروفیسر محبت الحسن / مسرور علی ہاشمی	ہندوستان کے دور وسطی کے مؤرخین
18/-	رام لال ناہیوی	چکبست
10/-	ظ۔ انصاری	چے خف (دوسری طباعت)
48/-	الطاف حسین حالی	حیات جاوید (تیسری طباعت)
24/-	ظ۔ انصاری / ابوالفیض سحر	خسرو شناسی (دوسری طباعت)
8/25	زیڈ۔ اے۔ عثمانی	دانے
12/-	(مترجم) پروفیسر خواجہ احمد فاروقی	دشتیو (غالب)
47/-	قومی اردو کونسل	درس بلاغت (تیسری طباعت)
40/-	ڈاکٹر فہمیدہ بیگم	قدیم اردو نظم (حصہ اول)
42/-	پروفیسر نصیر الدین ہاشمی	دکن میں اردو
15/50	پروفیسر نصیر الدین ہاشمی	دکنی ہندو اور اردو
45/-	پروفیسر سیدہ جعفر	دکنی نثر کا انتخاب
60/-	علی جواد زیدی	انیس کے سلام
36/-	صالحہ عابد حسین	انیس کے مرثیے اول (دوسری طباعت)
40/-	صالحہ عابد حسین	انیس کے مرثیے دوم (دوسری طباعت)
18/-	پروفیسر اختر اور نیوی	بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء
58/-	ڈاکٹر یوسف سرمست	بیسویں صدی میں اردو ناول



Price : Rs. 75/-